فہرست ابواب مقالہ

صفحہ نمبر		عنوان
(۱)		☆ پیشِ لفظ
		(۱) باب اوّل
(۸)	شخصیت اور سوانح	....
		(۲) باب دوم
(۲۵)	نذؔیر فتح پوری کا ادبی پس منظر	....
		(۳) باب سوم
(۴۹)	نذؔیر فتح پوری بحیثیت شاعر	....
		(۴) باب چہارم
(۲۰۷)	نذؔیر فتح پوری بحیثیت نثر نگار	....
		(۵) باب پنجم
(۲۹۹)	نذؔیر فتح پوری اور متفرق اصناف نثر	....
		(۶) باب ششم
(۳۶۳)	ماحصل	....
		☆ کتابیات
(۳۶۹)	کتابیات	....

پیش لفظ

شاعری تمام فنون لطیفہ میں امتیازی مقام رکھتی ہے یہ دلی جذبات وخیالات کے اظہار کا بہترین وسیلہ بھی ہے۔اوراسی لیےاس میں تاثیر بھی زیادہ ہوتی ہے۔شاعری کوجن شعراء نے معتبراور معنی خیز بنایا ہےان میں ایک نام نذیر فتح پوری کا بھی شامل ہے۔

نذیرایک کثیرالجہت شاعرہیں اوران کی سوچ کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ان کا شماران تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ادب میں نئے تجربات کا نہ صرف خیر مقدم کیا بلکہ ترویج واشاعت میں اہم رول بھی ادا کیا کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ تلاش وجستجو کا سلسلہ چلتا رہے تو نئے نئے انکشافات ہوتے رہیں گےاور خوب سے خوب تر کی تلاش کا مرحلہ بھی طے ہوتا رہے گا۔اوراس طرح اچھوتے ذہن کی سیر کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔ان کا یہی تخلیقی جذبہ انہیں ہمیشہ متحرک اور مصروفِ عمل رکھتا ہے۔

نذیر فتح پوری کی شخصیت انسانی خوبیوں اخلاقی اچھائیوں اوراعلیٰ نصب العین سے متصف ہے۔ان کے فکروفن پر متعدد تصانیف ومضامین شائع ہوچکے ہیں۔جونذیر شناسی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ان کی شخصیت وفکروفن کی مزید وضاحت کے لیے یہ مقالہ ''نذیر فتح پوری شخصیت اورادبی کارنامے'' تحریر کیا گیا ہے۔

یہ مقالہ بظاہر چھ ابواب پر مشتمل ہےان میں سے پانچ ابواب بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور آخری باب میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

☆...... پہلا باب نذیر کی ''شخصیت اورسوانح'' سے متعلق ہے۔اس باب میں ان کی شخصیت اوران کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آپ کے آباء واجداد، پیدائش، تعلیم ،تربیت ،فکر معاش ،ازدواجی زندگی ،شعری زندگی کا آغاز ،نثر نگاری کی ابتداء ،انعامات واعزازات اورعادات وخصائل وغیرہ کے ذریعہ آپ کی شخصیت کو پیش کیا گیا ہے۔

آپ یکم دسمبر ۱۹۴۶ء میں فتح پور کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔بچپن غربت کے حالات میں بیتا۔اوراسی غریبی نے ان کے ہاتھوں سے کاپی کتابیں چھین کر محنت مشقت بھری زندگی کی طرف دھکیل دیا۔لیکن نذیر کب رکنے والے تھے۔اپنے ناسازگار حالات کے باوجود انہوں نے اپنی زندگی ہمتوں اور حوصلوں کے نام کردی۔اور مزدوری کے شغل کے ساتھ اپنی ادبی زندگی میں ہمت وحوصلے کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔۱۹۵۹ء کے قریب نذیر فتح پوری پونہ چلے گئے۔

یہاں رہ کرآپ نے اپنے اہلِ خانہ کی ذمہ داری اٹھائی اورعلم وادب سے بھی رشتہ استوار کیا۔اپنی عمر کے ۷۰ ویں پڑاؤ پر بھی آپ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے ادبی اثاثے میں اضافہ کرتے جارہے ہیں۔

☆...... دوسرا باب۔''نذیر فتح پوری کا ادبی پس منظر'' اس باب کے پہلے حصے میں فتح پور اور دوسرے حصے میں پونہ میں نذیر کے ہم عصر شعراء کا جائزہ لیا گیا ہے۔جس زمانے میں نذیر فتح پوری کا ادبی ذوق پروان چڑھا۔اس عہد کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے فتح پور کے ادبی ماحول کو سمجھنا ضروری ہے۔اسی کے متعلق اس باب میں گفتگو کی گئی ہے۔کرم چند چوہان کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے پوتے نواب فتح خان نے ۱۴۵۱ میں فتح پور آباد کیا۔قائم خانی نوابین ۱۴۵۱ تا ۱۷۵۰ فتح پوری پر قابض رہے۔ان نوابین نے دل کھول کرعلم وادب کی خدمت کی۔نواب الف خان کے دوسرے بیٹے نعمت خان جو جان کوی کے نام سے مشہور ہوئے ،ان کی اہم تصنیف قائم راسا ۱۶۷۶ء میں شائع ہوئی۔ان کے علاوہ نواب فدن

خان کی بیٹی تاج بی بی جو بادشاہ اکبر کی بیگم تھی نے بھی کرشن بھگتی کا اثر قبول کیا۔ان کی مشہور تصنیف بیوی باندھی کا جھگڑا ہے۔حضرت نجم الدین چشتی، حاجی محمد نصیر الدین شاہ محدث، حضرت محمد عیسیٰ اور خواجہ محمد حنیف کے بعد شیخ ابراہیم خیال فتح پوری، وفا فتح پوری، قمر الدین خان جوڈ، ماسٹر اصغر علی خان پڑھیار اور دیگر حضرات نذیؔر کی پیدائش سے پہلے اس خطہ کے ادبی ماحول کو سجائے ہوئے تھے۔ان کے بعد بھی فتح پور کی ادبی محفل کو عبدالکریم خان کریم، غلام جیلانی انجمی، شبیر حسن فرازؔ، عادل فتح پوری، عنبر فتح پوری وغیرہ دیگر حضرات نے روشن رکھا۔فتح پور کے ساتھ پونہ کے ادبی ماحول نے بھی نذیر پر اپنے نقوش چھوڑے۔اور جناب شوکت حسن عکسی برنی، دبلدار ہاشمی، حکیم راضی ادیبی، علامہ کالی داس گپتا رضاؔ کی صحبتوں سے نذیؔر فیض یاب ہوتے رہے۔ان کے علاوہ ڈاکٹر امانت، جلیل الہ آبادی نور منیری، سحر جلگانوی، رفیق جعفر وغیرہ حضرات نے پونہ کے ادبی ماحول کو پروان چڑھایا۔

☆......تیسرا باب ''نذیؔر فتح پوری بحیثیت شاعر'' ہے۔اس باب میں نذیؔر کی غزل، آزاد غزل، نظم، سہ سطری نظم، نثری نظم، گیت، دوہے ماہیے، کہہ مکرانی، پہیلی، حمد، نعت، مثنوی، تکونی وغیرہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔آپ نے کثرت سے غزلیں کہیں ہیں۔شاعری کی سبھی اصناف میں آپ نے فنی مہارت کا ثبوت دیا۔اور اپنی شاعری کو فنی لوازمات سے آراستہ کیا۔غزل میں مطلع ردیف قافیہ مقطع اور بحر کی پابندی کے ساتھ آپ نے غزلوں کو سنوارا اور سجایا۔نظم گیت ماہیے اور دوہے تخلیق کرتے وقت بھی انہوں نے ان کے فنی اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔

آپ نے اپنی شاعری میں موضوعات کی بھی کوئی قید نہیں رکھی اور مختلف موضوعات کو اپنی شاعری میں سمو دیا۔آپ کی شاعری زبان کی سادگی کے ساتھ دلکشی بھی لیے ہوئے ہے، آپ کی شاعری انسانی احساسات کی ترجمانی کرتی ہے، آپ کی شاعری دکھے ہوئے دلوں کی صدا بھی ہے اور ہمت وحوصلوں کی زبان بھی ہے۔

☆......چوتھا باب ''نذیؔر فتح پوری بحیثیت نثر نگار'' ہے۔اس باب میں نذیؔر فتح پوری کی نثر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے تحت ان کے ناول، افسانہ، مختصر افسانہ، تنقید، مضمون، سوانح، سفرنامہ، تاریخ وتذکرہ، تحقیق وتنقید، اور فلمی مکالمہ نگاری، پر روشنی ڈالی گئی ہے نذیؔر جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے نثار بھی ہیں۔انکی تقریباً سبھی نثری تصانیف اسی بات کا پختہ ثبوت ہیں۔انہوں نے ناول، افسانہ، افسانچہ اور ڈرامہ کے ذریعہ اپنے عہد و ماحول کی عکاسی کی۔معاشرے کی برائیوں کو اجاگر کرکے سماج کا اصلی چہرا قارئین کے سامنے پیش کیا اور ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے اپنے قارئین کو پیغام بھی دیا۔اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کرکے معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ فراہم کیا۔سفرنامے میں سفر کی روداد اس انداز سے بیان کی ہے کہ قارئین ان کے ہم سفر ہوگئے۔سوانح میں اپنے ماضی کو اس انداز سے بیان کیا ہے مانو ان کی زندگی نہ ہوکر کوئی دلچسپ کہانی ہو۔تحقیق وتنقید کے ذریعہ آپ نے ان دشوار گزار راہوں کی بھی سیر کی جہاں جانے سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں۔تاریخ وتذکرے کے ذریعہ اپنے وطن عزیز کی تاریخ اور وہاں کے شعراء کا تذکرہ پیش کردیا۔غرض کہ نذیؔر نے شاعری کی طرح نثر میں بھی اپنے سادہ ودلکش انداز بیان کے ذریعہ اپنی بات پیش کی اور مشکل سے مشکل تر مسئلہ کو بھی آسانی سے حل کرلیا۔

☆...... پانچواں باب ''نذیؔر فتح پوری اور متفرق اصناف نثر'' ہے اس باب کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ان کی طنز ومزاح نگاری، صحافت نگاری، ترجمہ نگاری، اور ترتیب وانتخاب کا جائزہ لیا گیا ہے۔نذیؔر کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''غالب اور ہم'' ابھی بھی غیر مطبوعہ ہے۔یہ وہی مضامین ہے جو نذیؔر نے ایک زمانے میں خانہ بدوش کے فرضی نام سے مختلف رسائل وجرائد میں شائع کروائے تھے۔

پچھلے ۳۶ سالوں سے نذیر اسباق کے ذریعہ اردو کی خدمت میں مشغول ہیں۔پونہ میں اردو کے لیے ناسازگار حالات ہونے کے باوجود

اس خارزار بستی میں اردو کے پھول کھلائے ہوئے ہیں۔اور بڑے عزم وحوصلے کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔اپنی اداریہ نگاری کے ذریعہ آپ نے بہت سے مشکل موضوعات پر قلم اُٹھایا اور اپنے قارئین کو ان سے آگاہ کروایا۔

نذؔیر نے ترجمہ نگاری میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھایے اور ہندی ناول کے علاوہ کچھ نظموں اور افسانوں کو اردو میں ترجمہ کیا۔ترجمہ اس انداز سے کیا کہ وہ ترجمہ نہ ہوکر خود کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں۔

ترتیب وانتخاب کے ذریعہ آپ نے مختلف حضرات کے مضامین یکجا کر کے کتابیں ترتیب دیں اور مشہور سے لے کر گمنام شخصیات کو خراج تحسین عطا کیا۔ان کتابوں کی تعداد ۱۵ سے تجاوز کر چکی ہے۔دوسروں کے فن اور شخصیت کو چاند اور سورج کی طرح روشن کر کے اس کی روشنی عوام و خواص تک پہنچانا ان کا شیوہ ہے۔

☆...... باب چھ ''ماحصل'' ہے۔اس حصے میں نذیر کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اور نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔نذؔیر کی تمام شائع شدہ تصانیف ان کی تعمیری سوچ، دورِحاضر کے روشن نظریات اور صحت مند رجحانات کی منہ بولتی تصویر پیش کرتی ہے۔ان کی شخصیت اردو تہذیب، اردو اقدار اور روایات کی پاسدار رہے۔مقالے کے آخر میں کتابیات کی فہرست شامل کی گئی ہے۔یوں تو اس مقالے کی تکمیل میں لاتعداد کتب و رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن کتابیات کے ذیل میں صرف انہیں کا حوالہ درج ہے جن سے براہِ راست مدد لی گئی ہے۔

میں ڈاکٹر حسن آراء صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کی زیرِ نگرانی یہ مقالہ تحریر کیا گیا۔میں اپنی کم علمی کے باوجود انکی علمی وادبی بصیرت، مخلصانہ رہنمائی اور بے پناہ شفقت کی وجہ سے ہی یہ کام کر پائی ہوں۔انہوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور تحقیق وتنقید کے رموز سے آشنا کیا۔تحقیق کی اس دشوار گزار راہ کو میں نے انہیں کی شفقت، ہمت افزائی اور رہنمائی میں سلامتی سے پار کیا جس کے سبب مجھے یہ ثمرہ حاصل ہوا۔میں ان کے لیے اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ دنیا جہاں کی تمام خوشیوں سے انہیں نواز دے اور صحت وتندرستی عطا فرمائے۔(آمین)

میں نذؔیر صاحب کی بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے مواد کی فراہمی سے لے کر مقالے کی تکمیل تک قدم قدم پر میری مدد کی۔ان سے جب بھی ملاقات اور فون پر بات ہوئی وہ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ان کی مخلصانہ شخصیت کے سبب وہ ہمیشہ میری مدد کے لیے تیار رہتے۔اس مقالے کے مواد کی فراہمی میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔مقالے سے متعلق ہر چھوٹی سے چھوٹی معلومات وہ مجھے وقت بہ وقت فراہم کرواتے رہے۔بارگاہِ الٰہی میں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کے ادبی و دنیاوی مال وزر میں برکت کے ساتھ تندرستی عطا فرمائے اور عمر دراز کرے۔(آمین)

میں میرے اساتذہ ڈاکٹر قمر جہاں بیگم، ڈاکٹر نادرہ خاتون اور ڈاکٹر محمد نعیم فلاحی کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بہترین تعلیم سے مجھے آراستہ کیا اور ان کے نیک مشوروں نے مجھے یہ مقالہ تحریر کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

میں اپنے مشفق والدین جناب عبدالحمید صاحب اور ریحانہ بیگم کی بھی شکر گزار ہی نہیں احسان مند ہوں کہ انہوں نے تعلیمی میدان میں مجھے آگے بڑھانے میں میری نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ مالی تعاون بھی عطا کیا۔اللہ تعالیٰ نے آج جو مقام مجھے عطا کیا ہے یہ انہیں کی دعائے سحر گاہی کا ثمرہ ہے۔ان کی تربیت نے ہی مجھے یہ مقالہ لکھنے کے قابل بنایا۔اس کے لیے میں ان کا جتنا شکریہ ادا کروں اتنا کم ہے۔اللہ ان کے دل کی تمام جائز دعائیں قبول فرمالے اور انہیں صحت وتندرستی عطا فرمائے۔(آمین)

میں اپنی ہمشیرہ ترانہ بانو اور بھائی عادل حسین، آصف حسین کی بھی شکر گزار ہوں جن کی محبتوں کے طفیل میں اس مقالے کو مکمل کر پائی ہوں

اللہ انہیں زندگی کے ہر مورچے پر فتح یاب کرے (آمین)

میں عرفان فتح پوری (فرزند نذیر فتح پوری) کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس مقالے سے متعلق کئی کام انجام دیئے۔ اللہ انہیں منزل مقصود عطا کرے۔ میں جناب مفتی حبیب الرحمٰن صاحب ندوی اور مولانا نور الحسن رضوی کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقالے کو حسن کتابت سے آراستہ کیا۔ ساتھ ساتھ میں اپنے عزیزان شیرین فاطمہ، انو مینا، اخلاق حسین اور عبد الکلیم قریشی کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور کام کے سب ہونے والی مایوسی سے مجھے بچائے رکھا اللہ انہیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔

تحقیق میں کوئی بات حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آئے دن انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ ادب میں تو یہ بات اور بھی شدت کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ اسی لیے میں اہلِ نظر حضرات سے امید کرتی ہوں کہ وہ میری کم علمی کو مدنظر رکھتے ہوئے میری لغزشوں کو درگزر فرمائیں گے۔ میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ مقالہ مکمل ہو۔ لیکن خامیوں کا بہرطور اعتراف بھی ضروری ہے۔

ترنم

ریسرچ اسکالر

☆☆☆

بابِ اوّل

شخصیت اور سوانح

شخصیت اورسوانح

راجستھان نہ صرف تاریخی بلکہ ادبی اورثقافتی اعتبار سے بھی ہندوستان میں اہمیت کا حامل ہے۔راجستھان کی ریاستیں تاریخی اورادبی لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ کا اہم حصّہ رہی ہیں۔

یہاں ایک طرف ایسے بہادر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے بازوؤں کے زور پر اپنے ملک کی حفاظت کی تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے ادبی خدمات سے اُردوادب کوفروغ دیااورآج بھی اس میدان میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جس طرح ایک مجاہداپنی بندوق اورتلوار کے ذریعہ اپنے ملک کی خدمت کرتا ہے اسی طرح ایک ادیب اورشاعراپنے قلم کے ذریعہ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو ہمارے سامنے نمایاں کرتاہے۔قلم کے ایسے ہی خدمت گزاروں میں ایک نام نذیؔر فتح پوری کا بھی قابل ذکر ہے۔وہ اپنے قلم کی طاقت پرخدمت ادب میں سرگرم عمل ہیں۔

نذیؔر............ یہ نام ہے فتح پورشیخاواٹی، ضلع سیکر میں کھلے اس پھول کا جوآج پونہ میں مقیم ہوکر پوری اردودنیا کواپنی خوشبو سے مہکارہاہے۔نذیؔر فتح پوری کاقلم وقت کی دھڑکنوں کے ساتھ رواں دواں رہنے کا ہنر جانتا ہے،عمرکے اس پڑاؤ میں جہاں انسان تھک تھکا کراور بجھ بجھا کراپنے آپ کوحالات کی ہواؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتاہے۔نذیؔر فتح پوری کوایسے حالات میں بھی قدرت نے تروتازہ رکھاہے۔ان کے خاکستر میں آج بھی چنگاریاں موجود ہیں۔نذیؔران چنگاریوں کی حدت سے اپنے تخلیقی جذبے کی شدت کوتاپتے رہتے ہیں ایک طرح سے نذیؔر فتح پوری کے جینے کے لیے لکھنالازم ہے۔بلکہ قرطاس وقلم کی ذمہ داری ایک فرض کی طرح نبھاتے ہیں۔لفظوں کااک بسیط جہاں ان کے پاس ہے۔تخیل کاایک بحرِ بے کراں ان کی تحویل میں ہے،وہ خلوص کے موتی رولتے ہیں اورمحبت کی زباں بولتے ہیں۔یہ سچ ہے کہ جس انسان کے پاس معاون جذبہ ہوتاہے قدرت بھی اس پراپنی فیاضی کے سارے درواکردیتی ہے۔نذیؔرایسا عنوان ہے جس کوپوری گرفت میں لیناممکن نہیں۔!!

نذیؔرکاخاندانی شجرہ اس طرح ہے:-

خاندانی شجرہ

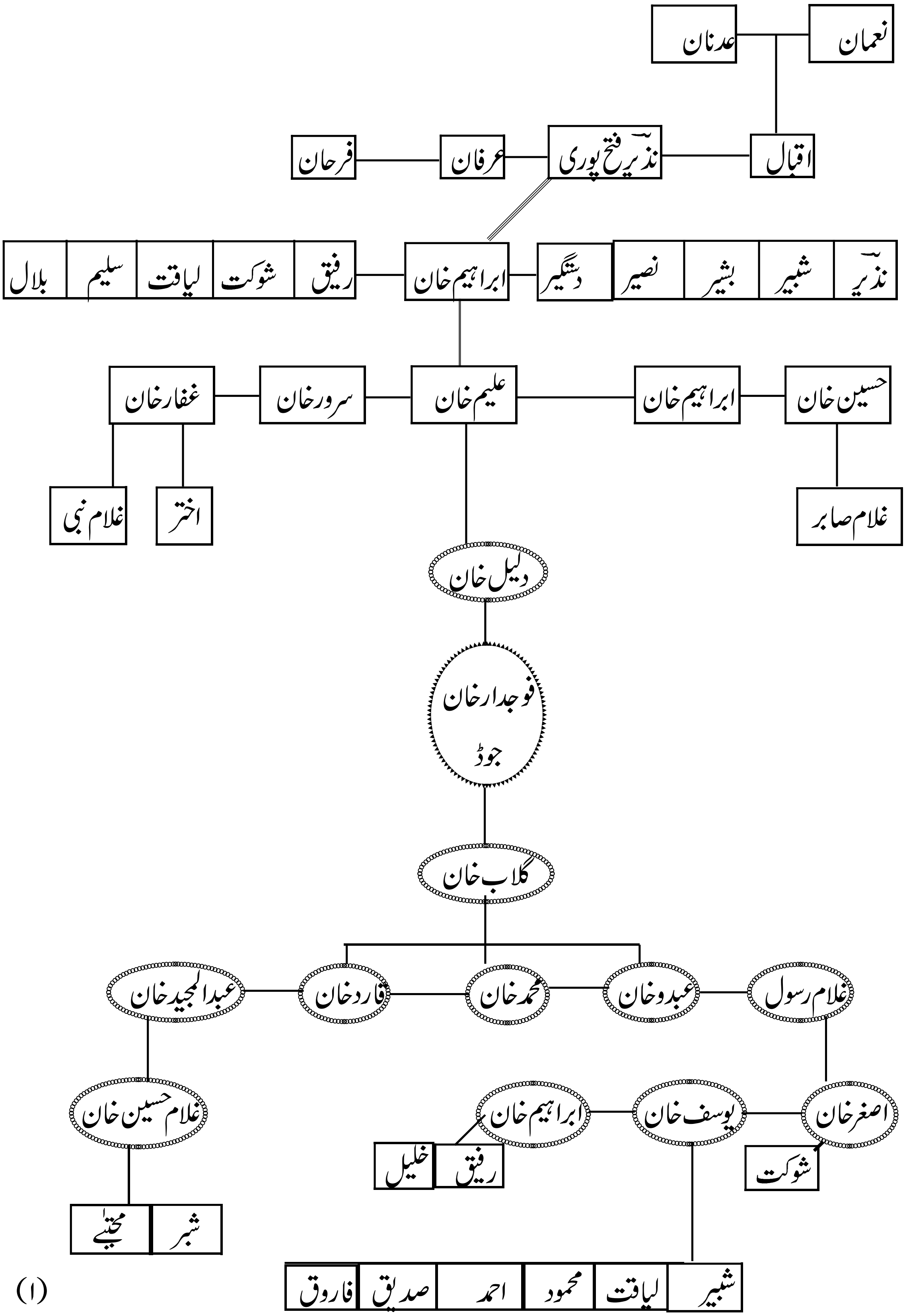

(۱)

آباؤ اجداد:-

بادشاہ محمد تغلق کے عہد میں جن راجپوت راجاؤں نے اسلام قبول کیا ان میں سب سے اوّل نام کرم چند چوہان (راجپوت) کا ہے۔ یہ حصار کے رہنے والے تھے۔ آج سے ساڑھے پانچ سو سال قبل نواب فتح خان نے فتح پور شہر بسایا تو راجستھان کے شیخاواٹی علاقوں کی جن برادریوں نے اسلام قبول کیا ان میں چوہان، پنوار، پڑھیار، جوڑ، بینس، دربان، جویا، بھاٹی، تنور، لہنگے، دیوڑا اور بدانوں کے نام اہم ہیں۔ موئل اور چوہل بھی ان میں شامل ہیں۔ نذیرؔ اسی خاندان کی جوڑ برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا خاندان ''خانجیوں کا خاندان'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اور یہی ''فوجدار خان'' کا خاندان بھی ہے۔ اس خاندان کے بہت سے افراد دربار سیکر سے وابستہ تھے۔ ان میں بہت سے افراد تو اعلیٰ عہدوں پر فائز بھی رہے۔

جناب فوجدار خان صاحب کے دو فرزند تھے جن کا نام گلاب خان اور دلیل خان تھا۔ دلیل خان کے بیٹے ''علیم خان'' کے چار بیٹے تھے جن کے نام حسین خان، ابراہیم خان، سرور خان اور غفّار خان ہیں۔ ان میں حسین خان کے صاحب زادے غلام صابر ہیں۔ اور غفار خان کے دو بیٹے اختر اور غلام نبی ہیں۔ سرور خان ۱۸؍سال کی عمر میں کنوارے ہی انتقال کر گئے تھے۔ ابراہیم خان کے دس بیٹے ہوئے ان کے نام نذیر، شبیر، بشیر، نصیر، دستگیر، رفیق، شوکت، لیاقت، سلیم اور بلال ہیں۔ ان میں نذیرؔ سب سے بڑے ہیں۔ اور یہی وہ شخصیت ہے جو ادبی دنیا میں نذیرؔ فتح پوری کے نام سے اپنی ایک منفرد پہچان بنا چکی ہے۔

جب نذیرؔ تقریباً ۷؍۸ برس کے تھے تب ان کے بڑے ابّا حسین خان کا انتقال ہو چکا تھا، یہ بہت گرم مزاج کے تھے۔ ان کے تین بچّے تھے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ یہ تینوں آج بھی فتح پور میں آباد ہیں اور ان کی اولادیں خوب پھل پھول رہی ہیں۔ ابراہیم خان اور غفّار خان دونوں بھائی پونہ میں آباد ہیں، نذیرؔ کے چچا غفّار خان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ نذیرؔ کے دس بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

چونکہ نذیرؔ کے آباؤ اجداد راجپوت برادری سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا اور الگ الگ پیشے اختیار کئے۔ ان میں ان کے والد بلڈنگ تعمیر کرنے کا کام کرتے ہیں اس لئے نذیرؔ نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا۔ آزادی سے پہلے نذیرؔ کے والد برطانیہ فوج میں ملازم تھے۔ مگر یہ ملازمت مستقل نہیں تھی اس لئے فوج میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے کبھی بندوق نہیں چلائی۔

نذیرؔ کی والدہ سائرہ بی دیوڑا خاندان کے فرد علاؤالدین خان دیوڑا کی صاحب زادی تھیں۔ سائرہ بی کے والدین جوانی میں ہی انتقال کر چکے تھے اُن کے بعد اُن کی شریک حیات آمنہ بی نے سائرہ بی اور ان کے بھائی مقبول خان دیوڑا کی پرورش نہایت کسمپرسی کی حالت میں کی۔ آمنہ بی نہایت صبر رسیدہ خاتون تھیں۔ انہوں نے زندگی کے تمام آلام و مصائب سے لڑتے ہوئے اپنے بچوں کی پرورش کی۔

وِلادت:-

نذیرؔ کے دادا علیم خان فتح پور سیکر کے جس محلے میں آباد تھے وہ محلّہ ''زمینداران'' کہلاتا ہے۔ اسے وہاں کے کچھ باشندے محلّہ خانجی کی حویلی بھی کہتے ہیں۔ اس جگہ علیم خان کے چاروں بیٹوں حسین خان، ابراہیم خان، سرور خان، اور غفّار خان کی ولادت ہوئی ان چاروں میں ان کے بیٹے ابراہیم خان کا نکاح دیوڑا خاندان کی بیٹی سائرہ بی جو مرحوم علاؤالدین خان دیوڑا کی بیٹی تھی سے ہوا۔

نذیرؔ کی پیدائش کے سلسلے میں ریاض بجنوری فرماتے ہیں۔

''نذیرؔ صاحب کی پیدائش فتح پور شیخاواٹی ضلع سیکر راجستھان کے ایک مسلم راجپوت گھرانے میں یکم دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہوئی تھی۔'' (۲)

اس قول کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نذیرؔ ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے۔نذیرؔ جس گھر میں پیدا ہوئے تھے اس گھر کے مالی حالات اچھے نہیں تھے گھر میں غربت کا راج تھا۔نذیرؔ جس کمرے میں پیدا ہوئے وہ ایک دس بائی دس کا چھوٹا سا کمرا تھا۔

تربیت:۔

اچھی تربیت ہی زندگی کو سنوارنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔اگر تربیت بہترین طریقے سے کی جائے تو اولاد نیک بنتی ہے۔

نذیرؔ کی تربیت میں بھی ان کی ماں اور نانی کا اہم رول رہا ہے۔ان کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں ان دونوں کا نہایت اہم حصہ رہا ہے۔نذیرؔ اپنی نانی کے لاڈلے تھے۔ان کی نانی آمنہ دیوڑا خاندان کی تھیں۔نذیرؔ کے بچپن کا زائد حصہ اپنے ننھال میں گزرا ہے۔اس گھر میں ان کی چار نانیاں، ماموں، ممانی، خالائیں سب ہی تھے۔جو نذیرؔ کو بے حد پیار کرتے تھے اور انہیں پیار سے ''جیا'' کہہ کر پکارتے تھے۔نذیرؔ نے ان سبھی کی محبت اور شفقت میں اپنا بچپن گزارا۔

نذیرؔ کی والدہ کوئی تعلیم یافتہ خاتون نہیں تھیں دنیاوی تعلیم سے ان کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔اور دینی تعلیم بھی انہوں نے حاصل نہیں کی تھی۔پھر بھی کلام پاک پڑھنے کا انہیں بہت شوق تھا۔ایک مرتبہ کسی نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ قرآن کی ہر سطر پر بسم اللہ پڑھ کر اُنگلی پھیر لی جائے تو اس طرح بھی قرآن پڑھا جا سکتا ہے۔اس مشورے کو قبول کرتے ہوئے وہ اسی طرح قرآن پڑھ لیا کرتی تھیں۔اتنا سب ہونے کے باوجود بھی انہوں نے نذیرؔ کو بہترین آدابِ زندگی سکھائے اور بہترین اخلاق سے آراستہ کیا۔

میں نے نذیرؔ سے ایک تحریری مکالمہ بھی کیا تھا جس میں وہ اپنی پرورش کے متعلق بتاتے ہیں۔

میں ددھیال اور ننھال دونوں جگہ پہلا بچہ تھا اس لئے ہر کوئی مجھ سے پیار کرتا اور میرا خیال رکھتا میری ماں اور خالائیں کہا کرتی تھیں کہ بچپن میں میں بہت خوبصورت تھا اس لئے دونوں گھرانوں کے افراد مجھے بے حد لاڈ کرتے۔اور محبت سے پیش آتے۔سب پیار سے مجھے ''جیا'' کہتے تھے۔(۳)

تعلیم:۔

نذیرؔ کا بچپن غربت کے حالات میں گزرا۔گھر میں غریبی کی بادشاہت تھی۔ان حالات میں ان کی تعلیم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔انہوں نے جب ہوش سنبھالا، والد سے مدرسہ جانے کی ضد کی۔اس کے پہلے والدین نے انہیں کبھی مدرسہ جانے کی تاکید نہیں کی تھی۔والدہ ان کی تجویز سے خوش ہوگئی۔اور انہیں مدرسہ بھیجنے کے لئے راضی ہوگئی اور انہیں درگاہ حاجی نجم الدین میں عربی پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔وہاں رسیقہ نام کی خاتون عربی پڑھاتی تھیں۔وہ نذیرؔ کی والدہ کی ہم عمر تھیں اس لئے نذیرؔ انہیں رسیقہ خالہ کہا کرتے تھے۔یہ نذیرؔ کو پوری توجہ سے پڑھاتی تھیں، نذیرؔ خود بھی بہت ذہین تھے اس لئے انہیں جلد ہی پانچ کلمیں، آیتیں، نماز کے آداب سب یاد ہوگئے، بچپن میں یہ پنج گانہ نمازی ہوگئے اور گھر میں نماز کا ایک خاص ماحول بنا دیا، خود بھی پاک صاف رہتے اور اپنے بھائی بہنوں کو بھی پاک صاف رہنے کی تاکید کرتے۔اپنے بھائی بہنوں کو بھی انہوں

نے نماز کا چسکا لگا دیا تھا۔نذیؔر کی تیز دماغی کے متعلق ان کے والدین ایک جگہ ان الفاظ میں اس راز سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔

’’عربی کی اُستانی بولتی تھی کہ بچہ ذہین ہے جو پڑھاتی ہوں یاد کر لیتا ہے
پانچ کلمے، آیتیں، نماز کے طریقے سب اُسے (نذیر کو) یاد ہو گئے۔‘‘ (۴)

نذیؔر نے ابتدائی دینی تعلیم تو حاصل کی لیکن ساتھ ہی ساتھ دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کا خیال بھی ان کے دل میں آیا۔اُن کا گھر اسلامیہ اسکول سے (۱۰۰) سو قدم کے فاصلے پر تھا لیکن اس معمولی سے فاصلے کو بھی وہ طے نہیں کر پائے۔کوئی نہیں تھا جو ان کی اُنگلی تھام کر انہیں مدرسہ میں داخلہ دلا آتا۔کچھ دنوں کے لیے انہوں نے محلّہ بیوپاریان کے اسکول میں داخلہ لیا وہاں دل نہ لگا تو دھوبیوں کے محلے میں واقع حاجی وزیر اسکول میں داخلہ لے لیا۔دو سال وہاں پڑھائی کی اس اسکول میں اردو کی درس وتدریس کا کوئی انتظام نہ تھا اس لئے نذیؔر یہاں اردو نہیں پڑھ سکے۔البتہ ہندی کی پہلی کتاب پڑھنا سیکھ لی تھی۔اس اسکول میں قاضی رحمت اللہ پڑھاتے تھے۔وہاں ایک صاحب بھی پڑھانے آتے تھے جو بے حد نیک تھے اور رضا کارانہ طور پر وہاں پڑھانے آتے تھے۔یہ اسکول کے قریب ہی رہا کرتے تھے۔یہاں ان کا گھر تھا مگر ان کا کاروبار ممبئی میں تھا یہ جب بھی گھر آتے تھے تو اس اسکول میں بچوں کو پڑھانے آجایا کرتے تھے۔نذیؔر کو اردو سے تھوڑی بہت جان پہچان ان صاحب ہی نے کروائی تھی۔چند وجوہات کے سبب نذیؔر نے یہ اسکول چھوڑ دیا۔

نذیؔر کے والدین تعلیم کی اہمیت سے ناواقف تھے اس لئے انہوں نے نذیر کی تعلیم پر بھی خاص توجہ نہیں دی۔ایک دن خود نذیؔر نے اپنی والدہ سے اس بارے میں بات کی اور ان سے اسکول جانے کے لئے اجازت مانگی۔ان کی ماں نے بھی رضامندی دے دی۔رضامندی پا کر نذیؔر بے حد خوش ہوئے اور دوسرے ہی دن اپنے بھائی شبیر کو لے کر عیدگاہ اسکول چلے گئے۔وہاں مرحوم جناب طالب علی فاروقی بچوں کے داخلے کا کام دیکھا کرتے تھے۔انہوں نے ان کے چھوٹے بھائی کو تو اسی وقت پہلی کلاس میں داخلہ دے دیا اور نذیؔر کو واپس بھیج دیا کہ وہ دوسرے دن آئیں کیونکہ ان کی عمر زیادہ تھی اس لیے ان کا ٹیسٹ لے کر مقرر کیا جائے گا کہ ان کو کون سے درجہ میں داخلہ دیا جائے۔

دوسرے دن نذیؔر اسکول گئے تب ماسٹر طالب علی نے ان کا امتحان لیا اور اُنہیں درجہ سوم میں داخلہ دے دیا۔ماسٹر صاحب نے ان کا داخلہ کا فارم پُر کرنے کے لیے ان سے تاریخ پیدائش دریافت کی۔لیکن ان کو اس معاملہ میں کچھ بھی معلوم نہ تھا خود ماسٹر صاحب نے ہی اندازاً یکم دسمبر ۱۹۴۶ء طے کر کے فارم بھر دیا۔اس فارم کے بھرتے ہی نذیؔر کا باقاعدہ طور پر اسلامیہ اسکول عیدگاہ میں داخلہ ہو گیا جس وقت نذیؔر کا داخلہ اسکول میں ہوا تھا اس وقت ان کی عمر دس برس کی تھی ان کے اسکول میں داخلے کی تاریخ یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء ہے۔طالب علی صاحب نے انہیں درجۂ سوم میں داخلہ دیا تھا انہوں نے پڑھنا شروع کیا اور روز وقت پر مدرسہ جاتے، پڑھتے جو بھی سبق گھر سے کر کے لانے کو دیا جاتا اسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ کرتے اور اپنے استاد کو دکھاتے۔وہ نہایت ذہین تھے اس لئے اوّل نمبروں سے درجہ سوم کو پاس کر کے درجہ چہارم میں پہنچ گئے۔

زندگی انسان کو پوری دنیا سے لڑنے کا اور فتح حاصل کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اور انسان اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے پوری دنیا سے لڑنے کی ہمت رکھتا ہے لیکن اپنے ہی نصیب کے ہاتھوں ہار جاتا ہے۔نذیؔر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔وہ تعلیم حاصل کرنے کے خوبصورت خواب کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ پھر انہیں پڑھائی ترک کرنی پڑی۔درجۂ سوم پاس کر کے جب درجہ چہارم میں پہنچے تو انہیں تلاش معاش کے لیے اپنے والد کے پاس پونہ بھیج دیا گیا۔لیکن والد نے انہیں تین ماہ بعد واپس فتح پور بھیج دیا گھر آنے کے بعد واپس اپنی تعلیم کا خیال ان کے ذہن میں آیا۔لیکن اسکول سے چار مہینے غیر حاضر رہنے کے باعث ان کا نام وہاں کے دفتر سے کاٹ دیا گیا تھا۔انہوں نے دوبارہ کوشش کر کے اپنا

نام اسلامیہ اسکول میں لکھوایا۔اس کے بعد باقاعدگی کے ساتھ درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی۔

اُس وقت اسلامیہ اسکول میں صرف درجہ پنجم تک ہی تعلیم کا انتظام تھا۔کیوں کہ نذیؔر یہاں درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کر چکے تھے اور آگے تعلیم حاص کرنے کے خواہش مند تھے اس کے لیے انہیں سرکاری اسکول میں داخلے کی ضرورت پیش آئی۔سرکاری اسکول میں داخلے کی فیس چھ روپے تھی اور گھر کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔اسکول کی فیس کے علاوہ دوسرے اخراجات جیسے کاپی کتابیں وغیرہ کے لیے پیسوں کا انتظام کرنا ان کی والدہ کے لیے جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔وہ اپنے لختِ جگر کے لئے فیس کا انتظام نہ کر سکیں۔اور وہ آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔اسکول میں جس دن داخلہ لینے کی آخری تاریخ تھی وہ دن آیا اور چلا گیا۔لیکن جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ نذیؔر کے تعلیم حاصل کرنے کے ارمان کا خون بہا کر چلا گیا۔ان کی ماں اور وہ خو وقت کی اس ستم ظریفی پر بہت روئے تھے پر وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے وہ کسی کے آنسوں اور آہیں دیکھ کر اپنے آپ کو نہیں بدلتا ہے وہ کبھی کسی پر رحم نہیں کھاتا۔

نذیؔر اپنی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کے پاس تعلیم حاصل کرنے کا واحد ثبوت اسکول کا وہ سرٹفکٹ ہے جو انہیں ۳۰ رنومبر ۱۹۹۳ء کے دن مرحوم نواب علی ماسٹر نے دیا تھا جو اس وقت اردو پڑھایا کرتے تھے۔

بچپن میں اکثر بچے شرارت کرتے ہیں اور یہ شرارتیں کبھی کبھی بری عادتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں نذیؔر نے اپنے بچپن میں ایسی شرارتیں کبھی نہیں کیں۔رفیق جعفر نے اپنی تصنیف۔''نذیؔر فتح پوری شخص، شاعر اور مدیر'' کی ترتیب کے دوران نذیؔر کے والدین سے بھی گفتگو کی۔اس دوران نذیؔر کی شرارتوں کے بارے میں دریافت کرنا چاہا تو نذیؔر کے والدین نے بتایا۔

''بڑا نیک بچہ ہے میرا۔اللہ ایسی نیک اولاد سب کو دے۔بچپن میں بچے تو ماں باپ کو بہت ستاتے ہیں
لیکن یہ عجیب بچہ تھا کہ اس نے ہمیں بالکل نہیں ستایا۔آدھی صدی سے بھی زیادہ دنوں سے،ہم دنیا کے
بچوں کو دیکھ رہے ہیں لیکن ایسا بچہ نہ ہم نے ہمارے گھر اور خاندان میں دیکھا اور نہ ہی محلّہ اور پردیش میں''۔(۵)

لیکن اس کے برعکس ایک روز اپنے اسکول میں بچوں کے ساتھ چھپ کر سگریٹ کے کش ضرور لگائے۔مگر جب اس بات کی خبر وہاں کے ہیڈ ماسٹر جناب محمد حسین کو ہوئی تو انہوں نے بچوں کی اس حرکت کے عوض میں تمام بچوں کو ایک ایک ڈنڈا بطورِ سزا رسید کیا۔اس ڈنڈے کی مار نے دوبارہ کبھی ایسا غلط کام نہیں کرنے دیا۔اس مار کو وہ آج بھی اپنے ہاتھوں پر محسوس کرتے ہیں اس مار نے ان کے معصوم دل پر ایسے گہرے نقش چھوڑے کہ آج تک نذیؔر نے بیڑی اور سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

عادات

نذیؔر نہایت نرم مزاج ہیں لیکن جوش میں ہوش کھونے والوں میں سے نہیں ہیں، اگر وہ بہت غصے میں ہوں تب بھی ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور صبر سے کام لیتے ہیں اور ان کی اسی خوبی کی وجہ سے ان کے رفیق و احباب کی تعداد بہت ہے، وہ دشمنی کو ترجیح نہیں دیتے اور اسی لیے گلے شکوے سے بھی دور رہتے ہیں۔اگر اپنی غلطی کی وجہ سے کسی سے گلا شکوہ ہو بھی جائے تو اپنی غلطی پر شرم سار ہوتے ہیں اور اگر دوسرے کی غلطی بھی ہو تو ضبط کرتے ہیں۔

نذیؔر بچپن سے ہی بہت خوبصورت ہیں۔اور اسی لئے ان پر ہر رنگ زیب دیتا ہے۔لیکن پھر بھی وہ سفید رنگ کے شیدائی ہیں۔سفید رنگ

امن وسکون کی شانی ہے۔اور نذیؔر بھی امن وسکون پسند ہیں۔کرتا پاجامہ اور سفاری سوٹ ان کے پسندیدہ لباس ہیں۔

نذیؔر جس طرح سادہ لباس پسند کرتے ہیں اسی طرح کھانا بھی سادہ پسند کرتے ہیں۔گوشت خوری کے شوقین نہیں ہیں کھانے سے فارغ ہوکر تھوڑا میٹھا کھانا پسند ہے وقفہ وقفہ میں چائے پیتے ہیں۔

زندگی کو بہترین انداز سے جینے کی خواہش ہر شخص کے دل میں موج زن ہے۔نذیؔر بھی اپنے دل میں ایسی بہت سی خواہشات کو دبائے ہوئے ہیں۔ان میں سے کچھ پایائے تکمیل کو پہنچیں اور کچھ ادھوری رہیں جن میں سے ایک فلموں کے لیے کہانیاں، گیت، منظرنامے، اور مکالمے تحریر کرنا بھی ہے۔

فلموں کے لیے نذیؔر نے کہانی اور مکالمے ضرور لکھے۔ان کے دو گیت بھی صدا بند ہوئے لیکن یہ سلسلہ محض کاغذی رہا۔اس موضوع پر آگے چل کر روشنی ڈالی جائے گی۔

فکر معاش:-

زندگی گزارنے کے لیے روزی روزگار کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ایک وقت کے بعد ہر شخص کو اپنی خانگی ذمہ داریوں کو اُٹھانا ہی پڑتا ہے یہ اور بات ہے کہ کسی کسی پر یہ ذمہ داری وقت سے پہلے آن پڑتی ہے۔

نذیؔر بھی انہیں لوگوں میں شامل ہیں جو وقت سے پہلے اپنی ذمہ داریوں کو اُٹھا لیتے ہیں۔فکر معاش بچپن میں ہی دامن گیر ہوگئی تھی۔گھر میں غریبی اس اندھیرے کی مانند پھیلی ہوئی تھی جسے دور کرنے کے لیے چاہے کتنے بھی دیئے روشن کیے جائیں ان کی روشنی اس اندھیرے کو پاٹ نہیں سکتی، والد اسی فکر میں پہلے ہی فتح پور چھوڑ کر پونہ جا چکے تھے پھر جب نذیؔر درجہ چہارم کے طالب علم تھے اسی وقت انہیں بھی اپنے والد کی مدد کے لئے پونہ بھیج دیا گیا۔وہ بچہ جو نہایت دلچسپی اور خوش دلی سے حصول تعلیم میں مصروف تھا اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے والد کے پاس جانا پڑا۔وہاں چار مہینے قیام کرنے کے بعد ان کے والد نے انہیں واپس فتح پور بھیج دیا۔

درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پڑھائی سے رشتہ منقطع ہوگیا اپنے حصولِ تعلیم کے خواب کو جب ریزہ ریزہ ہوتے محسوس کیا تو خون کے آنسوں روئے لیکن اپنی ماں کی مجبوری اور گھر کے معاشی حالات کو سمجھتے ہوئے مزدوری کرنے کا ارادہ کیا۔تاکہ گھر خرچ میں ہاتھ بٹا سکے۔جب مزدوری کرنے کے لیے گھر سے نکلے تو پلہ داری کرنے کا خیال دل میں روشن ہوا۔اور اپنے بھائی شبیر کا ہاتھ تھامے نکل پڑے۔بازار میں پہنچے تو انہیں کوئی کام نہ مل پایا مایوس ہوکر گھر لوٹنے کا ارادہ کرلیا، جیسے ہی گھر کی طرف روانہ ہونے لگے تو ایک ساہوکار نے انہیں گیارہ (۱۱) آنے کی مزدوری میں اپنی دوکان کی صفائی کرنے کا کام سونپا، یہ ان کی زندگی کی پہلی کمائی تھی دونوں بھائی شام تک کام پورا کرکے اور اپنی مزدوری لے کر ماں کے پاس پہنچے۔جب ماں کے ہاتھوں میں وہ گیارہ آنے رکھے تو ماں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسوں چھلک پڑے۔

نذیؔر کے معاشی حالات کے متعلق وقار قادری اپنے مضمون ''نذیؔر فتح پوری! شاعر و شخصیت'' میں لکھتے ہیں۔

> ''پانچویں جماعت تک پڑھنے کے بعد ان کو تعلیم چھوڑنی پڑی۔مفلسی کی وجہ سے محنت مزدوری کے سوا کوئی چارہ نہ تھا گاؤں میں رہ کر دو برس تک محنت مزدوری کی بوجھ ڈھونے کا بھی کام کیا وہاں آمدنی کم تھی اس لئے اپنے والد بزرگوار حاجی ابراہیم

خان جوڈ کے پاس پونے آگئے پونے میں راج مستری کا کام کیا۔ وہاں شاندار دکن
کالج میں نئی عمارت کی تعمیر ہورہی تھی۔ رزق حلال کمانے کا آغاز وہیں سے ہوا۔'' (٦)

نذؔیر نے ان حالات میں اپنا بچپن گزارا ایک طویل عرصہ تک وہ تعمیر کے کام میں مشغول رہے جوڈ کنسٹرکشن کے سائے تلے رزق حلال کمانے میں مصروف رہے اور اپنے خاندان کی پرورش کرتے رہے۔

ازدواجی زندگی:۔

١٥ سال کی عمر میں نذؔیر کا نکاح والدین کی رضامندی سے مرحوم علیم خان کی بیٹی جمیلہ بانو سے ہوا۔ ان کی اہلیہ نے زندگی کے ہر موڑ پر ان کا ساتھ دیا اور ہر خوشی و غم میں ان کے ساتھ مضبوطی سے کھڑی رہیں۔ ان کے تین بیٹے۔ اقبال جوڈ، عرفان جوڈ، اور فرحان جوڈ ہیں۔ ان کی سات بیٹیاں بھی ہیں۔ جن کے نام۔ زینت، فضیلت، شفقت، شبانہ، عصمت، رفعت، اور منیبہ ہیں۔ ان سب کی شادیاں ہوچکی ہیں۔ نذیر کے دو پوتے عدنان اور نعمان اور تین پوتیاں، صبیحہ، مدیحہ اور سمیہہ ہیں۔

نذؔیر اس باغ کے مالی ہیں جس میں بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، اور نواسہ، نواسی، سبھی پھل پھول رہے ہیں۔ اپنے اس گلزار میں نذؔیر کو نہایت خوشی و سکون حاصل ہوا ہے۔ اپنے ایک شعر میں اس خیال کے متعلق فرماتے ہیں۔

گھر میں بچوں کا مسکرانا تھا
ہم وہاں تھے جہاں خزانہ تھا

پونہ میں قیام:۔

ایک بچہ جو حصول تعلیم کا خواب اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے تھا۔ لیکن اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور و لاچار ہو کر تعلیم سے اپنے رشتے کو منقطع کر کے اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہوگیا اور اپنے والد کے پاس پونہ چلا گیا۔ یہ بچہ کوئی اور نہیں بلکہ وہی نذیر ہے جو آج اردو دنیا میں نذؔیر فتح پوری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

١٩٥٩ء کے قریب نذؔیر اپنے وطن عزیز کو چھوڑ کر تلاشِ معاش کے سلسلے میں اس اجنبی شہر میں آئے۔ اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے اس شہر نے انہیں ہر خوشی سے نوازا۔ اور آج بھی وہ اپنے خاندان کے ساتھ پونہ میں مقیم ہیں۔

پونہ سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار نذؔیر نے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

میں اس کو چھوڑ کے تنہا کہیں نہ جاؤں گا
یہ شہر میرے غموں کا امین ہے لوگو!

شعر گوئی کا آغاز:۔

شاعری میں غزل وہ صنف ہے جس سے ہر انسان لطف اندوز ہوتا ہے اور اسے اپنے دل میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے

ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسے محسوس کرنے کے ساتھ اپنے دلی جذبات واحساسات کو اس پیرائے میں بیان کرنے کی جرأت بھی کرتے ہیں اور شاعر کے لقب سے نوازے جاتے ہیں۔

میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، مومنؔ، ذوقؔ سبھی نے اپنی شعری زندگی کا آغاز کسی نہ کسی واقعے یا حادثے سے متاثر ہو کر کیا ہوگا، نذیرؔ کی شعر گوئی کے پیچھے بھی ایک ایسا ہی دلچسپ واقعہ پیش آیا جس نے مزدور نذیرؔ کو شاعر نذیرؔ بنا دیا۔

یہ واقعہ ۱۹۶۳ء میں پیش آیا، نذیرؔ شروع سے متجسس طبیعت کے مالک رہے ہیں۔ اوران کی اسی عادت نے انہیں شاعر بنا دیا۔ بات اس وقت کی ہے جب وہ ۱۹۔ ۲۰۔ سال کے نوجوان ہوا کرتے تھے۔ فتح پور میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ جہاں نذیرؔ نے بھی شرکت فرمائی وہاں انہوں نے اپنے ایک ہم جماعت کو غزل پڑھتے دیکھا۔ جسے دیکھ کر انہیں تھوڑی حیرانی ہوئی کہ جو بچہ اسکول کے وقت ٹھیک سے اردو پڑھنا لکھنا بھی نہیں جانتا تھا وہ آج مجمع میں غزل سنا رہا ہے۔ اسے دیکھ کر انہیں یہ خیال بےچین کرنے لگا کہ ''جب وہ غزل کہہ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کہہ سکتا؟''

مشاعرے کے دوسرے روز انہیں پونہ کے لئے روانہ ہونا پڑا۔ لیکن دل اُسی بےچینی میں مبتلا تھا سوائی مادھو پور کے ریلوے اسٹیشن پر وہ فیروز پور جنتا ایکس پریس کا انتظار کر رہے تھے۔ بہت سے مسافر اس ٹرین کے منتظر تھے اسٹیشن پر بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ایک عجیب سی بےچینی کا ماحول تھا۔ اسی اثنا میں نذیرؔ کے اندر اور باہر کا انتشار بھی بڑھتا جا رہا تھا، اسی بےچینی اور اضطراب کے عالم میں انہوں نے ایک بک اسٹال سے اردو کی ایک کتاب خریدی۔ اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع ایک کتاب ''اردو شاعری کے سات رنگ'' (مرتب پریم پرکاش) مل گئی۔ ایک مزدور جس کا واسطہ اینٹ، پتھر، مٹی ریت وغیرہ سے ہو اس کا شاعری سے کیا رشتہ ہو سکتا تھا بھلا۔ یہ کتاب اس کے کس کام کی تھی؟ لیکن پھر بھی کوئی طاقت تھی جس نے انہیں وہ کتاب خریدنے پر آمادہ کیا اور انہوں نے اس کی قیمت جو اس وقت محض ایک روپے تھی ادا کی۔ اور اس طرح شاعر نذیرؔ نے اردو کی پہلی کتاب خریدی اور پھر ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔

کچھ اشعار پڑھے لیکن بےچینی اتنی شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ کسی دم قرار نہیں ملتا تھا۔ بلکہ لمحہ بہ لمحہ بےچینی بڑھتی ہی جا رہی تھی سورج بھی اپنی روشنی کے ساتھ وداع ہو رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا بڑھنے لگا تھا اور قدرت کے تمام خوبصورت مناظر اندھیرے کی آغوش میں گم ہو گئے تھے۔ نذیر پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر آنکھیں بند کیے ہوئے بیٹھے تھے اور اپنی بےچینی پر ضبط پانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اپنے اندر اٹھے اس طوفان پر قابو نہیں کر پا رہے تھے اور اسی عالم میں ان کی زبان سے بےساختہ یہ الفاظ پھوٹ پڑے۔

شام ڈھلنے لگی ہے
شمع جلنے لگی ہے

یہ وہ پل تھا جہاں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز دوران سفر ہی کیا تھا اور اسی لئے انہوں نے اپنے شعری مجموعوں کے عنوان بھی لمحوں کا سفر ۱۹۸۴ء سفر تا سفر ۱۹۹۱ء تیسرا سفر ۱۹۹۳ء اور سفر مدام سفر ۲۰۰۸ء رکھے ہیں۔

بچپن میں نذیرؔ قاضی رضا محمد کے ساتھ محفلِ میلاد شریف میں بھی جاتے تھے یہ صاحب مسجد زمینداران میں امامت فرماتے تھے۔ نذیرؔ باقاعدہ طور پر ان کے ساتھ محفل میلاد میں شرکت کرتے تھے۔ شاعری کی نغمگی اور غنائیت کا احساس انہیں اس میلاد خوانی کی نعت اور قصیدوں سے ہو گیا تھا۔

نذیرؔ نے غزلوں کے علاوہ آزاد غزل، نظم، ماہیے، گیت، نعت، کہہ مکرنی، مثنوی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ان اصناف سے متعلق ان کی

اب تک تقریباً اٹھارہ (۱۸) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔جن میں پانچ شعری مجموعے، دو ماہیوں کے مجموعے اور ایک ہندی رسم الخط میں شائع تصنیف ''یہ زمین میری ہے'' بھی شامل ہے اس کے علاوہ ایک آزاد غزل کا مجموعہ ''غزل اندر غزل''۔بھی اہمیت کا حامل ہے ''نیا دن پھوٹ کر نکلا'' اپنے آپ میں ایک خاص رنگ لیے ہوئے ہیں۔اکرام نعتیہ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

ان کا پانچواں شعری مجموعہ ''تتلیوں بھرا آسمان'' ہے اس مجموعہ کی سبھی غزلیں منفرد انداز میں نظر آتی ہیں۔دیوانِ نذیؔر اس سلسلے کی کڑی ہے ادب کی دنیا میں نذیؔر نے اپنے دم پر اپنی پہچان بنائی ہے، نثر نگاری میں بھی انہوں نے اپنی پہچان خود بنائی ہے۔البتہ شاعری میں ابتداً دلدار ہاشمی اور عکسی برنی نے نذیؔر کی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں مدد کی بعد ازیں انہوں نے عتیق احمد عتیق اور علامہ کالی داس گپتا رضا کی شاگردی اختیار کی اور انہیں صاحبان کے نایاب مشوروں سے نذیؔر نے اپنی شاعری کو نکھارا اور سنوارا۔اس کے متعلق نذیؔر کا قول ہے کہ۔

> ''میرا حقیقی زندگی میں بھی اور ادبی زندگی میں بھی کوئی گاڈ فادر یا ودھاتا نہیں۔اپنی مکتبی تعلیم کی محرومی کے باوجود عملی طور پر میں نے ادب کی دنیا میں جی توڑ کر محنت کی ہے۔ہاں شاعری میں حضرت عتیق احمد عتیق اور ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا سے رہنمائی ضرور حاصل کی۔
> ابتدا میں دلدار ہاشمی اور مرحوم عکسی برنی صاحبان نے میرا حوصلہ بڑھایا۔'' (۷)

نذیؔر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز غزل کے ایک شعر کے ساتھ کیا تھا اسی لیے غزل ان کی محبوب صنف ہے۔حالانکہ انہوں نے غزل کے علاوہ شاعری کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل کے اوزان و بحور سے انحراف کرنا بالکل پسند نہیں کیا وہ اس کے سخت مخالف ہیں۔بقول نذیؔر۔

> ''میں نے ادب کی ہر صنف کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا ہے۔میں اصناف سخن کے سلسلے میں قطعی متعصب نہیں ہوں، لیکن غزل کے شعر کو وزن سے خارج برداشت نہیں کر سکتا۔''(۸)

اس قول کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نذیؔر غزل کو اس کے اس خوبصورت روپ میں پسند کرتے ہیں جس روپ میں میؔر غالبؔ نے اس سے محبت کی ہے۔جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ نذیؔر نے درجہ پنجم تک ہی تعلیم حاصل کی اور اپنے خاندان کے وہ پہلے فرد تھے جو اسکول کی دہلیز تک پہنچے۔تو ایسے میں ایک انسان جو کہ درجہ دہم تک بھی تعلیم حاصل نہ کر سکا ہو۔اس کا شاعر و ادیب بن جانا کیسے ممکن تھا؟ جبکہ خاندان کے افراد میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو ان کی رہنمائی فرماتا۔انہیں ادب کی اے بی سی ڈی سکھاتا۔ایسے میں نذیؔر کیسے ایک شاعر و ادیب کی حیثیت سے مقبول ہوئے اگر ان سب سوالوں پر غور کیا جائے اور جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے تو اس کا جواب نذیؔر کے ان الفاظ میں پوشیدہ ہے۔

> ''شاعر ادیب قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے۔اس کے اپنے محسوسات اسے مہمیز کرتے ہیں، اس کے اندر کی تخلیقی نمو اس کو پروان چڑھاتی ہے۔یہ میرا تجزیہ اور تجربہ ہے۔مختلف اہلِ قلم کے ساتھ دوسری وجوہات ہو سکتی ہیں۔''(۹)

نثرنگاری کا آغاز:-

ابن صفی مشہور ناول نگار ہیں۔جنہوں نے جاسوسی ناول تحریر کیے۔جب نذیؔر پونہ میں اپنے والد کے ساتھ قیام پذیر تھے اور عالم جوانی کے خوش گوار دنوں کو تعمیری کاموں میں صرف کر رہے تھے، عین اسی وقت ان کی قرابت اپنے ایک رشتہ دار غلام مصطفٰےحسین خان جوڑ سے ہوئی اور آگے چل کر یہ رشتہ داری دوستی میں تبدیل ہوگئی، مصطفٰے اردو کے طالبِ علم رہ چکے تھے اور نذیؔر اردو کے شیدائیوں میں سے تھے۔دونوں کی پونہ میں ملاقات اسی اردو کی وجہ سے ہوئی اور پھر ان کی ادبی گفتگو کا سلسلہ ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں سے آگے بڑھا، مصطفٰے کے پاس ابنِ صفی کے بہت سے جاسوسی ناول موجود تھے جن کا مطالعہ وہ کر چکے تھے۔انہوں نے وہی ناول نذیؔر کو بھی دیے۔نذیؔر اپنے فرصت اور فراغت کے لمحات میں انہیں ناولوں کا مطالعہ کرتے اور لطف اندوز ہوتے۔ان ناولوں میں ایسی کشش تھی کہ نذیؔر ان کو پڑھے بغیر نہ رہ پاتے تھے۔دیوانگی اس حد تک تھی کہ وہ ناول پڑھتے پڑھتے کھانا کھالیتے، سائیکل چلاتے وقت بھی انہیں نہ چھوڑتے یہاں تک کہ سوتے وقت بھی یہی ناول ساتھ ہوتا اور جب صبح اٹھتے تو ان کے دائے بائیں پڑا ہوا ملتا۔ناولوں کے کردار نذیؔر پر اس قدر حاوی ہو چکے تھے کہ عمارت سازی کرتے وقت بھی وہ کردار نذیؔر کے ذہن میں گردش کرتے رہتے اور وہ انہیں اپنے آس پاس محسوس کرتے۔یہاں تک کہ ایک کردار ''فریدی'' سے تو وہ اتنا متاثر ہوئے کہ خوابوں میں بھی اسی کی طرح حرکات سکنات کرتے۔

ان ناولوں کا نشہ نذیؔر پر اس قدر حاوی ہوگیا تھا کہ وہ اب مصطفٰے خان سے ناول مانگ کر پڑھنے کے بجائے خود خرید کر لاتے اور ان ناولوں کو حاصل کرنے کے لئے انہیں پونہ کے کیمپ علاقے میں موجود ''اسلم بک ڈپو'' پر جانا پڑتا تھا۔جو ان کے گھر سے اتنا دور تھا کہ وہاں جانے اور آنے میں ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا، لیکن یہ مشقت بھی انہیں ناگوار معلوم نہیں ہوتی تھی یہاں تک کہ کبھی کبھی تو انہیں ناول حاصل کرنے کے لئے بار بار چکر لگانے پڑے۔یہ ابن صفی کے ناول ہی تھے جنہوں نے نذیؔر کو نثر کی طرف راغب کیا۔ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ جاننا بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی نثری تصنیف کب تحریر کی؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔اس سوال کا جواب ہمیں ۱۹۷۱ء کے قریب ملتا ہے، جب انہوں نے اپنے رفیق دلدار ہاشمی کے اصرار پر ان کے پہلے شعری مجموعہ ''سنگھرش ہمارا نعرہ'' کے لیے اپنا پہلا ادبی مضمون لکھا، یہ مضمون ان کی نثر نگاری کا سنگ بنیاد ہے، یہیں سے ان کی نثر نگاری کا آغاز ہوا۔پہلے پہل تو نذیؔر نے یہ مضمون تحریر کرنے سے منع کر دیا۔پر دلدار ہاشمی کی ضد پر وہ اس بات کے لئے راضی ہو گئے۔

راقمہ نے جب نذیؔر سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے ان الفاظ میں جواب تحریر فرمایا۔

> ''دلدار ہاشمی نے ضد کر کے اپنی شاعری پر مجھ سے مضمون لکھوایا۔میرے انکار کرنے پر انہوں نے ایک بڑی بات کہی، کہنے لگے وہ نیاز فتح پوری تھے اور تم نذیؔر فتح پوری ہو''لکھو'' تب تک میں نیاز فتح پوری کے نام سے واقف نہیں تھا شاعری میں نیا نیا تھا دلدار ہاشمی کی ترغیب پر میں نے پہلا ادبی مضمون ان کی کتاب کے لیے لکھا''(۱۰)

اس کے بعد ان کا سب سے پہلا افسانہ ''محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا فرض کا موتی'' کے زیرِ عنوان خاتون مشرق میں شائع ہوا۔اس کے

ساتھ ہی وہ افسانہ نگاری کی دنیا میں داخل ہوئے۔ان کا ایک اور افسانہ بعنوان ''فغانِ درویش'' ندائے فلسطین میں شائع ہوا۔

۱۹۷۵ء میں ان کا سب سے پہلا ناول ''چٹانوں کے بیچ'' شائع ہوا۔اس کے بعد ان کا دوسرا ناول ''زخم اور آہیں'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

نذیؔر کے ادبی مضامین کا مجموعہ ''لفظوں کے سائے تلے'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ناول زخم اور آہیں اور اس تصنیف کے درمیانی وقت میں نذیؔر کے ادبی مضامین مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

نذیؔر نے مضامین ہی تحریر نہیں کئے بلکہ اردو ادب کی مقبول اور قابلِ تعریف شخصیات پر بھی قلم اٹھایا اور ان کے فن اور شخصیت پر تصانیف شائع کیں۔ان حضرات میں جگن ناتھ آزؔاد، علامہ کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر ساحر شیوی، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، کوثر صدیقی، دلدار ہاشمی، حیدر قریشی، امین حزیں، عصمت جاوید شیخ، فراز حامدی، جلیل الہ آبادی ،اصغر ویلوری، نور السعید اختر، آزاد سیکری، علیم صبا نویدی، وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ نذیر نے بعض نثری انصاف میں بھی طبع آزمائی کی جن میں افسانچہ، تاریخ و تذکرہ، تحقیق، ترجمہ اور سفرنامے بھی شامل ہیں۔

اعزازات:-

نذیؔر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف اکاڈمیوں اور اداروں کی جانب سے انعامات و اعزازات سے نوازہ گیا ہے۔جن کا جائزہ حسبِ ذیل ہے۔

انعامات و اعزازات کی ابتداء ۱۹۹۲ء میں ہوئی جب انہیں ''راجستھان اردو اکیڈمی کے ایوارڈ'' سے نوازہ گیا پھر ۱۹۹۳ء میں ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''تیسرا سفر'' شائع ہوا۔اس مجموعے پر انہیں آل انڈیا میرؔ اکیڈمی یوپی کی جانب سے ''میر تقی میر'' ایوارڈ تفویض کیا گیا۔۱۹۹۴ء میں پونہ مہاراشٹر سے ''چراغ غزل'' ایوارڈ عطا کیا گیا۔اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں ان کی کتاب ''لفظوں کے سائے تلے'' (مضامین کا مجموعہ) شائع ہوئی جس کے لئے مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی جانب سے انعام دیا گیا۔۱۹۹۹ء میں نذیؔر کو اپنی ادبی خدمات کے اعتراف میں پونے میونسپل کارپوریشن کی جانب سے میمنٹو دے کر اعزاز کیا گیا۔یہ اعزاز انہیں پونے کی میئر کے ہاتھوں دلوایا گیا ۱۹۹۸ء میں ان کی ایک کتاب ''جگن ناتھ آزاد ایک مستقل ادارہ'' شائع ہوئی اس تصنیف پر انہیں ۲۰۰۰ء میں دو ایوارڈ ملے جن میں ایک راجستھان اردو اکیڈمی کی طرف سے انعام ہے اور دوسرا بہار ساہتیہ سنسد سمتی پور کی جانب سے خواجہ احمد عباس ایوارڈ پیش کیا گیا۔بعد ازیں جون ۲۰۰۰ء میں اسلامیہ اسکول عیدگاہ (جہاں سے نذیؔر نے درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی تھی) کی جانب سے عوامی جلسے میں جناب اے ڈی مہرڈا (ایس ڈی ایم) کے ہاتھوں سپاس نامہ اور شال دے کر ان کا عزاز کیا گیا۔

۲۰۰۱ء میں انہیں ''نیا دن پھوٹ کر نکلا'' (شاعری) کے لئے مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی طرف سے انعام سے نوازاہ گیا اسی سال انہیں اپنی ایک نظم پر ''آل انڈیا قومی انعام'' تفویض کیا گیا۔اپنی ادبی سرگرمیوں کی بنا پر دہلی سے ''استاد رشید رام پوری ایوارڈ'' بنگلور سے ''غالب ایوارڈ'' دئے گئے نذیؔر نے ایک نکڑ ڈرامہ ''گرد'' تحریر کیا۔جن کے لئے انہیں آل مہاراشٹر انعامی مقابلے میں اوّل انعام تفویض کیا گیا۔انہیں اپنے وطن عزیز سے بھی خوب انعام و اکرام سے نوازہ گیا۔جن میں تنظیم جماعت المسلمین فتح پور اور انڈین کمپیوٹر ایجوکیشن کی جانب سے دئے گئے اعزاز بھی

خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

۲۰۰۳ء میں انہیں تعمیر سوسائٹی اودے پور۔ راجستھان ان کی جانب سے ''غالب ایوارڈ'' عطا کیا گیا۔ اسی سال انہیں تین ایوارڈ اور ملے جن میں جشنِ امین حزیں کمیٹی پونہ کی جانب سے ''امین ادب'' اعزاز آل مہاراشٹر اردو کانفرنس پونہ کی طرف سے اعزاز اور فتح پور شیخاواٹی کی طرف سے آفتاب شیخاواٹی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۲۰۰۴ء میں ان کے گیتوں کا مجموعہ ''میرے گیت اکیلے رہ گئے'' شائع ہوا۔ اس پر انہیں بہار ساہتیہ سنسد سمتی پور کی طرف سے میر تقی میر ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ اور ۲۰۰۵ء میں اسی کتاب پر بہار اردو اکادمی کی جانب سے انعام سے نوازہ گیا۔ ۲۰۰۴ء میں پونہ سے نکلنے والے ہندی اخبار ''بھارت ڈائری'' کی جانب سے بھی انہیں اعزاز عطا کیا گیا۔ نذیرؔ کی تصنیف ''شعراء پونہ ایک تحقیق'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ ان کا تحقیقی کارنامہ ہے اور اس کے اعتراف میں انہیں ۲۰۰۶ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے انعام سے نوازا گیا۔ ۲۰۰۵ء میں ان کی خدمات کے اعتراف میں بزمِ اطفال مالے گاؤں کی طرف سے اعتراف خدمات عطا کیا گیا۔

۲۰۰۷ء میں مسلم ویلفیئر ایجوکیشن سوسائٹی پونہ کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ علامہ اقبال ایوارڈ سے نوازہ گیا اسی سال یوپی اردو اکاڈمی کی جانب سے کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر پر انعام تفویض کیا گیا۔ اور بزمِ خوشتر کھنڈوا کی طرف سے پہلا خوشتر کھنڈوی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ۲۰۰۸ء نذیرؔ کے لیے بہت خاص رہا کیوں کہ اسی سال انہیں ان کی ادبی خدمات کا اصل صلہ ملا جبکہ انسٹانٹیرپل آرتھوڈوکس انسٹی ٹیوٹ امریکہ نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازہ یہ پل ان کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ ایک ایسا شخص جس نے صرف درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی ہو اسے ڈاکٹر جیسے لقب سے نوازہ جائے یہ احساس اپنے آپ میں بہت اہمیت رکھتا ہے نذیرؔ کو جب یہ ڈگری عطا کی گئی تب اس کی خبر انہیں سب سے پہلے ساحر شیوی نے سنائی جو برطانیہ میں مقیم ہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی نذیرؔ کی جو حالت ہوئی اس کے بارے میں نذیرؔ خود ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔ ''مضمون بہ عنوان۔ قصہ ہمارے ڈاکٹر بننے کا''۔

''یہ خوش کن اور خوشبودار خبر ہمیں سب سے پہلے برطانیہ سے ساحر شیوی
نے سنائی خبر سن کر ہمارا موبائل ہمارے کان سے ایسا چپک گیا جیسے اب
یہ ہماری بیوی کی طرح زندگی بھر ہم سے جدا نہیں ہوگا۔ موبائل کی اس وابستگی اور پیوستگی
نے ہمیں واقعی حیرتوں میں ڈال دیا ساحر شیوی کی سنائی خبر سے ہم سکتے
کے عالم بیٹھے رہ گئے۔'' (۱۱)

انہیں یہ ڈگری دلوانے میں منور احمد کنڈے کا بھی نہایت اہم رول رہا ہے۔ نذیرؔ کو سب سے پہلے ڈاکٹر کے لقب سے مخاطب کرنے والے بھی یہی صاحب تھے جب نذیرؔ کو اس لقب سے مخاطب کیا گیا تو ان پر یہ کیفیت طاری ہوگئی۔

''یقین کیجئے ہمارے تو ہاتھ پیر پھول گئے یہ پہلا مخاطبہ تھا جس نے ہمیں
سرور و کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہمیں چاند زمین پر نظر آنے لگا ستارے
قدموں کے نیچے بچھتے ہوئے محسوس ہوئے۔'' (۱۲)

نذیرؔ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اسی خوشی کے عالم میں جب احمد کنڈے نے انہیں یہ خبر سنائی کہ وہ اپنا سرٹفیکیٹ انٹرنیٹ سے حاصل کر لے تو ان کو احساس ہوا جیسے وہ بنا پروں کے ہی آسمان کی سیر کر رہے ہوں۔ اس انوکھے اور منفرد احساس کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ

> ''جاتے جاتے ڈاکٹر کنڈے سے اطلاع دی تھی کہ انٹرنیٹ پر آپ کا سرٹیفکٹ جاری کر دیا گیا ہے آپ اس کا پرنٹ لے سکتے ہیں اور شام میں ہم نے اس رنگا رنگ سرٹیفکٹ کا رنگا رنگ عکس حاصل کر لیا۔ جب سرٹیفیکٹ لے کر ہم گھر میں داخل ہوئے تو ہمارے گھر کے در و دیوار ہمیں قوسِ قزح کے رنگوں میں ڈوبے نظر آئے۔ رات ہم نے پھولوں پر گذاری یا کانٹوں پر ہمیں کچھ احساس نہیں رہا۔ بیوی نے ہمیں سو جانے کی کئی بار تلقین کی لیکن ہماری آنکھوں میں رنگ برنگ کے پھولوں کا چمن کھلا ہوا تھا۔ ہم نے بیوی سے کہا ہم آج کی رات کیسے سو سکتے ہیں آج تو ہم ڈاکٹر بن گئے ہیں۔'' (۱۳)

ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری کے ساتھ ہی انعام و اکرام کا یہ کارواں آگے بڑھتا رہا اور ۲۰۰۹ء میں حمد و نعت اکیڈمی دہلی سے علامہ شبلی نعمانی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ بزم احساس ادب جو فتح پوری شیخاواٹی میں واقع ہے کی طرف سے بھی علامہ کالی داس گپتا رضا ایوارڈ سے انہیں نوازہ گیا یہ ایوارڈ سب سے پہلے نذیرؔ ہی کے حصہ میں آیا/ ۲۱۰۰۰ روپیہ اور مومنٹو بطور انعام تفویض کیے گئے۔ ان کی ایک اور تحقیقی کاوش ''پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق (۱۹۲۳ء تا حال۔)'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی اس میں پونے کے ۱۹۲۳ء سے اب تک کی افسانہ نگاری کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ کتاب نذیرؔ کی دقت نظری کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ان کی اسی دقت نظری کا اعتراف کرتے ہوئے یوپی اردو اکادمی نے انہیں انعام سے نوازا اس کے بعد ۲۰۱۱ء میں پی اے انعام دار اور عوامی محاذ پونے کی طرف سے کوی اٹل بہاری واجپئی ایوارڈ عطا کیا گیا۔

راجستھان اردو اکیڈمی کی جانب سے ۶ ر جولائی ۲۰۱۳ء کو انھیں ان کی تصنیف ''تتلیوں بھرا آسمان'' کے لیے ۱۲۰۰۰ روپے کا نقد انعام اور میمنٹو پیش کیا گیا اس جلسے میں انعامات دینے کی شروعات نذیرؔ سے ہی کی گئی، حالانکہ اکیس ہزار اور پندرہ ہزار کے انعام حاصل کرنے والے حضرات بھی وہاں موجود تھے، لیکن ان سب سے پہلے نذیرؔ کو ہی انعام سے سرفراز کیا گیا۔

اس جلسۂ تقسیم انعامات میں راقمہ اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ بنفس نفیس موجود تھی میں نے دیکھا کہ راجستھان سے کوسوں میل دور مہاراشٹر کے شہر پونہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد بھی راجستھانی احباب نذیرؔ صاحب سے بے حد عزت و احترام کے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ ہال میں داخل ہوئے احباب نے بڑھ کر ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اور ان سے بغل گیر ہوئے۔

۲۰۱۴ء میں شولا پور کے آل انڈیا مشاعرے میں وزیر داخلہ ہند سشیل کمار شندے کے ہاتھوں اعزاز حاصل کیا۔ اور اسی سال ادارہ سہ ماہی تکمیل بھیونڈی، ممبئی کی جانب سے صحافتی ایوارڈ سے نوازہ گیا۔

نذیرؔ فتح پوری کی شعری تصانیف......

(۱) بجو آؤ گیت سنائیں۔ ۱۹۸۳ء، (۲) لمحوں کا سفر (غزلیں) ۔۱۹۸۵ء، (۳) غزل اندر غزل (آزاد غزلیں)۔ ۱۹۸۸، (۴) سفر تا سفر (غزلیں) ۱۹۹۱ء، (۵) تیسرا سفر (غزلیں)۔۱۹۹۳ء، (۶) ریگِ رواں (ماہیے)۔۱۹۹۷ء، (۷) اکرام (نعت)۔۱۹۹۸ء، (۸) نیا دن پھوٹ کر نکلا (شاعری)۔۲۰۰۰ء، (۹) مٹھی بھر ماہیے (ماہیے)۔۲۰۰۱ء، (۱۰) یہ زمین میری ہے (ہندی)۔۲۰۰۳ء، (۱۱) میرے گیت اکیلے رہ گئے۔۲۰۰۴، (۱۲) سفر مدامِ سفر۔۲۰۰۸ء (۱۳) ثنائے جلیل۔۲۰۰۸ء، (۱۴) مثنوی جواب زہر خند۔۲۰۱۱ء (۱۵) تتلیوں بھرا آسمان۔ (غزلیں) ۲۰۱۲ء، (۱۶) دیوان نذیرؔ فتح پوری۔۲۰۱۲ء (۱۷) نظم سفر۔۲۰۱۴ء

نذیرؔ فتح پوری کی نثری تصانیف......

ناول

۱) چٹانوں کے بیچ ۱۹۷۵ء ۲) زخم اور آہیں ۱۹۷۷ء

نثر

۳) لفظوں کے سائے تلے (مضامین) ۱۹۹۵ء (۴) جگن ناتھ آزاد۔ایک مستقل ادارہ۔۱۹۹۸ء (۵) جہان گپتا رضا۔۱۹۹۹ء (۶) غالب، گپتا رضاؔ اور سنجے گوڈبولے۔۲۰۰۰ء (۷) ریزہ ریزہ دل (افسانچے) ۲۰۰۵ء (۸) ڈاکٹر ساحر شیویؔ کا تخلیقی منظر نامہ ۲۰۰۷ء (۹) ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ۔۲۰۰۸ء (۱۰) میخانہ اردو کا پیر مغاں نارنگ ساقی ۲۰۱۲ء (۱۱) ملک تا سے مختلف الجہات شخصیت ۲۰۱۲ء (۱۲) اعتراف (ادبی مضامین) ۲۰۱۱ء ۱۳) ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ ہندی ۲۰۰۹ء (۱۴) ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی ۲۰۱۰ء (۱۵) میرا دیش مہان، بچوں کے لئے کہانیاں ۲۰۱۳ء (۱۶) گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت ۲۰۱۳ء (۱۷) میری شاعری میں جانور (تنقید)۔۲۰۱۴ء (۱۸) میرا دیش مہان۔بچوں کے لئے کہانیاں)۔۲۰۱۴ء (۱۹) ارشد مینا نگری، ہندوستانی ذہن وتہذیب کا نمائندہ شاعر۔۲۰۱۴ء (۲۰) مناظر صاحب! کتابیں ملیں۔۲۰۱۴ء (۲۱) علیم صبا نویدی کے تخلیقی تجزیے۔۲۰۱۴ء

ترجمہ

(۲۲) ڈھلی ڈھلی شام کا اجالا، ہندی ناول کا ترجمہ ۲۰۰۹ء

ترتیب وانتخاب

(۲۳) کوثر صدیقی۔فن اور شخصیت ۲۰۰۰ء (۲۴) دلدار ہاشمی۔فن اور شخصیت ۲۰۰۱ء (۲۵) علامہ کالی داس گپتا رضاؔ نمبر ۲۰۰۱ء (۲۶) حیدرؔ قریشی فن اور شخصیت ۲۰۰۲ء (۲۷) امینؔ حزیں۔شخص، شاعر اور استاد ۲۰۰۳ء (۲۸) مناظرؔ عاشق ہرگانوی کا ادبی منظر نامہ ۲۰۰۴ء (۲۹) عصمت جاویدؔ شیخ۔۲۰۰۴ء (۳۰) فرازؔ حامدی کے اردو گیت۔۲۰۰۶ء (۳۱) علامہ کالی داس گپتا رضاؔ کے ادبی سفر ۲۰۰۷ء (۳۲) جلیلؔ آلہ آبادی شخصیت اور شاعری۔۲۰۰۸ء (۳۳) اصغر ویلوری کی غزلیہ شاعری۔۲۰۰۸ء (۳۴) نور السعید اختر۔۲۰۱۰ء (۳۵) ماں کے نام۔۲۰۱۰ء (۳۶) آزاد بنام نذیرؔ۔۲۰۱۱ء (۳۷) کلیاتِ آزاد سیکری۔۲۰۱۲ء (۳۸) ملک تا سے مختلف الجہات شخصیت ۲۰۱۲ء (۳۹) اردو کے میخانے کا پیر مغاں نارنگ ساقی۔۲۰۱۲ء (۴۰) دیو داس بسملؔ۔حیات وادب۔۲۰۱۵ء

تاریخ وتذکرہ اور تحقیق

(۴۱) تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاوٹی۔۲۰۰۳ء (۴۲) شعرائے پونہ، ایک تحقیق۔۲۰۰۵ء (۴۳) پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق۔۲۰۱۰ء (۴۴) امیر تیمور (بچوں کے لئے ناول)۔۲۰۱۰ء (۴۵) امیر تیمور ہندوستان میں (بچوں کے لیے ناول) ۲۰۱۱ء (۴۶) اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔۲۰۱۱ء

سفر نامہ

(۴۷) پونے سے رانچی کا سفر۔۲۰۱۱ء

نذیرؔ فتح پوری کے غیر مطبوعہ مسودے

شاعری

(۱) میری توشیحات (۲) پانچویں سمت۔غزلیں (۳) پہلے دکھ کا نزول۔نظمیں (۴) کرموں کا محصول۔دوہے (۵) دوسری کربلا۔نثری نظمیں (۶) ہنگامی شاعری۔نظمیں (۷) ابرِ ارواں۔تیسرا مجموعہ، ماہیے (۸) ابتدائی غزلیں۔

ترتیب وانتخاب

(۹) کالی داس گپتا رضا کی یادداشتیں (۱۰) رضا بنام نذیرؔ مکتوبات (۱۱) اردو ماہیے کا ہندوستانی انتخاب (۱۲) شاعری میں برسات (۱۳) اردو شاعری چندر بھان برہمن سے چندر بھان خیال تک (ہندی میں)۔

تحقیق وتنقید اور تذکرے

(۱۴) غالب کا ایک گمنام شاگرد۔حکیم خداداد خان دہلوی (۱۵) پونہ۔مشاہیر اہل قلم کی نظر میں (۱۶) راجستھان میں اردو کا تخلیقی سفر

تخلیقی نثر

(۱۷) جستجو کا کرب۔افسانے (۱۸) چلتے چلے۔ناول (۱۹) کرن کا پیار۔ناول

ڈرامے

(۲۰) شاہجہاں (۲۱) آخری جام (۲۲) زینت محل (۲۳) کل کا سورج (۲۴) میں فنکار ہوں

ادبی نثر

(۲۵) مضمونچے (مختصر مضامین) (۲۶) تائید وتردید۔ادبی مضامین (۲۷) تبصرے

طنز ومزاح

(۲۸) غالبؔ اور ہم۔مضامین (۲۹) بیتے کل کا اک اک پل (۳۰) دوسرا کالی داس۔کالی داس گپتا رضاؔ

حوالہ جات

باب اول

نمبر حوالہ	کتاب/رسالے کا نام	مصنف/مرتب	صفحہ نمبر	سن اشاعت
(۱)	نذیر فتح پوری۔شخص شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۲۸	۲۰۰۶ء
(۲)	نذیر فتح پوری۔شخص شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۵۶	۲۰۰۶ء
(۳)	ماہنامہ۔رہنمائے تعلیم جدید نئی دہلی	-	۲۴	نومبر۔۲۰۱۲ء
(۴)	نذیر فتح پوری۔شخص شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۸	۲۰۰۶ء
(۵)	نذیر فتح پوری۔شخص شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۸	۲۰۰۶ء
(۶)	سہ ماہی۔رنگ۔دھنباد	-	۵۵	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
(۷)	سہ ماہی۔رنگ۔دھنباد	-	۱۱۵	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
(۸)	سہ ماہی۔رنگ۔دھنباد	-	۱۱۸	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
(۹)	سہ ماہی۔رنگ۔دھنباد	-	۱۱۸	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
(۱۰)	ماہنامہ۔رہنمائے تعلیم جدید،نئی دہلی	-	۲۵	نومبر ۲۰۱۲ء
(۱۱)	ماہنامہ۔رہنمائے تعلیم جدید،نئی دہلی	-	۳۰	جون ۲۰۱۲ء
(۱۲)	ماہنامہ۔رہنمائے تعلیم جدید،نئی دہلی	-	۳۱	جون ۲۰۱۲ء
(۱۳)	ماہنامہ۔رہنمائے تعلیم جدید،نئی دہلی	-	۳۲	جون ۲۰۱۲ء

☆☆☆

بابِ دوّم

نذیرؔ فتح پوری کا ادبی پس منظر

نذؔیر فتح پوری کا ادبی پس منظر

ہندوستان میں اردو کی پیدائش کو اکثر مسلمانوں کی آمد سے جوڑا جاتا ہے، جو صحیح نہیں ہے، لیکن ہاں اسلام کو پھیلانے میں صوفیہ اکرام کے ساتھ ساتھ مسلمان بادشاہوں کا بھی نہایت اہم رول رہا ہے۔ ان کے زمانہ میں بہت سے راجپوتوں نے اسلام قبول کیا اور مسلمان ہو گئے۔ ایسے ہی ایک راجپورت کرم چند چوہان تھے جو بادشاہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے۔ ان کے ساتھ اور بھی بہت سے حضرات نے اسلام قبول کیا جن میں جوڈ برادری کا نام بھی شامل ہے۔

نذؔیر نے اپنی تحقیقی تصنیف ''تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی'' میں کرم چند چوہان کے اسلام قبول کرنے کے واقعہ کو بیان کیا ہے جو انہوں نے جان کوی نعمت خان کی تصنیف ''قائم راسا'' سے اخذ کیا ہے۔

> ''اب میں کرم چند کی کہانی پیش کرتا ہوں، جس طرح خدا نے اسے ہندو سے مسلمان بنایا۔ ایک دن شہزادہ کرم چند کھیل رہا تھا اور اس کی زبان سے اچھے اقوال بیان ہو رہے تھے۔ ایک دن کرم چند اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کے لئے گیا، ان لوگوں نے جنگل میں ساور، ہرن اور روز دیکھے اور سب لوگ اپنے اپنے طریقے سے ان کا شکار کرنے کے لئے دوڑ پڑے اور شکار کی تلاش میں ایسے محو ہوئے کہ راستہ بھٹک گئے۔ کرم چند بہت تھک گیا تھا اس نے ایک درخت سے گھوڑا باندھا اور آرام کی غرض سے درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا، پھر اسے گہری نیند آ گئی۔ دلی کا سلطان فروز شاہ تغلق بھی حصار کے جنگل میں شکار کے لئے آیا، اس کا گزر اُسی راستے سے ہوا جہاں کرم چند ایک درخت کی چھاؤں میں گہری نیند سویا ہوا تھا، بادشاہ نے دیکھا کہ دوپہر کا وقت ہے سورج ڈھل گیا ہے جنگل کے تمام دوسرے درختوں کی چھاؤں ڈھل گئی ہے لیکن اس درخت کی چھاؤں نہیں ڈھلی ہے جس کے نیچے کرم چند سویا ہوا ہے۔ بادشاہ کو تعجب ہوا اور وہ اس سے متاثر بھی ہوا۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سیّد ناصر کو یہ حیرت انگیز منظر دکھایا دونوں نے اپنے اپنے دل میں سوچا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت کا مالک ہے، دونوں نے اس کراماتی شخص کو دیکھ کر کہا کہ آج ہماری تقدیر جاگ اُٹھی ہے۔ ہم اسے جگا کر قدم بوسی کریں گے۔ دونوں نے ہمت کر کے کرم چند کو نیند سے بیدار کیا۔ انہیں یہ دیکھ کر اور بھی تعجب ہوا کہ یہ شخص ہندو ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں میں کرامات نہیں ہوتی، اس کو خدا کی یہ نعمت کیسے ودیعت ہوئی؟ سیّد ناصر نے کہا کہ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آخر میں یہ شخص اسلام قبول کرے گا، انہوں نے کرم چند سے پوچھا ''تمہاری ذات کیا ہے، تم کہاں رہتے ہو؟ کرم چند نے جواب دیا میرے گاؤں کا نام ددریوا ہے اور میرے والد کا نام موٹے راؤ ہے۔ ہماری ذات چوہان ہے اور میرا نام کرم چند ہے۔ بادشاہ نے اسے گلے سے لگایا اور کہا چوہان میرے ساتھ چلو میں تمہیں شاہی اعزاز دوں گا۔ اس کے بعد کرم چند مسلمان ہو گیا بادشاہ نے اس کا نام کرم کی مناسبت سے قائم رکھا اور وہ کرم چند چوہان سے قائم خان چوہان بن گیا۔ یہ ۷۴۸ھ مطابق ۱۴۴۱ء کا زمانہ تھا۔'' (۱)

یہیں سے قائم خانی قوم کی ابتدا مانی جاتی ہے اور فتح پور شہر جو نذیؔر کا وطن ہے اسے بسانے والے نواب فتح خان قائم خان چوہان کے پوتے تھے۔فتح پور کی بنیاد ۱۴۵۱ء میں نواب فتح خان نے رکھی ،ان کے بعد نواب جلال خان،نواب درِ دولت خان،نواب ناہر خان،نواب فدن خان،نواب تاج خان،نواب الف خان،نواب دولت خان دوئم،نواب سردار خان،نواب دین دار خان،نواب سردار خان دوئم اور آخری نواب سردار خان کے گود لئے ہوئے بیٹے قائم خان ہوئے ان سبھی نوابین نے ۱۴۵۱ء تا ۱۷۵۱ء فتح پور پر حکومت کی ۔

قائم خانی نوابین میں علم و ادب کی خدمت کرنے والے افراد بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔نواب الف خان کے دوسرے بیٹے نعمت خان تھے جو جان کوی کے نام سے مشہور ہوئے ان کی اہم تصنیف ’’قائم راسا‘‘ ہے جو تقریباً ۱۶۷۱ء میں تصنیف کی گئی یہ قائم خانی خاندان پر تحریر کردہ پہلی تصنیف ہے جان کوی نے تقریباً ۷۵ کتابیں تصنیف کیں ہیں۔

نواب فدن خان کی بیٹی تاج بی بی جو بادشاہ اکبر کی بیگم تھی وہ بھی شاعری کرتی تھی اور کرشن بھگت تھی اور اس کی شاعری میں یہ رنگ بہت گہرا ہے۔اس نے نظمیں دوہے اور گیت بڑی کثرت سے لکھے ہیں ان کی مشہور تصنیف ’’بیوی باندھی کا جھگڑا‘‘ ہندی رسم الخط میں ہے اس تصنیف کے متعلق نذیر اپنے مضمون ’’تاج بی بی ،تاج کویتری ،تاؔج فتح پوری ،میں فرماتے ہیں۔

’’تاج کی مشہور کتاب ’’بیوی باندھی کا جھگڑا‘‘ ہندی ادب کے ناقدین کے لیے موضوع بحث رہی ہے اس کتاب میں عام انسانی زندگی کا احوال مزاحیہ پیرائیہ اظہار میں کیا گیا ہے۔اس لئے اسے ایک سنجیدہ اور بھکتی رس میں ڈوبی شاعرہ کا کلام نہیں کہا جاسکتا ،بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ تخلیق تاج کے ابتدائی دنوں کی لکھی ہوئی ہے۔ جب وہ بھکتی کے رموز و اسرار سے واقف نہیں تھی۔‘‘ (۲)

تاج کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اسی مضمون میں نذؔیر فرماتے ہیں۔

’’وید پرکاش گرگ نے بھی اپنی کتاب ’’ہندی ساہتیہ کا اتہاس‘‘ میں بڑی تفصیل سے تاج کا ذکر کیا ہے،انہوں نے تاج کو کرشن بھگت شاعرہ بتایا ہے۔اور تاج کی زبان کو برج بھاشا لکھا ہے۔اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہندی اور برج بھاشا میں کرشن بھکتی کے سلسلے کے جتنے بھی کوی (شاعر) ہوئے ہیں ان میں تاج کا بلند مقام ہے انہوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ تاج کی مکمل اور مستند سوانح حیات ابھی تک اندھیرے میں ہے بس ادھر ادھر پھیلے ہوئے اوراق سے ہی ہمیں تاج کے تعلق سے معلومات ملتی ہے تاج کے بارے میں لکھے مضامین کا تذکرہ کرتے ہوئے وید پرکاش گرگ لکھتے ہیں۔‘‘ (ترجمہ)

’’اِدھر تاج کے تعلق سے دو مضامین میرے مطالعے میں آئے پہلا مضمون ۱۰/جنوری ۱۹۵۴ء کے ہفتہ وار ہندوستان میں رام نرائن اگروال نے تاج اس کی شاعری اور شخصیت دوسرا مضمون برج بھارتی کے ۱۳/ویں سال کے دوسرے شمارے میں ،اگر چند جی ناہٹا نے ،تاج کی تحریر کردہ ایک اہم گمنام گرنتھ (بعد میں تاج کے تعلق سے اور بھی مضامین شائع ہوئے) ان مضامین کی روشنی میں تاج کی اندھیروں میں ڈوبی ہوئی زندگی کے کچھ خدوخال نمایاں ہوتے ہیں‘‘ (۳)

نذؔیر فتح پوری کے عہد کے ادبی پس منظر کو پیش کرنے کے پہلے فتح پور کے ادبی ماحول کو سمجھنا ضروری ہے۔

آفتاب شیخاواٹی حضرت خواجہ نجم الدین چشتی ۳/رمضان المبارک ۱۲۴۴ھ کے دن جھونجھنو میں پیدا ہوئے اور سولہ (۱۶) سال کی عمر میں

اپنے مرشد خواجہ سلیمان تونسوی کے حکم سے فتح پور شیخاواٹی تشریف لائے، فتح پور میں محلّہ چیجاران میں قیام کیا اور وہیں خدا کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے اپنے مزاج کے مطابق فارسی اردو، ہندی اور شیخاواٹی چاروں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ آپ کا دیوان فارسی، اردو، ہندی، ''دیوان نجم'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فتح پور میں آپ کا مزار ہے جو درگاہ کی شکل اختیار کر چکا ہے راقمہ کو بھی آپ کے آستانے پر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ نذؔیر خواجہ نجم الدین چشتی کے لیے اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''آپ شیخاواٹی میں ہی نہیں بلکہ راجستھان میں پہلے صاحب دیوان شاعری ہیں۔ آپ اردو بزم کے سب سے اوّل مسند نشین ہیں۔ آپ کی شاعری ہمیشہ پردۂ خفا میں رہی۔ اس لئے آپ کو شعر و ادب کے میدان میں وہ مقام نہیں ملا جس کے آپ مستحق تھے۔ آپ ہمیشہ ایک صوفی اور خدا رسیدہ بزرگ کی حیثیت سے مشہور و معروف رہے۔ اس لئے بیشتر تذکرہ نگاروں نے آپ کو نظر انداز کیا۔''(۴)

لیکن اسی تصنیف کے صفحہ نمبر ۸۲ پر انہوں نے ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کی تصنیف ''تخلیقات'' سے بھی حوالہ پیش کیا ہے۔

''لیکن حقیقت یہ ہے کہ راجستھان میں اس سے پہلے اردو شعر و ادب کے سراغ ملتے ہیں مثال کے طور ریاست جے پور کے ایک قصبہ دائرہ میں مہدویہ فرقہ کے چند بزرگوں نے اردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا تھا اس سلسلے کے ایک بزرگ محمد جی میاں ولد شیخ مجتبٰی نے ایک ضخیم مثنوی ''تاریخ غریبی کے نام سے ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۴۷عیسوی میں تصنیف کی تھی اس کا ایک نسخہ عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے۔''(۵)

نذؔیر نے ان کی تصانیف کی تعداد ۵۲ بتائی ہے اس کے برعکس ڈاکٹر معین الدین شاہین اجمیری اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

''مؤلف کا بیان ہے کہ نجم الدین صاحب نے اپنی ۵۲ برس کی عمر میں ۵۲ کتابیں تصنیف کیں ان کا نام ابھی پردۂ خفا میں ہے میں مؤلف کے اس بیان سے بہ صد معذرت اختلاف کرتے ہوئے عرض کروں کہ ان کی دس پندرہ کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں جو اجمیر کے دو ایک ذاتی کتب خانوں اور درگاہِ معلّٰی حضرت غریب نواز کے دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر القدس میں محفوظ ہیں۔ نجم الدین کے ساتھ اکثر کتابوں پر لفظ پروانہ تخلص کی علامت کے ساتھ موجود ہے حضرت نجم الدین نے فارسی، اردو، اور ہندی میں جو کتابیں تصنیف کیں ان میں چند نام اس طرح ہیں۔''(۶)

اس کے بعد شاہین صاحب نے خواجہ نجم الدین صاحب کی ۲۹ کتابوں کے نام قلم بند کیے ہیں۔ اور تفصیلی معلومات کے لئے ''سلطان التارکین'' مرتب احسان الحق فاروقی کے مطالعے کی تجویز پیش کی ہے۔

حاجی محمد نصیر الدین شاہ صاحب محدّث فتح پوری جھونجھنوں میں ۲۲/ جمادی الاوّل یومِ چہار شنبہ ۱۲۵۲ھ ۱۸۹۲ءکو پیدا ہوئے آپ حضرت نجم الدین چشتی کے فرزند تھے۔ اور ابتدائی تعلیم انہیں سے حاصل کی۔ بعد ازیں علم فرع و اصول فقہ و حدیث و تفسیر و معانی، علم الکلام اور علمِ ادب میں مہارت حاصل کی۔

حضرت نورؔ احمد فتح پوری بھی خواجہ نجم الدین چشتی کے پسر تھے اور ۱۳ر محرم ۱۲۶۰ھ کو جھونجھنوں میں پیدا ہوئے تھے آپ بھی اپنے والد اور بھائی کی طرح صوفیانہ مزاج کے مالک ہوئے اور آپ کی شاعری پر بھی یہ رنگ غالب رہا۔

حضرت خواجہ نجم الدین چشتی کے تیسرے فرزند مولانا محمد رمضان فاروقی بھی علوم وفنون کے خزانے سے مالا مال تھے ان کی دانش مندی کے جلوئے انکی تصنیف فخر التواریخ میں جلوہ افروز ہیں آپ کے کلام میں پختگی ہے اور واردات قلبی کے اظہار سے معمور ہے۔

خواجہ محمد سرورؔ خواجہ غلام محمد نجم الدین کے فرزند تھے۔اور ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۱۸ ہجری کو فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے اپنی شخصیت کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا اور دورانِ طالب علمی سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔آپ کا دیوان ۱۹۹۴ء میں ''دیوان خواجہ سرور'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نذیرؔ فتح پوری اپنی تصنیف تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی میں یوں رقم طراز ہیں۔

''خواجہ غلام سرورؔ فتح پوری صاحب کے دیوان میں تاریخی مادّے اردو فارسی، دونوں زبانوں میں پیش کیے ہیں۔

اس سے آپ کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے، کہیں ایک واقعہ کے لیے عیسوی اور ہجری دونوں تاریخیں نظم کی ہیں۔'' (۷)

حافظ محمد عیسیٰ خواجہ غلام سرورؔ کے بھائی تھے ۹ر ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ کو فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے والد کی سرپرستی میں تعلیم وتربیت پائی۔شعرو سخن سے شغف رکھتے تھے۔نعت، منقبت، اور غزل میں طبع آزمائی کی۔

حضرت خواجہ محمد حنیف خواجہ عبداللطیف کے بیٹے تھے ۱۲۸۸ھ میں پیدا ہوئے آپ علم کی دولت سے مالا مال ایک صاحبِ کمال بزرگ اور شاعر تھے۔

شیخ ابراہیم خیال فتح پوری کا تعلق فتح پور کی بیوپاریان برادری سے تھا ۱۹۲۲ء میں راجستھان کے مہوشہر میں پیدا ہوئے۔اس کے بعد ان کے والد ممبئی میں آکر مقیم ہوئے اور خیال بھی ممبئی کے ہو کر رہ گئے انہوں نے نثر اور شاعری دونوں ہی میدانوں میں طبع آزمائی کی۔ان کی نثری تصنیف ''ڈاکٹر عصمت جاوید شخص، شاعر، اور نقاد'' شائع ہو چکی ہے۔

وفاؔ فتح پوری کا پورا نام غلام سرور تھا۔۱۹۱۸ء میں فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے، بچپن وہیں گزرا اس کے بعد اپنے والد عبدالکریم صاحب کے ساتھ بیکانیر تشریف لے گئے وہیں سکونت اختیار کی، وفا کی شاعری طنز ومزاح کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی ہے، ان کے قطعات میں سیکڑوں داستانیں بیان کی گئی ہیں اور اکثر فی البدیہہ اشعار کہتے ہیں۔

محمد وآوارہ کا پورا نام محمد بخش تھا۔فتح پور کے امام باڑہ میں رہائش پذیر تھے۔نعتیہ انداز کی شاعری کرتے تھے۔اُن کی نعتوں کا مجموعہ ''جذبات آوارہ'' کے نام سے ۱۹۵۵ء کے قریب شائع ہوا۔آوارہ کی شاعری کے متعلق نذیرؔ کا خیال ہے کہ

''آوارہ صاحب میں جوہر شاعری موجود تھا اگر اس وقت انہیں بہتر ماحول میسر آتا یا کسی قابل اُستاد کی رہنمائی انہیں مل جاتی تو آوارہ صاحب ایک اچھے اور کامیاب شاعر کے طور پر ادبی حلقوں میں یاد کیے جاتے۔'' (۸)

منورؔ علی سیّد تخلص منور ۱۹۳۸ء میں مولانا علاؤالدین سید کے گھر شیخاواٹی کے ایک مقام بیسوا سیکر میں پیدا ہوئے ۱۹۵۹ء کے قریب شعر کہنا شروع کیا اور رشید جے پوری سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔یہ بھی اقبال کے پرستاروں میں شامل تھے۔

محمد جیون حیاتؔ فتح پوری شیخاواٹی میں پیدا ہوئے وہاں سے ہجرت کر کے والد کے ساتھ پونہ چلے گئے آپ میں بھی شاعری میں طبع آزمائی کی آپ کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

کسی خطا کی یہ سزا ہم کو ملی ہے اے حیاؔت   ان کی محفل میں بھی ان کا سامنا ہوتا نہیں''(۹)

قمرالدین خان جوڈ کہبت اور دوہے کہنے میں کمال رکھتے تھے ان کی کہبت اور دوہوں کی ایک مثال نذیؔر نے اپنے تذکرہ میں شامل کی ہے۔

''قرض کمر دے توڑ چاہے جتنا ہو بلوان

ہرن چوکڑی بھول جائے دیکھ تیر کمان''   (۱۰)

ماسٹر اصغر علی خان پڑھیار غالبؔ کے پرستاروں میں شامل تھے شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے اور شعر و شاعری بھی کرتے تھے۔

یہ تمام شعراء نذیر کی پیدائش کے پہلے فتح پور میں شعر و سخن کی شمع روشن کئے ہوئے تھے اس کے بعد ان شعراء کا ذکر کرنا لازمی ہے جو نذیؔر کے ہم عصر ہیں ان کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

عارفؔ نجمی ۱۲رذی الحجہ یوم دوشنبہ ۱۳۵۳ھ کو فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے آپ کا پورا نام محمد عارف حسین ہے آپ کے والد مولانا غلام سرور تھے عارف نے اپنی روح کے سکون اور دل کو مسرور رکھنے کے لیے شاعری کی لیکن کبھی اس کے ذریعہ شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

صباؔ کا پورا نام عمر دین خان ہے۔ فرید خان کے بیٹے ہیں ۴رمئی ۱۹۴۱ء کو چورو کی سرزمین پر موئل برادری میں پیدا ہوئے آپ ایک طبیب ہیں اور اسی نسبت سے فتح پور والے آپ کو حکیم صاحب کے نام سے جانتے ہیں۔ آپ شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اسے کبھی اپنے آپ پر حاوی نہیں ہونے دیا پھر بھی آپ کے اندر کے شاعر نے آپ کو نہیں چھوڑا۔ علم طب میں بھی آپ نے بہت اہم مضامین تحریر کیے ہیں۔

عبدالکریم خان کریمؔ کے والد کا نام عبدالرحیم خان تھا۔ ۱۲ردسمبر ۱۹۴۰ء کو سیکر راجستھان میں پیدا ہوئے کریم نے خالص شیخاواٹی زبان میں بے پناہ گیت لکھے ہیں کریم نے اپنے وطن کی محبت کی اپنے ہندی گیتوں میں بیان کیا۔

نجمی فتح پوری کا پورا نام غلام جیلانی ہے ۴راپریل ۱۹۴۲ء کو فتح پور شیخاواٹی میں حاجی غلام سرور صاحب کے گھر پیدا ہوئے شعر گوئی وراثت میں ملی ہے۔

عادلؔ فتح پوری کا پورا نام محمد اسماعیل ہے آپ جناب محمد یاسین کے گھر اگست ۱۹۴۴ء میں فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے انہوں نے نعت، نظم، غزل گیت، قطعہ، دوہا، اور ماہیہ، ان سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی آپ نے ادبی مضامین بھی لکھے۔ عادل کی نثری تصنیف ''نذیؔر فتح پوری ایک دوست ایک شاعر'' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔

راہیؔ کا پورا نام نثار احمد ہے، اور والد کا نام محمد حسین، یہ ۱۹۴۶ء میں فتح پور میں پیدا ہوئے۔ غزل کے ساتھ ساتھ قطعات، نعت، اور سلام جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آپ کے انداز بیان کی بنا پر عنبر فتح پوری نے آپ کو ''نفس مطمعنہ کا شاعر'' کے لقب سے نوازہ ہے۔

نام منصور احمد تخلص نیّرؔ اگست ۱۹۴۸ء میں عبداللہ بکھید کے گھر میں پیدا ہوئے آپ شاعری کرتے ہیں لیکن زود گوئی کے قائل نہیں ہیں۔

محمد الیاس محمد حنیف کے فرزند ہیں اور قمرؔ تخلص اختیار کرتے ہیں ۲۶ جون ۱۹۴۸ء کو فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کے دم پر اپنی شاعری کو رنگ و روپ عطا کیا ہے۔

شبیر حسن فرازؔ ۱۹۵۰ء میں جناب محمد یسین کے گھر فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے آپ کی شاعری کا سفر ۱۹۸۴ء کے آس پاس شروع ہوا۔ فرازؔ نے نعت، غزل، قطعہ، اور ماہیہ کے علاوہ داغؔ اور فیضؔ کی غزلوں پر خوبصورت تضمین بھی لکھی ہیں۔ فرازؔ کے شعری مجموعہ ''تمنا کا پہلا

قدم‘‘اور’’تمنا کا دوسرا قدم‘‘ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔

محمد صلاح الدین جناب یوسف کھوکھر کے گھر ۱۹۵۲ء میں محلّہ بیو پاریان فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے۔ادب کی دنیا میں عنبر فتح پوری کے نام سے مشہور ہوئے شاہد رتلامی سے مشورہ سخن کرتے رہے۔شاعری میں غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی اور ایک منفرد انداز اختیار کیا۔نثر میں آپ نے تنقیدی مضامین،عروضی تجزیے اور ادبی تبصرے تحریر کیے ہیں آپ کا شعری مجموعہ’’برف کی فصلیں‘‘ عنوان سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہو چکا ہے

گوہرؔ ۳ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام غلام عیسیٰ تنور تھا۔گوہر کا پورا نام شوکت علی ہے۔بھیڑ سے الگ پہچان بنانے میں گوہر کو سکون ملا اور انہوں نے اپنی شاعری کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔آپ کا اندازِ سخن روایت اور کلاسکیت سے ہم آہنگ ہے۔

نام پَوَن کمار شرما تخلص پروانہؔ ۱۰ر جنوری ۱۹۵۸ء کو فتح پور میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام بدری پرساد شرما تھا آپ نے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ملی جلی شاعری کی ہے۔گیت بھجن اور دوہا آپ کی فطرت سے میل کھاتے ہیں۔میوسیقی اور گائیکی کے علم کے علاوہ آپ نے ڈراموں میں بھی اداکاری کی ہے ساتھ ہی ساتھ ہندی اور راجستھانی فلموں میں بھی اداکاری کی ہے۔

شنبھو پرساد پاریکھ فتح پور میں ایک تاجر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں شاعری کا شوق رکھتے ہیں اور ادب نواز ہیں مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

محمد حسین مدنی کا تعارف عنبر فتح پوری نے اپنے ہندی اخبار’’اپنا شیخاواٹی‘‘ میں پیش کیا تھا،مدنی صاحب غزل اور نعت کہنے میں مصروف رہتے ہیں۔

ناصرؔ فتح پوری نے عشرت دھولپوری کو اپنا استاد بنایا اور ۱۹۶۴ء کے قریب شعر کہنے لگے۔اردو اور فارسی کی شاعری سے شغف رکھتے تھے اور اسی انداز میں شاعری کرتے تھے۔

’’ہے بزم خرد میں جنوں کارفرما
ہوا چاک داماں رفو کرتے کرتے‘‘ (۱۱)

رفیق رازؔ فتح پوری چوہان برادری سے ہیں۔جب ان کا قیام کویت میں تھا تو مرحوم شاہد رتلامی سے مشورہ سخن کیا۔شاعری سے گہرے مراسم رکھتے ہیں اور تحت اللفظ میں اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔

یعقوب فتح پور میں پیدا ہوئے نازؔ تخلص کرتے ہیں۔شاہد رتلامی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

محمد اسماعیل غازیؔ فتح پوری قریباً پچاس سال کے ہیں اور تقریباً پچیس سال سے شعر و سخن کے باغ کو آراستہ کیے ہوئے ہیں اور آج بھی اس باغ کی آبیاری میں مصروف ہیں انہوں نے منصور چوروی کو اپنا استاد تسلیم کیا اور اپنا کلام مع ترنم مشاعروں میں پیش کرتے ہیں آپ کا مجموعہ ’’قطرے کی وسعت‘‘ کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔

ان تمام حضرات کے علاوہ شوکت جذبیؔ، رفیق منظر، ادریس رازؔ چوروی اور لیاقت علی خاں وقارؔ وغیرہ کچھ ایسی شخصیات ہیں جنھوں نے فتح پور کے ادبی ماحول کو پروان چڑھایا اور ادب میں کئی مشعلیں روشن کیں۔

حالانکہ فتح پور میں اردو زبان کے حالات کچھ ٹھیک نہیں۔عوام میں اس زبان کا استعمال کم ہی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان تمام شعراء

نے اردو کے سفینہ کو سنبھال رکھا ہے اور اسے ہر طوفان سے بچائے ہوئے اسے اس کی منزل تک کے لے جانے کی جی توڑ کوشش میں لگے ہیں اور فتح پور کے ماحول کو اردو کی شرینی سے لذت پہنچاتے ہیں۔اسی ماحول میں نذؔیر کی ادبی شخصیت کا خمیر پروان چڑھا اور ان سے بے انتہا تصنیف قلم بند کروانے میں بھی مددگار ثابت ہوا۔

پونہ میں نذؔیر کے ہم عصر شعراء

حالانکہ نذؔیر فتح پوری سیکر فتح پور میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی لیکن عہد جوانی میں وہ یہاں سے اپنے خاندان کے ساتھ پونہ شہر میں منتقل ہو گئے اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ان کی شعری زندگی کا آغاز ہوا۔ پونہ کے ادبی ماحول میں نذؔیر کا شعری ذوق بھی پروان چڑھا۔ان کے اس شعری ذوق کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ان کے ہم عصر شعراء اور ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہے جو حسب ذیل ہے۔

شوکت حسین عکسی برنی کی ولادت میرٹھ اُتر پردیش میں ہوئی۔ زندگی کا زیادہ تر حصہ پونہ میں بسر ہوا۔ پونہ کے ادبی حلقوں میں انہیں بہت عزت اور مقبولیت حاصل تھی۔ زبان و بیان پر آپ کو قدرت تھی۔اور اسی لیے لوگ آپ کے فن کے دلدادہ تھے۔

عکسی نے پونہ کے ادبی ماحول کو جلا بخشی، وہ شاعروں کی رہبری بھی کرتے تھے،نذؔیر نے بھی انہیں اپنا استاد بنایا۔نذؔیر آج بھی ان کو یاد کرتے ہیں، نذؔیر بتاتے ہیں کہ وہ عکسی برنی صاحب کو ایک ہی وقت میں کئی غزلیں اصلاح کے لیے دکھاتے لیکن وہ کبھی آج کا کام کل پر نہیں ٹالتے تھے۔اور غزلوں پر فوراً اصلاح کر کے واپس دے دیا کرتے تھے۔انہوں نے تقریباً چار سو غزلوں پر اصلاح دی۔ یہاں تک کہ جب نذؔیر نے اپنا پہلا افسانہ تحریر کیا تو اس پر بھی عکسی صاحب نے ہی اصلاح دی۔انہوں نے جب اپنا ایک اور افسانہ چارفل اسکیپ عکسی صاحب کو اصلاح کے لئے دکھایا تو انہوں نے افسانہ پڑھا اور بنا اصلاح کیے اس کے اختتام پر ایک نوٹ لکھ کر دستخط کر دیئے۔

نوٹ کی تحریر کچھ یوں تھی!

”اگر اسی طرح لکھتے رہے تو ایک دن بہترین ادیب بن جاؤ گے۔جس طرح آدمی گاتے گاتے گویّا بن جاتا ہے۔“

(بقلم شوکت حسین عکسی برنی میرٹھی)

عکسی برنی صاحب کے انتقال سے ایک دن پہلے نذیر ان سے ملاقات کے لیے گئے تو انہوں نے نذیر سے ان کا قلم مانگا اور پھر اپنے تکیے کے نیچے سے اپنا قلم نکال کر نذیر کو دیدیا۔اس واقعہ کا اظہار دلدار ہاشمی نے اپنی اس نظم میں بھی کیا جو انہوں نے عکسی کے انتقال پر لکھی تھی۔

”اور نذؔیر باصفا کے دے گئے اپنا قلم“

اس واقعہ سے نذیر اور عکسی صاحب کی درمیانی محبت کا پتہ چلتا ہے کہ استاد شاگرد کے بیچ کتنی محبت تھی۔نذیر ان سے جتنی محبت رکھتے تھے اتنی ہی عقیدت بھی رکھتے تھے۔عکسی کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ایسا بسا نگاہ میں مایوسیوں کا درد
اب تک نظر کے سامنے طاری ہے جیسے رات
کسی کو آنکھ بھر کر دیکھ لینے کی سزا یہ ہے
نظر کی آج تک اس دن سے حیرانی نہیں جاتی

کھلی ہیں آنکھیں مگر جیسے سو گیا ہوں میں
بڑے حسین مناظر میں کھوگیا ہوں میں

دلدار ہاشمی ۱۷ر جولائی ۱۹۳۲ء کو دھارواڑ کرناٹک کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے ان کا پورا نام شیخ عبدالرحیم ہے۔ ان کی بھی اسکولی تعلیم برائے نام ہی تھی۔ پھر حالات کچھ ایسے بدلے کہ ان کا خاندان دھارواڑ کو خیر آباد کہہ کر پونہ میں منتقل ہوگیا۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے اپنی اسکولی تعلیم جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا اور بچپن میں ہی کاپی کتاب چھوڑ کر محنت مزدوری میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۵۲ء کے قریب انہیں ایس ٹی ورک شاپ (داپوڑی) پونہ میں ملازمت مل گئی وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی کرتے رہے۔ وہ یونین کے اجلاس میں حصہ لیتے اور مزدوروں کے حق میں شاعری کرتے جس کے لیے وہ مشہور بھی ہوئے۔ انہوں نے جلسوں اور مشاعروں میں احتجاجی لہجہ اختیار کیا جس سے عوام بہت متاثر ہوئی۔ یہ نذیؔر کے بہت خاص دوست بھی تھے اور نذیؔر کی شاعری کے اولین دور میں ان کے رہبر بھی رہے۔ یہ بھی عکسی برنی صاحب کے شاگرد تھے۔ شاعری کا انداز ملاحظہ ہو۔

نقشِ پا سے اس لیے محروم ہے اپنی زمیں
سب ہوا کے دوش پر ہیں، کوئی بھی پیدل نہیں
روز پھولوں سے مرا بستر سجاتا ہے یہ کون
مجھ کو خوشبو کے وسیلے سے بلاتا ہے یہ کون

حکیم رازؔی ادیبی کا اصلی نام رجب علی تھا۔ ایلولہ ضلع ناسک میں ۱۰ر فروری ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے، والد کا نام محمد سلیمان تھا۔ پیشے سے حکیم تھے۔ ادیب مالیگانوی کی شاگردی اختیار کی۔ اور اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ ادیبی لگاتے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے ''اسباق'' کی سرپرستی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ محفلوں اور مشاعروں میں اپنی جادو بیانی سے سب کو مدہوش کر دیتے تھے۔ عمر کے آخری پڑاؤ پر بھی ادب و زندگی کے معاملے میں ہمیشہ گرم جوشی سے پیش آتے رہے۔ ان کی چھ شعری تصانیف ''سرور بخش'' اللہ (لغت) رگِ سنگ، ''کاروانِ سنگ'' ''ارمغانی لغت'' ''گلشن دیب'' ''جہانِ سنگ'' تاحال شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ حکیم صاحب کی شخصیت اور فن پر ''اسباق'' کا گوشہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ پونہ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

آؤ میری آڑ میں بیٹھو
تم کو زمانہ دیکھ رہا ہے
آدمی اتنا سخت جاں کب تھا
زہر پی کر بھی جی رہا ہے ابھی

عزیز قیصری کا پورا نام عبدالعزیز خان اور والد کا نام محمد سردار خان تھا آپ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو مدھیہ پردیش کے ضلع کھنڈواہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اس کے بعد ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک جونا گڈھ گجرات میں بہاؤالدین کالج سے سائنس کا ایک کورس مکمل کیا۔ بعدازیں ۱۹۳۸ء میں ممبئی یونیورسٹی سے ایک اور امتحان پاس کیا۔ تعلیم کے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے بی ایس سی اور بی۔ٹی۔ کے امتحان پونے یونیورسٹی سے پاس کیے۔ پونہ کی آب و ہوا عزیز کو اس قدر راس آئی کہ وہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ یہیں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۰ء سے ملازمت کی ابتداء ہوئی اور ۱۹۸۰ء میں مولیدینہ اسکول سے سبک دوش ہوئے۔

عزیز ابتداء سے ہی ادب سے رغبت رکھتے تھے،آپ نے ''ولی'' سائنس وادب اور ''عرفان'' وغیرہ رسالے جاری کیے۔آپ غزلوں کے ساتھ ساتھ،نظمیں، رباعیات،قطعہ اور مثنوی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔اپنے اشعار سے پہلے خود لطف حاصل کرتے ہیں پھر اپنے سامعین کو اس کی سحر انگیزی میں گم کر دیتے ہیں۔آپ کے غیر مطبوعہ مسودے ہیں۔

(۱) ''آبشار'' (غزلوں کا مجموعہ)

(۲) ''ایوان سخن'' (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ)

(۳) ''رنگِ فرنگ'' (منظوم اقوال زرین)

(۴) ''تثلیثات اور رباعیات''

(۵) ''خطِ مستقیم'' (نعت،منقبت،اور سلام کا مجموعہ)

شاعری کا انداز ملاحظہ ہو۔

رباعی

جینا ہے بہرحال خوشی ہو یا غم
شعلہ ہے کبھی زیست کبھی ہے شبنم
مجموعہ ٔ اضداد ہے ہستی اپنی
دشواری بہت اس میں ہے آسانیاں کم

قطعہ

روح افزا ہے اعتبارِ حیات
کس بلندی پہ ہے وقارِ حیات
ہر نفس کی اس آمد وشد پر
فی الحقیقت ہے انحصار ِ حیات

علامہ کالی داس گپتا رضا ماہر غالبیات کے طور پر جانے گئے ہیں۔آپ ۲۵ راگست ۱۹۲۵ء کو مکند پور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔حالانکہ آپ ممبئی میں قیام پذیر تھے۔لیکن آپ کا تعلق پونہ سے بہت خاص رہا ہے۔پونہ میں بھی آپ کا فلیٹ تھا اور اسی نسبت سے آپ پونہ آتے رہتے تھے۔یہاں رہ کر انہوں نے بہت سے علمی ادبی اور تحقیقی کاموں کو ان کے انجام تک پہنچایا۔پونہ کے اہل ذوق حضرات اور شعراء سے آپ کے تعلق بہت بہتر تھے۔آپ پونہ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں صدر اور مہمان خصوصی کے طور پر اکثر بلائے جاتے تھے۔نذیر فتح پوری سے آپ کا تعلق بہت خاص رہا ہے۔نذیر اپنی تحریروں پر آپ سے رائے بھی لیا کرتے تھے۔آپ سہ ماہی اسباق کے کئی برسوں تک سر پرست بھی رہے۔آپ کی ساٹھ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اسباق نے بھی آپ کے فکر وفن پر ایک خاص گوشہ شائع کیا تھا۔آپ کا انتقال ۲۱ رمارچ ۲۰۰۱ء کو دہلی کے ایک اسپتال میں ہوا لیکن اردو دنیا میں آپ ایک معتبر نقاد محقق اور شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شاعری جیسے جوئے خونِ جگر
موجِ تفہیم چشم تر جیسے
جگمگا اٹھی رات بن باتی
رکھ دیا دل چراغ میں کس نے

ڈاکٹر امانتؔ کا پورا نام شیخ امانت اللہ اور والد کا نام نصر اللہ تھا۔ ۳؍ جولائی ۱۹۲۶ کو ایولہ ضلع ناسک میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے ہی تھا۔ جمیل احمد جمیل برہانپوری کے شاگرد ہوئے پونہ کے واڈیا کالج میں صدر شعبہ کے حیثیت سے فائز ہوئے۔ اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ آپ نے تخلیق تحقیق اور تنقید کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ''حیات بیدلؔ'' کے نام سے آپ کی تحقیقی تصنیف شائع ہو چکی ہے۔ جس کے لئے انہیں مہاراشٹر اور اتر پردیش کی اردو اکادمیوں کی جانب سے انعامات بھی تفویض ہوئے۔ آپ کی دوسری شائع شدہ تصانیف میں ''بال و پر'' (بچوں کے لئے نظموں کا مجموعہ) اور ''وینس کا سوداگر'' (بچوں کے لئے ڈرامے) شامل ہیں۔ مسودات میں (۱) بیدلؔ کا اثر اردو شعراء پر (۲) عکس و شعر (اردو میں مروج فارسی کے معروف اشعار کا منظوم ترجمہ) اور (۳) نشاط تصور (مجموعہ کلام) شامل ہیں۔ آپ مقالہ نگاری کا بھی شوق فرماتے تھے۔ اور آپ کے مقالے مختلف رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ ادبی جریدے ''تکلم'' کے سر پرست بھی رہے جو حکیم رازیؔ ادیبی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ حالانکہ آپ تنہائی پسند تھے اس کے باوجود آپ نے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنائی، امانت شاعری کے روایتی انداز کے عاشق تھے وہ کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے ہمیشہ روایتی لطافت و فصاحت کے شیدائی رہے آپ نے پونہ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہر ایک بار میرا عزم برقرار رہا
ہزار بار لگی آگ آشیانے کو
ظلمت کدے کا میرے اندھیرا نہ مٹ سکا
سورج کے گردیوں تو زمین گھومتی رہی

ملک تا سے ۱۱۹پریل ۱۹۲۲ کو بھیونڈی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں اینگلو اردو ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی آپ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور انگریزی میں بھی مہارت رکھتے تھے ترقی پسند تحریک سے اثر قبول کر کے نظم کی جانب رخ کیا۔ اور نظموں کے دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ آپ نے واقعاتی نظمیں بھی کہیں نظم نگاری کا انداز بے حد خوبصورت ہے۔ آپ کی نظمیں اصول' پونہ' انقلاب ممبئی، ایوان اردو، اور بیسویں صدی دہلی میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ آپ کا اولین مجموعہ کلام ''دردنہاں'' کے نام سے ۱۹۲۳ میں شائع ہوا۔ آپ کا ایک سفر نامہ ''گردسفر'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ''دردنہاں'' کے لیے انہیں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی جانب سے انعام بھی تفویض کیا گیا۔ وہ ایک مقرر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے اور ادبی اور تعلیمی موضوعات پر مدلل گفتگو بھی کرتے تھے۔ ان کے مطالعہ کی گہرائی اور فکر کی گیرائی ان کی تحریروں کی خاص پہچان ہے۔ نثر لکھنے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ آپ تنہائی پسند تھے اور وقت گزارنے کے لیے مطالعہ کو سب سے بہتر ذریعہ تسلیم کرتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

حیات مختصر اور کام کیا کیا
اور اس پر ذہن میں اوہام کیا کیا

برا ہوا اے خلوص نیت دل
تیری خاطر ہوئے بدنام کیا کیا

انور سیمابی کا پورا نام شیخ محمد انور تھا۔اور والد کا نام شیخ محمد منور منیؔر تھا۔وہ ۵/نومبر ۱۹۲۴ کو ایوالہ ضلع ناسک میں پیدا ہوئے۔اور وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر محکمہ دفاع میں ملازم ہو گئے۔دوران طالب علمی سے ہی عاشقان سخن میں شامل ہو گئے۔اور سب سے پہلے اپنے والد محترم جناب منیر کو شاعری میں اپنا استاد بنایا۔پھر احمد نگر میں قیام کے دوران ان کی نزدیکیاں افسؔر سیمابی سے بڑھ گئیں۔اور دوستی گہری ہو گئی۔سیمابی انور کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے۔لیکن ملک کے تقسیم ہو جانے پر سیمابی پاکستان چلے گئے۔اور اصلاح کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا پچھلے کچھ عرصے سے انور پونہ میں مقیم ہیں۔

یوں تو آپ کا تعلق پونہ کے ادبی ماحول سے بہت کم ہی رہا ہے لیکن پھر بھی اپنے خیال کی رعنائیوں اور احساس کی رنگینیوں سے وہ اپنا دامن نہیں بچا پائے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دل و نگاہ کے پردے اٹھا رہی ہے جھیل
جمال شاہد فطرت دکھا رہی ہے جھیل
یہ موج آبِ میں غوطے لگا رہا ہے قمر
کہ آب نورِ قمر میں نہا رہی ہے جھیل

امین حزیںؔ صاحب کا پورا نام شیخ امین الدین تھا والد کا نام شیخ محی الدین۔تخلص حزیںؔ اختیار کیا۔اور اسی نام سے ادبی حلقوں میں مشہور ہوئے۔آپ کی ولادت ۲/اگست ۱۹۲۷ کو پونہ میں ہوئی۔۱۹۴۲ سے ادبی میدان میں شامل ہوئے اول اول غزلیں کہیں پھر ادب اطفال میں دلچسپی لینے لگے اب تک آپ کی ۱۲ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک کتاب مراٹھی سے اردو سیکھنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔آپ بیک وقت ایک شاعر، معلم،متکلم،مقرر،محرر،اور منتظم کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔پونہ میں آپ کے کئی شاگرد موجود ہیں۔پونہ میں آپ نے ملک عدم کی راہ لی۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

میری ہستی عجیب ہستی ہے
صبح تا شام غم پرستی ہے
زندگی اور وہ بھی تیری بندگی
ہائے میری مختصر سی زندگی

ناظم القادری کی پیدائش پونہ میں ۱۹۲۹ میں ہوئی انہوں نے حضرت شاد پونوی کی شاگردی اختیار کی۔آپ غزل کے ساتھ ساتھ علم عروض میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ایک عرصے تک آپ نے محکمہ ٹیلیفون میں ملازمت کی آپ کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۹۰ میں جذبات حق کے نام سے شائع ہوا۔آپ کا دوسرا شعری مجموعہ بعنوان فردوس نظر اسباق پبلی کیشنز سے شائع ہوا ناظم القادری پر شاعری جنوں کی حد تک طاری تھی۔آپ پونہ ہی میں راہی ملکِ عدم ہوئے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

میں کھڑا ہوں آسمان ناز پر
ہے انہیں حیرت میری پرواز پر

چلتے پھرتے زندگی کے ساز پر
موت آئی عمر کی پرواز پر

منظور الحسن منظورؔ ۷؍جنوری ۱۹۳۰ کوکھڑکی پونہ میں عبدالرحمٰن کرنالکر کے گھر پیدا ہوئے۔۱۹۴۴ میں شعروادب کی دنیا میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر امانت شیخ کو اپنا استاد بنایا۔اوران کی رہنمائی میں ادبی زندگی کا طویل سفر طے کیا۔آپ نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔اور سیاسی ،سماجی اور ثقافتی موضوعات کا تجزیہ بڑے سلیقے سے کیا۔آپ ایک مقرر بھی تھے۔اردو کے مختلف رسائل وجرائد میں آپ کے مضمون شائع ہوتے رہتے تھے۔آپ کی تصنیف ’’ملک محمد جائسی کی پدماوت جدید تحقیقات کی روشنی میں‘‘ ۱۹۹۳ میں شائع ہوئی اوراس کے لئے انہیں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی جانب سے انعام تفویض کیا گیا آپ کے دوسرے مسودات میں۔

(۱) اسلامی ثقافت کا عالمگیر ورثہ (۲) قرآن اور ماحولیات (۳) سبدگل (نظموں کا مجموعہ) (۴) غزلوں کے دو مجموعے اور (۵) نشاط ادب (مضامین کا مجموعہ) وغیرہ ہیں۔

منظور صاحب ایک ایسے فنکار تھے جنہیں خدا نے سخنوری کی اسی دولت سے عطا کی تھی جو کم ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ایک حساس دل شاعر ہونے کے سبب وہ ہر شہ کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے تھے اور صفحہ قرطاس پر اتار دیتے تھے ان کی شاعری واردات قلب کی عکاس تھی۔ آپ نے موضوعاتی پابند نظمیں بھی کامیابی کے ساتھ کہی ہیں۔آپ نے بھی پونہ میں انتقال کیا۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

حسن ازل کوآپ ہی ہونا تھا بے نقاب
دنیائے رنگ وبو کا بہانہ بنا ہوں میں
میں ضبط اشک کی تلقین کررہا ہوں انہیں
مگر ہے کتنا مجھے خودپہ اختیارنہ پوچھ

مرزا حمید بیگ تحمل قادری آپ کا نام مرزا حمید بیگ اور تخلص تحمل تھا۔ادبی دنیا آپ کو مرزا حمید بیگ قادری کے نام سے جانتی ہے۔سیاسی اور سماجی حلقوں میں مرزا صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔۱۶ مارچ ۱۹۳۰ کو پونہ میں پیدا ہوئے۔شعروشاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اوراسی لئے محمد عثمان شاد پونوی مرحوم کو اپنا استاد تسلیم کیا۔شاعری کے علاوہ ادبی نثر میں بھی آپ کی دلچسپی ہے اوراسی دلچسپی کے سبب ’’تاریخ ادب پونہ ایک تحقیق‘‘ جیسی تصنیف وجود میں آئی اس تصنیف کے ذریعہ پہلی بار پونہ میں اردو کی پیدائش اس کی نشونما اور شعروادب کے بارے میں معلومات فراہم ہوئی ہیں۔ان کا ایک اوراہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک اہم مراٹھی تصنیف مسلم مجاہدین اور تحریک آزادی کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کروایا۔اس کے علاوہ ان کی کتابیں مینارہ نور، صدائے حق، مسلم پرسنل لا اور شیوا جی اور اورنگ زیب وغیرہ بھی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔آپ کی سیاسی،سماجی وادبی خدمات کے سبب آپ کو مختلف انعامات واعزازات سے نوازہ گیا۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

زندگی کیا ہے فقط اذن سفر اذن سفر
موت ایک حکم تحمل ہے ٹھہر جانے کا
جو رنگ ونسل ومذاہب کے فرق کم ہوتے
قسم خدا کی خدائی میں ہم ہی ہم ہوتے

ابراہیم فیضؔ کا پورا نام محمد ابراہیم عبدالرزاق مجاور ہے آپ ۱۵ جنوری ۱۹۳۳ کو میرج ،ضلع سانگلی مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔زمانہ طالب

علمی میں ہی شعروسخن کے عاشق ہوگئے اورفیض تخلص اختیار کیا۔ابتداء میں اصلاح سخن جناب حکیم سید عبدالباسط جوشؔ حیدرآبادی سے حاصل کی ۔آپ نے اردو فارسی اور ہندی میں ایم اے کی سند لی اور دکنی لوک ادب‘‘ پر مقالہ تحریر کیا جس کے لیے آپ کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔مہاراشٹر کے مختلف کالجوں میں آپ ہندی، اردو انگریزی اور فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے ملازم رہ چکے ہیں۔مختلف اداروں میں آپ اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر بھی فائض رہے۔پھرنوروزجی واڈیا کالج میں صدرشعبہ اردوفارسی اور ہندی میں مسلسل پچیس سال تک ملازمت کی اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔

آپ کی سب سے پہلی غزل ممبئی کے روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی جس کا مطلع یہ تھا۔

خدارا سلامت رہے درد الفت
یہی میری پونجی یہی میری دولت

آپ کی تصانیف میں آپ کا پہلا شعری مجموعہ ’’نگارش‘‘ کے نام سے ۱۹۸۸ میں شائع ہوا۔اس کے بعد ۱۹۹۱ میں ’’جل میرے چراغ جل‘‘ قومی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ دیونگری رسم الخط میں شائع ہوا۔اسی سال میں آپ کی تصنیف جوشرڈی کے سائیں بابا کی منظوم کہانی ہے گیت سائیں کے عنوان سے شائع ہوئی۔آپ کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ۱۹۹۴ میں ’’غزل میں نے چھیڑی‘‘ کے نام سے شائع ہوا۔فیض صاحب کی نثری تصانیف میں (۱) امیر خسرو سوانح حیات، راشٹروانی کی خصوصی اشاعت کی ادارت (۲) غزل نما سہ ماہی رسالے کی ادارت،جس کا ایک ہی شمارہ شائع ہوا۔(۳) حضرت پیر سید شمس الدین المعروف خواجہ شمناں میرا، میرج کی سوانح حیات (۴) میں غزل ہوں۔غزل کی تعریف اور تاریخ پر مسلسل مضمون پونے کے ہندی اخبار آج کا آنند میں شائع ہوا۔

شاعری کے علاوہ آپ نے ڈرامے کہانیاں، ادبی اور تخلیقی مضامین تحریر کے۔فلموں میں بھی گیت اور مکالمہ تحریر کئے آپ بنیادی طور پر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فطری طور پر کامیاب گیت نگار ہیں۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

موسم ہے لاجواب غزل کہہ رہا ہوں میں
ہے چاند پر شباب غزل کہہ رہا ہوں میں
دیکھیں کون دنیا کو روشنی دکھاتا ہے
تم دیے کرو روشن ہم بھی دل جلاتے ہیں

نور منیری آپ کا پورا نام قاضی عمر اور تخلص نورؔ تھا۔آپ کے والد کا نام الحاج ابراہیم منشی تھا۔آپ ۱۴ فروری ۱۹۳۴ کو ستارا مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔۱۹۶۰ کے قریب شعروسخن سے وابسطہ ہوئے۔اورمنیر الہ آبادی کے شاگرد ہوئے سلام بن رزاق اور انور قمر جیسے بلند پایہ افسانہ نگار اور حفیظ آتش جیسے شاعر کی صحبتوں نے نور صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ریلوے کی ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ادبی سرگرمیوں کو بھی قائم رکھتے رہے۔اور ملازمت سے سبک دوشی کے بعد صرف اور صرف شعر گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔

نور صاحب نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں طبع آزمائی کی۔آپ کا مجموعہ کلام بعنوان ’’یادوں کے زخم‘‘ ۱۹۹۸ء شائع ہو چکا ہے آپ کا کلام مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنتا رہا ہے۔ان میں توازن، شاعر، اسباق، قرطاس سخن ورکراچی، اصول، کاتب اور دوسرے رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔آپ کا دوسرا مجموعہ کلام ۲۰۰۴ء میں شہر کی فصیلوں سے کے نام سے شائع ہوا جس میں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۳ء تک کا

کلام شائع ہوا۔آپ نے بھی پونہ ہی میں انتقال فرمایا۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ساری دنیا جل رہی ہے اک ہوس کی آگ میں
ہم کسے آوازدیں اب جاکے انگاروں کے بیچ
میں تیز دھوپ کا بھٹکا ہوا مسافر ہوں
پکار دل سے کبھی شاخ سایہ دار مجھے
لوگ کچھ بولتے نہیں ڈر کے
بڑھ گئے حوصلے ستمگر کے

محی الدین کیفؔ کا پورا نام شیخ محی الدین حسین ہے آپ ۱۲/جنوری ۱۹۳۲ء کو جونا مودی خانہ کیمپ میں پیدا ہوئے۔آپ کی ابتدائی تعلیم مولیدینہ اینگلواردو اسکول اور بعد میں واڈیا کالج میں تعلیم حاصل کی۔آپ بطور سنیما مینیجر مقامات پر ملازم رہے۔اس کے علاوہ فارم سپروائزر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔۱۹۹۲ میں محکمہ رائے دہندہ میں بھی ملازمت کی۔آپ ابتدا ہی سے شعروسخن کے عاشقوں میں شامل ہیں اور ڈاکٹر امانت شیخ اورعزیز قیصری کے شاگرد ہوئے۔سادہ طبیعت کے مالک ہیں اور یہی سادگی ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔آپ نے غزل قطعات اور نعت گوئی میں طبع آزمائی کی ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دل میں عشق نبی گامزن ہے میرے
شکر اللہ کا کوئی وحشت نہیں
میرے آقانے ایسا کرم کردیا
اب کسی کے کرم کی ضرورت نہیں

سحرؔ جلگانوی پورا نام محمد یعقوب محمد اسمٰعیل ہے۔آپ ۱۶/اگست ۱۹۳۶ء کو جلگاؤں مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔۱۹۴۷ میں آپ اپنے والدین کے ساتھ پونہ آگئے۔فارغ تعلیم ہوکر فن کتابت کی طرف رخ کیا اور اسے اپنے لئے ذریعہ معاش قرار دیا ۱۹۵۲ء کے قریب ادبی دنیا میں شامل ہوئے اور مرحوم احسن رضوی اور عزیز قیصری کے شاگرد ہوئے۔اپنی ادبی خدمات کے سبب انہیں مختلف اکیڈمیوں اور اداروں کی جانب سے انعام واکرام سے نوازہ گیا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جب مصیبت کا وقت آتا ہے
راستے سارے بند ملتے ہیں
حدو د فن میں اب عیب وہنر دونوں برابر ہیں
زمانہ تو فقط معیار کی تعریف کرتا ہے

جلیلؔ الہ آبادی کا پورا نام عبدالجلیل والد کا نام محمد اسحاق اور تخلص جلیلؔ۔آپ ۲۲/اپریل ۱۹۳۷ء کو پھولپور الہ آباد میں پیدا ہوئے۔۱۹۶۰ء کے قریب ادبی دنیا میں داخل ہوئے آپ کے والد بھی شعروشاعری سے شغف رکھتے تھے والد کی صحبتوں میں آپ بھی شعروشاعری کی طرف مائل ہوئے۔قیام پونہ کے دوران پونے کے ادبی ماحول کو متاثر کیا۔آپ پونہ میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مشاعروں میں بھی بڑی خوشی دلی سے شرکت کرتے۔جس کے متعلق جناب نذیر فتح پوری اپنی تصنیف شرائے پونہ ایک تحقیق کے صفحہ نمبر ۳۲۶ پر لکھتے ہیں۔

''یہ واقعہ ہے کہ جلیل صاحب کے پونہ قیام کے دوران پونہ میں ادبی ماحول ہمیشہ گرم رہا۔ ایروڈا سے لے کر گنیش پیٹھ اور گنیش پیٹھ سے لے کر لشکر تک ایک زنجیر سی بندھی ہوئی تھی۔ ایک چنگاری سبھی کو دوڑائے پھرتی، راجندر سنگھ بیدی، مجروح سلطانپوری، عالم فتح پوری جیسے ادباء اور شعراء کو پونہ میں پہلی بار جلیلؔ صاحب ہی نے بلایا۔ کئی بڑے مشاعرے ان سے منسوب ہیں۔ آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ تحریر و تقریر جیسی صلاحیتوں سے تہی دامن ایک شخص نے پونہ کے ادبی ماحول کی نبض اپنی گرفت میں کیسے لے رکھی تھی۔ یقیناً یہ ان کا خلوص تھا ان کی ایمانداری تھی جس کی وجہ سے وہ ماحول پر چھائے رہے۔ اعتبار اور بھروسے کی تلاش میں سرگرداں ہر نظر جلیل صاحب کے دروازے تک آ کر رک جایا کرتی تھی۔'' (۱۲)

جلیل صاحب کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) لہو رنگ ۔۱۹۷۰ (۲) نئے زخم ۔۱۹۷۵ (۳) اڑان ۔۱۹۷۷ء (۴) چوراہا ۔۱۹۹۴ اور (۵) صدا بہ صحرا ۲۰۰۲ بعد میں آپ اورنگ آباد چلے گئے اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کس قیامت سے ہم گزرتے ہیں
سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں
اور کہتے ہیں کسے حوصلہ جینے کا جلیلؔ
وقت سے جیت نہ پایا تو میں ہارا بھی نہیں

حسن عباس فطرتؔ آپ ۳۰؍جون ۱۹۳۸ء کو قصبۂ ہلّور سادات ضلع سدھارتھ نگر یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام سید حسن عباس رضوی اور تخلص فطرت ہے۔ آپ ممتاز الافاضل اور ادیب کامل سند یافتہ ہیں۔ آپ سدھارتھ نگر سے ممبئی مہاراشٹر آ کر بس گئے۔ پھر پونہ گئے۔ آپ نے حصولِ معاش کے لئے امامت، خطابت، صحافت اور درس و تدریس کے پیشے اختیار کیے۔ آپ ایک ہفت روزہ اردو اخبار صداقت بھی شائع کرتے تھے۔

آپ کے مضامین کا مجموعہ بیاں اپنا کے عنوان سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے مضامین کے علاوہ غزلوں اور نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سحر تلک بھی میری آہ وزاریاں نہ گئیں
وہ آئے آ کے گئے بیقراریاں نہ گئیں
بتاؤ چارا گروہ اس کے بعد کیا ہوگا
اگر وہ آئے بھی اور بے قراریاں نہ گئیں

سید یوسفؔ پیرزادہ قادری پونے میں یکم جولائی ۱۹۴۰ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی پھر کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی زلف سخن کے عاشقوں میں شامل ہو گئے اور استاد شاعر رومیؔ کے شاگرد ہوئے۔ آپ قادریہ سلسلے سے وابستہ ہیں اور قادریہ سلسلے کی مشہور تصنیف ''گلزار قدیر'' میں آپ کا کلام شامل ہے۔ حیدرآباد کے اخباروں اور رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا ہے

۔آپ مشاعروں میں تحت اور ترنم دونوں ہی انداز میں بڑھتے ہیں سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔اسی لئے بے تکلفی سے کم ہی کام لیتے ہیں۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

زلف کا سایہ ہے اس کے رخ پہ لہرایا ہوا
دھوپ بھی نکلی ہوئی اور ابر بھی چھایا ہوا
کریں انسان کی خدمت کہ ہے یہ بندگی اپنی
کسی کے کام آجائے یہی ہے زندگی اپنی

رفیق جعفر ۱۴؍فروری ۱۹۴۵ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۷۲ء میں فکر معاش کے سلسلے میں ممبئی ہجرت کر گئے۔دنیائے اردو ادب میں آپ افسانہ نگار و شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔آپ کے افسانوں کا مجموعہ بعنوان البم ۱۹۸۰ء میں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں آپ کے افسانے اور کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔آپ نے ادبی صحافت میں بھی اپنے قلم کا جادو جگایا ہے اور کئی ادبی رسائل کے معاون اور نائب مدیر کے عہدے پر فائض رہ چکے ہیں۔آپ نے کلیات امین حزیں اور قاضی مشتاق احمد پر پی ایچ ڈی کے مقالے بھی تحریر کیے ہیں۔آپ نے فلموں میں بطور اسسٹنٹ رائٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھی کام کیا ہے اور فلموں کے لیے منظر نامے اور مکالمے بھی تحریر کیے ہیں۔

آپ کی غزلوں کا مجموعہ ''موسم سوچ نگر کا'' شائع ہو چکا ہے۔مجلسوں اور آل انڈیا مشاعروں میں اپنا کلام سنا چکے ہیں۔پچھلے کچھ عرصے سے آپ پونہ کے کلے گاؤں دھباڑے گاؤں میں مقیم ہیں اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں اپنا تعاون کر رہے ہیں نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

پھر زندگی کی فلم ادھوری ہی رہ گئی
وہ سین کٹ گئے جو کہانی کی جان تھے
جب دشمنوں کا کال پڑا میرے گاؤں میں
مجھ پہ میرے رفیق بڑے مہربان تھے
رستہ رستہ سناٹا ہے منزل منزل جائے کون
اپنی آنکھیں روشن رکھ کر یارو ٹھوکر کھائے کون

تسخیر فہمی کا پورا نام تسخیر احمد۔تسخیر تخلص تھا آپ کے والد منشی دبیر احمد خاں مرحوم تھے۔آپ ۱۹؍دسمبر ۱۹۴۰ء کو قصبہ اوجھاری تحسیل حسن پور ضلع مراد آباد یو پی میں پیدا ہوئے۔آپ نے عالم فاضل دینیات فاضل طب ،منشی کامل ،محکمہ تعلیم یو پی فاضل دار العلوم دیو بند ادیب ماہر ادیب کامل جامعہ اردو علی گڑھ فاضل طب و جراحت (B.I.M.S.) ریگزامیگ باڈی آیورویدک اینڈ یونانی سسٹم دہلی سے تعلیم حاصل کی۔

۲؍مارچ ۱۹۹۲ء میں یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہسپتال پونہ میں پرنسپل کے عہدے سے منسلک ہوئے۔ساٹھ سال کی عمر میں ۳۱؍دسمبر ۲۰۰۰ء کو اپنے کام سے سبکدوش ہوئے۔آپ رہنمائے تعلیم دہلی (آف لاہور) کے معاون مدیر بھی رہے۔۱۹۷۲ء میں ابر صاحب کے انتقال کے بعد آپ اسی رسالے کے مدیر اعلی کے عہدے پر فائز ہوئے۔

شاعری میں آپ نے مرحوم حضرت ابر احسنی گنوری کو استاد تسلیم کیا۔۱۹۷۰ کی دہائی میں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل و جرائد میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔جن میں شمع دہلی ،اور شاعر ممبئی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔آپ کی تصانیف مبادیات منطق و فلسفہ اور

کلیات امور طبیعہ بی یو ایم ایس کے نصاب میں شامل ہیں۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

بس اس خطا پہ کہ شیوہ ہے میرا حق گوئی
صلیب تاک میں، زنداں مری تلاش میں ہے
لوگو !تمہاری غیرت احساس کیا ہوئی
ہنستے ہیں بے بسوں پہ مگر اس قدر نہیں

شیخ عثمان ثاقبؔ پونوی کا پورا نام شیخ عثمان اشرف انعامدار تھا۔آپ کی پیدائش یکم مئی **۱۹۱۹ء** میں کوسٹر گاؤں تعلقہ جام کھیڑ ضلع احمد نگر میں ہوئی ۵ سال کی عمر میں والدین کے ساتھ پونہ آ کر مقیم ہوئے۔یہیں اردو سے تعلیم حاصل کی اور''فوٹو زنکو''میں ملازمت حاصل کر لی۔

ثاقب صاحب کے بڑے فرزند کا انتقال محض ۱۷ سال کی عمر میں ہو گیا جس کی وجہ سے انہوں نے ہر خوشی سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔آپ کا کلام آپ کی ڈائری میں ہی محفوظ ہو کر رہ گیا شائع نہ ہوسکا۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کہیں غنچے کہیں شبنم کہیں آہیں کہیں آنسوں
تمہارے حسن دلکش کا اثر سارے جہاں پر ہے
خس وخاشاک سے تعمیرِ خرمن ہوگئی لیکن
سنا ہے پھر نظر برقِ تپاں کی گلستاں پر ہے

یوسف ندیمؔ کا پورا نام محمد یوسف اور ندیمؔ تخلص ہے۔آپ کے والد کا نام عبدالشکور تھا۔۱۴ رنومبر **۱۹۴۷ء** کو پونہ میں پیدا ہوئے۔بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا لیکن ۱۹۸۰ سے سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوئے۔شاعری میں کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا۔آپ نے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔آپ نے نثر میں بھی اپنے قلم کا جادو جگایا اور افسانے مضامین بچوں کے مقابلے کے لیے تقاریر وغیرہ تحریر کیں۔ان کی غزلوں کا مجموعہ ''پر پرواز'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔آپ نے جاسوسی ناول بھی تحریر کیے ہیں۔آپ کو اپنی ادبی خدمات کے سبب ۱۸ انعامات واعزازات سے نوازہ جا چکا ہے جن میں پونہ میونسپل کارپوریشن کا گروید انعام بھی شامل ہے۔آپ کا لہجہ شریں اور زبان فصاحت سے لبریز ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رعب پڑتا نہیں ہے ناموں سے
لوگ پہچانتے ہیں کاموں سے
تہہ بہ تہہ بے شمار چہرے ہیں
لوگ اس فن میں کتنے گہرے ہیں

ابراہیم آمرؔ کا پورا نام ابراہیم خان اور تخلص امر ہے۔آپ ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۴۹ کو پونہ میں پیدا ہوئے انگریزی میڈیم سے تعلیم حاصل کی اور بی کام تک پڑھائی کر کے بینک میں ملازم ہو گئے۔انگریزی میڈیم کے طالب علم ہونے کے باوجود آپ نے اردو شاعری میں دل چسپی دکھائی ۱۹۶۹ء میں امر نے ایک افسانہ ہندی رسم الخط میں تحریر کیا تھا جسے نذیر فتح پوری نے ''بڑا آدمی'' اردو میں ترجمہ کیا۔یہ افسانہ ماہ نامہ'' شاعر'' میں شائع ہوا'' شاعری پونے چی'' میں آپ کی چند غزلیں شائع ہو چکی ہیں نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سپنے یہ سہانے ہیں بکھر کیوں نہیں جاتے
دنیا کی حقیقت میں اتر کیوں نہیں جاتے
تھی کبھی میری ادا سب سے الگ سب سے جدا
کیوں بدلتے وقت کی مجھ کو صدا ہونا پڑا

سید آصف ۳؍اکتوبر ۱۹۴۸ء کو قصبہ پیٹھ پونہ میں پیدا ہوئے۔آپ کا پورا نام محمد حسین ہے۔۱۹۶۰ میں شاعری کے میدان میں داخل ہوئے تو اردو سے رابطہ پڑا اور اردو سیکھنے لگے پہلے پہل منظر صدیقی سے اصلاح سخن کرتے رہے پھر بعد میں شوکت حسین عکسی برنی میرٹھی کے شاگرد ہوئے۔آپ ہمیشہ خانہ بدوشی کے جال میں پھنسے رہے۔اسی لئے شاعری کو کبھی سنجیدگی سے اختیار نہیں کیا۔آپ نے افسانے ڈرامے اور مضامین بھی تحریر کیے۔آپ نے ساحر کی نظم ''پرچھائیاں'' کو ڈرامے کے قالب میں ڈھالا اور مراٹھی ڈرامہ ایک پیالہ کو اردو میں ایک ہی جام کے نام سے ترجمہ کیا۔آپ سے پونہ کے اردو شاعروں کا ایک انتخاب مراٹھی زبان میں شائع کیا اس انتخاب کی اشاعت میں جناب سریش چندر سورت والا کا بھی پورا پورا تعاون تھا۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سچ اگلتا تھا مگر کڑوا سچ
زہر اس نے بھی پیا تھا شاید
ہیں زندگی کے اب بھی مسائل وہی جو تھے
عرفان و آگہی کے سرابوں سے کیا ملا

حسن خان اشرقی آپ کا پورا نام محمد حسن خان والد کا نام محمد قاسم خان تخلص اشرقی، پیدائش ۴؍جون ۱۹۵۰ء کو پونہ میں ہوئی ابتدائی تعلیم مولیدینہ ہائی اسکول میں ہوئی۔ایس ایس سی کرکے بھارت سنچار نگم میں ملازم ہوگئے۔۱۹۸۰ء میں اردو شعروسخن کی دنیا سے وابسط ہوئے۔آپ نے اپنے والد کی نصیحت کے سبب میلادخوانی کی طرف توجہ کی اور اسی لیے نعتیہ کلام کو بے حد پسند کرتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہو۔

حمد کے لائق ہے تیری ذات اے رب قدیر
تیری رحمت سب پہ ہے اے مالک ہر دوجہاں
طلب تھی اس کی رضا تھی ان کی اٹھا جو پردہ تو دیکھا کیا کیا
نبی نے اپنے خدا کا جلوہ خدا نے اپنے نبی کی صورت

تاج الدین تاج پورا نام محمد تاج الدین ہے۔آندھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر میں ۱۹۵۸ء میں پیدا ہوئے والد کا نام عبدالنبی تھا۔آپ درجہ چہارم تک ہی تعلیم حاصل کرسکے۔پھر تلاش معاش پونہ لے آئی۔اس کے بعد احمد آباد کی طرف روانہ ہوئے۔قیام احمد آباد کے دوران آپ شرر سلطان پوری، قیوم کنول، قمر رامپوری شریف دہلوی کی صحبتوں نے شعروشاعری کا شوق پیدا کیا۔پھر جب اپنے وطن لوٹے تو ظہیر ناصری کو اپنا استاد تسلیم کیا پچھلے تیس سال سے آپ پونہ میں آباد ہیں اور یہاں شرر شیوگانوی کو اپنا کلام دکھاتے ہیں آپ پونہ کی محفلوں اور مشاعروں میں بھی بڑی خوش دلی سے شرکت کرتے ہیں آپ کی شاعری سادگی سے لبریز ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہمارے جرم کا اعلان ہوگا
تو کتنا خوش دل نادان ہوگا

دن کٹے ہے نہ میری رات کٹے
بن ترے کس طرح حیات کٹے

جمشید عالم فتح پوری یوپی کے گاؤں فتح پور میں ۱۹۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ بہت عرصے پہلے روزگار کے سلسلے میں پونہ آ کر بس گئے۔ اور یہاں کے ادبی ماحول میں رچ بس گئے۔ آپ ہر موضوع پر بآسانی شاعری کر لیتے ہیں پھر چاہے وہ ادبی ہو۔ سیاسی ہو سماجی ہو یا کوئی اور۔ غزل میں آپ کا ایک منفرد انداز بیان ہے جس میں دل کے احساسات کو سادہ اور دلکش زبان میں بیان کر لیتے ہیں۔ طنز و مزاح میں بھی آپ نے اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی تصنیف ''میری سوتن بن گئی لاٹری'' شائع ہو چکی ہے آپ کی دوسری تصانیف تیسری بیوی کی تلاش اور گھر کی مرغی دال برابر ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ آپ کی غزلوں سے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

فیض ہے میرے بزرگوں کا یہ مجھ پر عالم
سو جھکاتا ہوں تو اونچا مرا سر لگتا ہے
اشک آنکھوں میں نہ دامن میرا تر لگتا ہے
غم کے سہنے کو بھی پتھر کا جگر لگتا ہے

ریاض بجنوری ۱۹۵۵ء میں کوٹرہ نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ پورا نام محمد ریاض ہے۔ والد کا نام کریم بخش انصاری ہے گھریلو حالات نہ سازگار تھے اور اسی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ گئے اور مکتبی تعلیم پر ہی اکتفہ کرنا پڑا۔ اس کے بعد پونہ میں آ کر مقیم ہوئے اور تلاش معاش میں مصروف ہو گئے ۱۹۸۵ء میں شاعری کی ابتداء کی اور نذیر فتح پوری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ کو مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ اور قرآن و احادیث کی کتابوں کو اولیت دیتے ہیں۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ آزاد غزل ماہیہ اور کہہ مکرنیاں بھی آپ نے خوب کہی ہیں۔ خاموش طبیعت کے مالک ہیں۔ مشاعروں میں بھی دھیمے لہجے میں غزل سناتے ہیں۔ اسباق اور توازن جیسے اہم رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۹۹ء میں اکرام کے نام سے نعت کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں دلدار ہاشمی نذیر فتح پوری اور آپ کا نعتیہ کلام شائع ہوا۔ نثر میں آپ نے انشائیے خاکے اور توصیفی مضامین لکھنے کی کوشش کی ہے۔

ریاضؔ شعر کی تخلیق میں بہت عرق ریزی سے کام لیتے ہیں ریاض کے متعلق ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا خیال ہے کہ۔

''حسرت موہانی کی طرح ریاض بجنوری کی زندگی ایک طرفہ تماشا ہے دن بھر بیکری کی مکشقت شام کے بعد میخانہ شعر و سخن کا طواف نئے نئے امکانات کی کھوج نئے نئے جہانوں کی تلاش شعر کی تخلیق کو نئے سانچوں میں ڈھال کر پیش کرنا اور نتیجہ میں ایسے اشعار سے مالا مال ہونا یہ ریاض کے روزمرہ میں شامل ہے۔'' (۱۳)

ریاض نے اس شعر و سخن کے سمندر میں خوب غوطے لگائے اور اس گہرائی سے ان کے ہاتھ یہ نگینے لگے۔

ہم نے ریاض اکثر دیکھا ہے زندگی میں
آ آ کے ڈوبتی ہیں ساحل پہ کشتیاں بھی
عدالتیں تو فقط فیصلوں کے حق میں ہے
بلا سے جرم کسی کا کسی کے سر جائے

سید عقیلؔ کا پورا نام سید عقیل ہے والد کا نام سید عظیم۔ پیدائش ۹ر نومبر ۱۹۵۲ء کو پونہ میں ہوئی آپ نے بی ایس سی، بی اے آر ایم بی، بی

اے تک تعلیم حاصل کی اوراس کے بعد وکالت کی ڈگری بھی حاصل کی گزشتہ کئی برسوں پہلے شعروشاعری کی دنیا میں داخل ہو چکے ہیں۔انگریزی کے طالب علم ہونے کے باوجود اردو سے آپ کو بے حد محبت ہے۔آپ نے ۱۲/جنوری ۱۹۹۲ء میں پہلی بار اسباق کے مشاعرے میں غزل پڑی تھی۔آپ نے اپنی چند غزلوں پر مرحوم رشید اعجاز سے مشورہ سخن بھی کیا تھا چند اشعار ملاحظہ ہو۔

ساتھ لائے ہو مقدر ساتھ لئے جاؤ عمل
آئینے میں عکس پرکھا بندگی میں ہے شگاف
خوشی کو جو اداسی سے مخاطب کرکے جیتے ہیں
جواز نقش پا کی پھر سروری پر پڑا پردہ

مشتاق مدنی کھڑکی پونہ میں ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مولیدینہ ہائی اسکول میں ہوئی۔پھر پونہ کالج سے بی اے کی سند حاصل کی۔زمانہ طالب علمی سے ہی علم وادب کے شوقین رہے ہیں۔سب سے پہلے معنی افسانے سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔آپ نے شخص خاکے بھی لکھے ہیں۔اس کے علاوہ سیاسی موضوعات پر مضامین بھی لکھے ہیں۔جو روزنامہ انقلاب ممبئی اور روزنامہ اردو ٹائمز میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔آپ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۹۱ء میں کونپل عنوان شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔آپ کی تنقید کی ایک خوبی یہ ہے کہ آپ کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کردیتے ہیں۔طنز ومزاح کے میدان میں بھی آپ پیچھے نہیں رہے شاعری میں کچھ غزلیں کہیں پھر اس کے بعد نثری نظموں میں طبع آزمائی کی۔

آپ نے ایک پندرہ روزہ اردو اخبار اصول بھی جاری کیا اس اخبار کے ذریعہ آپ کی صحافت نگاری پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اس اخبار کے ادارے کے لئے مدنی صاحب نے بہت سے انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں بھی مضامین لکھے پونہ کے اس اخبار نے یہاں کی صحافت کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔آپ کی صحافتی خدمات کے سبب ۲۰۰۲ میں آپ کو مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی جانب سے صحافتی ایوارڈ عطا کیا گیا۔اس کے علاوہ ۷ دسمبر ۲۰۰۳ میں انجمن ترقی اردو ہند کی پونہ شاخ کی جانب سے امین ادب کا اعزاز دیا گیا آپ کے ادبی مضامین کا مجموعہ بھی صدا بہ صحرا کے نام سے شائع ہوکر چکا ہے۔آپ مذاہب کے تقابلی مطالعے کے شوقین ہیں دلائل وشوہد کی بنا پر اپنی بات منوانے کا ہنر رکھتے ہیں۔آپ کی ایک اور تصنیف P. A. Inamdar a living legend انگریزی زبان میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔آپ کی نثری نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

زندگی! زندگی
چند سانسوں کا ہجوم
چند آشنا نا آشنا چہروں کی بھیڑ
کچھ قہقہے، خوش گپیاں
خوش فہمیاں فریبیاں
کچھ جال سازشوں کے
چند وعدے بھلا دینے کے لئے

ہر اک بندھن مڑا تڑا

ہر اک رشتہ کٹا پھٹا

زندگی کا ہے مفہوم

جسم و جاں کا درمیانی خلاء

اڑیل سوچ کا ان چاہا مبہم سلسلہ

پھر کروں کیوں میں آس

دوسرے جنم کی

چند سانسوں کا ہجوم

چند آشنا نا آشنا چہروں کی بھیڑ

حسام الدین شعلہ کا پورا نام شیخ حسام الدین ہے والد کا نام ہاشم اور تخلص شعلہ اختیار کیا۔ آپ ۲؍ مئی **۱۹۶۲ء** میں منگلوار پیٹھ پونہ میں پیدا ہوئے۔ **۱۹۸۰ء** میں شعر و سخن کی دنیا میں شامل ہوئے۔ سید آصف سے شرف تلمذ حاصل کیا آپ نے اسٹیج پر اداکاری بھی کی ہے اس کے علاوہ ٹیلی فلم اور سیریل میں بھی اداکاری کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ شعر کہتے وقت شاعری کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں اور اپنا کلام تحت اللفظ میں سناتے ہیں نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جو بھی ہونا تھا ہوا اب بھلا روتا کیا ہے
خود کو تو غم کے سمندر میں ڈوبتا کیا وہے
اک شناسا نے جو پوچھا میاں کرتے کیا ہو
عاجزاً میں نے کہا عشق میں ہوتا کیا ہے

شبیہ احسن کاظمی ۱۳؍ فروری **۱۹۶۳ء** میں رسول پور دھولڑی ضلع میرٹھ یوپی میں پیدا ہوئے آپ نے ادیب کامل فاضل بی اے ایم ایس آلہ آباد ایم اے تک تعلیم حاصل کی **۱۹۸۰ء** سے آپ شعر و سخن کی دنیا کو اپنے اشعار سے آراستہ کر رہے ہیں۔ جناب افضال سرسوی آپ کے استاد ہیں۔ پاپولر میرٹھی، انور حسن انور، احمد علوی، عرفان اعظمی اور دیگر اصحاب کے ساتھ آپ کے ادبی مراسم رہے ہیں ابتداء میں آپ نے افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور محبت کا حمالہ شبنم کے آنسو دولت کی پجارن افسانے تحریر کیے۔ آپ کے نوحوں کا مجموعہ دعوت غم **۱۹۸۲ء** میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ آپ کا کلام آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے بھی نشر ہو چکا ہے۔ آپ نیشنل اور انٹرنیشنل مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنا چکے ہیں **۱۹۸۶ء** میں آپ پونہ آ کر آباد ہو گئے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

مفلسی میں تیرا ممنون رہوں گا ہردم
تو نے انسان شناسی کا ہنر بخشا ہے
بس اس خطا پہ اندھیرے دیے زمانے نے
کچھ اندھے لوگوں کو رستہ بتا رہا تھا میں

لطیف جوہر کا پورا نام عبداللطیف خان ہے ۲۹ راگست ۱۹۴۷ء کو پونہ میں ہی پیدا ہوئے ۔عربی اور اردو کی تعلیم حاصل کر کے عالم کا کورس کیا اور امامت کرنے لگے ۔پھر امامت چھوڑ کر شعر وسخن کی طرف مائل ہوئے اور شعر وشاعری میں مصروف ہو گئے ۔پھر اسی زندگی سے بھی دل بھر آیا اور اس کوچہ کو خیر آباد کہہ کر ضروریات زندگی کی حصولگی میں مشغول ہو گئے ۔ابھی کچھ عرصے سے واپس شعر وسخن کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے ہیں اور شاعری پر توجہ کرنے لگے ہیں ۔قطعہ ملاحظہ ہو ۔

خود پر جب بھی سوچا ہے
رشتہ رشتہ الجھا ہے
بیت گیا جو اپنا تھا
باقی سب تو سپنا ہے

متین انصاری کی پیدائش پونہ میں ۱۹۶۷ء میں ہوئی بی اے تک تعلیم حاصل کی قریباً تیرہ سال کے تھے تب سے شعر وشاعری سے وابستہ ہوئے اور زاہد کمال صاحب کو اپنا استاد بنایا۔فن کتابت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا آپ نے تبصراتی مضامین بھی تحریر کئے ہیں ادبی محفلوں میں نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں آپ نے مراٹھی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا ہے جو کینوس کے نام سے شائع ہوا۔اشعار ملاحظہ ہو ۔

پر کٹ چکے تھے اڑنے کی طاقت وہی رہی
تجھ سے بچھڑ کے ملنے کی حسرت وہی رہی
صدا ازان کی جب مسجدوں سے آتی ہے
گمان ہوتا ہے خوشبو گلوں سے آتی ہے

عطار مہر ذوالنہری کا پورا نام غلام حسین ہے مولید ینہ ہائی اسکول میں استاد تھے ۔۱۹۸۰ء میں شعر وادب کی دنیا وابستہ ہوئے ۔آپ اسباق ٹرسٹ کے رکن بھی رہے اپنی زندگی کے نشیب وفراز سے جنگ جیت کر تجارت میں مشغول ہو گئے ۔۱۹۸۵ء میں جب اسباق ٹرسٹ ختم ہو گیا تو آپ بھی ادبی سرگرمیوں سے الگ ہو گئے اور عمارت سازی کے کام کو اپنا پیشہ بنایا۔اپنے مختصر ادبی سفر میں عطا مہر نے غزل آزاد غزل آزاد نظم اور رباعی وغیرہ میں طبع آزمائی کی ۔چند اشعار ملاحظہ ہو ۔

پایا ہے قلم تو نے تو اعجاز دکھا
رکھتا ہے اگر ساز تو آواز سنا
مدفن ہے ارماں کی بستی ڈھائی قسمت نے دیوار
پھر امیدوں کے ملے جلے سے چمکیلے احساس جگا

یہ پونہ کی وہ اہم علمی وادبی شخصیات ہیں جن کی صحبت میں نذیر نے شاعری کے چراغ روشن کیے۔اورادبی دنیا کا سہانا سفر طے کیا۔علاوہ ازیں اردوادب میں ناقابل فراموش مقام بھی حاصل کیا پونہ کی سرزمیں نذیر کی احسان مند ہے کیوں کہ نذیر نے یہاں کی ادبی محفل میں نئی روح پھونک دی۔

☆☆☆

حوالہ جات

باب دوم

نمبرحوالہ	کتاب کا نام	صفحہ نمبر	مصنف	سن اشاعت
(۱)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	30	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۲)	سہ ماہی اسباق پونہ	24	مدیر نذیرؔ فتح پوری	اپریل تا جون ۲۰۱۳
(۳)	سہ ماہی اسباق پونہ	23	مدیر نذیرؔ فتح پوری	اپریل تا جون ۲۰۱۳
(۴)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	108	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۵)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	82	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۶)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	99	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۷)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	115	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۸)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	122	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۹)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	124	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۱۰)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	125	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۱۱)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	151	نذیرؔ فتح پوری	1995
(۱۲)	شعرائے پونہ ایک تحقیق	326	نذیر فتح پوری	2005
(۱۳)	شعرائے پونہ ایک تحقیق	355	نذیر فتح پوری	2005

☆☆☆

بابِ سوم

نذیرؔ فتح پوری بحیثیت شاعر

نذیرؔ فتح پوری کی غزل گوئی

اُردو غزل دنیائے شعروشاعری کا گراں قدر سرمایہ ہے اور عالمی ادب کا بیش قیمتی اثاثہ ہے۔اسی لیے رشید احمد صدیقی نے اسے ''اردو شاعری کی آبرو''،فراقؔ گورکھپوری نے''اردو شاعری کا عطر''،مجنوںؔ نے''اردو کی پاکیزہ صنف''،نیاز فتح پوری نے''موسیقی کا رس''اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے''اردو شاعری کی عظیم اصناف''قرار دیا۔غزل کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کوئی بھی بڑا نقاد غزل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

غزل کی اس مقبولیت کے ساتھ اس کی مخالفت بھی اکثر و بیشتر ہوتی رہی۔حالی اور محمد حسین آزاد کی تحریک کے زیرِ اثر حالی کو''مقدمہ شعر وشاعری''میں اپنے عہد کے مخصوص حالات کی بدولت شاعروں کو غزل سے دور رہنے کا مشورہ دینا پڑا۔عظمت اللہ خان نے غزل کی گردن بے تکلف مار دینے کی سفارش کی تھی۔اور ہمارے نقاد کلیم الدین احمد صاحب نے تو غزل کو ایک''نیم وحشی صنفِ سخن''قرار دیا تھا۔

ان مخالفتوں کے باوجود یہ کہنے میں زرا بھی جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ غزل اس تمام تر ردّ و قبول کے باوجود بڑی خاموشی سے اپنا سفر طے کرتی رہی۔غزل کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟اس کی تاریخ کیا ہے؟اس کے لفظی اور لغوی معنی کیا ہیں؟اور وہ کونسے عناصر ہیں جن کی بدولت غزل کے درخت میں،موسم کے تمام سرد و گرم کے باوجود نئے پتے اور پھول کھلتے رہے۔اس عہد میں بھی جب حقیقت نگاری کو شاعری کا اہم جزو مانا گیا۔اور شاعری کو عام انسانوں کے قریب لانے کی کوشش کی گئی اور جب اردو کا مقبول ترین غزل گو شاعر جگر مرادآبادی یہ کہنے پر مجبور ہوا۔

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اُس عہد میں بھی غزل اپنی آب و تاب و توانائی کے ساتھ اپنا سفر طے کرتی رہی تھی۔اور جب ہم موجودہ عہد کی غزل کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام تر شور شرابے کے باوجود ذرا سی دھند چھٹتے ہی ان غزل گو شعراء کے چہرے ہمارے سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے غزل کی مخالفت کے زمانے میں بھی غزل کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔غزل کے دامن کو مالا مال کیا،غزل کو نئے موضوعات سے سجایا۔اظہار و اسلوب کے نئے زاویوں سے غزل کو سنوارا۔

عام طور پر غزل میں عاشقانہ مضامین کو جگہ دی جاتی ہے اس لیے غزل پر شدید حملے بھی ہوئے۔اور غزل کی شاعری کو محدود موضوعات کی شاعری قرار دیا گیا۔لیکن وقت اور حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ غزل کی شاعری محدود نظریات خیالات اور احساسات کی شاعری نہیں بلکہ بیشتر ناقدین متفق ہیں کہ غزل عاشق و معشوق کے مکالمے ہی سے عبارت نہیں ہے بلکہ غزل نے تمام نازک لطیف اور مختلف احساسات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ بلکہ یوں کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ غزل مختلف جذبات و احساسات کا رنگین اور فکری گلدستہ ہے۔ایک زمانے تک غزل کو داخلی جزئیات بیان کرنے کی ضد میں گھسیٹا جاتا رہا یعنی کچھ لوگ چاہتے تھے کہ غزل محض ہمارے داخلی جذبات کی عکاسی کر سکتی ہے۔لیکن بعد کے شعراء نے یہ بات ثابت کر دی کہ غزل محض نہ داخلی ہے نہ خارجی بلکہ وہ ہمارے تمام تر،نفسیاتی رومانی تہذیبی احساسات کی ترجمان بن سکتی ہے۔

مطلع،ردیف،قافیہ،بحر،صنعتوں کا استعمال،تشبیہ استعاروں اور محاوروں کے استعمال سے غزل میں رمز و ایمائیت پیدا ہوتی ہے فصاحت و بلاغت سے نئے دروازے کھلتے ہیں اور شاعر اپنے فکر و احساسات کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔سماج کے دکھ درد اور اس کی خوشیوں کو اپنے مخصوص لب و لہجے میں ڈھال کر اور غزل کا ایسا منظر نامہ تیار کرتا ہے کہ اس کا ذاتی غم بھی معاشرے کے ہر فرد کو اپنا لگتا ہے۔میر تقی میرؔ کی شاعری اس کی سب سے بہترین مثال ہے۔غزل کے انہیں محاسن اور عناصر سے غزل میں تاثر پیدا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر

جانے کے بعد بھی غزل اسی طرح مقبول ہے جیسی قدیم زمانے میں تھی، زمانے کے سرد وگرم بھی غزل کی مقبولیت کو کم نہ کر سکے۔اوراس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ غزل کا شاعر، غزل کو زمانوں کے مطابق ڈھالنے کے ہنر سے واقف ہے۔اسی لئے غزل نے ہر طرح کے موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دی۔قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر میر تقی میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، آتشؔ، ناسخؔ، اور داغؔ دہلوی، کے ادوار سے گزرتی ہوئی یہ عروس غزل نذیرؔ فتح پوری کے زمانے میں بھی ترقی کا لباس پہن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔اور زندگی کی بھرپور عکاسی کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔اور نہ صرف علاقائی، ملکی، بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کے شیدائیوں کی تعداد میں لگا تار اضافہ ہو رہا ہے۔

علاقائی سطح پر جب راجستھان میں اردو غزل کا جائزہ لیتے ہیں۔تو ۷۰ کی دہائی کے بعد ابھرنے والے غزل گو شعراء میں نذیرؔ فتح پوری اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ان کی غزل گوئی کا سفر روایتی انداز میں ہی شروع ہوا لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی فکر کے دھاروں کو جدید حساسیت کی جانب موڑ دیا۔اور اپنے پیش رو شعراء میں کسی کی بھی تقلید نہ کرتے ہوئے انہوں نے غزل کے میدان میں اپنا الگ راستہ تلاش کرنے کی شعوری کوشش کی۔ان کی مسلسل کوششوں اور کاوشوں نے انہیں غزل کے حوالے سے نو بہ نو جہانوں کی سیر کرائی اور پردۂ کائنات میں پوشیدہ بہت سے راز ہائے سربستہ ان کے سامنے واہوتے چلے گئے۔

نذیرؔ کی غزلوں کا سب سے پہلا مجموعہ ’’لمحوں کا سفر‘‘ ہے جو ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ ۱۰۵ غزلیں شامل ہیں۔ مجموعہ کی پیشانی پر ہی غروب ہوتا آفتاب دکھائی دیتا ہے۔شام کی تنہائی میں آسمان میں ایک اکیلا پرندہ محوِ پرواز ہے جو شاید شام ہو جانے کی وجہ سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔اور پانی میں ایک اکیلی ناؤ تیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس کا پیش لفظ ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ نے تحریر کیا ہے۔جو تفصیلی انداز میں لکھا گیا ہے۔بعدازیں ’’نذیرؔ فتح پوری کا فن از مناظر عاشق ہرگانوی‘‘ اور نذیر۔ایک تاثر از ایم یوسف ندیم شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جناب مظہر امام، جناب ظہیر غازی پوری اور ان کے استاد عتیق احمد عتیق کی گراں قدر رائے بھی شامل کی گئی ہے۔اس مجموعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب عصمت جاوید شیخ فرماتے ہیں۔

> ’’مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نذیرؔ فتح پوری کا شعری مجموعہ ’’لمحوں کا سفر‘‘ نئی غزل کے تخلیقی سفر کا وہ نشانِ منزل ہے جہاں اس نے اپنے آپ کو بڑی حد تک پا لیا ہے۔اس مجموعہ میں آپ کو نہ تو اعصابی تشنج ملے گا، اور نہ فنی ولسانی کرتب بازیاں نہ مبہم اور کثیر الفہم علامتیں ملیں گی، نہ ژولیدہ بیانی، نہ قدیم اساطیر میں سکون تلاش کرنے کا رجحان ملے گا، نہ جنگل کی تہذیب کی طرف مراجعت کرنے کی کوشش، نہ خور ترحمی ملے گی، نہ خودکشی کا ارادہ پورا مجموعہ کلام پڑھ جائیے، آپ کو نذیرؔ کی غزلیں نئی اور غزل کے ابتدائی خس وخاشاک سے پاک نظر آئیں گی آپ کو ان غزلوں میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت کی موجودگی کا احساس ہوگا۔ایک ایسی فضا ملے گی جس میں بظاہر تو بڑا سکون ہے لیکن جو تناؤ سے بھری ہوئی محسوس ہوگی۔سمندر کی سطح پر آپ کو کوئی طوفان نہیں ملے گا، لیکن اس کی تہہ نشین موجوں میں مسلسل اضطراب کی موجودگی کا احساس ہوگا۔نذیرؔ کی غزلوں میں ذاتی محرومیوں کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔‘‘ (۱)

جناب بلراج کومل نذیرؔ کی شاعری پر اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط جو انہوں نے ’’لمحوں کے سفر‘‘ کی

رسید کے طور نذیؔر کو ارسال کیا تھا میں لکھتے ہیں۔

''آپ کا کلام میں رسائل میں دیکھتا رہتا ہوں۔ایک ساتھ بہت سی چیزیں پڑھیں تو طبیعت سرشار ہوگئی۔
آپ کے کلام میں ایک آزاد اور کھلی فضا کی کیفیات ہیں۔آپ منجمد اور مصنوعی سلاسل سے آزاد ہیں۔'' (۲)

''لمحوں کا سفر'' پر اپنی رائے تفوض کرتے ہوئے جناب وارث علوی فرماتے ہیں۔

''آپ میں شعر گوئی کا ملکہ قدرت کا عطیہ ہے۔زیادہ فکر سخن اور استاذہ کے گہرے مطالعے سے آپ کی سخن طرازی میں زیادہ عمق اور وسعت پیدا ہوگی۔'' (۳)

جناب ابنِ فضا فیضی اپنے ایک خط جو انہوں نے نذیؔر کو ''لمحوں کا سفر'' کی رسید کے طور پر ارسال کیا تھا میں ان کی شاعری پر اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں۔

''بلا شبہ تہذیبی تسلسل کے کہکشاں زار سے جگنوؤں کے شبستان تک، نیم روشن دائروں کا ایک حسین سلسلہ ہے۔جس سے ''لمحوں کا سفر'' عبارت ہے۔'' (۴)

سفر تا سفر نذیؔر فتح پوری کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو جولائی ۱۹۹۱ء میں ''اسباق'' پبلی کیشنز پونہ سے شائع ہوا۔اس کی اشاعت میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ نے مالی تعاون بھی دیا۔کتاب کی شروعات نذیؔر نے اپنے ایک شعر سے کی۔شعر ملاحظہ ہو۔

میں روشنی کی کتابوں کا اک مصنف ہوں
سیاہیوں کے پیمبر مجھے تلاش نہ کر

کتاب کا انتساب نذیؔر نے ''ماہر غالبیات علامہ کالی داس گپتا رضا'' کے نام کیا ہے۔بعد ازیں ''حرف چند'' کے عنوان سے پروفیسر نثار احمد فاروقی کا گراں قدر مضمون شامل ہے، جو مجموعہ کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے اس مضمون میں فاروقی صاحب نے نذیؔز کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اپنی رائے تفویض کی ہے جو نہایت متوازن اور اعتدال لیے ہوئے ہے۔

مضمون کے بعد حمد مناجات اور نعت پاک شامل ہے۔اللہ و رسولؐ کی مداح کے بعد نذیؔر نے اپنا ''تعارف'' شامل کیا ہے۔جس میں اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی گہر کشائی کی ہے۔اس کے بعد کل ۸۵ غزلیں شامل ہیں جن میں سینکڑوں مضامین بیان کئے گئے ہیں ۱۱۲ رصفحات پر مشتمل یہ مجموعہ اپنے شعری محاسن کے سبب اہمیت کا حامل ہے اور ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔

خوبصورت سرِ ورق کے فلیپ پر علامہ کالی داس گپتا رضا اور جناب وارث علوی کی بیش قیمتی آراں بھی آویزاں ہیں۔نذیؔر کے اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی کا خیال ہے۔

''نذیر فتح پوری کا تازہ مجموعہ ''سفر تا سفر'' ایک ایسا ہی مجموعہ ہے جسے آپ محض تفنن طبع بھی نہیں کہہ سکتے یہ صرف ذات کا نوحہ بھی نہیں ہے نہ اپنی شخصی ناکامیوں اور محرومیوں کا مرثیہ ہے، بلکہ اس میں ان کی ذات ایک ایسا وسیلہ بن گئی ہے جس سے ہم ان کے عہد تک پہنچ سکتے ہیں۔اور اس عہد کے کرب کو اُس کے خلجان اور ہیجان کو اُس کشمکش اور کشاکش کو سمجھ سکتے۔'' (۵)

نذیؔر کی علامت نگاری کے متعلق جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی کا خیال ہے۔

''نذیؔر کی شاعری نہ مبہم ہے نہ سپاٹ ہے۔انہوں نے علامت کا خوشگوار استعمال کیا ہے، اُسے اپنے عجزِ بیان کا پردہ نہیں بنایا۔ وہ اپنی دھرتی سے بھی رشتہ بنائے رکھتے ہیں، گاؤں کی سوندھی مٹّی کی باس ان کے شعروں میں بہت نمایاں ہے، زبان میں بھی آورد اور تکلف نہیں، انہوں نے ہندی الفاظ بھی بے تکلف استعمال کئے ہیں اس سے تجربے کی صداقت بڑی حد تک محفوظ رہتی ہے۔اُن کی بحریں سادہ ہیں اور زمین سادہ تر، اکثر نئی زمینیں نکالی ہیں۔ چھوٹی بحر میں اچھے اور تیکھے شعر کہنا آسان نہیں، نذیؔر نے اس میں اکثر کامیابی حاصل کی ہے۔'' (۶)

نذیؔر کے شعری لہجے سے متعلق پروفیسر نثار احمد فاروقی کا خیال ہے۔

''نذیؔر کی شاعری میں گھن گرج بھی نہیں، یہ نرم لہجے کی شاعری ہے اور جس طرح میرؔ کی شاعری کے بڑے حصے میں خود کلامی ملتی ہے اس طرح نذیؔر اکثر خود کلامی میں مشغول ملتے ہیں۔مگر ان کے لہجے میں اعتماد ہے تھکن اور شکست خوردگی نہیں ہے، یہ اعتماد وہ ہے جو اعلیٰ اقدار پر یقین رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔''(۷)

نذیؔر کی شاعری سے متعلق پروفیسر نثار احمد فاروقی کا خیال ہے ۔

''نذیؔر فتح پوری فارمولے کی شاعری نہیں کرتے نہ انہوں نے صرف روایت کے دائرے میں رہ کر قافیہ پیمائی کی ہے وہ خواہ مخواہ چونکاتے بھی نہیں، اور ٹیڑھی چال چل کر خود کو تماشا بھی نہیں بناتے۔مگر انہوں نے یقیناً شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ وہ تر و تازہ نظر آئیں اور باسی خیالات کی تجارت نہ کریں۔''(۸)

نذیؔر کی غزل ہمیں نئے زمانے کا احساس دلاتی ہے۔''لمحوں کا سفر'' کے بعد ''سفر تا سفر'' اسی نئے زمانے کی عکاسی کرنے والا غزلیہ انتخاب ہے۔اس مجموعہ پر اپنی رائے بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عنوان چشتی اپنے ایک خط جو انہوں نے نذیؔر فتح پوری کو تحریر کیا ہے میں فرماتے ہیں۔

''مجھے کہنے دیجئے کہ نذیؔر فتح پوری کی شاعری کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو بچ کر چلنے کا شوق ہے۔شاعر کا یہ مزاج یا رویہ اس کی شاعری میں جھلکتا ہے۔چنانچہ نذیؔر فتح پوری نے زندہ عناصر کو نئے عناصر اور مظاہر سے ہم آہنگ کر کے ایک دلکش شعری اسلوب تراشا ہے۔''(۹)

''تیسرا سفر'' نذیؔر کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ یہ ۱۹۹۳ء میں اسباق پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔مجموعے کے سرورق پر نذیر کی تصویر آویزاں ہے ساتھ ہی ریگستان میں تین اونٹ اپنے سفر پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔اس مجموعے کی شروعات میں انتساب شامل کیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے عزیز دوست دلدار ہاشمی کے نام کیا ہے۔ یہ وہی دلدار ہاشمی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے نذیؔر کی شاعری میں رہنمائی کی۔ بعد ازیں نظام صدیقی کے تفصیلی مضمون بعنوان ''نئے عہد کی تخلیقیت کا استعارہ۔نذیؔر فتح پوری'' کو شامل کیا گیا ہے غزلیہ انداز میں حمد و ثنا کے ساتھ ساتھ بعنوان ''تعارف'' نذیر نے اپنے اوصاف قاری کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ جناب مظفر حنفی کی رائے بھی کتاب کے سرورق کے فلیپ پر شامل کی گئی ہے۔

نذیؔر کے شعری مجموعہ ''تیسرا سفر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب نظام صدیقی فرماتے ہیں۔

''نذیؔر فتح پوری کا تیسرا سفر کلاسیکی ترقی پسندی اور کلاسیکی جدیدیت پسندی کا ارتفاع کر بے محابا نئے عہد کی

تخلیقیت سے ہم کنار ہو گیا ہے نئے عہد کی تخلیقیت زندہ بیدار و توانا تخیل کی بغاوت ہے۔بغاوت آفریں تخلیقیت کے معنویاتی اور کیفیاتی خطوط امتیاز کے لیے سیاسی بغاوت نہیں بلکہ نئے تازہ کار اور نادر کار تخیل کی بغاوت ناگزیر ہے''۔(۱۰)

نذیؔر کے شعری مجموعہ ''تیسرا سفر'' کے متعلق جناب بشیر بدر صاحب اپنے ایک خط میں نذیر سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

''آپ کی غزلوں کا مجموعہ ''تیسرا سفر'' ملا کئی بار پڑھ چکا ہوں، ہر بار دو چار اور نئے اور انوکھے شعر مل جاتے ہیں۔آپ کی غزل میں وہ اکثر خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے غزل اپنے عہد میں اپنے بعد کے زمانے میں بھی زندہ رہتی ہے۔'' (۱۱)

طویل انتظار کے بعد نذیر کا چوتھا شعری مجموعہ ''سفر مدام سفر'' جون ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔سفر مدام سفر نذیر کی غزلوں کا ایسا انتخاب ہے جسے شاعر نے طویل غزلوں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔یقیناً اس مجموعے کے ابتدائی حصے میں قدرے طویل غزلیں ضرور شامل ہیں۔لیکن کئی غزلیں ایسی ہیں جن کے اشعار کی تعداد نو تک ہے۔اس لحاظ سے یہ طویل مختصر غزلوں کا مجموعہ ہونا چاہیے تھا۔

کتاب کا انتساب شاعر نے اپنی نصف بہتر کے نام کیا ہے اور بہت ہی خوبصورت انداز میں انتساب کی عبارت مرتب کی ہے ۔

''اپنی شریک حیات کے نام
جس نے
زندگی کی
طویل راہوں میں
خود کانٹوں پر چل کر
میرے قدموں میں ہمیشہ پھول بچھائے
جس نے کبھی میرا ایک شعر نہیں سنا
لیکن اس کی رفاقت کے بغیر میں
ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔''(۱۲)

اس عبارت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ نذیر فتح پوری محض لفظوں کے سوداگر نہیں اور نہ ہی وہ صرف خیالات کی دنیا میں جینے والے شاعر ہیں بلکہ ان کی فکر کے سوتے ان کے اپنے گھر آنگن سے پھوٹتے ہیں۔اور اسی سے نمو پا کر ان کے فن اور ہنرمندی کے پودوں پر بہار آتی ہے۔''سفر مدام سفر'' کا پیش لفظ نذیر نے چند ناقدین کے حوالے سے خود ہی لکھا ہے اور انہوں نے اس طرح اپنی غزل گوئی پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔اس پیش لفظ کے حوالے سے نذیر نے بتایا ہے کہ تمام نقادوں کی پسند اور ان کا مطمح نظر مختلف ہوتا ہے اس لیے کوئی تخلیقی فنکار تمام ناقدوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

محمد ایوب واقف صاحب نے نذیؔر فتح پوری کو ایک خط ''سفر مدام سفر'' کی رسید کے طور پر لکھا جس میں وہ نذیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''قدرت نے نذیؔر فتح پوری صاحب کے شاعرانہ مزاج کو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا اور نتیجے کے

طور پر اپنے ہم عصروں میں وہ اردو کے ایک کامیاب غزل گو شاعر بن چکے ہیں ان کے یہاں فکر کی تہداری
تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ زبان و بیان پر ان کی مکمل دسترس نے سونے پر سہاگا کا کام کیا ہے۔'' (۱۳)

نذیر کی ایک اور تصنیف ''نیا دن پھوٹ کر نکلا'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی (تمام کوششوں کے باوجود اس مجموعے کی کاپی دستیاب نہیں ہو پائی اور اسی لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھ پائی ہوں۔

نذیر کی غزلوں کا ایک اور مجموعہ یا یہ کہہ لیجئے کے پانچواں مجموعہ ''تتلیوں بھرا آسمان'' کے زیرِ عنوان جنوری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۸/ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ان کی تقریباً ۱۸۷ غزلیں شامل ہیں سرورق پر آسمان میں پرواز کرتی تتلیاں کتاب کے ٹائٹل کو تصویری انداز میں بیان کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس تصنیف کا انتساب نذیؔر نے اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ پھر گفت باہمی کے عنوان سے اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں اس میں وہ تتلیوں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''تتلی کے استعارے سے مجھے آج بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا پیار بچپن میں تتلی سے تھا۔ تتلی اب بھی میرے تعاقب میں ہے'' (۱۴)

کتاب کا ''پیش لفظ'' جناب وزیر آغا نے تحریر کیا ہے۔ وہ نذیؔر کے بارے میں اپنے خیالات بیاں کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

> ''نذیر فتح پوری ایک جدید غزل گو شعراء ہیں۔ ان کے کلام میں تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ کلیشوں کے مصنوعی اور آرائشی انداز سے انہیں چڑ ہے۔ وہ لفظ کے چھپے ہوئے معنی کو سطح پر لانے کا گر جانتے ہیں۔ تاہم ان کے اسلوب کی اس جادوگری میں بچپن کی معصومیت، حیرت، تجسس، اور اشیاء کو سینے سے لگانے کی روش، یہ سب اس خوبصورتی سے جذب ہوتے ہیں کہ خود ان کی غزل بھی نٹ کھٹ بچوں کی طرح تھرکتی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔ اس میں ان کی انفرادیت ہے۔'' (۱۵)

نذیر کا ایک اور غزلیہ مجموعہ ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ یہ ان کا دیوان ہے جو ''دیوان نذیر فتح پوری'' کے نام سے شائع ہوا۔ سرورق پر جلتی ہوئی شمع دیوان کے ٹائٹل کو روشن کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انتساب ان الفاظ میں تحریر کیا گیا ہے۔

> ''برطانیہ میں مقیم اردو کے
> معروف سخن ور
> ڈاکٹر منور احمد کنڈے
> کی محبتوں کے نام'' (۱۶)

پورا دیوان حروف تہجی کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں ''الف'' سے لے کر ''ے'' تک ۱۱۶ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں گفت باہمی کے عنوان سے نذیر خود اپنے قارئین سے مخاطب ہوتے ہیں۔ پھر ''گفتنی'' کے زیر عنوان ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی تفصیلی انداز میں نذیر کی شاعری پر محو گفتگو ہیں۔

نذیؔر کی دیوان سازی پر جناب مناظر عاشق ہرگانوی کا خیال ہے کہ۔

> ''نذیر فتح پوری نے اکیسویں صدی میں دیوان تیار کیا ہے۔ جس کا رواج اب نہیں ہے۔ الف سے ی تک ان کی غزلوں میں تہذیب کے انتشار اور بعض محبوب قدروں کے زوال کے کرب کی بڑی اثر انگیز عکاسی ملتی ہے

نذیرؔ فتح پوری نظریاتی وابستگی قبول نہیں کرتے بلکہ حقیقت کا تجزیہ اور شخصی وذاتی نظریہ کام لیتے ہیں ان کے دیوان کی غزلوں کا بنیادی آہنگ اوراس کا مکمل پیکر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔اسی بدلاؤ کی وجہ سے ان کے اندر وسعت نظری، بیان کی بالیدگی تازگی، شگفتگی اور تجربات ومحسوسات کا تسلسل نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔‘‘(۱۷)

نذیرؔ فتح پوری بھلے ہی پونہ میں مقیم ہیں اور اردو کی آبیاری میں مشغول ہیں۔لیکن ان کی رگ رگ میں وہی گاؤں بسا ہے جو ان کا آبائی وطن ہے۔جہاں انہوں نے آنکھیں کھولیں، جہاں ان کے بچپن کے حسین لمحے بیتے’’جس کی مٹی کی خوشبو نذیرؔ کی سانسوں میں بسی ہے‘‘ جس کی آب وہوا نے نذیر کو جوان کیا۔اس گاؤں کو وہ آج تک نہیں بھول پائے ہیں۔اوراس سے اپنی محبت کا اظہار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔عشق ومحبت کے جذبے سے آگے بڑھ کر نذیر کی غزلوں میں کھیت، پگڈنڈیاں، چوپال گاؤں کی مٹی، پروائیاں، کھلیان، قدرتی مناظر کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ان کی غزلوں میں اپنے گاؤں سے محبت اور اپنائیت کا اظہار دل کی گہرائیوں سے ہوا ہے۔مثلاً یہ شعر ملاحظہ کریں۔

شہر سے جب ہم کسی دن لوٹ کر گاؤں آئینگے
کھیت کی پگڈنڈیوں پر گیت بوئے جائیں گے

جتنی کہانیاں ہیں ملیں گی یہیں کہیں
چوپال کی حدوں سے نہ آگے بڑھا کرو

نذیرؔ گاؤں میں آکر ہوا یہ اندازہ!
چھتوں کی چھاؤں سے پیڑوں کی چھاؤں بہتر ہے

نذیرؔ چھوڑ کر آجاؤ شہر پونہ اب
تمہارے گاؤں کے گھر میں بسے ہے تنہائی

گاؤں والوں کو ضرورت ہے مری
لے رہاہوں شہر سے سنیاس میں

شہر آئے تو بہت یاد ستائی ان کی
ہم جو دے آئے تھے چاہت کے خزانے گھر کو

قیمتیں لاکھ لگائی گئیں ہر گام مگر
مرے اجداد نے بیچانا پرانے گھر کو

ہے تعلق گاؤں کی مٹی سے اپنا آج بھی
آج تک ہے گاؤں کے ٹوٹے ہوئے چھپر عزیز

آرہی ہے یاد پیپل کی گھنی پر چھائیاں
کاش شہروں میں بھی آئیں گاؤں کی پروائیاں

گاؤں سے آئے ہوتو پیارے اتنا تو کرتے
آتے آتے لے آتے پروائی تھوڑی سی

ہر برس بس یہی سوچ کر رہ گئے
گاؤں جائیں گے ہم اب کے تعطیل میں

نذؔیر نے اپنی شاعری میں جو الفاظ کا خوبصورت ذخیرہ استعمال کیا ہے اس کے متعلق جناب ساحلؔ احمد اپنے مضمون نذیر فتح پوری ایک لفظ شناس شاعر میں یوں رقمطراز ہیں۔

''ان کی غزلوں میں لغت کی دنیا ہے۔ وہ چند الفاظ وتراکیب استعارے یا روزمرہ ومحاورہ پر قناعت نہیں کرتے۔'' (۱۸)

پھر آگے ان الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ساحل احمد فرماتے ہیں۔

''گھر، گاؤں، لہو، دیوار، سفر، شہر، آئینہ، سایا، آسمان اور زمین سے انہیں گہری دلچسپی ہے اور شاید بہت زیادہ عزیز بھی۔ یہ سب بہت وسیع المعنی الفاظ ہیں۔ کب کہاں کیسے کس طرح استفادہ کے لائق بنایا جائے تا کہ یہ فکرواحساس کو زبان دے سکنے میں معاون ہوسکیں۔'' (۱۹)

ذاتی محرومیاں اور رشتوں میں آئی دراریں یہ وہ احساس ہیں جو نذؔیر کی شاعری میں شدت سے جگہ پا گئے ہیں۔ اپنوں سے رشتوں کے نام پر ملے دھوکے اور چالبازیاں ایک حساس دل شاعر کیسے نظر انداز کرسکتا ہے اور اسی لئے ایسے جذبات احساس کی آگ میں تپ کر شعر کے قالب میں ڈھل گئے۔

ملا نہ سایا ہمیں سائبان کتنے تھے
سروں پہ چھائے ہوئے آسمان کتنے تھے

اندھی مسافتوں کا تعین جو کر سکے
رستے میں ایسا میل کا پتھر نہیں رہا

سوچ احباب کس طرف تھے نذؔیر
دیکھ پتھر کدھر سے آیا تھا

کبھی سوچا نہیں تھا گل فروشوں!
تمہارے ہاتھ میں پتھر بھی ہوگا

یخ ہیں جذبے آرزوئیں سرد سرد
بن گیا ہے ''سنگ صورت'' فرد فرد

سلگ اٹھی جو دبی آگ تو ہوا معلوم
کہ پاس والے میرے پاسبان کتنے تھے

دوستی کے بدن پہ ڈالی تھی
ٹکڑے ٹکڑے ہوئی وہ چادر اب

یوں اُگے ہیں مری زمین میں سانپ
جیسے پالے ہوں آستین میں سانپ

اب ایسے دوستوں سے رکھیں کیا امید ہم

جو بے وفا نہیں تو وفا دار بھی نہیں
پھر یوں ہوا کہ ہوگیا عریاں ہر ایک شخص
رشتوں کی کھینچ تان میں دامان پھٹ گئے
تھے جو شاداب و شادماں رشتے
ہو رہے ہیں دھواں دھواں رشتے
اب کس سے اماں چاہیں
سب اپنے پرائے ہیں
ہم نے دیکھا خوب اپنوں کا مزاج
تب سمجھ میں آیا شعلوں کا مزاج

اس خوبصورت دنیا میں جہاں ہر کوئی اپنے عزیزوں کے ساتھ زندگی کو خوشنما وخوشگوار انداز میں بسر کر رہے ہیں وہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اردگرد لوگوں کا ہجوم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔کبھی کبھی یہ تنہائی سکون بخش ہوتی ہے تو کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہوتی ہے۔نذیرؔ کے دل کی تنہائی اکثر ان پر حاوی نظر آتی ہے۔اور تقریباً سبھی شعری مجموعوں میں اس تنہائی کا عکس نظر آتا ہے۔تنہائی کی مختلف شکلوں کو اشعار میں بیان کرنا نذیر کا شعار ہے۔

ہم اس کی یاد سے کیوں دل کو پھر لہو کرتے
سفر میں تھا وہ کبھی ہم سفر تو تھا ہی نہیں
یہ باہر کی آبادیوں میں نہیں
ہیں جو ویرانیاں دل کے اندر میاں
کھلے ہیں پھول تو کیا کیا ڈسے ہے تنہائی
بہار آئے تو دشمن بنے ہے تنہائی
تنہائی نے کیسا میرا ساتھ دیا
مجھ کو تیری یاد دلائی زخموں نے
سناٹے گونجتے ہیں مرے دل کے آس پاس
ایسے میں مجھ کو خواہشِ گفتار بھی نہیں
تنہائی میں یادوں کی جب چلمن سی لہراتی ہے
جس کو بھول چکے ہیں کب کے یاد اسی کی آتی ہے
جب بھی تنہا ہوتا ہوں
کاغذ کالے کرتا ہوں
جھیل پہ تنہا بیٹھا ہوں
چاند سے باتیں کرتا ہوں

ہم سجالیں گے تصور میں خود اپنی محفلیں
کس لیے تجھ سے ڈریں اے کنجِ تنہائی عبث

روح میں چبھتی ہیں جب تنہائیاں
موسمِ گل میں بھی خوں روتے ہیں لوگ

یاد آتے ہی قربتیں اس کی
ہوگئی ہے اداس تنہائی

اہلِ دل کو ہے تو بہت محبوب
تجھ میں ہے کیا مٹھاس تنہائی

اس لئے دور ہوں سمندر سے
میری قسمت میں پیاس تنہائی

پھر طنابیں کھینچتی سرکش ہوا کی قربتیں
پھر وہی جنگل وہی یادوں کا خیمہ اور میں

اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں دنیا کی تمام خوشیاں بہت آسانی سے مل جاتی ہیں تو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک ادنی سی خوشی کے لیے جی توڑ محنت کرتے ہیں اور اس کے باوجود بھی اس خوشی کو حاصل کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ یہ ناکامی انہیں بے چین کر دیتی ہے وہ درد کے سمندر میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ پوری دنیا انہیں بے معنی لگنے لگتی ہے، یہاں تک کہ ان کا اپنے وجود پر سے بھی یقین ختم ہوا اور وہ اپنے وجود کو بھول کر گمنامی کے اندھیروں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔ نذیر کے یہاں اس نوعیت کی محرومی کا احساس ضرور ہے۔اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے نذیر نہایت سنجیدہ نظر آتے ہیں۔

ایک مرکز پر بہم ہوجائیں گے بودو نبود
میرا ''میں''مجھ سے بچھڑ کر جب ترا ہوجائے گا

یہ ارتقا ء ہے یا ہے تنزل کی برکتیں
جینے کی خواہشات میں کیوں مر رہے ہیں لوگ

کانٹے روند کے آیا ہوں
اب تو پھول سا بستر دے

قید جو اپنی ذات کے گھر میں رہتے ہیں
جھوٹی انا کے زخم وہی تو سہتے ہیں

اسی سے صفحۂ تخلیق جگمگائے گا
ہماری روح میں جو آفتاب روشن ہے

شیتل چھاؤں کی آشا میں

صحرا صحرا بھٹکا ہوں
کائناتوں پر نظر رکھتے ہوئے
ذات سے ناآشنا ہے آدمی
خود شناسی کا بھرم ٹوٹ گیا اس دن سے
ہم نے آئینے میں جس روز سے چہرا دیکھا
مگر چند بوندیں بھی پا نہ سکے
کنویں میں بہت ڈول ڈالا گیا
زمانے سے میں بھاگ آیا مگر
کہاں خود سے ممکن مفر ہے مرا
کروٹ بدل رہی ہے کانٹوں پہ زندگانی
ڈوبی ہوئی ہیں نیندیں بے خوابیوں کے رس میں
یہ کون چھپ رہا ہے ہمارے وجود میں
یہ کس ہوا کے دوش کا آنچل ہوئے ہیں ہم

نذؔیر کے اشعار میں زندگی اپنی حقیقی شکل میں نظر آتی ہے۔زندگی میں پیش آنے والی ہر چھوٹی سے چھوٹی پریشانی پر بھی نذؔیر نے قلم اٹھایا اور اسے لفظوں کے پیرائے میں ڈھال دیا۔کہیں تنہائی دل کو پریشان کرتی ہے تو کہیں کچھ حاصل کرنے کی چاہت دل کو بے چین کر دیتی ہے،کہیں ان کے اندر کا انسان ہمت و جواں مردی سے بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے تو کہیں پست حوصلوں اور ناکامی کے سبب اپنی قسمت پر الزام لگاتے ہوئے لاچار اور مجبور نظر آتا ہے کہیں اپنے وجود کی تلاش میں گم ہے تو کہیں ماضی کی یاد میں ڈوبا ہوا اپنے ، بیگانوں کے ساتھ بتائے ہوئے خوبصورت لمحات کو یاد کرتا دکھائی دیتا ہے۔کہیں اپنی خواہشوں کے پورے نہ ہونے کا افسوس مناتا ہے کہیں اپنی محبت کو پانے کی چاہت ہے تو کہیں اسی محبت سے جدائی کا غم ہے۔کہیں اپنے دشمنوں پر انگلی اٹھاتا نظر آتا ہے تو کہیں اپنے ہی فن کی قصیدہ خوانی کرتا بھی دکھائی دیتا۔نذیر کے دل کی بے چینی مختلف پیرائے اختیار کر کے اشعار کے نگینوں میں ڈھل جاتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہو۔

باہر سے خاموش ہوں لیکن
اندر حشر بپا ہے مجھ میں
جب بھی شہر طرب میں جائیں
راہ میں حائل غم ہوتے ہیں
پانیوں کی تہہ میں کرتی ہیں کسے جاکر تلاش
ڈوبتی رہتی ہیں آخر کشتیاں کس کے لئے
میں لفظ لفظ اسے شعر میں سموتا ہوں
جو اضطراب کی بھرمار ہے مرے اندر
فلک پہ اڑنے سے بے چینیاں بڑھیں گی بہت

سکون کی ہے طلب تو ذرا زمیں پر آ
قدم قدم پہ یہاں تشنگی کا عالم ہے
تو بھر کے کوزۂ ہستی میں اک سمند لا

انسان کی زندگی میں غم بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی خوشی کیوں کہ اگر زندگی میں کوئی غم نہ ہو تو خوشی کا احساس بھی نہیں ہوگا۔غم کے سبب ہی خوشی کا احساس دوبالا ہوتا ہے۔اور یہی غم نذیر کے اشعار میں مختلف شکلوں میں ملاحظہ کیا جا تا سکتا ہے۔

زخم چنتا ہوں تو خوش ہوتے ہیں لوگ
میرے غم کا بوجھ کب ڈھوتے ہیں لوگ
زخموں کے چاند درد کے سورج غموں کی دھوپ
بستی ہمارے دل کی منور ہے آج کل
ہر ایک شخص ہے غرقاب اپنے اشکوں میں
یہاں کسی کو بچانے کوئی نہ آئے گا
درد کا چاند چمکتا ہے مری بستی پر
تم نے دیکھا ہے کہیں اور یہ منظر یارو
رات پھر آگئی زخموں کا لبادہ اوڑھے
سوچتا ہوں کہ کہاں مجھ سے مداوہ ہوگا
درد کی تند ہواؤں نے اٹھائے طوفاں
دل میں ہلچل ہوئی آنکھوں میں سمندر جاگے
ابتدا تھی وہ میرے زخموں کی
جس کو دنیا نے انتہا جانا
لے ڈوبے گا دیکھ نذیرؔ
دل کی بستی کا سیلاب
کروٹ بدل رہی ہے کانٹوں پہ زندگانی
ڈوبی ہوئی ہے نیندیں بے خوابیوں کے رس میں
مختصر ہے راستہ
آبلے ہیں بے حساب
رفیق سارے بچھڑتے ہیں ایک اک کرکے
بس ایک درد ہی دل سے جدا نہیں ہوتا
اک ایک حرف سے تحریر ہورہا ہوں میں
عجیب کرب کی تصویر ہورہا ہوں میں

داد ہم کو ملتی ہے اس لیے نذیر احمد
ہم غزل سناتے ہیں درد کے جہانوں سے

میری قسمت میں مرے حالات نے
ہونٹ لکھے قہقہہ لکھا نہیں

اب کس سے اماں چاہیں
سب اپنے پرائے ہیں

نذیؔر نے اپنی زندگی کا ابتدائی خاص حصہ غربت وافلاس میں گزارا ہے اور ہر تکلیف کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے اور یہی احساس نذیر کے اشعار میں بھی ڈھل گیا۔

تم نے لے دے کے بس احوال پڑھے دنیا کے
ہم نے اس آنکھ میں دنیا کا سراپا دیکھا

ملا نہ سایا ہمیں سائبان کتنے تھے
سروں پہ چھائے ہوئے آسمان کتنے تھے

انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے ایک انسان اس وقت تک انسان کہلانے کا حقدار ہوگا جب اس کے اندر انسانیت کا جذبہ بیدار ہوگا۔ اس میں غیروں کی مدد کرنے کا حوصلہ موجزن ہو غیروں کا درد اپنا درد مانے، ہر ایک کو خوشی کے لمحات مہیا کرانے کی کوشش کرے نذیؔر میں یہ خوبی ان کی رگوں میں خون کے ساتھ سرایئت کرتی رہتی ہے۔ اور اسی لیے ان کی غزلوں میں ایثار و قربانی کے اشارے ملتے ہیں۔

نذیؔر مجھ سے برائی نہ مٹ سکی لیکن
بھلائی بانٹتا رہتا ہوں یہ بھی کیا کم ہے

مانا کہ زمیں کا ذرہ ہوں لیکن یہ عزائم ہیں میرے
سورج کی سنہری کرنوں کو پہنچا کے رہونگا گھر گھر میں

روشنی بانٹتے ہیں دنیا کو
کم نہیں ہم بھی آفتابوں سے

زندگی کو ہمت و حوصلے سے جینے کا جذبہ ہر کسی کے پاس نہں ہوتا لیکن اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے ہمت و حوصلے کا ہونا نہایت ضروری ہے اگر مشکل وقت میں انسان اپنا حوصلہ کھو بیٹھے تو اس کے لیے زندگی جینا محال ہو جائے گا حوصلوں کی اڑان ہی انسان کو درد وغم میں بھی زندہ رہنا سکھاتی ہے۔ نذیر بھی اسی ہمت و حوصلے کے ساتھ زندگی کی ہر مشکل کو برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے ہیں۔ ان کا حوصلہ پرندوں کے پروں پر پرواز کرتا ہے اور لوہے کو پگھلانے کا عزم رکھتا ہے۔ اس لیے ان کے یہی ارادے ان کی غزلوں میں پوری توانائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

ابھی تو میرے عزائم میں ہے بہت ہلچل
ابھی تو خون کی بوچھار ہے میرے اندر
روشنی کی داستاں لکھوں گا اپنے خون سے

رات کی دہلیز پر سورج اگاؤں گا بہت
دیکھ کے جس طوفاں کے دھارے ڈوبے لوگ کناروں میں
ہم نے اپنی راہ بنائی اس طوفاں کے دھاروں میں
جس جگہ ڈٹ گئے ہم لوگ چٹانوں کی طرح
گردشیں ڈھے گئیں ریتیلے مکانوں کی طرح
لاکھ تو کوششیں کر دیکھ مگر شوخ ہوا
تجھ کو سانسوں کے دریچے سے نہ جانے دوں گا
نذیر احمد ہواؤں سے یہ کہہ دو
کروں گا میں چراغوں کی حفاظت
دشمن ہوا کو ایسے بھی ہم آزمائیں گے
جلتے ہوئے چراغ سرراہ لائیں گے

زمانہ چاہے کیسی ہی کروٹ بدلے، لوگ چاہے ہمارے شریک غم ہوں یا نہ ہوں ہمیں امید کا دامن تھامے رہنا چاہئے کیوں کہ اگر امید چھوڑ کرنا امیدی کے سمندر میں ڈوب گئے تو زندگی کے بد سے بدتر ہونے میں وقت نہیں لگتا، نذیر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور گزرتے لمحوں کے ساتھ ان کی امید اور بھی مستحکم ہوتی جاتی ہے۔اوران کے حوصلوں کو دوگنا کر دیتی ہے۔

بدلتی ساعتیں یہ کہہ رہی ہیں
ہمارے سر پہ اک چھپّر بھی ہوگا
بس اسی آس پہ ہم بھوگ رہے ہیں راتیں
اپنی دنیا میں کسی دن تو سویرا ہوگا
امید کے چہرے پہ ابھی نور ہے باقی
آزردہ ہوا کس لئے اے باورے من بول
مجھکو ہر حال میں گلشن کا بھرم رکھنا ہے
پھول مرجھائے تو کانٹوں کو جواں رکھوں گا
ممکن ہے کہ آئندہ اندھیروں کا سفر ہو
تو اپنی ہتھیلی میں کوئی چاند چھپا رکھ
اس آس پر کہ مسیحا کبھی تو آئے گا
بچھائے بیٹھا ہے زخموں کی وہ ردا کب سے

خیال وافکار جب بے تاب کرنے لگتے ہیں تو اضطراب پر قابو پانا مشکل ہوجاتا ہے اور انسان کو اندر ہی اندر کریدنے لگتا ہے، نذیر اپنی اس کیفیت کو بڑے سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔

کون اندازہ لگا سکتا ہے اس کے کرب کا

جاگتی آنکھوں سے جس نے خواب دیکھا رات بھر
سچ کے ہونٹوں پہ شعلے سجائے گے
حوصلے فکروفن کے بڑھائے گے

جب ایک عام آدمی کے دل کا یہ عالم ہے تو ایک حساس شاعر تو اس درد کو اور بھی شدت سے محسوس کرتا ہے اور یہی درد و تکلیف فکر و خیال کی بھٹی میں تپ کر تخلیق کے سانچے میں ڈھل کر بیش قیمتی تخلیقی دولت میں تبدیل ہو جاتے ہیں ۔

اسی کے درد نے بخشی ہے دولتِ تخلیق
جو ایک باؤلا فنکار ہے میرے اندر

برق رفتاری سے آگے بڑھتے زمانے میں ہر کوئی اپنی مصروفیات میں اس قدر مشغول ہے کہ کسی غیر کی تکلیف کو سمجھنے اور اس کا شریک غم ہونے کے لئے اس کے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ دوسروں کے درد و غم سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ اگر ضرورت پڑے تو انسان اپنے فائدے کی خاطر کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ انسان کی اس بے حسی کو نذیر اس طرح شعر کے پیکر میں ڈھالتے نظر آتے ہیں۔

نذیر احمد مرے احباب آخر
صفِ اعدا میں شامل ہوگئے ہیں
اس قدر اچھی نہیں بے گانگی حالات سے
کام اپنا کر مگر کار جہاں کا پا س رکھ

لیکن اس کے باوجود ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو دوسروں کی خوشی میں خوش ہوتے ہیں، غیروں کی مدد کر کے فرحت و سکون حاصل کرتے ہیں نذیر کے دل میں بھی یہ جذبہ شدت سے پرورش پاتا ہے اور دوسروں کے غم کو چننے کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ دوسروں کی زندگی کے کانٹوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر پھولوں کا اتہاس لکھتے نظر آتے ہیں ۔

زخم چنتا ہوں تو خوش ہوتے ہیں لوگ
میرے غم کا بوجھ کب ڈھوتے ہیں لوگ
لہو میں جب شرارت دوڑتی ہے
تو پھر رستے کے پتھر جاگتے ہے
دیکھتے نہیں ہے جو اپنی ذات سے آگے
ایسے خود پسندوں کو دیدہ ور نہیں کہتے
رکھ لوں سب کانٹوں کو اپنے پاس میں
پھول کا لکھا کروں اتہاس میں

غرور ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو بلندی سے پستی میں دھکیل دیتی ہے نذیر کو اس حقیقت کا خوب احساس ہے ۔

بلند قامت وقد کا اثر نہیں لیتے
فضول ہم کبھی یہ دردِ سر نہیں لیتے

اکثر بڑی بڑی تقریروں میں دبی ہوئی نصیحت اتنی کارگر ثابت نہیں ہوتی جتنی دو مصرعوں کے شعر میں ڈھلی ہوئی کام کر جاتی ہے۔نذیر نے بھی ناصح بن کر نصیحت کی مگر انہوں نے اس نیک کام کے لئے ایسا پیرایۂ اظہار اختیار کیا کہ پڑھنے والا خود بخود اس طرف رجوع ہو جائے اور اس نصیحت کو دل سے قبول کرے۔

کب تک آخر جابجا خوں ریز منظر دیکھنا
وقت اور حالات کے ہاتھوں میں پتھر دیکھنا
کون ہے نا عاقبتِ اندیش اپنے دیش میں
کس نے پتھر رکھ دیئے پھولوں کے اندر دیکھنا
سطح پر گہرائیوں کا بھید پانے کے لئے
ہے ضروری تیر کر گہرا سمندر دیکھنا

نذیؔر نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک پیغامبر کا کردار بھی ادا کیا ہے جس کے متعلق جناب معین الدین عثمانی کا خیال ہے کہ۔

”شاعری کو پیغمبری کا جز کہا گیا ہے کیوں کہ شاعر اپنے وقت کا نقیب ہوتا ہے۔وہ ملک وقوم کے تعمیری نیز تخریبی عناصر کی نشاندہی اپنے قلم کی نوک کے ذریعہ کرتا ہے۔طبیعت کا حساس ہونے کے باوجود بھی تلخ ماحول کی عکاسی اس کا شعار بن جاتی ہے۔علاجِ گردشِ دوراں کے ساتھ ساتھ قوم کی رہنمائی بھی فرماتا ہے متذکرہ بالا تمام ہی عناصر نذیؔر صاحب کی شاعری میں پورے عروج کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔“(۲۰)

دہشت گردی عالم انسانیت کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔اس نے ہندوستان کو بھی اپنی زد میں لے رکھا ہے یہ وہ خطرناک بیماری ہے جو ہمارے ملک کو دیمک بن کر کھوکھلا کر رہی ہے اس کے نقصانات دل دہلانے والے اور روح تڑپانے والے ہیں نذیر نے کچھ ایسے ہی منظروں اور اس کے سبب پیش آنے والے حالات کو اشعار میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔نذیر کا حساس دل بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بے اختیار پکار اٹھا۔

برپا ہوا فساد جہاں بھی کہیں نذیؔر
بیٹے کی لاش ماں کے کفن سے لپٹ گئی
زمیں ماں کی طرح بے بس ہوئی
جواں بیٹے لٹیرے ہوگئے ہیں
کھیتوں میں مدفون تھیں لاشیں
تلواروں پر خون لگا تھا
زہر کی شاخ پر ٹانگ دیں گردنیں
سبز خوابوں کے منظر دکھائے گئے
اب کے بلوائیوں کے ہاتھو سے
کتنی اجڑی ہے بستیاں لکھ دے
جنوں میں پھونکنے جس کو چلے ہو سوچو تو

کہیں تمہارا ہی اپنا جو گھر نکل آیا ؟
جس لہو کو لہو دیا میں نے
وہ ہی میرا لہو بہائے گا

ماں کی دعا ہر بچوں کی زندگی کو روشن کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہر آفت سے بچاتی ہے۔ ماں کے آنچل کے سائے تلے بچہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ جہاں ڈاکٹر وحکیم کے سارے نسخہ بے کار ثابت ہوتے ہیں وہاں ماں کی دعا ہی کام آتی ہے۔ نذیر بھی اپنی ماں کی دعا کے نتیجے میں آج اس مقام پر پہنچے ہیں جہاں عزت شہرت اور کامیابی ان کے قدم چومتی ہے، یہ ان کی اپنی ماں کے لیے والہانا محبت ہی تھی جس کے تحت انہوں نے اسباق کے زیر اہتمام ''ماں نمبر'' شائع کیا۔

جس میں دکھ شامل ہو ممتا کا نذیر
ہاتھ دے دو اس دعا کے ہاتھ میں
نذؔیر ماں کی دعا جن کے ساتھ ہوتی ہے
وہ زندگی میں کبھی رائیگاں نہیں ہوتی
بزرگ سائے سروں سے جدا ہوئے تو لگا
نذؔیر چھاؤں کا اب سلسلہ نہیں ملتا
یہ دعا کا آشیانہ ہے جلے گا کس طرح
کیوں لپکتا رہتا ہے اس سمت یہ شعلہ عبث
حوصلہ باندھ کے جب رخت سفر باندھتا ہوں
پھر مری ماں مرے دامن میں دعا باندھے ہے

نذؔیر ایک حساس دل شاعر ہیں۔ حال میں جیتے ہوئے بھی وہ ماضی کے جھرونکوں سے اترنا نہیں چاہتے۔ ماضی کی پر کشش یادیں انسان کا جینا محال کر دیتی ہیں اور ان یادوں کو دل سے لگا کر رکھا جائے تو زندگی کے میدان میں پیش قدمی دشوار ہو جاتی ہے۔ جب گزرا کل یاد آتا ہے تو ہمیں ہمارے آج میں بہت سی کمیاں خامیاں اور محرومیاں نظر آتی ہیں اور بیتے کل کی بات دل کو بے قرار اور روح کو مضطرب کرتی چلی جاتی ہے۔ اس بات کو نذیر نے محسوس کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھؤاریں تو گرا کرتی ہیں اب بھی
مگر ساون کا جھولا اب نہیں ہے
یادوں کی منڈیروں پر چہکتا رہا ماضی
کیا کیا نہ کیے ہم نے بھلانے کے جتن بول
کھیت کی پگڈنڈیاں دہرائیں گی ماضی کا گیت
تتلیوں کو دیکھ کر پھر بچپنا یاد آئے گا

بچپن کی یادیں تتلیوں کی مانند ہوتی ہیں۔ ان حسین یادوں کو انسان زندگی بھر سانسوں میں بسائے رکھتا ہے جب وہ ان خوشنما یادوں میں کھو

جاتا ہے تو ایک الگ ہی خوبصورت وخوشنما دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اکثر نذیر بھی ایسے احساسات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں ان کا دل آج بھی رنگ برنگی تتلیوں کے پیچھے دوڑتا ہے، تتلی کے سترنگی پروں میں انہیں اپنے بچپن کے خوبصورت لمحات دکھائی دیتے ہیں۔ تتلی ان کے یہاں بچپن کی علامت ہے۔ تتلیوں سے ان کی محبت اس قدر گہری ہے کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعے کا نام ''تتلیوں بھرا آسمان'' رکھ لیا جو جنوری ۲۰۱۲ء میں اسباق پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اور تو اور اس کے سرورق پر تتلیاں اڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بچپن کی منزلوں سے آگے گزر چکے ہیں
احساس اپنا پھر بھی ہے تتلیوں کے بس میں

پھر وہی خوشبو کی آندھی، پھر وہی رنگوں کی دھول
پھر وہی تتلی، وہی بچپن کا سپنا اور میں

بچپنا اُڑ جائے گا معصوم تتلی کی طرح
زندگی کے ہاتھ میں رنگین پر رہ جائیں گے

تتلیاں دیکھ کے رنگوں سے بہل جائے گا دل
پھول کو دیکھ کے ہر آنکھ معطر ہوگی

جدا باغ سے تتلیاں کیا ہوئیں
کہانی سنانے کا موسم گیا

بعد مدت کے ملا دوست جو بچپن کا نذیرؔ
اس پہ پڑتے ہی نظر تتلی کا پر یاد آیا

تتلیوں کے قافلے آآ کے گزرے صف بہ صف
ہوگئے ہیں رنگ میں تحلیل جذبے صف بہ صف

بچپنا تو چلا گیا لیکن
دل سے تتلی کا کب خیال گیا

نذیرؔ کے محبوب استعارے تتلی کے متعلق ڈاکٹر اسلم حنیف کا خیال ہے کہ۔

''نذیر فتح پوری صاحب نے غزل کے حوالے سے پرانے اور گھسے پٹے پیکروں کی نئے انداز سے پینٹنگ بھی کی ہے اور فنی اور ذاتی تشخص کے لئے نئے پیکر بھی تراشے ہیں نئے پیکروں کی فرہنگ میں تتلی ان کا محبوب ترین پیکر کہا جاسکتا ہے۔'' (۲۱)

پھر اسی مضمون میں وہ آگے فرماتے ہیں۔

''تتلی کا پیکر نذیر فتح پوری کے متحرک درمیانی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ اس کے وسیلے سے شاعر کے ذوق جمالیات کو بخوبی پرکھا جاسکتا ہے۔'' (۲۲)

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کو ہر شاعر نے مختلف پیرایۂ اظہار میں بیان کیا ہے۔ یہ ازل سے تھا اور ابد تک رہے گا نذیر نے بھی اس جذبے کو

خوب خوب نبھایا ہے اور بڑی سادگی سے اپنے اشعار میں اس جذبے کا اظہار کر دیا ہے۔ یہ کیسی تنہائی کا سماں ہے جہاں شاعر تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں ہے۔

تری باتیں ہیں تیری وارداتیں
ہمارا دل اکیلا اب نہیں ہے

حرف حرف پر وعید
لفظ لفظ پر عتاب

ہمارے ذہن میں لہرایا تھا جو مدت بعد
وہ تم نہیں تھے مگر عکس تھا تمہارا سا

ہمارے خون دل کو وہ یہ سمجھے
ہتھیلی پر حنا رکھی ہوئی ہے

کوئی حسرت کوئی خواہش کوئی ارماں بھی نہیں
دل کی دنیا ہوئی ویران مکانوں کی طرح

مجھ کو بیگانہ جاننے والا
مجھ سے چھپ کر سما گیا مجھ میں

کر گیا سب سے بے نیاز مگر
اپنی خواہش جگا گیا مجھ میں

جتنا سہل ہے اس سے بڑھکر مشکل ہے
میرے دل سے تیرا نام مٹا دینا

ترقی کی چاہت میں لوگ گاؤں چھوڑ کر شہروں کی طرف رخ کر رہے ہیں اور شہری زندگی کی چمک دمک میں گم ہو جانے کے بعد گاؤں لوٹنا ہی نہیں چاہتے اس بات کو نذیر شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے اس احساس کو ایک خوبصورت شعر کے ذریعے پیش کیا۔

یہ کہہ کر اڑ گئے شاخوں سے پنچھی
یہاں کا آب ودانا اب نہیں ہے

گاؤں شہروں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں اس احساس کو بیان کرتے ہوئے نذیر فرماتے ہیں۔

شہر پھیلاؤ پر ہے آمادہ
گاؤں نقشے لپٹ کر رکھ دے

احساس تنہائی اور اکیلا پن زندگی میں مایوسی بھر دیتے ہیں تنہائی اس اژدہے کی مانند ہے جو انسان کے چین اور سکون کو نگل لیتا ہے اس کی خوشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان کے چاروں طرف مایوسی اور اندھیروں کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا۔ نذیر بھی کبھی کبھی اس مایوسی کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں اور اپنی تشنگی کو بجھانے کے لیے سوکھے دریاؤں کی خاک چھانتے ہیں اور پھر جب کچھ ہاتھ نہیں آتا تو امید کا دامن بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

جانتا ہے وہ کہ اس کی تشنگی ہے لا علاج

سوکھے دریاؤں کی جانب کیوں گیا پیاسا عبث

ہم نے ڈالے کئی گوشوں میں بھنور بھی لیکن

خامشی چھاہی گئی زیست پہ جھیلوں جیسی

آس کی جو ردائیں تھیں نہ رہیں

زندگی بے کفن ہے اپنے پاس

برق رفتاری سے بڑھتی ہوئی ٹیکنالوجی نے انسان کو چاند پر پہنچادیا ناممکنات کا شمار اب ممکنات میں ہونے لگا ہے اس ترقی کے جہاں بہت سے تعمیری نتائج سامنے آئے ہیں وہیں بہت خطرناک منظر بھی دیکھنے کو مل رہے ہیں آج عراق اور افغانستان کی صورت حال ہمارے سامنے ہے اس بات کو ہر ذی حس شخص محسوس کرر ہا ہے۔اس صورت حال کو نذیرؔ نے شدت سے محسوس کرکے اپنے اشعار میں ڈھالا ہے۔

آپ جس کو عروج کہتے ہیں

وہ مجھے تو زوال لگتا ہے

دھرتی کے حسن کا تو اب ہے خدا ہی حافظ

مصروف ہوچکی ہے دنیا تہس نہس میں

نذیرؔ کی غزل کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہر موڑ سے کامیابی کے ساتھ گزر جاتی ہے نذیر کے یہاں ترسیل، تفہیم کی مرہون منت نہیں ہے وہ جو کہنا چاہتے ہیں ان کا قاری اسے بخوبی سمجھ لیتا ہے۔

زندگی کو گزارنے میں جو پریشانیاں پیش نظر ہیں وہ اس پر خار جنگل کی مانند ہیں جہاں سے گزرتے وقت انسان لہولہان ہوجاتا ہے پھر ان تکالیف سے گزر کر انسان زندگی کی جنگ میں آگے بڑھنا چاہتا ہے۔حالانکہ ایسے حالات میں اس کا سکون اور طمانیت سب کچھ برباد ہوجاتا ہے اور اس کی بے تابیاں بڑھنے لگتی ہیں اور اسی بے چینی نے نذیرؔ کی نیندیں بھی اس حد تک حرام کردی ہیں کہ وہ جاگتی آنکھو سے رات گزار دیتے ہیں۔اس صورت حال کو نذیر نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

کروٹ بدل رہی ہے کانٹوں پہ زندگانی

ڈوبی ہوئی ہیں نیندیں بے خوابیوں کے رس میں

کون اندازہ لگا سکتا ہے اس کے کرب کا

جاگتی آنکھوں سے جس نے خواب دیکھا رات بھر

کروٹ پہ کھلے جاتے ہیں زخموں کے دہانے

بستر کی شکن جیسے نمک اس کے لیے تھی

نیند کی گود میں جھولے تو لگے سب اپنا

آنکھ کھل جائے تو ہر خواب پرایا ہوئے

بے چینی نے چھین لیے

ساری نیندیں سارے خواب

زندگی ایک ایسے باغ کی مانند ہے جس کی تمام خوشیاں خوبصورت پھولوں سے تعبیر کی جاتی ہیں اور سارے دکھ درد اور تکالیف کانٹوں کی مثال ہیں۔کانٹوں کے ڈر سے ہم باغ میں پھول کھلانا نہیں چھوڑتے تو پھر دکھ اور تکلیف کے ڈر سے زندگی جینا کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔اپنے آپ کو برباد کرنے کا منصوبہ کیوں بنالیتے ہیں اور خودکشی کے لیے کیوں آمادہ ہوجاتے ہیں، انسان کو ہر حال میں امید اور حوصلے کا دامن تھامے رکھنا چاہئے۔اور پرامید زندگی بسر کرنے کا جذبہ رکھنا چاہیے۔نذیر کو مرجھائے پھول اور کانٹے بھی بہت عزیز ہیں اور اسی لیے وہ مرجھائے ہوئے پھولوں پر غم نہیں کرتے اور اس کے برعکس کانٹوں کو جواں رکھنا چاہتے ہیں وہ کسی طوفان سے نہیں گھبراتے اور طوفان کے دھاروں میں کنارہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔نذیؔر کا ایسا عزم اور حوصلہ مندرجہ ذیل اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مجھ کو ہر حال میں گلشن کا بھرم رکھنا ہے
پھول مرجھائے تو کانٹوں کو جواں رکھوں گا
وقت اور حالت کا رخ موڑ کر
وقت اور حالات کی زد سے نکل
شکستوں پر شکستیں جھیل کر بھی
ابھی تک حوصلہ رکھا ہے دل نے
پت جھڑ میں جب کوئی غنچہ کھلتا ہے
اس منظر سے حوصلہ کتنا ملتا ہے
یہ بھی عزم دکھانا ہے
پربت سے ٹکرانا ہے
دیکھ کے جس طوفان کے دھارے ڈوبے لوگ کناروں میں
ہم نے اپنی راہ بنائی اس طوفاں کے دھاروں میں

انسان کی زندگی جب مشکلوں سے دوچار ہوتی ہے تو اس کے دل میں طوفان کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔انسان اسے ایسے طوفاں سے جلد نجات حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے منصوبے بھی بنائے جاتے ہیں، وقت کے ساتھ ہم اپنی سمجھ بوجھ اور عقل وخرد کو بروئے کار لاکر ان حالات سے نجات کا راستہ تلاش کرہی لیتے ہیں نذیر کا سامنا ایسے حالات سے ہوتا رہتا ہے لیکن وہ ان مشکل حالات کے شکر گزار نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی سوچوں کو گہرائی نصیب ہوئی بہت ہی منفرد اور دلکش انداز میں فرماتے ہیں۔

میں ان حالات کے قرباں جنہوں نے
مری سوچوں کو گہرا کردیا ہے

اولاد کی پرورش والدین اس انداز سے کرتے ہیں کہ آگے چل کر وہ اپنے قبیلے کی عظمت و وقار میں اضافہ کا سبب بنے اور اپنے کردار و عمل سے اپنے خاندان کے لہو کو سرخ رو کرے۔اس تناظر میں نذیؔر کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ کریں۔

باغ کو ہم نے دیا تھا جو لہو
ہیں اسی کے سارے جلوے شاخ شاخ

اگر کوئی اولاد اس کے برعکس اقدام کرتی ہے تو اُس کے انجام کی طرف بھی نذیؔر نے واضح اشارے کر دیئے ہیں۔

قبیلے میں اسے اب کون چاہے
لہو کو جس نے رسوا کر دیا ہے
بالغ ہو کر نابالغ سمتوں کی جانب دوڑ پڑا
انگلی تھام کے جس بچے کو ہم نے راہ دکھائی تھی

اس لیے تو غزل کو زندگی کی ترجمان قرار دیا گیا ہے، ہمیں نذیؔر کی غزلوں میں زندگی کی بھرپور ترجمانی کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔اسی طرح نذیؔر کو زندگی کا ترجمان شاعر بھی کہا جاتا ہے۔

انسان کی قوت پرواز اگر بلند ہو تو وہ ایک پل میں ساتوں آسمان کی سیر کر لیتا ہے۔نذیر کی فکری پرواز بھی کچھ اسی بلندی پر نظر آتی ہے۔

اب آشنا ہوا ہوں میں بینائی سے نذیؔر
اب ہوگا خوب کام کا منظر میرے لئے
ہر سطر میں ہے لہو میرے جگر کا شامل
ایسا گلرنگ کہیں تم نے نوشتہ دیکھا
لفظ مضموں متن ہے اپنے پاس
بات کہنے کا فن ہے اپنے پاس

یا پھر یہ شعر ملاحظہ کریں۔کتنا دلچسپ اور کس قدر وسعت کا حامل تصور ہے۔

میں ڈالی ڈالی اڑتا پھر رہا ہوں
تخیل نے پرندہ کر دیا ہے
نذیر شاخ تخیل سے پھول جھڑتے ہیں
میرے قلم کی زباں جب بہار اگلتی ہے

اوپر کی سطور میں نذیر کے بعض اشعار کے حوالے سے انہیں زندگی کا ترجمان شاعر قرار دیا گیا ہے۔نذیؔر ایک گہرا سماجی شعور بھی رکھتے ہیں۔اس شعور نے انہیں زندگی کی گرہ کشائی کا ہنر عطا کیا ہے۔اگرچہ یہ بات وہ تخیل و تصور کے حوالے سے ہی کرتے ہیں۔لیکن ان کا تخیل اور تصور زندگی کی سچائیوں کے اردگرد رقص کرتے نظر آتے ہیں۔

عموماً لوگ اپنے عیبوں کو فراموش کر کے دوسروں کی عیب جوئی میں لگ جاتے ہیں حالانکہ سب سے بہتر انسان وہ ہے جو پہلے اپنی کمیوں اور خامیوں کو تلاش کر کے ان کا علاج کرے اور پھر دوسروں کی طرف متوجہ ہو۔نذیر میں یہ وصف پایا جاتا ہے جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں۔

یہ فقط الزام ہے ہم پر کہ باہر ڈھونڈتے ہیں
ہم تو اپنے دشمنوں کو اپنے اندر ڈھونڈتے ہیں
کائناتوں پر نظر رکھتے ہوئے

ذات سے ناآشنا ہے آدمی

صنعتی ترقی کے اس تیز رفتار زمانے میں ہر شخص صرف اور صرف اسی خواہش میں ڈوبا ہے کہ کس طرح وہ آسمان کی بلندیوں پر پہنچ جائے۔ نذیر اس صورت حال کو اس طرح نشان زد کرتے ہیں۔

آسماں پیمائش کی خواہش نے اندھا کردیا ہے
لوگ اڑنے کے لیے غیروں کے شہہ پر ڈھونڈتے ہیں

مشینوں کی بہتات نے مزدوروں کے ہاتھ قلم کردیے ہیں دست ہنر کی اب کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی غریب بستیوں سے کر گھے اور چرخیاں غائب ہو چکی ہیں نہ روئی ہے نہ دھاگے ہیں۔ اب تو وہ بڑھیا بھی غائب ہو چکی ہے جو چاند میں چرخہ کاتتی نظر آتی تھی۔ نذیؔر کے تصور میں آج بھی وہ منظر بسا ہوا ہے جس کی موت پر وہ اپنے دکھ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

نہ جانے چرخیاں کیا اکاتتی ہیں
کسی پر کوئی دھاگا اب نہیں ہے

چاند کی بڑھیا کا چرخہ، سنت کبیر کا چرخہ، اور گاندھی کا چرخہ، ہماری تہذیبی روایتوں کی ایسی علامتیں ہیں جن کے دھندلے عکس آج بھی ذہن میں اتر آتے ہیں نذیر نے سنت کبیر کے کردار میں اپنے آپ کو سمونے کی کوشش کی ہے انہوں نے اپنے اشعار میں میؔر غالؔب اقباؔل اور کبیؔر سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے کبھی وہ اپنے آپ کو کبیؔر کے دوہوں کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور کبھی اپنی غزلوں میں میؔر کا انداز بیان محسوس کرتے ہیں اور وہی غم انگیز فضا کو محسوس کرتے ہیں جو میؔر کی شاعری کا وصف خاص ہے جس کے سبب وہ خدائے سخن کہلائے۔ پھر وہ غالؔب کی طرز میں شعر کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چند اشعار ان کے مختلف جذبات کے اظہار کے غماز بن گئے ہیں۔

زندہ ہے مجھ میں آج بھی اک سنت آدمی
میں آج بھی کبیؔر کے دوہوں کے ساتھ ہوں
سلگ رہا تھا ہر اک لفظ آتشِ غم میں
ہماری غزلوں کا انداز میؔر جیسا تھا
نذیؔر احمد مجھے بھی میؔر کا ہی جانشیں سمجھو
میں اپنا درد جمع کرکے اک دفتر بناتا ہوں
روشنی کی لکیر باقی ہے
میؔر ہے تو نذیؔر باقی ہے
جب میں کبھی حصول سخن کی طرف گیا
احساس میرا میر کے فن کی طرف گیا

''میؔر ہے تو نذیؔر باقی ہے'' میر ایسا زندگی کا ترجمان شاعر صدیوں میں ایک ہوتا ہے، اسی ترجمانی کا پرتو نذیؔر کی غزلوں کے اکثر اشعار میں نظر آتا ہے۔ جس کی طرف نثار احمد فاروقی نے ''سفر تا سفر'' کے پیش لفظ میں اشارہ کیا ہے۔ نذیؔر نے اپنی فکر کا کچھ حصہ میر سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اسی لیے وہ اعتراف کرتے ہوئے کہتے ''میؔر ہے تو نذیؔر باقی ہے۔

دوسری طرف نذیؔر نے غالبؔ کی فکری انگلی بھی تھام رکھی ہے۔ غالبؔ نے اپنے انداز میں زندگی کی جو شرح بیان کی ہے، نذیر اس سے واقف ہیں، انہوں نے غالبؔ کے نقش پا کو رہنما بنانے کی کوشش ضرور کی لیکن پھر قدم ہٹا لیے۔ اور اس کا اعتراف بھی کرلیا کہ

بہت ہی فکر و کاوش ہم نے کی لیکن نذیر احمد　　　یہ غالب کی زمین تھی شعر اس میں کم سے کم نکلے

لیکن نذیؔر نے پوری طرح ہار نہیں مانی۔ انہوں نے غالبؔ کے نقش پا کو چھونے کا حوصلہ دکھایا، اگرچہ اس زمین میں شعر کم سے کم نکلے، لیکن نکلے ضرور۔

شاعر کا تصور بھی چاند اور سورج کی طرح اپنی سمتیں بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی نذیر کسی تیسرے کردار کے حوالے سے یہ احتجاج بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اس تیسرے کردار میں بھی وہ اپنے آپ ہی کو تصور کرتے ہوں۔

زبان شعر میں وہ کیوں یہی اک بات کہتا ہے
کہ ترے شہر میں ایک غالب ثانی بھی رہتا ہے

یہ غالب ثانی کون ہے۔ اس کا انکشاف ہونے سے پہلے ہی وہ شدید احتجاج کے لہجے میں اپنا پرچم بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالبؔ و اقبالؔ ہی کو سن رہے ہو جا بجا
بزمِ حرف وصوت میں اک ہم سخن میں بھی تو ہوں

نذیر کی خود اعتمادی محض احتجاجی لہجے کی بازگشت بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ وہ دوٹوک اپنی بات کہنے سے گریز نہیں کرتے۔

نہیں ہے میر و غالب کے تابع
نذیؔر اپنا تو ہے بس اپنا لہجہ

نذیر کی شاعری دیکھ لیں۔ ان کی زندگی دیکھ لیں۔ کسی بھی میدان میں وہ کوری تقلید کے قائل دکھائی نہیں دیتے۔ حالانکہ وہ کسی اور کے ہم نوا اور ہم سفر بننے سے گریز نہیں کرتے۔ لیکن اپنے وجود کی سالمیت کے ساتھ۔ وہ اپنے انداز فکر اور انفرادی لہجے کا دفع کرتے نظر آتے ہیں۔

''نذیر اپنا تو ہے بس اپنا لہجہ''

قدیم و جدید زمانوں کے بیچ بڑا فاصلہ ہے۔ آج نیا معاشرہ تغیر و تبدل کا حامل نظر آتا ہے۔ ادب میں بھی یہ تبدیلی ناگزیر ہے۔ اسی زبان کا ادب زندہ رہتا ہے جس زبان میں تغیر کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ نذیؔر بھی روایتی اور جدید لب و لہجے کے حامل ہیں۔ وہ جتنے کلاسیکل ہیں اتنے ہی جدید بھی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ شعر قابل توجہ ہے۔

لہجہ نیا ہے پھر بھی روایت عزیز ہے
غالب کی اور میر کی غزلوں کے ساتھ ہوں

یہ سچائی ہے کہ ادب انسانی فکر کو وسعت عطا کرتا ہے، ادب کے تخلیق و ترسیل اور مطالعہ سے فکر کے نئے نئے زاویئے کھلتے ہیں۔ پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ نذیؔر کے بعض اشعار اس سچائی کی نشان دہی کرتے نظر آتے ہیں۔

اب　فکر　چاہتا　ہے　دستان　شاعری

لفظوں سے کھیلنے کے زمانے گزر گئے
لپک رہا ہے لہو میں کہیں شرارہ سا
سخن کی اوٹ سے ابھرے گا ماہ پارہ سا

انسان کی زندگی ہمیشہ محبت کی طلبگار اور متلاشی رہی ہے۔اسی لیے اس دور کے جلووَں کو حاصل کرنا انسان کا مقصد حیات بھی ہے جب محبتوں کے یہ جلوے زندگی سے اوجھل ہو کر کسی اور کے خوابوں میں منور ہو جاتے ہیں تو دل جدائی کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے زندگی گراں معلوم ہونے لگتی ہے۔نذیر بھی اس قلبی واردات کا شکار ہوئے ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار میں اس قلبی کیفیت کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوا ہے ۔

جہاں ٹھکرا کے تم رخصت ہوئے تھے
وہیں اب تک وفا رکھی ہوئی ہے
ہمارے ذہن میں لہرایا تھا جو برسوں بعد
وہ تم نہیں تھے مگر عکس تھا تمہارا سا
اب جہاں چاہے رہے آباد وہ
جو ہمارے دل کو خالی کر گیا
اس سے مل کر نہ بچھڑا ہوتا نذیر
خود سے مل کر بچھڑ گیا ہوتا
کوئی حسرت کوئی خواہش کوئی ارماں بھی نہیں
دل کی دنیا ہوئی ویران مکانوں کی طرح
تیری دستک کو ترستے ہی رہے گھر کے کواڑ
درد کے بے نام جھونکے! تو نہ آیا رات بھر
وصل کے خواب لرزتے رہے پلکوں پہ نذیر
دوریاں راہ میں حائل رہیں میلوں جیسی
میں کٹ چکا ہوں ترے ہاتھ کی لکیروں سے
میرے عزیز! مقرر مجھے تلاش نہ کر

ہجر وصال کی اس کیفیت کو غزل کا شاعر جس انداز، اسلوب اور اشاروں میں بیان کرتا ہے۔وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں، شاعر کو اسی لیے ہنر مند اور شاعری کو فنکاری کا نام دیا گیا ہے۔

خاموشی وہ زبان ہے جو احساس کی ترجمانی کے کام آتی ہے،محبت میں تو اکثر خاموشی ہی عاشق ومعشوق کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بنتی ہے نذیر کو اس نازک گفتنی کا احساس ہے۔اس احساس کو وہ یوں بیان کرتے ہیں ۔

یوں تو کہنے کو بے وفا ہے وہ
پھر بھی آنکھوں سے بولتا ہے وہ

آنکھوں کی زبان، خاموشی کی زبان اور ہواؤں کی زبان کوئی فطری فنکار ہی سمجھ سکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی نے دنیا کو ارتقاء اور وسعت عطا کی ہے۔ لیکن اس سے روایتیں پیچھے چھوٹتی جا رہی ہیں۔ نذیر آئندہ نسلوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی قدروں کا خیال کرتے ہوئے اپنی تہذیب کی حفاظت کرنی ہے۔

ہر چیز ارتقا کی حدوں سے گزر گئی
انسان زندہ رہ گیا تہذیب مرگئی
طفل نو کے کام آئے ایسے باب لکھ دینا
تتلیوں کے رنگوں پہ اک کتاب لکھ دینا
جب سے عریاں ہوگئی تہذیب کی کالی تحریر
لفظ در لفظ چھپے جاتے ہیں غیرت والے
ڈھونڈھ کرے گا مجھ کو مرے بعد ہر کوئی
آئندہ نسل کو یہ سزا دے کے جاؤں گا
آج بھی تہذیب کی سانسوں پہ پہرے ہیں بہت
چلمنوں کی اوٹ میں جذبے سلگتے ہیں بہت

ہمارے ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ بستے ہیں۔ اور ان کو جوڑے رکھنے کے لیے اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے۔ قومی یکجہتی کا یہ جذبہ الگ الگ تہذیب و روایت کے ماننے والوں کو ایک ساتھ باندھ کر رکھتا ہے۔ اس تعمیری جذبے کا ہر دل میں ہونا بے حد ضروری ہے نذیؔر کو اس کا خوب احساس ہے، اس لیے وہ سب کو مل جل کر رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور نفرت کے خاروں کو چاہتوں کے بیل بوٹوں سے سجانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

نفرت سے زمانہ کبھی مغلوب ہوا ہے
نفرت سے زمانے میں کوئی بات بنی ہے
آؤ گلے لگ جائیں یار
کیسے جھگڑے کیسا جھوڑ
نفرتوں کے خارزاروں سے نکل کر کوئی دن
چاہتوں کے بیل بوٹے دل کی دھرتی پر سجا

نذیر دنیا میں پھیلی ہوئی گندی سیاست کو بھی ملامت کا نشانہ بناتے ہیں اور عام انسانوں سے امید کرتے ہیں کہ وہ اس سے بچیں۔

تخت و تاج بدلتے ہوئے منظر ٹھہرے
خود کو سمجھو نہ مقدر کا سکندر یارو !
آندھیوں نے مرکزیت چھین لی
ٹہنیوں سے گر پڑے ناچار لوگ
جو بن چکا ہے علامت ردائے ظلمت کی

نذیر اس سے ہی عالم پناہ مانگے ہے
شہر میں آگ لگائیں گے سیانے مل کر
اور الزام دوانوں کی طرف جائے گا

نذیر اردو زبان کے عاشق وشیدائی ہیں۔اور اردو سے اپنی بے انتہا محبت کا اظہار وہ مختلف صورتوں میں کرتے رہتے ہیں۔

میں آج بھی فعول مفاعل پسند ہوں
مجھ کو نذیر آج بھی اردو سے پیار ہے

محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال عبارت کو خوبصورت بنا دیتا ہے اور شیرینی گھول دیتا ہے۔لیکن انہیں شعر میں استعمال کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔نذیر نے انہیں اپنے اشعار میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔

دودھ جلا کچھ ایسا ہوں
چھاچھ بھی پھونک کے پیتا ہوں
خوش ہیں اب ان کی سرسراہٹ پر
ہم نے جو آستیں میں پالے لوگ

نذیر نے اپنے اشعار میں صنعت تلمیح کا استعمال بھی بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

میں آئینہ ہوں نہ پتھر، مجھے تلاش نہ کر
مرے زمانے کے آذر مجھے تلاش نہ کر
وہ صلیبوں پہ سج گیا آخر
جس نے بھی خوئے سرمدی پائی
میں بھی اک یوسف ثانی ہوں مگر آہ نذیر
میرا دنیا میں خریدار نہیں ہے کوئی

نذیر نے اپنے اشعار میں استعارہ سازی سے خوب خوب کام لیا ہے۔دھوپ،سورج،تتلی،تنہائی،چٹان،ہرن،آئینہ،آگ،برگد،کشتی، پتوار،ریت،خواب،موسم،پیاس،سمندر،وہ استعارے ہیں جو اپنے معنی خیز انداز میں اشعار میں استعمال ہوئے ہیں۔

ریت کی سچائیاں مہلت اگر دیتیں مجھے
میں کھلی آنکھوں سے خوابِ آسمانی دیکھتا
کب نذیر اپنے عیب دیکھے گا
خود کو کب آئینہ کریں گے آپ
برہنہ پاؤں سفر کیسے ہم سے طے ہوگا
زمیں پہ آگ کی صورت بچھی ہوئی ہے دھوپ
تو سمجھتا ہے تیرے چہرے کا ہے دھبا عبث

کیوں سجا رکھا ہے پھر یہ آئینہ خانہ عبث
جدا باغ سے تتلیاں کیا ہوئیں
کہانی سنانے کا موسم گیا
ہوا پرائی ہوئی بے وفا ہوئی ہے دھوپ
کہاں پرندے سکھائیں گے بال وپر اپنے
روح میں چبھتی ہیں جب تنہائیاں
موسم گل میں بھی خوں روتے ہیں لوگ
موسمِ جوان دیکھ کر جاگیں بغاوتیں
ہر اک پرندہ بوڑھے شجر سے نکل گیا
چٹختی ریت پہ جلتے وجود کے ہاتھوں
غزالِ وقت فریبِ سراب میں گم ہے
پیاس ہونٹوں پر تڑپ کر کہہ گئی مجھ سے نذیؔر
ہر سمندر قطرۂ تشکیک ہے میرے لئے

ڈاکٹر داؤد کشمیری اپنے مضمون ''نذیؔر فتح پوری شعری ڈکشن اور استعاروں کا فنکار'' میں نذیؔر کی استعارہ سازی کے متعلق فرماتے ہیں۔

''نذیؔر نے کتابی موضوعات کو دہرانے کے بجائے جدید حسیت کے تازہ تجربات کو پیش کیا ہے۔اور یہی جدید حسیت اور تازگی استعاروں کے ذریعے ان کے اسلوب میں بھی سرایت کرگئی ہے۔''(۲۳)

نذیؔر نے اپنے اشعار میں ہندی الفاظ کو بھی بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔لفظ کا مفہوم اشعار میں گھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔

فصل کٹی تو دھان ملا
محنت کا وردان ملا
رہنے دے نذیؔر اوروں کے اب قصے کہانی
اپنی ہی کوئی اچھی کتھا ہو تو سنا چل
فن کی سیما کو پاکر فنکار نذیؔر
اپنے خوں میں اپنے ہاتھ ڈبولے گا

الفاظ کی تکرار سے شعر میں نغمگی پیدا ہوتی ہے۔نذیر نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے اشعار میں اسی تکرار سے نغمگی کا جادو جگایا ہے۔

پنگھٹ پنگھٹ لو کے جھونکے بکھری گاگر گاگر دھوپ
اب کے برکھا رت نے بانٹی میرے گاؤں میں گھر گھر دھوپ

پھر اس کے بعد اجالا ملے، ملے نہ ملے
جبینِ شام پہ اک چاند جگمگا رکھیے

مری کتاب کا ہر ایک باب روشن ہے
سطر سطر میں نیا انقلاب روشن ہے
گیت بدائی کا گا گا کر
شہنائی نے دل توڑا تھا

اگر ہم نذیرؔ کی غزلوں کا مختلف حوالوں سے مطالعہ کریں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ نذیر نے جانوروں پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ نذیرؔ نے جانوروں کا ان کی صفات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چاہے دیمک ہو یا سانپ، آہو ہو یا پرندے، ابابیل ہو یا پروانہ، یا پھر تتلی، جگنو، چڑیا، کوئل، یا پھر مور یہ سبھی جانور نذیرؔ کے اشعار کو معنوی رنگ عطا کرتے ہیں۔ جہاں تتلی اپنے رنگ بکھیرتی ہے اور بچپن کی یاد دلاتی ہے وہیں سانپ اپنی دورنگی فطرت دکھاتا ہے۔ کہیں کوئل کی کوک سنائی دیتی ہے تو کہیں مور کا حسن جلوہ گر ہوتا ہے۔ کہیں جگنوں اندھیرے میں روشنی پھیلاتے ہیں تو کہیں چڑیائیں تنہائی میں گیت سناتی ہیں۔

جن میں لکھا تھا پیار کا دستور
ان کتابوں کو کھا گئی دیمک
یہ سانپ بن کے ڈسے گا اک دن محافظوں کو
نکل گیا زد سے جب سنپولا تو میں نے جانا
ہم قلا نچیں یونہی نہیں بھرتے
خواب آہوں پلک پہ رکھا ہے
اتنے جال بچھائے ہیں تنقیدوں نے
فکر وفن کا ہر پنچھی پر بستہ ہے
مسمار اس لیے ہوئی محراب زندگی
مجبور ہو چکے تھے ابابیل اور میں
حفاظت کر نہیں سکتے جو اس کی
دیئے کو ایسے پروانے نہ دینا
بچپن کی شوخی سے بوڑھی سوچوں تک
تتلی کے پیچھے منڈلاتے لوگ ملے
اجالا ہو تو کہیں کچھ نظر نہیں آتا
اندھیری رات میں دکھتا ہے جگنوؤں کا جلوس
کچھ ایسے اس حمد کی گونجی صدا نذیر
چڑیوں کے ساتھ ساتھ شجر بولنے لگے

نذیرؔ کی غزلوں میں لفظ ''میں'' کے استعمال کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی اپنی ذات کے عرفان کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے اس ''میں'' لفظ کا استعمال کے ذریعہ وہ اپنی پہچان اپنے قارئین سے کرواتے ہیں۔

میرا میں جب مجھ سے خفا تھا
میں نے تمہارا ساتھ دیا تھا
ایک مرکز پر بہم ہوجائیں گے بودونبود
میرا ''میں'' مجھ سے بچھڑ کر جب ترا ہوجائے گا
جس میں لکھے ہیں انا کے مرثیے
ہاں اسی پستک کا دیباچہ ہوں میں
میں اگر پھول سا کھلا ہوتا
شاخ سے ٹوٹ کر گرا ہوتا
پہلے اپنی ذات کے اندر جھانکوں میں
پھر لوگوں کے عیب وہنر کو جانچوں میں
میں اپنی پیاس کا دیتا ہوں واسطہ تجھ کو
سراب ایسے سمندر مجھے تلاش نہ کر

نذیؔر کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب نظام صدیقی فرماتے ہیں :

''نذیؔر فتح پوری کی شاعری کا مرکزی استعارہ ارتفاع پذیر واحد متکلم ہے۔ جو آفاق بکتا رہے۔ وہ اپنی داخلی اور خارجی پوری کائناتی حدود کو اپنے معنویاتی، کیفیاتی اور جمالیاتی انسلاکات کے ساتھ شعری سطح پر منور اور مدین کرتے ہیں۔ اس کی سادگی میں بڑی پرکاری ہوتی ہے جو اپنا کام کرجاتی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔'' (۲۴)

نذیؔر نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں تعلّی سے بھی کام لیا ہے۔ نذیؔر کی اس عادت کے متعلق جناب نذیر احمد یوسفی فرماتے ہیں۔

''نذیو فتح پوری نے تعلّی کا شعر بھی کہا ہے۔ حالانکہ تعلّی بعض نقادان فن کے نزدیک قابلِ اعتراض قرار پاچکا ہے پھر بھی شاعر بعض نہیں آتے، اور شعر موزوں کرہی لیتے ہیں۔ نذیؔر فتح پوری کے یہاں بھی یہ حسن یا عیب متواتر ملتا ہے۔ (۲۵)

جناب عظیم راہی بھی اس بارے میں اس انداز میں اپنی رائے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری کی غزلوں میں محبوب کی تعریف سے زیادہ خود ان کی تعریف ملتی ہے جو ان کی غزلوں کی خصوصیت بھی ہوسکتی ہے یا ہوسکتا ہے کہ وہ برنارڈ شاہ کے اس قول پر عمل کرنے کے قائل ہوں کہ جب اپنی تعریف وتوصیف میں خود کرنے کا اہل ہوں تو یہ کام کسی دوسرے سے کیوں لیا جائے۔ ان تعریفوں میں شاعرانہ تعلّی کا رنگ تو ملتا ہے مگر مغالطہ کم ہی ہوتا ہے۔ اس لیے میں اس صنعت شعر کو ان کی غزلوں کا وصف خاص سمجھتا ہوں لوگ چاہے کچھ بھی سمجھیں۔'' (۲۶)

نذیؔر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر مدبر علی زیدی فرماتے ہیں۔

''نذیؔر فتح پوری ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہیں غزل نظم، دوہا، گیت، ماہیہ سبھی پر دسترس حاصل ہے۔ ان کا انفرادی لب ولہجہ جدت وتازگی لئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے اشعار میں واردات قلب کا اظہار بڑی دلکشی سے کرتے

ہیں ان کے کلام میں سہل ممتنع کی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ کہیں کوئی پیچیدگی یا دقت پسندی نہیں ہے۔ وہ ایک عوامی فنکار ہیں جو عوام کی زبان روزمرہ اور محاوروں میں ہی بات کرتے ہیں انفرادیت کی اہمیت ان کے نزدیک سب سے زیادہ ہے۔'' (۲۷)

جناب ایم یوسف ندیم بھی مدیر علی زیدی کے خیالات سے اتفاق رکھتے ہیں۔

''نذیر ایک ایسا گلدان ہے جس میں مختلف صلاحیتوں کے حسین وخوشنما پھول سجے ہوئے ہیں۔ ان پھولوں کی دلکشی رنگت اور بھینی بھینی خوشگوار خوشبو نگاہ و دل کو ایسی طلسمی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں سکون ہے طمانیت ہے مسرت ہے اور راحت ہے۔ وہ ایک شاعر ہے اور ایسا شاعر ہے کہ اس کے عناصر اربعہ شاعری کی سحر آفریں وادی سے گزر کر اس کے خمیر میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی لئے جب اس کے تخیل کی دلکش وادی سے الفاظ کا خوشنما لباس زیب تن کئے۔ گہرائی و گیرائی کے شیریں سروں میں گنگناتا ہوا کوئی شعر نمودار ہوتا ہے تو دیکھنے والوں کی نگاہیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔'' (۲۸)

جناب عتیق احمد عتیق جو نذیؔر کے استاد محترم ہیں انہوں نے بھی اپنے شاگرد کے کلام پر ان الفاظ میں رائے تفویض کی ہے۔

''قدرت نے نذیر فتح پوری میں وہ مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ جو انہیں ایک اچھا سچا اور مستقبل قریب میں بڑا شاعر بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ نذیر صاحب بیک وقت ادبی طور پر اور بھی بہت کچھ کیوں نہ ہوں، لیکن شاعر بڑے پیارے ہیں۔ ان کی فکری کاوشیں تخلیقی عنصر سے بھری پوری تو ہیں ہی زندہ و متحرک کلاسیکت اور آفاقیت کی امین بھی ہیں اور ''یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو باطل ہو نہیں سکتی'' (۲۹)

جناب معین الدین عثمانی نذیر کی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں۔

''نذیر صاحب بھی عام لوگوں کی دنیا میں جیتے ہیں، اینٹ اور پتھر کے درمیان نرم لفظوں کا پیکر سجاتے ہیں اور اپنے محسوسات اور مشاہدے کو لفظوں کی مئے میں کشید کر نذر قارین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہمیں زندگی کے قریب محسوس ہوتی ہے۔'' (۳۰)

جناب رونق شہری نذیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''نذیؔر فتح پوری اردو شعر و ادب کی ایک ایسی ہی متحرک شخصیت کا نام ہے جس کا ہر ایک لمحہ زندگی کے صرف خوش رنگ خدوخال پر غور و فکر میں ہی نہیں گزرتا بلکہ رنج و ملال کے کرخت لہجے کی ناشنیدہ آواز کو بھی سوالیہ نشان بنا کر پیش کرتا ہے'' (۳۱)

جناب معین الدین عثمانی اپنے مضمون ''ہمہ جہت شاعر نذیر فتح پوری'' میں نذیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''نذیر صاحب کی شاعری انسانی زندگی کی شاعری ہے اس زمین پر روزانہ رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو وہ پہلے ایک مخلص انسان کی نظر سے دیکھتے ہیں بعد میں اسے لفظی پیکر دے کر شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ موجودہ دور میں زندگی مسائل کا انبار اور پیچیدگیوں کا خیمہ بنی ہوئی ہے انہوں نے اپنی کھلی آنکھ سے زندگی کا مشاہدہ کیا اور بڑے ہی فنکارانہ انداز میں اس کا مظاہرہ بھی کیا۔ ان کے اشعار ایسے ہرگز نہیں

کہ قاری ان کو سرسری پڑھ کر گزر جائے بلکہ حقیقت کی ضرب اسے رک کر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے نذیر صاحب نے شاعری کے ذریعہ کبھی براہِ راست درس دینے کی کوشش نہیں کی۔''(۳۲)

پھر وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۔

''ان کی شاعری زندگی سے قریب تر ہونے کا سبب یہی ہے کہ وہ عام انسانوں کے درمیان انہیں کی طرح جیتے ہیں۔ان کا ذریعہ معاش بھی انہیں پتھر اور مٹی کے قریب لے جاتا ہے۔ان سخت چیزوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی ان کے ہاتھوں کی نرمی اور تازگی قائم ہے۔وہ قلم بڑے سلیقے سے سنبھالتے ہیں اور رات کی تنہائی میں جب چاروں طرف لوگ باگ دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے لوٹتے ہیں یہ مضبوط ہاتھوں والا شخص قلم کی نوک سے لفظوں کے موتی بکھیرتا ہے۔''(۳۳)

نذیرؔ کی استعارہ سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ فرماتے ہیں۔

''نذیر علامتوں کے شاعر نہیں ہیں۔اس لئے ان کی غزلوں میں کہیں بھی الجھاؤ کا احساس نہیں ہوتا وہ استعاروں کے مہر و ماہ سے اپنا دیوان سجاتے ہیں۔ان کی غزلوں میں یہ استعارے پیکر سازی کا کام دیتے ہیں ان کی غزلوں میں سماجی اور لمسی پیکروں کی کثرت ملتی ہے۔''(۳۴)

نذیرؔ فتح پوری کی شاعری سے متعلق مناظر ہرگانوی اپنے مضمون ''نذیر فتح پوری کا فن'' جو انہوں نے لمحوں کا سفر کے لیے تحریر کیا ہے میں فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری نیا جسم اور نئی روح رکھتے ہیں۔نئے زمانے کی نئی معنویت اور نیا اسلوب بھی ان کے یہاں ہے اور شعری تجربات اور زندگی کے تجربات کی ایک طویل داستان ان کی غزلوں میں چھپی ہوتی ہے چوں کہ وہ عصری شعور رکھتے ہیں اس لیے تجربات کی داستان میں انفرادیت نمایاں ہے۔تہذیب، ثقافت، اور روایت کا خون عصری شعور کی رگوں میں لہریں لیتا ہے اور نذیر فتح پوری کی غزل اپنی تہذیب، ثقافت اور روایات سے انہیں معنوں میں ہم آہنگ ہے۔ان کی غزلوں میں کوئی اجنبی فضا نہیں ہے اور نہ ہی ماورائے قیاس کوئی معاشرہ آباد ہے بلکہ وہ صنعتی اور سائنسی عہد کے شاعر ہیں۔مادہ و روح کے تصادم سے معاشرے میں شکست و ریخت، جبر و کراہ، کرب، بے چینی، اور انتشار کے جتنے زہر بھی دستیاب ہیں انہیں وہ اپنے سینے میں بڑے صبر و سکون و اطمینان سے اتارتے ہیں، پھر دھیرے دھیرے یہ زہر غزل کے قالب میں لوٹا دیتے ہیں۔''(۳۵)

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ۔

''نذیر فتح پوری کے ہاں زندگی اپنی پوری اصلیت اور حالات و عوامل کی پوری واقعیت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ طبقاتی جدوجہد کی کارفرمائی کے ساتھ سماجی ذمہ داری کے احساسات اور اقدار حیات کی عظمتیں بھی ان کے ہاں نمایاں ہیں۔''(۳۶)

نذیر فتح پوری کے اسلوب کے متعلق جناب مناظر عاشق ہرگانوی فرماتے ہیں۔

''نذیؔر فتح پوری کی غزلوں میں اعلیٰ قسم کی اسلوبیاتی خوبیاں ملتی ہیں۔ ان کے اسلوب کی تعمیر میں تین باتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نازک مزاج اور تجزیاتی آگاہ پسند ہیں۔ دوئم یہ کہ وہ دردوکرب کو سہل اور سادہ لفظوں میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ سوئم یہ کہ وہ لفظوں کی تکرار سے بھی صناعی کام لیتے ہیں۔ ان کے خلوص تیور اور شعری آہنگ سے ان کے اسلوب کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے نئے مسائل نئے تجربے اور نئے مشاہدے سے دوچار ہو کر لکھی جانے والی ان کی غزلیں وقت کا تقاضہ ہیں۔ ان غزلوں میں عصری آگہی ہے لیکن تیور نیا ہے۔'' (۳۷)

نذیؔر کی روایت پسندی کے متعلق جناب مناظر عاشق ہرگانوی فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری کی غزلوں میں طرزِ احساس کے نئے پن کے باوجود رچا ہوا کلاسیکی شعور ملتا ہے جس میں روایت کا استحکام اور جبر کی معنی خیزی نمایاں ہے۔ ان کے یہاں تہذیب ذات اور تناسب کا جو انداز موجود ہے۔ اس میں دبا دبا سا انسانی سوز دردمندی کی ایک مستقل کیفیت اور وضع احتیاط کی ایک خودکار کوشش ماحول سے مشروط ہے۔'' (۳۸)

نذیؔر نے اپنی شاعری میں ناپاک سیاست کو بھی حرف ملامت بنایا اس کے متعلق جناب عبدالاحد سازؔ کا ماننا ہے۔

''نذیؔر کے ہاں بھی اپنے عہد کے سماجی سیاسی کوائف اور فرد پر ان کے ردعمل کے پہلو کثرت سے ملتے ہیں ایک باخبر شاعر کے لیے ان موضوعات سے متصل ہونا فطری بھی ہے اور ناگریز بھی۔ لیکن زیادہ مستحسن بات یہ ہے کہ وہ ان علائق کے دائرے میں قید ہو کر نہیں رہ جاتے۔ انفس و آفاق کی دائمی رشتگی سے ان کا جمالیاتی ربط مستقل متحرک رہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ زندگی کو ایک راسخ عقیدے کی آنکھ سے بھی دیکھتے ہیں۔'' (۳۹)

نذیر کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب احمد کمالؔ پروازی اپنے مضمون ''نئی غزل کا پاسدار۔ نذیر فتح پوری'' میں فرماتے ہیں۔

''اردو غزل جس ذہن اور دل سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے، جس نوعیت کا دھڑکتا ہوا ذہن اور سوچتا ہوا دل اسے درکار ہے جس نرمی و آنچ، شعور و وجدان، قلندری و دانش کی یہ متقاضی ہے اس کی واضح تصویر نذیؔر فتح پوری ہیں۔'' (۴۰)

پروفیسر عنوان چشتی نذیؔر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''نذیؔر فتح پوری اُردو کے ان جیالے شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے زندگی کو برتا ہے۔ اور اپنے وجود کا تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے داخلی کوائف اور جذبات کو خارجی علامتوں، پیکروں اور لفظیات کے ذریعہ مجسم کیا ہے۔ اس عمل میں انہوں نے روایت سے روشنی اور تجربے سے تازگی حاصل کی ہے۔ یہی خصوصیت نذیؔر کو ان کے ہم عصروں میں اہم جگہ دیتی ہے۔'' (۴۱)

جناب یوسف ناظم نذیؔر کی شاعری کے متعلق اپنی رائے یوں بیان کرتے ہیں۔

''نذیؔر فتح پوری کہنہ مشق شاعر ہیں۔ جذبہ اور خلوص ان کے کلام کی شناخت ہے اتنے خشوش اور خضوع سے شعر

کہتے ہیں کہ شعر بولنے لگتے ہیں۔'' (۴۲)

ڈاکٹر ساحر شیوی نذیؔر کی شاعری پر کچھ اس انداز میں رقمطراز ہیں۔

غزلوں میں ان کی پایا نا بھرتی کا ایک لفظ
اک پُر اثر غزلخواں فتح پور کے نذیؔر
اردو کی ہر اک صنف پہ حاصل ہے دسترس
اک قابلِ سخنداں فتح پور کے نذیؔر
اردو جہاں میں ہوگئے ہیں ایسے ضوفشاں
انجم سے ہیں درخشاں فتح پور کے نذیؔر

(۴۳)

جناب دلدار ہاشمی جو نذیؔر کے رفیق خاص اور استاد دونوں ہی تھے وہ نذیؔر کی شاعری پر اپنی رائے اس قطعہ کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔

''خوب انداز ہے تیرا، تو شاعر بھی نرالا ہے
ادب کی سرزمیں پر آج تیرا بول بالا ہے
لہو دل کا پلا کر تو نے شعروں کو جلا بخشی
ترے ہی دم قدم سے آج محفل میں اُجالا ہے''

(۴۴)

ڈاکٹر قمر جہاں اپنے مضمون ''اُس پیکر افکار کی کھولیں گے قبا چل'' میں نذیر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتی ہیں۔

''غزلیات نذیرؔ کی سب سے اہم خوبی جو میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ نذیؔر نے اپنی شاعری کے ذریعہ نہ صرف اپنے قاری کے جذبات احساسات کو ہی Teceh کیا بلکہ اکثر اوقات ان کی رسائی قاری کے ذہن تک بھی ہوگئی ہے اور عظیم شاعری کی شاید یہ ایک اہم پہچان ہے۔'' (۴۵)

یہاں ہم نے نذیؔر کی غزل سے متعلق مشاہیرِ ادب کی قیمت آراء پیش کی ہیں۔ اگر چہ ہر نقاد کی رائے اپنے آپ میں انفرادی وصف رکھتی ہے لیکن نذیؔر کی غزل کو سبھی نے نہ صرف سراہا ہے بلکہ اس میں انفرادیت کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نذیؔر ترقی پسند تحریک کے بعد ابھرنے والے نئے غزل گو شاعروں میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔

نذیؔر فتح پوری نے غزل کو ہمیشہ پہلے مقام پر رکھا ہے۔ وہ جب بھی غزل کہتے ہیں کچھ نہ کچھ نیا کہنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ان کے تمام غزلیہ مجموعوں کا مطالعہ کر لیجئے۔ وہ کہیں اپنے آپ کو دہراتے نظر نہیں آتے۔ شاعری میں اور بطور خاص غزل میں ایسا انفرادی وصف نذیؔر کو ایک کامیاب غزل گو شاعر کے طور پر ایک مقام عطا کرتا ہے۔

نذیؔر فتح پوری کی آزاد غزل

اُردو ادب میں غزل وہ صنف سخن ہے جو ہر دل عزیز ہے۔ اور ہر پل ایک نئے تجربے سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ ایک نئی دنیا کو اپنے اندر جذب کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے، کسی بھی صنفِ سخن میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ غزل کا مقابلہ کر سکے۔ انسان دنیا کے تمام علوم و فنون (جو بظاہر دیکھنے میں بڑے دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔) کو پڑھ کر ایک حد تک مسرور ہوتا ہے لیکن بعد میں اسے اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ جبکہ غزل کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ غزل ہر پل، ہر وقت اپنے قارئین کو ایک ایسے خوبصورت جہاں کی سیر کراتی ہے جہاں سے کوئی بھی واپس لوٹنا نہیں چاہتا۔

علی گڑھ تحریک کے سبب اردو ادب کی زیادہ تر اصناف میں تبدیلی رونما ہوئی اس تحریک کا خاص مقصد اصلاحِ معاشرت اور علم کی ترویج تھا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ اور مولانا الطاف حسین حالیؔ کی کوشش کے سبب نظم کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اور غزل پر تنقید کی گئی۔ قوم کی فلاح و بہبود اور اخلاقی تربیت کے لیے غزل میں اصلاح کی تجاویز ڈھونڈی جانے لگیں۔ جس کے سبب غزل میں موجود ان سبھی برائیوں مثلاً مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا رجحان، مشکل صنف کاری، لفظی بازی گری وغیرہ سے پرہیز کیا جانے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی غیر مردف غزلیں رواج میں آئیں۔

حسرتؔ موہانی، عزیزؔ لکھنوی، شادؔ عظیم آبادی، آرزوؔ لکھنوی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، جگرؔ مراد آبادی، یگانہؔ چنگیزی یہ وہ نام ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ غزل کے پرانے تصور کو بدلا اور عشق و محبت کے حقیقی جذبات و احساسات کو غزل کے پیرائے میں بیان کیا اور اسے نیا رنگ و روپ عطا کیا۔ انہوں نے غزل میں محبوب کے روایتی تصور مثلاً محبوب کی بے وفائی اور اس کے ظلم و ستم کو بیان نہ کر کے عصرِ حاضر کے مسائلِ زندگی سے متعلق پریشانیوں کو بیان کیا اور اس کے ساتھ ساتھ مناظرِ قدرت کو بھی اپنی غزلوں کا موضوع بنایا۔ اور ہندوستانی معاشرت و تہذیب کو اپنی غزلوں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں حلقۂ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک نے اپنی اہمیت و افادیت کو اہلِ زمانے سے منوایا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء نے یہ بات محسوس کر لی کہ اگر ہمیں اپنا پیغام عوام تک پہنچانا ہے تو غزل سے بہتر ذریعہ نہیں ملے گا اور اس خیال کے زیرِ نظر سیاسی خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس کے برعکس حلقۂ اربابِ ذوق کے شعراء نے نئے نئے تجربے کیے۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، اور ساحر لدھیانوی جیسے شعراء نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعہ سیاسی، بغاوتی انقلابی خیالات کو عوام تک پہنچایا۔ اور ان خیالات کے بیان کے لئے نئے نئے استعارے اور نئے نئے زاویے ایجاد کئے ملک کے آزاد ہونے کے ساتھ ہی سیاسی حالات بھی بدل گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی غزل کو بھی تخلیقی اور نئی حقیقت پسندی سے جوڑ دیا گیا۔ غزل میں یہ تبدیلی لانے والوں میں اختر شیرانی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ابنِ انشاء عزیز حامد مدنی، جمیل مظہری، عبدالحمید عدم، یوسف الدین یوسف وغیرہ کے نام خاص طور سے شامل ہیں۔

۱۹۶۰ء کے قریب جدیدیت کی تحریک عمل میں آئی۔ اس تحریک نے غزل کی عصری آگہی پر خاص توجہ کی، زبان کی تبدیلی کے ساتھ فن میں نئے نئے تجربے کیے جانے لگے۔ اب غزلوں میں سیاسی مسائل سے آگے بڑھ کر انسانی وجود کی تلاش اور اس کے مسائل بیان کیے جانے لگے۔ نئے نئے استعارات و علامات کا استعمال کیا جانے لگا۔ عشق کے تمام احساسات جذبات اور محسوسات کو حقیقی انداز میں پیش کیا جانے لگا۔ جس کے سبب جدید اردو غزل اظہار کے نئے اسلوب کے ساتھ منظرِ عام پر آئی۔ اور اس کے ساتھ موضوعات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ اس صف کے شاعروں میں محمد علوی، احمد فراز، ظفر اقبال، شاذؔ تمکنت، محمد ایاز، مخمورؔ سعیدی، احمد مشتاق، عزیزؔ قیسی، منیرؔ نیازی، مجید امجدؔ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے آتے آتے جدیدیت کی تحریک ماند پڑنے لگی۔ اور اس کے بعد ہندوستان کے سماجی، سیاسی، اور عالمی منظر نامے میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ بے روزگاری، غریبی اور جہالت کے سبب، ملک کے حالات بگڑنے لگے۔ اب غزل میں بے روزگاری، دہشت

گردی، فسادات، ظلم ونا انصافی کے حالاتِ بیان کیے جانے لگے۔غزل کو مابعد جدید غزل اور مابعد جدیدیت کے نام دیئے گئے۔جو اپنے موضوعات اور اصطلاحات کے لحاظ سے پوری طرح واضح نہیں ہے۔الغرض یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جدیدیت کا دور ختم ہونے کے بعد غزل گوشاعروں پر کسی بھی طرح کی کوئی نظریاتی پابندی نہیں رہی۔وہ ہر بندش سے آزاد ہو گئے۔شعراء نے نئے نئے تجربے اور طرزِ اظہار کے ذریعہ نئے اسلوب کی راہیں ہموار کیں۔غزل کی ہیئت میں بھی تبدیلی کے امکان روشن ہوئے۔نثری غزل، اینٹی غزل کے دوش بدوش آزاد غزل نے بھی اپنا سر ابھارا۔

آزاد غزل کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے۔اس کے بانی مظہر امام ہیں۔ان کے علاوہ جن شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ان میں ڈاکٹر کرامت علی کرامتؔ، حرمت الاکرام، زرینہ ثانی، ڈاکٹر مناظر عاشقؔ ہرگانوی، ظہیرؔ غازی پوری، عتیق احمد عتیقؔ، نازشؔ پرتاپ گڑھی، کرشن کمار طورؔ، علیمؔ صبا نویدی، سلیم شہزاد، رشیدؔ اعجاز، علامہ یونس احمر، ظفر ہاشمی، فضا کوثری، یوسف جمال، فرحت قادری، شفیعؔ اللہ خاں رازؔ، کوثر ایاغ بدیع الزماں خاور، پروین کمار اشک، آزاد گلاٹی، ضیاء الانجم، حسن فیاض، اظہار مسرت، ظہیرؔ جعفری اور نذیرؔ فتح پوری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

''آزاد غزل'' جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہر قید سے آزاد ہے۔اس کے متعلق ڈاکٹر کرامت علی کرامتؔ کا خیال ہے کہ۔

> ''میری نظر میں آزاد غزل کا جواز محض یہ نہیں ہے کہ پابند غزلوں کو حشو وزوائد سے پاک کر کے اسے آزاد غزل کی شکل دی جائے بلکہ اس کا اصل جواز یہ ہے کہ ایسی جدید ہیئت جس میں وسعت فکر کا عنصر شامل ہو اور جو تنگنائے غزل میں سمٹ سکتی ہو نہ نظم کے پھیلاؤ میں گم ہو کر اپنی نزاکت برقرار رکھ سکتی ہو......اس کے اظہار کے لیے آزاد غزل کے سوا دوسرا کوئی وسیلہ ہے ہی نہیں۔'' (۶۴)

آزاد غزل کے اس نئے تجربے کو اکثر شعراء نے خوشی سے قبول کیا تو بہت سے لوگ اس کے حریف بن بیٹھے۔نذیرؔ نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنے آزاد غزل کے مجموعے ''غزل اندر غزل'' کے ساتھ اس میدان میں آگئے یہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ کا پیشِ لفظ ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے تحریر کیا ہے۔اس میں انہوں نے آزاد غزل کی نشاندہی کی ہے اس کے بعد نذیرؔ فتح پوری کی آزاد غزل کے متعلق ظفر ہاشمی کے خیالات شامل ہیں۔بعد ازیں دعا اور نعت شامل کی گئی ہیں۔

نذیرؔ آزاد غزل کے تمام اصولوں کو سختی سے اپنی غزلوں میں برتنے کے ساتھ ساتھ فنی محاسن کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ان کی اس اصول پسندی کی سند کرامت علی کرامت ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> ''نذیرؔ فتح پوری آزاد غزل کے تمام فنی اصولوں کی سختی سے پابندی کر رہے ہیں۔ان کے یہاں کہیں بھی اس قسم کی فنی بے راہ روی نظر نہیں آتی، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ان کی بندشوں میں چستی، زبان میں فصاحت بیان میں روانی، نیز شعری آہنگ میں ایسی دلکشی پائی جاتی ہے، جو آج کل پابند غزلوں میں بھی خال خال نظر آتی ہے۔'' (۴۷)

حالانکہ نذیرؔ نے اپنی آزاد غزلوں میں آسان عام فہم اور سیدھی سادی زبان کا استعمال کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی آزاد غزلوں میں خوبصورتی اور دلکشی بلا کی پائی جاتی ہے، اپنی آزاد غزلوں میں وہ سیدھی سادی بحریں اور سیدھے سادے الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن ان کو وہ ایسے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں کہ ان کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے کسی لغت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور ایک بار پڑھتے ہی شعر کا مفہوم ذہن نشین ہو جاتا ہے ان اشعار کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس کے اوصاف کا ہر اک قطرہ
لب بہ لب بیکراں سمندر ہے
کون سمٹا ہوا تھا مرکے دل کے گوشے میں تیرے سوا
اور پھیلا ہوا چار سو کون تھا
تو نہیں تھا تو پھر اپنے ہونے کا اعلان کرتا ہوا
انجمن انجمن کوبہ کو کون تھا
حادثے سے اب کے بھی تم بچ گئے
شکر کا سجدہ کرو
اتنی گہرائی کی باتیں کون سمجھے گا یہاں
اتنی گہرائی سے مت سوچا کرو
بڑی پرسوز ہے فکر زمانہ
نذیرؔ اندر ہی اندر جل رہا ہے
میں تو اس کو بھول گیا ہوں لیکن دل کو یاد ہے وہ
نس نس میں آباد ہے وہ

ان اشعار میں کہیں اوصاف کی نشاندہی ہے تو کہیں خدا کے ہر سمت میں ہونے کو موضوع بنایا ہے۔خدا ہماری روح میں بسا ہوا ہے۔کہیں خدا کی رحمت کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ ہی ہمیں ہر آفت اور مصیبت سے بچاتا ہے۔کہیں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں بہت درد وغم ہے جو انسان سکون سے زندگی گزارنے نہیں دیتے ہیں اور اس دنیا کی فکر میں شاعر اندر ہی اندر اپنے دل میں درد محسوس کرتا ہے۔

ان کے اشعار میں انتہائی کا کرب ہے۔کسی کے دور چلے جانے کا درد ہے۔لیکن ان سب کے باوجود وہ زندگی سے مایوس وناامید نہیں ہیں ان کے اشعار میں جہاں تنہائی کا اظہار ہے وہیں شعاع امید بھی نظر آتی ہیں۔جس طرح رات کے بعد صبح ہوتی ہے اسی طرح نذیر کے اشعار مایوسی وناامیدی سے نکلنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ان کا پرامید حوصلہ مایوسی پر غالب آجاتا ہے۔

دامنِ اُمید دے کر ہوا
سرد چنگاری کو شعلہ کر دیا
دل کی فصلیں دھوپ سے کب بچ سکیں
یوں تو بادل نے میرے کھیتوں پہ سایہ کر دیا
صبح سارے منظر بدل جائیں گے
صبر کرنا پڑے گا مگر رات بھر
روشنی کی داستاں لکھوں گا اپنے خوں سے
رات کی دہلیز پہ سورج اگاؤں گا بہت

یہی امید شاعر کو زندگی کی جنگ لڑنے اور فتح یاب ہونے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

احساس جدائی کسی بھی دل کو شاد نہیں کرتا ہمیشہ ناشاد ہی کرتا ہے اس احساس نے اکثر لوگوں کو تکلیف ہی پہنچائی ہے کبھی کسی کو خوشی کے لمحات میسر نہیں ہوئے غزل کے تقریباً تمام شعراء نے اس احساس کو اپنی غزلوں میں بیان کیا ہے اور سبھی نے مختلف انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

نذیؔر نے بھی اپنی غزلوں اور آزاد غزلوں میں جدائی کے احساس کو بڑے درد بھرے انداز میں بیان کیا ہے۔ان کے اشعار میں شدت کے ساتھ اپنے محبوب کے آنے کا انتظار اور اس سے جدائی کا غم موجود ہے۔کہیں وہ اپنے محبوب کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ اپنے محبوب سے جدائی کا غم سہیں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو بہت یاد بھی آئیں گے ۔

ہجر توں کے زخم سہہ لوں گا مگر

اشک بن کر تیری آنکھیں ڈبڈباؤں گا بہت

شہنائی نے جس دن اس کے گھر میں آنکھیں کھولی تھیں

میرے گھر سناٹا تھا

انسان کی زندگی میں جب اس کا کوئی اپنا نہ رہے،کوئی ایسا نہ بچے کہ وہ اس کے ساتھ اپنے درد و غم کو بانٹ سکے تو ان حالات میں انسان مایوسی کے اندھیرے میں گھر جاتا ہے اور اپنے آپ کو تنہائی میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے۔یہی تنہائی اسے چاروں طرف سے حصار میں لیتی ہے اسے سب سے الگ کر دیتی ہے۔

نذیؔر کی تصنیف ’’غزل اندر غزل‘‘ میں بھی کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں یہی تنہائی بسی ہوئی ہے۔ان اشعار میں اکیلا پن، مایوسی، تنہائی کے سبب من میں اترنے والا درد زندگی کی راہ میں کسی ہم سفر کی تلاش، زندگی کا خالی پن یہ تمام موضوع ان کے اشعار میں موجود ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

روشنی نے کرلیا تھا اپنا ہم سایہ مجھے

پھر اندھیروں نے اکیلا کر دیا

جو خموشی کی خلاؤں میں کبھی بھٹکا نہیں

اس سے بڑھ کر کوئی بے بہرہ نہیں

کب تک جھیلوں تنہائی کا کرب نذیؔر

کب تک ٹوٹوں بکھروں میں

دل ہے تنہا نہیں کوئی بھی ہم سفر

طول در طول ہے رہگزر

آج کے اس تیز رفتار زمانے میں جب کہ انسان کو کسی دوسرے کے دکھ اور تکلیف سے کوئی واسطہ نہیں رہا سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہیں۔لوگوں کے احساس اور جذبات مر چکے ہیں۔سب اپنے آپ کو برتر اور اعلی سمجھتے ہیں۔اور غیر میں برائیاں تلاش کرتے ہیں۔ جو کہ ایک غلط سوچ کا نتیجہ ہے۔انسان کی اس برائی کی طرف اشارے کرتے ہوئے نذیر لکھتے ہیں ۔

کسی کی جانب اٹھانا انگلی
خود اپنے آلودہ پیرہن کو نچوڑ بابا
پہلے اپنی ذات کے اندر جھانکوں میں
پھر لوگوں کے عیب وہنر کو جانچوں میں

نذیرؔ نے اپنی آزاد غزلوں میں نادر تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے۔اپنے ایک شعر میں انہوں نے خوشی کو اس بھکارن سے تشبیہہ دی ہے جو کسی کو کچھ نہیں دے سکتی۔جس طرح ایک محتاج انسان خود کسی کو کچھ نہیں دے سکتا اسی طرح سے نذیر خوشی کے لیے کہتے ہیں کہ خوشی تو خود دوسروں کی محتاج ہے اس کی جھولی میں خود کچھ نہیں تو وہ کسی کو دو پل کی خوشی دو پل کا سکون کیسے دے سکتی ہے۔

یہ خود بھکارن ہے کیا رکھے گی تیرے کٹورے کی لاج آخر۔
خوشی سے رشتہ نہ جوڑ بابا

ایک اور جگہ نفس کو نرتکی سے تشبیہہ دی گئی ہے اور بڑے ہی خوبصورت انداز میں سانسوں کے چلنے کو اس نرتکی سے تشبیہہ دی گئی۔جو وقت کی دھن پر اپنے قدم سے قدم ملاتی ہے۔

ہر نفس ناچتی نرتکی
بن گئی وقت کی راگنی نرتکی ''

نذیر نے اپنے اشعار میں صنعت تلمیح کو بھی بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے اس کی مثال ملاحظہ ہو ۔

کوفیوں کی زد میں ہوں
جان دینے کے سوا چارا نہیں
ہم لب دریا منائیں کیوں نہ جشن تشنگی
کوفیوں نے ختم پہرہ کردیا

زندگی مسلسل آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے، لگاتار اپنے آپ کو آگے بڑھنا ہی زندگی ہے جو شخص رک کر بیٹھ جاتا ہے اس کی زندگی میں روانی ختم ہو جاتی ہے، زندگی کی یہ حرکت ہی ہمیں زندہ ہونے کا احساس دلاتی ہیں، زندگی میں پیش آنے والی تمام پریشانیوں کو برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہی زندگی ہے۔نذیر نے ان احساسات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

''لہو کی گرمی سے زندگی کی علامتوں کے پیام جاگے
بنامِ طرزِ کلام جاگے
''زندگی کے نام پر صدمے اٹھاؤں گا بہت
اور پھر بھی مسکراؤں گا بہت
موت بھی لکھ گئی گھر کی دیوار پر
زندگی ہے بس اک لفظ نا معتبر ''
سرخ شعلوں سے خود کو بچاتے ہوئے

اپنے موسم سے جل جائے گی زندگی

ہمارے ملک ہندوستان کو ترقی کے لئے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ قومی یکجہتی ایکتا واتحاد ہے یہی وہ جذبہ ہے جو تمام ہندوستانیوں کو ایک لڑی میں پرونے میں مدد کرتا ہے اس جذبے کو برقرار رکھنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔نذیر بھی اس احساس کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں اور اس لئے وہ ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ ہم اگر ایک دوسرے سے لڑتے رہے تو نقصان ہمارا ہی ہوگا۔اور ہمارا ملک ترقی کے راستے پر گامزن نہیں ہو پائے گا ۔

دیکھنا ہو جاؤ گے خود زخم زخم

اپنی ہی پرچھائیوں سے مت لڑو

ٹیکنالوجی کے اس زمانے میں جہاں ترقی کے نام پر گاؤں اپنے باشندوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں یہاں کے لوگ ترقی کی ڈور میں گاؤں کو چھوڑ کر شہروں کی طرف رخ کررہے ہیں۔اور اپنے گاؤں کی تہذیب رفاقت ومحبت سب کچھ بھولتے جارہے ہیں۔خود نذیر بھی فکر معاش کی تلاش میں اپنے گاؤں کو چھوڑ کر پونہ آگئے۔مگر وہ اپنے گاؤں کو وہاں سے جڑی ہوئی یادوں کو الگ نہیں کرپائے اور لگاتار دہراتے رہے۔

شہر سے ہم گاؤں جب جب آئیں گے

کھیت کی پگڈنڈیوں پر گیت بوئے جائیں گے

پیڑ پیپل کا بنے گا سائباں

دھوپ کی بارش سے ہم محفوظ تو ہوجائیں گے

گاؤں کی تہذیب پیاری ہے ہمیں

ہم جہاں جائیں گے قصے گاؤں کے دہرائیں گے

دکھ کی ٹہنی دل کا پنچھی عریاں دھوپ

اکثر خواب میں دیکھوں میں

یہ چلتے پھرتے تمام پتھر تیرے ہی در پر جھکے گے اک دن

ہے شرط اپنی انا کے پتھر کو توڑ بابا

نذیرؔ نے اپنی آزاد غزلوں میں علامت نگاری کا بھی استعمال کیا ہے۔لیکن ان علامتوں پر ابہام کا کوئی گمان نہیں ہوتا۔سارا منظر آئینے کی طرح صاف نظر آتا ہے۔مثال ملاحظہ ہو۔

دل کی انگنائی سرسبز وشاداب تھی کس لیے

کشت جاں میں مہکتا ہوا وہ گل رنگ وبو کون تھا

دل کی فصلیں دھوپ سے کب بچ سکیں

یوں تو بادل نے مرے کھیتوں پہ سایا کردیا

آنکھ میں بھر کر اجالوں کے خطوط

خواب کی پگڈنڈیوں نے کیوں اندھیرا کردیا

آزادغزل میں بھی فنی اصول مثلاً روانی، بندشوں کی چشتی، زبان میں فصاحت سادگی، شیرینی، نغمگی وغیرہ کا نذیؔر نے چابکدستی سے استعمال کیا ہے ان کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کرامت علی کرامت لکھتے ہے۔''

''بہرکیف مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ نذیر فتح پوری آزادغزل کے تمام فنی اصولوں کی سختی سے پابندی کررہے ہیں ان کے یہاں کہیں بھی اس قسم کی فنی بے راہ روی نظر نہیں آتی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ان کی بندشوں میں چشتی زبان میں فصاحت بیان میں روانی نیز شعری آہنگ میں ایسی دلکشی پائی جاتی ہے جو آج کل پابندغزلوں میں بھی خال خال نظر آتی ہے۔'' (۴۸)

ڈاکٹر کرامت علی کرامت نذیر کے شعری مجموعے ''غزل اندر غزل'' پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ''غزل اندر غزل'' آزادغزلوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں پہلی بار آزادغزل کے تمام فنی اصولوں کوملحوظ خاطر رکھنے کی محتاط کوشش کی گئی ہے۔'' (۴۹)

اس تصنیف پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے خیالات کچھ اس طرح کے ہیں۔

''غزل اندر غزل میں انفرادی سطح پر نذیر فتح پوری کی شعری صلاحیت زبردست تخلیقی اپج رکھتی ہے۔ انہوں نے عصری صورت حال کو نئے اور وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جن سے ہیئتی تجربے کی بنا پر ان کے شعری اظہار کے عمومی رنگ اور میلان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (۵۰)

نذیؔر کی آزادغزلوں کی سادہ بیانی کے متعلق ظفر ہاشمی کا خیال ہے کہ

''نذیؔر کی آزادغزلوں کی کامیابی کی وجہ ان کی زبان ہے یعنی انہوں نے شستہ تازہ کار، سادہ اور عام فہم زبان میں بھی جادو جگایا ہے۔'' (۵۱)

نذیؔر کی آزادغزلوں میں الفاظ کی تکرار اور نغمگی بھی بے حد خوبصورت انداز میں ملتی ہے مثال ملاحظہ ہو۔

نغمگی

اپنی دھند سے باہر مجھکو آنے دے
پھر سمتوں کو کھوجوں گا

تکرار

کب تک جھیلوں تنہائی کا کرب نذیؔر
کب تک ٹوٹوں بکھروں میں

نذیؔر نے اپنے ایک شعر میں زندگی کو طفلِ معصوم سے تشبیہہ دی ہے۔

دیکھ کر تتلیوں کا تھرکنا نذیر
طفل معصوم جیسی مچل جائے گی زندگی

کہیں کہیں نذیر نے خطابیہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔

اپنے ہی سودائیوں سے مت لڑو
میری مانو! سربریدہ بھائیوں سے مت لڑو

نذیرؔ نے آزاد غزل لکھنے کے ساتھ ساتھ بعض شعراء کی آزاد غزلوں پر تضمین بھی لکھی ہے جن میں علامہ نادم بلخی مظہر امام، کرامت علی کرامت، عتیق احمد عتیق، علامہ یونس احمر، مناظر عاشق ہرگانوی، صابر فخر الدین، اظہار مسرت، رشید اعجاز، ظہیر غازی پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

علامہ نادم بلخی کی حمد یہ غزل پر نذیر کا تضمین لکھنے کا انداز دیکھیے ۔

میری فکر نے جو پائی ہے وہ جولانی۔ تیری دین

لفظ و معنی...... تیری دین

حمد و ثنا کی طرز پرانی...... تیری دین

''کی نادم نے تیری یہ جو مدحت خوانی...... تیری دین

میرے مولی...... اس کی بانی...... تیری دین''

نذیرؔ نے مظہر امام کی آزاد غزل جسے اردو کی پہلی آزاد غزل ہونے کا شرف حاصل ہے پر بھی تضمین لکھی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

لہروں لہروں ڈولتی نیا کا سپنا آپ ہیں

چپوؤں کی کوکھ میں کروٹ بدلتے عزم کا بیباک جذبہ آپ ہیں

بادبانوں کا پھریرا آپ ہیں

''ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا آپ ہیں

عشق طوفان ہے سفینہ آپ ہیں''

نذیرؔ نے ڈاکٹر کرامت علی کرامت کی آزاد غزل جس کی ردیف ''مہک'' ہے پر بھی بہت خوبصورت تضمین کہی ہے ۔

ہر طرف پھیلی ہوئی تھی موسمِ غم کی طرح

چشم پرنم کی طرح

پل میں ہے شعلہ صفت اور پل میں شبنم کی طرح

''یہ کوئی بہروپ ہے جس کا بدلتا جا رہا ہے رنگ موسم کی طرح۔

ہے کبھی یہ لاجوروی تو کبھی ہے لال اور پیلی مہک''

نازکی کلیوں کی ہے یا لالہ و گل کا غرور

ہے عروسِ گلستاں کی آرزوؤں کا ظہور

یا کسی احساس کے آوارہ جھونکے، یا تخیل کے طیور

'ہے کوئی آوارہ تتلی جو فضا کو بخشتی ہے رنگ و نور

یا کہ ڈالی ڈالی ٹہنی ٹہنی پر اڑتی مہک''

نذیرؔ نے عتیق احمد عتیق کی آزاد غزل پر بھی تضمین لکھی ہے یہ وہ آزاد غزل ہے جس پر سب سے پہلے تضمین لکھی گئی اس غزل کے کچھ بند ملاحظہ ہو۔

چبھن کی لذت سہار لیتے

گلوں کے بدلے میں خار لیتے

سکھوں کی خواہش کے نرم سائے جو صحن دل میں اتار لیتے

''دکھوں کے موسم گزار لیتے

تو ہم مقدر سنوار لیتے''

گلوں کے شیدا کلی کلی کی چبھن کے والی

مہکتے موسم کے پاسباں کیا! چہکتی ہر انجمن کے والی

روش روش پر کھلی بہاروں کے ہر نئے بانکپن کے والی

''جو بس میں ہوتا تو دن دہاڑے چمن کے والی

ہری بھری رُت کے پیرہن تک اتار لیتے''

علامہ یونس احمر کی آزاد غزل پر بھی نذیر نے تضمین کہیں ہے اس تضمین کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

اس طرح چھائی ہوس کی تیرگی

زندگی سے ہو گئی خالی ہر اک پاکیزگی

کیسے کیسے روپ دکھلاتی رہی

''چیل کوّے دن میں شب میں آدمی

جیسے عصمت کی کسی دیوار پر پہرہ نہ تھا

نذیؔر نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی آزاد غزل پر بھی تضمین کہی ہے۔جس کے ایک بند میں ان کا انداز بیان ملاحظہ کریں۔

شبنم کی برسات نے منھ کی کھائی تھی

سورج کی یلغار نے چاروں جانب دھوم مچائی تھی

کرن کرن ہرجائی تھی

''جلتی دھرتی کی چھاتی پر اک پیاسی انگڑائی تھی

آوارہ آکاش پہ کس نے چادر سی پھیلائی تھی''

ظفر ہاشمی کی آزاد غزل پر بھی نذیر نے تضمین کہی ہے۔

امید کا اک دیپک گو ہم نے جلایا تو

خوابوں کو جگایا تو

دیوار میں جا سویا دیوار کا سایا تو

''سورج بھی نشیبوں میں ہوا آخر وہ گھر بھی نہ آیا تو

بے چین نگاہیں تھیں، بدمست ادائیں تھیں زہریلی ہوائیں تھیں۔

نذیؔر نے صابر فخر الدین کی آزاد غزل پر بھی ایک خوبصورت تضمین کہی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

مجتہد بن، قدرِ آفاقی کا ہر امکان بن

مخزنِ علم و ہنر بن، آگہی کی کان بن

صاحبِ عرفان بن

''غیر کی تسکین کا سامان بن

یعنی اک انسان بن''

نذیؔر نے ڈاکٹر اظہار مسرت کی آزاد غزل پر بھی تضمین کہی ہے چونکہ دونوں کا تعلق راجستھان سے ہے اس لیے اس ان مصرعوں میں جو لفظیات استعمال ہوئی ہیں وہ راجستھان ہی کے موسم منظروں کا احساس دلاتی ہیں۔

خشک ہے دریا سمندر اور سوکھی ہے ندی

دن بھی پیاسا اور پیاسی رات بھی

ان سلگتے ریگزاروں میں خدائے زندگی

''یوں کمی محسوس ہوتی ہے تیری

جیسے کوئی تحفۂ نایاب دے کر چھین لے''

نذیؔر نے رشید اعجاز کی آزاد غزل پر بھی تضمین لکھی ہے۔ رشید اعجاز نذیر کے ہم عصر تھے اور پونہ میں نئی شاعری کے نمائندہ شاعر بھی تھے۔

کوئی دستک، کوئی آہٹ، کوئی سانکل کوئی در

کوئی احساس سی بگولہ داد گر

کس کا پیکر دیکھ کر

''جو دریچے وا ہیں وہ ہیں کس ہوا کے منتظر

بند ہیں جو کھڑکیاں کس کے لئے ''

ظہیر غازی پوری کی آزاد غزل پر بھی نذیر نے تضمین لکھی ہے مثال ملاحظہ ہو۔

افکار کے سورج کی شعاعوں سے پگھل کر

سوچوں کے دہکتے ہوئے انگاروں میں جل کر

جتنے ہیں پرانے وہ سب انداز بدل کر

ہر دائرہ فن سے کسی روز نکل کر

احساس اماں پائے تو آزاد غزل کہہ''

متعدد شعرائے کرام کی آزاد غزلوں پر نذیؔر کی تضمینات کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے کہ نذیؔر نے جن اشعار پر تین تین

مصرعوں کا اضافہ کیا ہے وہ ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہوگئے کہ ایک ہی شاعر کی تخلیق معلوم ہوتے ہیں۔تضمین کی یہ خوبی دوسرے شعراء میں کم ہی ملتی ہے، واقعی تضمین ایک مشکل فن ہے،اس کے لیے پوری تخلیقی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔قدرت نے یہ ہنرمندی نذیرؔ کو ودیعت کی ہے۔نذیرؔ نے چند پابند غزلوں پر بھی خوبصورت تضمین کی ہے، غالب کی غزل پر تضمین کرنا واقعی جوئے شیر حاصل کرنے کے جیسا ہے،نذیر نے غالب کی ایک مشکل ترین غزل پر تضمین کرنے کی جسارت کی ہے،ہم یہاں پوری غزل کی تضمین پیش کرتے ہیں،نذیرؔ نے غالبؔ کی لفظیات سے اپنی لفظیات کو ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔اور بہت رواں مصرعے پیوست کیے ہیں۔

تضمین بر غزل غالبؔ

احساس کیسا دل پہ ،یہ کیسا اثر ہے آج
ویرانیوں کا خوف ہے کانٹوں کا ڈر ہے آج
اک ایک شاخ دل پہ خزاں کی نظر ہے آج

”گلشن میں بندوبست بہ رنگ دیگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج“

اتنا نہ خود نمائی کا کر اہتمام چل
صبح نہ چل سکے گا تو پھر وقتِ شام چل
چل اے جنوں پسند ذرا تیز گام چل

”اے عاقبت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلاب گر یہ درپئے دیوار ودر ہے آج“

شعلوں میں اپنے آپ کے جھلسا بدن تمام
دل کی تپش سے خاک ہوا پیرہن تمام
جل جل کے راکھ ہوگیا صحن چمن تمام

''کرتی ہے عاجزی سفر سو جتن تمام
پیراہن خسک میں غبارِ شرر ہے آج''

یہ کون منتظر ہے یہ کس کا ہے انتظار
یہ کون کس کے ہجر میں رہتا ہے اشک بار
رقصاں ہیں دل میں کس کی تمناؤں کے شرار
''ہوں داغ نیم رنگیٔ شامِ وصالِ یار
نورِ چراغ بزم سے جوش سحر ہے آج''

(نذیؔر کی یہ تضمین ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی کے اپریل ۲۰۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے)

نذیؔر کے شعری مجموعے ''غزل اندر غزل'' کے متعلق ڈاکٹر عظیم راہی فرماتے ہیں۔

''غزل اندر غزل ۱۹۸۸ء کے عنوان سے مجموعہ منظر عام پر لا کر ادبی دھما کہ کیا حالانکہ آزاد غزل کا تجزبہ بری طرح نا کام ہو کر محض تماشہ ثابت ہوا لیکن نذیر فتح پوری دل برداشتہ نہیں ہوئے بلکہ اپنے تجربوں کے سلسلے کو جاری رکھا اور دوسری زبانوں کی اصناف گیت، دوہے اور ماہیوں میں بھی طبع آزمائی کی۔'' (۵۲)

ڈاکٹر امام اعظم اپنے مضمون '' آزاد غزل کی صحیح سمت کا شاعر نذیؔر فتح پوری'' میں نذیر کے شعری مجموعے ''غزل اندر غزل'' پر اپنی رائے تفویض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

''نذیؔر فتح پوری نے آزاد غزل کو نہ صرف ایک نئی صنف سخن سمجھ کر اس میں تجربہ کیا بلکہ یہ فارم انہیں اپنے افکار وخیال کو ادا کرنے کا اچھا ذریعہ محسوس ہوا۔ اس لیے انہوں نے صرف ایک دو غزلیں کہہ کر اس صنفِ سخن میں اپنا نام درج نہیں کرالیا بلکہ مجموعہ شائع کر کے جذباتی لگاؤ کا ثبوت بھی پیش کیا۔'' (۵۳)

جہاں نذیر نے دوسرے حضرات کی غزلوں پر تضمینیں کہیں ہیں وہیں ان کی غزلوں پر فضل افضلؔ اور خالد رحیمؔ کی تحریر کردہ تضمین سے ایک ایک بند ملاحظہ ہو۔

فضل افضل:۔

پریم رس کا راگ بھنورے گائیں گے
شاخ دل پر پھول بھی مسکائیں گے
سیج پر گوری کا من بھرمائیں گے
''شہر سے ہم گاؤں جب جب آئیں گے
کھیت کی پکڈنڈیوں پر گیت بوتے جائیں گے''

(نذیر فتح پوری۔شخص،شاعراور مدیر۔ص ۲۱۵)

خالدرحیم۔

میں جانتا ہوں حد سے سوا دے رہے ہیں لوگ
ہر ہر قدم پہ دشتِ بلا دے رہے ہیں لوگ
حیرت زدہ ہوں کیسی فضا دے رہے ہیں لوگ
خود آگہی کی مجھ کو سزا دے رہے ہیں لوگ
دنیا سے میرا نام مٹا دے رہے ہیں لوگ

(نذیر فتح پوری شخص شاعر ومدیر۔ص ۲۱۹)

☆☆☆

نذیرؔ فتح پوری کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری

اُردو کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں ہر اصناف کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ پھر چاہے وہ غزل ہو، نظم ہو، قصیدہ ہو، مرثیہ ہو، رباعی ہو یا پھر کوئی دوسری شعری اصناف، ان تمام اصنافِ سخن میں حمد ونعت کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ نذیرؔ نے بھی اپنی تصنیف ''ثنائے جلیل'' اور ''اکرام'' میں انہیں اصناف میں خدا اور اس کے رسول سے اپنی پاک محبت کا اظہار کیا ہے۔

''ثنائے جلیل''حمد، دعا اور مناجات پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف کا انتساب نذیر نے حضرت محمدؐ کے نام یہ کہہ کر کیا ہے کہ ''خدا سے ملایا مجھے آپؐ نے''

یہ کتاب ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۵۱ دعا، حمد، اور مناجات مختلف عنوان سے شامل ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ ''نذیر فتح پوری کی حمدیہ اور مناجاتی شاعری'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کے بعد ''کچھ اس کتاب کے بارے میں'' کے عنوان سے مسعود احمد مجددی اکملؔ سعید احمد مجددی شاہدؔ اور اسعد احمد مجددی اسدؔ نے اپنے خیالات رقم کیے ہی۔ کتاب کے آخر میں حمدیہ ماہیے اور قطعات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے پہلے ۱۹۹۸ء میں مشترکہ طور پر ''اکرام'' کے نام سے نعت کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع ہوا تھا جس میں دلدار ہاشمی، ریاض بجنوری اور نذیرؔ کا نعتیہ کلام شامل تھا اس مجموعے میں نذیر کی ۴ نعتیں ایک آزاد نعت اور پانچ نعتیہ ماہیے شامل ہیں۔

نذیر نے بھی اپنی تصنیف ''ثنائے جلیل'' میں مالکِ حقیقی کی حمد وثنا میں اپنے دلی احساسات وجذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے۔ اللہ اس کائنات کا خالق ہے اسی نے اس کائنات کی ہر شہ کو تخلیق کیا۔ وہی سب کا مالک ہیں۔ جاندار اور بے جان تمام چیزیں اسی نے بنائی ہیں خدا کی انہیں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نذیر کہتے ہیں۔

کتاب تیری قلم تیرا، تیرے حرف وصدا
ورق ورق پر تری داستان ہے یارب

خدا کو کسی پیکر میں نہیں ڈھالا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی دنیا کی بنائی ہوئی ہر شہ میں اسی کا عکس نظر آتا ہے۔ انسان چاروں طرف سے مشکلوں اور پریشانیوں میں گھرا ہوتا ہے اور ان مصیبتوں سے اگر کوئی آزاد کراسکتا ہے تو وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ اللہ بے جان چیزوں کو بھی جان عطا

کرنے والا ہے۔اور اسی خدا نے شاعر کے اشعار کو بھی اپنا نور عطا کر کے چمکا دیا ہے اسی عنایتِ خالص کے لیے نذیر بھی خدا کے شکر گزار ہیں۔

میرے شعر کہاں تھے اتنے چمکیلے
سچ پوچھ تو سارا جو ہر اس کا تھا

دنیا کی تاریک راہوں میں زندگی بسر کرنے کے لئے ایک روشن ستارے کی ضرورت درپیش آئے گی اور ان مشکل راہوں میں وہ روشن ستارہ حضور اکرمؐ کو بتایا گیا ہے۔

رستے کی تاریک دشائیں میری تھیں
روشن قدموں والا رہبر اس کا تھا

خدا ہمارا مددگار ہے وہی ہمیں پالنے والا ہے جب تک وہ نہ چاہے ہم کسی بھی شہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

میرے ہونٹوں پر رکھی تھی پیاس مری
ندی نالہ تال سمندر اس کا تھا

خدا کی وحدانیت میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے اور ہم سب اس کی بندگی میں مشغول ہیں اگر ہم کسی دکھ درد میں مبتلا ہیں تو ہمارے زخموں پر مرہم وہی رکھتا ہے۔

میرے زخموں پر رکھے گا اک دن آکر مرہم بھی
صدقے جان اسی کی ہے اور دل بیمار اسی کا ہے

خدا ہمارا رب ہے اور اسی کی معبودیت پر ہمارا مکمل ایمان ہے۔دنیا کی تمام مخلوقات اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں۔

اسی کی ذات کی تفسیر کررہے تھے سب
کتاب اس کی تھی اہل کتاب اس کے تھے

اللہ ہمیں صحیح راستہ دکھانے والا ہے اگر ہم گمراہی کے راستے پر گامزن ہیں تو وہی ہمیں راہ نیک پر چلانے والا ہے۔اسی کا کرم ہمیں نیک راہ کا انتخاب کرنے میں مدد کرتا ہے۔

ٹیڑھی میڑھی ساری راہیں میری ہیں۔
سیدھا سچا راستہ پیہم اس کا ہے

ہماری زندگی اسی کی مرضی سے چلتی ہے اسی کی مرضی سے ہی ہم ہر فیصلہ کرتے ہیں اور وہی ہمیں صحیح فیصلے کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔

اپنی مرضی سے قدم کیسے اٹھائے گا نذیرؔ
راستے سارے اس کے ہیں سفر بھی اس کا

خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے انسانوں میں کسی کو اللہ نے خوب مال و زر دیا ہے تو کوئی غریبی کے حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے مگر ان سب کے باوجود وہ کسی بھی بنا پر انسانوں میں فرق نہیں کرتا اور اپنی رحمت کا سایہ سب پر مساوی بنائے رکھتا ہے۔

تیری نظروں میں کوئی فرق نہیں
یعنی ہر خاص و عام تیرا ہے

اللہ اپنی بنائی ہوئی مخلوقات میں سب کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ رکھتا ہے اور اسی لئے وہ سب کا محافظ ہے اس کی محافظت میں ہم سب خیریت سے ہیں چاہے کوئی ہمارا کتنا بھی برا چاہے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔اسی کے ساتھ ساتھ خدا فیاض بھی ہے جسے ایک بار اپنی رحمت کے سائے میں لے لے وہ زمین سے آسمان ہو جاتا ہے۔

وہ محافظ تو خوف کیا ہم کو
لاکھ بیٹھے کوئی لگا کرگھات
یہ تو اس نے مجھے نواز دیا
ورنہ کیا تھی بھلا مری اوقات

اس دنیا میں جہاں لوگوں کے احساس مر چکے ہیں۔جہاں کوئی کسی کے جذبات کی قدر نہیں کرتا وہاں خدا ہی ہے جو ہمارے غم کو پہچانتا ہے اسے سنتا ہے ہماری تکلیف کو دور کرتا ہے۔

خدا کو چھوڑ کے اس بے حسوں کی بستی میں
ہمارے غم کا یہاں کون سننے والا ہے

نذیؔر اپنی تحریروں کو خدا کی تخلیق بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔کہ میرے دل میں جو بھی خیالات طوفان کے مانند اٹھتے ہیں اسے تو ہی خوبصورت پیکر عطا کرتا ہے۔

الٰہی خوبصورت پیکروں میں ڈھال دے اس کو
ہمارے دل میں جو تخلیق کا طوفان اٹھتا ہے

نذیؔر نے اس تصنیف میں کچھ حمدیہ ماہیے بھی تحریر کیے ہیں ان ماہیوں میں خدا کی تعریف بہترین انداز میں کی ہے،ان ماہیوں میں وہ عرض کرتے ہیں کہ یا خدا میری زبان پر ہمیشہ اللہ اکبر کا ورد رہے۔تو ہی محتاجوں پر کرم کرنے والا ہے،تو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے، مجھے علم کی دولت سے سرفراز کر دے۔تو ہمارے ہر دکھ درد سے واقف ہے، تجھ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، دنیا کی تمام خوبصورتی مثلاً کلیاں، پھول، باغ سب تیرے ہی دم قدم سے خوبصورت ہیں۔اے خدا اگر تیری رحمت کا سایہ دنیا کے تمام لوگوں کے سر سے اٹھ جائے تو کوئی بھی سکون سے نہیں رہ پائے گا پہاڑوں پتھروں یہاں تک کہ سبزے میں بھی تیرا ہی جلوہ نمایا ہے۔

”کس دل سے دعا مانگوں غنچوں میں تیری بو ہے
تجھ پہ عیاں ہے سب باغ کا مالک تو
کیا تجھ سے خدا مانگوں“ کلیوں میں تو ہی تو ہے“

خدا واحد ہے اس کے حکم پر ہی نظام کائنات چل رہا ہے۔وہی ہر ایک کو حکم دیتا ہے اور اسی کے حکم پر دنیا کی ہر شے وقت کی پابندی سے اپنے فرض کو انجام دے رہی ہے۔

نہ دے گا چاند ستاروں کو تو اجازت تو
اندھیری رات کو روشن یہاں کرے گا کون

خدا رحیم وکریم ہے۔ وہ اپنے ہر بندے کی خبر گیری کرتا ہے زمین تا آسمان اس کی کرم فرمائیوں اور نوازشات کے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔

کرم وہ کرتا ہے جب بھی سسکتی دھرتی پر
تو گرم ریت سے چشمے ابال دیتا ہے

جو بندہ اپنے برے افعال کی وجہ سے معتوب قرار دیا جاتا ہے اور خدا کی نظر التفات سے محروم کر دیا جاتا ہے تو دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اسے جائے پناہ مل جائے۔

پھر اس کو کوئی بھی سایہ کہیں نہیں ملتا
وہ اپنے سائے سے جس کو نکال دیتا ہے

خدا قادر مطلق ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کی مرضی سے چلتی ہے۔ ''عروجِ صبح'' اور ''شامِ زوال'' اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔

بدلتے رہتے ہیں موسم اسی کی مرضی سے
عروجِ صبح کو شامِ زوال دیتا ہے

نذیرؔ نے خدا کی تعریف میں ایک طویل حمد غزل کے انداز میں تحریر کی ہے اس کا ہر شعر خدا کی قدرت اور اس کی عنایتوں اور شفقتوں کا اظہاریہ ہے۔ یہ حمد ان کے شعری مجموعے ''سفر مدام سفر'' میں بھی شامل ہے۔ اشعار ملاحظہ ہو۔

میں خوش ہوں اپنے پسینے کی چند بوندوں پر
مرا خدا مجھے رزق حلال دیتا ہے
ہر ایک شام کو دیتا ہے رات کے جلوے
ہر ایک رات کو صبحِ وصال دیتا ہے
سفر میں رکھتا ہے آفاق کے پرندوں کو
جنوب کچھ کو تو کچھ کو شمال دیتا ہے
بساطِ دہر بچھا کر وہ کتنی خوبی سے
ہر ایک مہرے کو مرضی کی چال دیتا ہے
جدا طریقے وہ رکھتا ہے نا خدائی کے
بھنور سے آگے بھی کشتی نکال دیتا ہے
لباس زرد کی تقسیم اس کے ہاتھ میں ہے
جو سوکھے پیڑوں کو سبزے کی شال دیتا ہے

نعت:۔

نعت گوئی وہ صنف ہے جس کے ذریعہ حضور اکرمؐ سے محبت وعقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ نذیر نے بھی نعت کہہ کر اپنی عقیدت ومحبت

کا اظہار کیا ہے لیکن یہ فن تلوار کی دھار پر چلنے جیسا ہے۔جس کے متعلق نذیر خود اعتراف کرتے ہیں۔

''نعت کہتے وقت اور نعت کہنے کے بعد ایک انجانے سے خوف کی لہر دل و دماغ میں کروٹ لینے لگتی ہے۔کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ کہاں میری زبان وقلم اور کہاں اس مقدس ہستی کا بیان جس کی توصیف خدا نے اپنے کلام میں کی ہے۔''(۵۴)

نذیر کو حضور اکرم سے بے حد محبت ہے اور اسی کے سبب مدینے کی زمین بھی انہیں جنت سے حسیں معلوم ہوتی ہے اور اس زمین کے ذرے ذرے میں وہ خدا کے حسن کی جلوہ گری محسوس کرتے ہیں

مدینے کی زمیں خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے
یہاں ہر چیز پھولوں سے حسیں معلوم ہوتی ہے
عقیدت کی یہ حد ہے کہ نبیؐ کا نام سنتے ہی
مجھے جھکتی ہوئی اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے
نبیؐ کا نام لینے سے سکونِ قلب ملتا ہے
نبیؐ کے نام سے دنیا حسیں معلوم ہوتی ہے
کیا پھول کیا بہار کیا نکہت تمؐ ہی تو ہو
اس رنگِ کائنات کی زینت تمؐ ہی تو ہو
جتنے بھی سلسلے ہیں چمن میں وہ تمؐ سے ہیں
پھولوں کا حسن تتلی کی چاہت تمؐ ہی تو ہو
محشر کی تیز دھوپ سے گھبرا کے امتی
سائے میں جس کے بیٹھیں گے وہ چھت تمؐ ہی تو ہو

نذیؔر اس مقدس در پر جا کر اس کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

طواف اک دن کروں گا تیرے در کا
ارادہ کر رہا ہوں اب سفر کا

نذیؔر ہمیشہ نبیؐ کے سائے میں رہ کر اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ وہ سایہ ہے جس نے ہر بے سہارا کو سہارا دیا ہے۔

دنیا میں کہیں جس کا کوئی سایہ نہیں تھا
بے سایوں کو سایہ اسی پیکر سے ملے گا
محشر کی تیز دھوپ سے بچنے کے واسطے
بے سایہ جس کی ذات ہے سایہ اسی کا ڈھونڈ
ترے جسم اطہر کا سایہ نہیں ہے
مثالیں تری کیسے دے گا زمانہ
بگاڑے گی کیا ان کا محشر کی گرمی

ہے رحمت کے سائے میں جن کا ٹھکانہ

محمدؐ کی یاد نذیر کے دل میں سمائی ہوئی ہے اور اس عالم میں ان پر دیوانگی سی طاری ہے۔

کس سادگی سے عشق کا قائل ہوا ہے دل
اک اونٹنی سوار پہ مائل ہوا ہے دل
کشکول جس نے بھر دیئے سارے گداؤں کے
ایسے سخی کے قدموں کا سائل ہوا ہے دل
جس نے دلوں کے آئینے چمکادیئے نذیرؔ
اس نور کے گلے میں حمائل ہوا ہے دل

نذیرؔ کے دل کی یہ دیوانگی عروج پر ہے اور اس بیتابی سے سکون حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔

بیتابیاں کہتی ہیں ترے در سے ملے گا
آنکھوں کو سکوں طیبہ کے منظر سے ملے گا

پریشانیوں کے عالم میں جب کوئی سہارا نہیں ملتا تو حضور اکرمؐ ہی آخری سہارا نظر آتے ہیں۔

سمندر ریت لگتا ہے ہوا تیزاب لگتی ہے
میری کشتی ہے اب تیرے حوالے سرور عالمؐ

قدیم زمانے میں بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا اور دور حاضر میں بھی یہی حالات پیش آ رہے ہیں۔ پیارے نبی نے اپنی امت کو اپنی بیٹیوں کو بچانے کا پیغام دیا اور ان کا یہ پیغام صرف اسلام کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کے لیے مثال بن گیا ہے۔

نہ اب ہوگا کسی بھی باپ کے سر خون بیٹی کا
پیامِ زیست لے کر مصطفےٰ تشریف لے آئے

نذیرؔ نے اگر چھوٹی بہروں میں نعتیں کہیں ہیں تو کہیں کہیں انہوں نے بڑی بحروں کا استعمال بھی کیا ہے۔

''میرا ایمان ہے، میرا ایقان ہے، کملیؐ والے سے جس کو محبت نہیں
اس کا دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں حشر کے دن بھی اس کی شفاعت نہیں
آپؐ خیر البشر، آپؐ خیر الوری، آپ کی ذات ہے رحمتوں کی ردا!
آپؐ جن کے سروں پر ہیں سایہ فگن، ان کو غیروں کے سائے کی حاجت نہیں

نذیرؔ نے آزاد نظم اور ماہیوں کی شکل میں بھی نعت خوانی کی ہے آزاد نعت کی مثال ملاحظہ ہو۔

گلشن دہر میں الگ سب سے منفرد خوشبوؤں کا پیکر ہے
ایک بیوہ کا وہ گل تر ہے
اس کے اوصاف کا ہر اک قطرہ
لب بہ لب بیکراں سمندر ہے

دین و دنیا کے ہر سفینے کو

وہی گرداب سے نکالے گا بحر وحدت کا جو شناور ہے

صنف ماہیہ میں نعت ملاحظہ ہو۔

دیکھوں تو یہی دیکھو　　بس اتنا کرم کیجئے

نو رِ مجسمؐ کے　　حشر میں ہم سب کو

چہرے کی چھبی دیکھو　　دھوپوں سے بچا لیجئے

نذیؔر نے اپنی دعائیہ غزلوں میں اپنے احساسات اور اپنی آرزوؤں کو مختلف انداز میں خدا کے حضور پیش کیا ہے۔ ایک غزل میں وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ سچ کہنے سننے اور حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

سچ کہوں سچ سنوں ایسا جذبہ اتار

میرے دل میں حقیقت کا کلمہ اتار

آگے نذیر دعا کرتے ہیں کہ اللہ انہیں زندگی میں وہ بلند مقام عطا فرمائے جہاں پہنچ کر وہ آسمان کو چھو سکیں۔

میرے مولیٰ میں زمیں کا ایک بے بس ہاتھ ہوں

آسماں سی مستجاب اونچائیاں دیدے مجھے

اپنی عاجزی اور ویران دنیا کو پھر سے آباد کرنے اور خدا کی مہربانی و کرم کے سائے میں اپنے آپ کو پانے کی خواہش میں نذیر خدا سے التجا کرتے ہیں کہ ان کے احساسات و آرزوئیں ادھوری ہیں انہیں مکمل کردے۔

پہاڑ سوکھے ہیں پیاسی ہیں وادیاں دل کی

ادھر سے بھی کوئی جھرنا گزاردے ربّی

پورے ہندوستان بلکہ یوں کہیے پورے عالم کائنات میں جو دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے اس کو اس دنیا سے دفع کرنے کیلئے بھی نذیر خدا سے دعا گو ہیں کہ اللہ ہماری اس زمین کو جنت جیسا خوبصورت بنادے تا کہ یہاں کوئی دکھ کوئی تکلیف نہ ہو لوگ چین وسکون کے ساتھ اپنی زندگی کو خوشی خوشی بسر کرسکیں۔

یہی دعا ہے ہماری دھرتی کو ارض جنت بنادے سائیں

جہاں پہ شعلے بجھے ہوئے ہیں وہاں پہ شبنم بچھادے سائیں

جہاں انہوں دہشت گردی کو شعلوں سے تعبیر کیا ہے وہیں اپنی زندگی کی تمام مشکلات کو کانٹوں سے مثال دیتے ہوئے خدا سے رحم کی دعا کرتے ہوئے اپنی پریشانیوں سے نجات دلانے کی گذارش کرتے ہیں۔

کانٹے روند کے آیا ہوں

اب تو پھول سا بستر دے

نذیؔر بارگاہ الٰہی میں اپنے دامن کو پھیلاتے ہیں اور اپنی ایک ادنٰی سی مگر بہت خاص التجا اس کے سامنے پیش کرتے ہیں اور فکر ونظر کی دعا مانگتے ہیں۔

دل بھی دے نظر بھی دے
فکر معتبر بھی دے
گھر تو دے دیا لیکن
اعتبار در بھی دے

اپنے احساسات کو پیش کرنے کے بعد نذیر نے خود کے لیے ہمت وحوصلہ عطا کرنے کی بھی دعا کی ہے۔ساتھ ہی ساتھ اپنی زندگی کو خدا کے ذکر وفکر میں گزرنے کی خواہش بھی ظاہر کی ہے۔

جو کچھ بچی ہے وہ یاد خدا میں کٹ جائے
نذیر آنے لگا ہے یہی خیال مجھے

نذؔیر دنیا کی تمام مشکلوں اور پریشانیوں سے نجات کی دعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا ان کی زندگی میں امیدوں کی وہ شمع جلا دے جس کی روشنی انہیں منزل مقصود پر پہنچانے میں مددگار ثابت ہو۔

بھٹک نہ جائے اندھیرے میں کاروان حیات
ذراسی روشنی راہوں میں ڈال دے اللہ

جب انسان کا احساس اسے غیر کے دکھ، درد اور غم کو اپنا بنالینے کی ہمت عطا کرتا ہے اس کے اندر یہ احساس روشن کر دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا بنا سکے۔تو وہ ان دردمند لوگوں کا غمخوار اور دعاؤں کا مستحق ہو جاتا ہے۔ایسے انسان کو خدا بھی عزیز رکھتا ہے۔لیکن یہ ظرف بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے کہ وہ غیر کے غم کو اپنا غم مان کر اس کے غم میں شریک ہو سکے۔اس ہمت وحوصلے کے لیے نذیر خدا سے گزارش کرتے ہیں کہ۔

درد مندوں کے کام آجاؤں
بس یہی جذبۂ عبادت دے

انسان اللہ کی بنائی ہوئی تمام مخلوقات میں اشرف المخلوق ہونے کا شرف حاصل کر چکا ہے۔تمام مخلوقات میں اسفل واعلیٰ ہونے کے باوجود بھی نہ جانے کیوں ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کے لیے رفاقت ومحبت ختم ہوتی جارہی ہے اس محبت واتحاد کو قائم رکھنے کے لیے نذیر خدا سے دعا گو ہیں۔

سلگتے دل پہ کبھی یوں نوازشیں کردے
کہ بوند بوند محبت کی بارشیں کردے

جو انسان دوسروں کے درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ ہمدرد کہلاتا ہے ایسا انسان یہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کے گھر میں خوشیاں ہوں اور اس کے آس پاس کے لوگ دکھ درد میں مبتلا ہوں۔اس درد کو نذؔیر شدت سے محسوس کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں۔

مرے مکان میں دے کر خوشی کے نذرانے
مرے پڑوس کے گھر میں اُداسیاں مت دے

رسولِ اکرم ﷺ کی محبت میں جو سرشار ہو جائے جو اپنے دل میں نبیؐ کی محبت کو بسا لے اسے پھر دنیا میں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔اپنی تمام زندگی دیارِ حبیب میں بتانا ہر مسلماں کا خواب ہے اپنی اسی خواہش کو نذیر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

لپٹ کے رونا ہے اپنی ندامتوں پہ مجھے
نبیؐ کے روضۂ اطہر کی پاک جالی دے

بارگاہِ الٰہی میں شاعر نے جب دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور اپنے دل کی تمام خواہش اور گزارشیں اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیں تو ہر پل ان میں یہ یقین اور بھی پختہ ہوتا گیا کہ ۔

ابھی میں روشنی میں ہوں، مرا کردار زندہ ہے
مری تحریر زندہ ہے، مری گفتار زندہ ہے
ابھی سانسوں میں گرمی ہے ابھی رفتار زندہ ہے
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی دھار زندہ ہے

مراٹھی کے نامور ڈرامہ نگار گڈکری کے مشہور ڈرامے ''ایکچ پیالہ'' کو سید آصف نے اردو کے پیکر میں ڈھالا تو ڈرامے کی ابتداء سے پہلے ایک دعائیہ شامل کیا گیا تھا جو نذیر سے لکھوایا گیا اس کے چند بول ملاحظہ ہوں ۔

خوشبو کے سائے پھیلا دے
دکھ کے سارے پیڑ گرا دے
اس دھرتی کو سورگ بنا دے
یہ خواہش ہے......''

جب گرمی کی تپش، سوکھے ہوئے کھیت، مرجھائی فصلیں، سوکھے درخت، پیاس سے تڑپتے لوگ بادلوں کی طرف ابرِ باراں کی خواہش میں نہارتے ہیں تو ان کے لبوں پر بھی یہ دعا آ جاتی ہے جو نذیرؔ خدا کے حضور گزارتے ہیں ۔

دھوپ کی شدت، ریت کی وحشت، جیون ہے پامال
اس سوکھے سنسار میں ربّا تھوڑا پانی ڈال
او ربّا تھوڑا پانی ڈال

بستر علالت کے زیرِ عنوان ایک دعا ''ثنائے جلیل میں شامل کی گئی ہے۔ دعا کا انداز ہ ملاحظہ ہو ۔

کون ہے محرم میرے غم کا
تجھ سے بڑھ کر کون مسیحا
فریادی ہوں سن لے سائیں
دور مٹا دے ہر پرچھائیں
دھوپ میں سایہ دینے والے
بے رکھوالوں کے رکھوالے
زخموں پر اب مرہم رکھ دے

ہونٹوں پر کچھ شبنم رکھ دے

دستِ مسیحائی پھیلا دے

میرا سارا درد مٹا دے

''ایک بوڑھی عراقی عورات کی دعا'' کے عنوان سے ایک اور دعا ''ثنائے جلیل''میں شامل ہے۔اس دعا کے تحت نذیر نے سرزمین بغداد اور باشندگانِ بغداد کے لیے دعا کی ہے کہ خدا انہیں کربلائی شہیدوں کی صفات سے آراستہ کردے صبر سے ان کا دامن بھر دے۔

ہر ماں کو فولاد بنا دے

ہر اک باپ کے سینے میں تو

شبیری احساس جگا دے

ہر اک بھائی کے بازو کو

عباسی قوت سے بھر دے

ہر اک بہن کو زینب کر دے

صبر و سکوں کے پیمانوں سے

بغدادی مٹّی کو بھر دے

اس کے علاوہ ''مسلسل دعائیں'' کے زیرِعنوان بھی نذیر نے مختلف دعائیں شامل کی ہیں جس میں نذیر خدا سے دعا کرتے ہیں کہ تو ہی ہر شئے کا خالق ہے۔تو نے ہی اندھیروں میں جگمگاتی روشنی کی ہے،تو ہی ہمارا غمخوار ہے،ہماری زندگی ایک خالی کتاب ہے جس کا ہر پنّا کورا ہے تو جو چاہے ہماری تقدیر میں لکھ سکتا ہے،تو ہی ہماری سانسوں کا مالک ہے تو چاہے تو زندگی دے دے تو چاہے تو موت دے دے،جب ہم کسی کشمکش میں ہوتے ہیں تو تو ہی ہمیں صحیح راستہ دکھاتا ہے۔

پھر آگے عرض کرتے ہیں کہ تو نے ہی مجھے فکر و احساس کی دولت عطا کی ہے اور تو ہی انہیں اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی قوت عطا کرتا ہے۔تو مجھے یہ طاقت،یہ قوت عطا کرنے کے بعد کہیں مجھ سے یہ صلاحیت چھین نہ لینا۔

تصنیف ''ثنائے جلیل'' میں ایک نظم ''بھوک کا وظیفہ'' کے عنوان سے تحریر کی گئی ہے جس میں خدا کو تمام مخلوقات چرندوں پرندوں اور درندوں کا مالک حقیقی اور ان کے لیے غذا کا انتظام کرنے والا بتایا گیا ہے اس نظم میں انسان نے اپنے لئے خدا کے سامنے دستِ سوال کیا ہے کہ تو نے سب جانوروں کو پیٹ بھرنے کے لیے غذا کا انتظام کیا ہے تو پھر مجھے اشرف المخلوقات کا درجہ دے کر بھی بھوکا کیوں رکھا ہے۔

اے خدا! اے پالنے والے!

مجھے اشرف بنا کر

علم و فن کے شوکیس میں سجا کر

فہم و فراست کے رنگوں میں بسا کر

میری پیشانی پر

کس لیے بھوک کا وظیفہ لکھ دیا......؟

فنی لحاظ سے نذؔیر کی حمدیہ شاعری میں بحر ووزن الفاظ کی تراش ، لے وآہنگ کا اُتار چڑھاؤ وغیرہ بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔طویل بحر میں تحریر ایک مناجات ''ازل سے سوکھے لبوں کی پیاسی روایتوں کومٹادے سائیں''میں نذؔیر کا لہجہ بڑا رقت انگیز بھی ہے اور عجزو انکسار میں ڈوبا ہوا بھی ہے۔

نذؔیر نے اپنی حمدیہ شاعری میں بعض اشعار میں صفت مراۃ النظیر کا بہترین استعمال کیا ہے۔جس کی مثال ملاحظہ ہوں۔

کتاب تیری قلم تیرا تیرے حرف وصدا
ورق ورق پہ تری داستاں ہے یارب
میرے ہونٹوں پر رکھی تھی پیاس مری
ندی، نالہ، تال، سمندر اس کا تھا
جام بھی اس کا، مینا اس کا، اس کا سارا میخانہ
قطرہ قطرہ پینے والا بھی میخوار اسی کا ہے
کون سی چیز ہے گلشن میں جسے اپنا کہیں
شاخ بھی اس کی ثمر اُس کے شجر بھی اُس کا ہے
ڈوبنا اورترانا ہے اُسی کے بس میں
ناؤ اس کی ہے، ندی اُس کی، بھنور بھی اس کا

بعض مقامات پر نذؔیر صنعتِ تلمیح کو بھی بڑے خوبصورت انداز میں اپنے اشعار میں پرودیا ہے جس کی خوبصورت مثال مندرجہ ذیل ہے۔

اذان دیتے ہیں لیکن مزہ نہیں آتا
ہمارے لہجے کو تو لہجۂ بلالی دے
کرم وہ کرتا ہے جب بھی سسکتی دھرتی پر
توگرم ریت سے چشمے اُبال دیتا ہے

نذؔیر نے اپنی تصنیف ثنائے جلیل میں خوبصورت ونادر تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے ان کے بعض اشعار میں ایسے ہی نادر نمونہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

بساطِ دہر بچھا کر وہ کتنی خوبی سے
ہرایک مہرے کو مرضی کی چال دیتاہے

نذؔیر کی شاعری میں کہیں کہیں علامہ اقبال کا رنگ و جھلک بھی نظر آتی ہے۔مثلاً شاہین علامہ اقبال کا محبوب استعارا ہے جسے نذؔیر نے بڑی خوبی سے اپنے ایک حمدیہ ماہیے میں استعمال کیا ہے۔

''دے مجھ کو دلِ شاہیں
اتنی گزارش ہے

اے مالکِ یوم الدین''

علامہ اقبال کے ایک مشہور شعر ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

میں ''دیدہ ور'' لفظ کو بڑے ہی سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے اس لفظ کو نذیر نے بھی اپنے ایک شعر میں بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔''

''اپنی دید کی خاطر

کوئی دیدہ ور بھی دے''

اردو زبان میں ہندی اور انگریزی زبان کے الفاظ کے شامل ہونے کا سلسلہ تو ابتدا سے ہی رہا ہے لیکن حمدیہ اور مناجاتی شاعری میں بھی ہندی اور انگریزی الفاظ کا بہترین استعمال نذیر نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے مثلاً۔ دیش۔ سنسار۔ گگن، جیون، سورگ، سپنا، درپن، چھرنے، تالاب، دھانی چندری، وردان، گیت، مٹی، پستک، امر اور انگریزی لفظ شوکیس خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ نذیرؔ ان الفاظ کو اپنی شاعری میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں اس کی ایک اہم مثال ان کا وہ شعر بھی ہے جس میں انہوں نے بطورِ قافیہ ایک لفظ ''جگالیاں'' استعمال کیا ہے ؎

میں روز ایک نئی بات کہنا چاہوں گا

مرے سخن کو پرانی جگالیاں مت دے

چرندے نگلی ہوئی غذا کو دوبارا منھ میں لا کر چباتے ہیں اسی عود کو جگالی کہتے ہیں۔ نذیر نے اپنے فن کے لیے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ جو بات، جو خیال وہ ایک بار پیش کر چکے ہیں وہ ہی بات دوبارا پیش نہ کریں۔ نذیر نے اپنی تصنیف میں جو حمدیہ ماہیے تحریر کیے ہیں ان میں ایک ماہیہ ؎

''ہر آدمی ترسے گا

ابر کرم تیرا

جب تک نہیں برسے گا''

ان کی تصنیف ''یہ زمین میری ہے'' میں ہندی رسم الخط شامل کیا گیا ہے۔ نذیر کی حمدیہ شاعری میں بحر و وزن کے متعلق ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط اپنے مضمون ''نذیر فتح پوری کی حمدیہ اور مناجاتی شاعری'' میں رقمطراز ہی

''نذیرؔ کی حمدیہ شاعری میں بحور و اوزان سے لے کر الفاظ کا دروبست، لے و آہنگ کے نشیب و فراز، حسنِ معنوی وصوری میں صلابت نہیں نزاکت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی حمدوں میں رنگِ تغزل کچھ زیادہ دکھائی دیتا ہے شعری محاسن کا بھر پور استعمال کرنے کی وجہ سے ان کی حمدوں میں (باوجود عقیدے کی شاعری ہونے کے) شعریت عود کر آئی ہے۔'' (۵۵)

نذیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یحیٰ نشیط فرماتے ہیں۔

''نذیرؔ کی حمدیہ شاعری میں ہمیں سچی عبدیت اور عبودیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ انہوں

نے عبد و معبود کے رشتے کو بڑے والہانہ انداز میں اپنی حمدوں میں سنوارا ہے۔'' (۵۶)

نذیرؔ فتح پوری کی حمدیہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید شکیل دسنوی فرماتے ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری کے اشعار میں جذبہ عبودیت کی تمازت میں حرارت پیدا کر دیتی ہے۔فکر و احساس کی لو تیز کر دیتی ہے۔'' (۵۷)

سید شکیل دسنوی نذیر کی حمدیہ شاعری کی فنی خوبیوں پر کچھ اس طرح بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری کے حمدیہ اشعار آیتوں کی پاکیزہ خوشبوؤں کو سمیٹ کر احساس و شعور اور قاری کے پورے وجود کو مضطرب کر دیتے ہیں یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں احساس و شعور پورے وجود میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔'' (۵۸)

کتاب ''ثنائے جلیل'' کے مطالعہ سے اور مشاہیر ادب کی گراں قدر رائے کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح صنفِ غزل کا میدان نذیرؔ نے انتہائی کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے اسی طرح حمد، مناجات اور نعت کی وادیوں سے بھی وہ انتہائی سرخ روئی اور گہری عقیدوں کے ساتھ گزرے ہیں۔ان کے لہجے میں عجز ان کی لفظیات میں نرمی اور ان کے تخاطب میں بندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔

☆☆☆

نذیرؔ فتح پوری کی نظم نگاری

نظم......وہ لفظ جسے موتیوں کو پرونے سے تعبیر کیا گیا۔یہ صرف ایک لفظ نہیں بلکہ وہ کائنات ہے جس میں حسن و عشق، مناظر فطرت، خوشی، غم، غصہ، عصری ماحول کی عکاسی، دہشت گردی غرض کے ہر موضوع کو پناہ دی گئی۔اردو کے تقریباً سبھی شاعروں نے نظم کے پیرائے میں اظہار خیال کیا اور ان کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔اس فہرست میں نذیر فتح پوری نے بھی نظمیں کہی ہیں۔یوں تو وہ غزل گو شاعر ہیں لیکن انہوں نے نظم میں بھی اپنا ہنر دکھایا۔نظموں کے متعلق ان کا خیال ہے کہ۔

''نظم لکھتے وقت میرا قلم سخت ہو جاتا ہے۔میرے مزاج کی وہ نرمی جو میری شاعری کی پہچان ہے وہ ایک پتھر بن جاتی ہے۔ایسا کیوں ہوتا ہے شاید کبھی کبھی زمین کے بدلتے ہوئے حالات اپنی بھیانک شکل میں میرے سامنے آتے ہیں تو میں بوکھلا جاتا ہوں۔خوف اور غصے سے میرا بدن کانپنے لگتا ہے۔میرے ذہن کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔ایسے حالات میں جب کوئی نظم میرے قلم کی نوک سے نکلتی ہے۔تو وہ تلخیوں میں ڈوب جاتی ہے۔'' (۵۹)

ان کے اس قول کو رد کرتے ہوئے مالتی شرما صاحبہ کا کہنا ہے کہ۔

''نذیرؔ صاحب بھلے ہی کہتے رہیں کہ وہ نظم لکھتے ہیں تو ان کی قلم سخت ہو جاتی ہے۔پر بات ایسی نہیں ہے نہ ان کا مزاج پتھر ہوتا ہے نہ قلم سخت، بلکہ ان کی نظموں کی تلخی ہی یتھارتھ کی سچائی بن ابھیویکت ہوئی۔ان کی نظموں کی شکتی ہے۔چھندوں کا وشیے کے ساتھ صحیح رشتہ رچنا کے لیے ضروری ہوتا ہے۔جو کہ یہاں موجود

ہے اوران کی نظموں کو یادگار نظمیں بناتا ہے۔'' (۶۰)

یوں تو نذیرؔ کی نظمیں ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں ان کی کچھ نظمیں ان کی تصنیف ''یہ زمین میری ہے'' میں شامل ہیں یہ مجموعہ ناگری لپی میں شائع تھا۔ جس میں نظموں کے ساتھ دیگر اصناف بھی شامل تھیں۔ اردو میں نذیرؔ کی نظموں کا مجموعہ ''نظم سفر'' کے نام سے ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں نذیر نے پابند نظموں کے علاوہ سہ سطری نظمیں اور تکونیاں بھی شامل کی ہیں۔

نذیرؔ نے مذہبی فرقہ پرستی کے موضوع پر نظم '' کالی چرن تم کیسے ہو'' تحریر کی ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ انہوں نے بہت ہی سدھے سادے انداز میں بٹوارے کے پہلے کے ہندوستان کی تصویر کھینچ دی کہ کس طرح سالم ہندوستان میں دونوں مذہب کے لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ کسی میں کوئی فرق نہیں تھا۔

گاؤں کی جس چوپال میں اپنا
بچپن بیتا
وہ چوپال نہیں تھی ہندو
گاؤں کے جس پیپل کے نیچے
ہم کھیلے تھے
اس پیپل کو یاد نہیں تھا
کلمہ کوئی
کالی چرن تم سوچو تو!
کیسی آزاد فضا وہ
جس میں ہم اڑتے پھرتے تھے
ایک تھی دھرتی ایک گگن تھا
ہم دونوں کا ایک چمن تھا

یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ ہندوستان میں بٹوارے کے پہلے دونوں فرقوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن بٹوارے کی لکیر نے دونوں مذہبوں کو ایک دوسرے کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا نذیر ان حالات کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

قسمت نے کچھ ایسی خون کی ہولی کھیلی
ہم دونوں کے بیچ میں خوف کی سرحد پھیلی
پیار، محبت، بھائی، چارہ
ہندو، مسلم سب تہذیبیں
سارا کلچر، سارے رشتے
شعلوں میں تبدیل ہوئے ہیں !

یہ ساری سازش فرنگیوں کی تھی جو پورے ہندوستان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔اور اسے آزاد کرتے وقت ٹکڑوں میں بانٹ گئے۔

تخت وتاج کے متوالوں نے
مل کر گاؤں کی دونوں آنکھیں،
اندھی کردی
دھرتی ماتا کے سینے میں
آگ سی بھردی
نفرت کی دیوار اٹھادی
تہذیبوں کے آنگن میں
تم کو یہ احساس دلایا
کہ تم کٹر ہندو ہو
مجھ کو یہ احساس دلایا
کہ میں کٹر مسلم ہوں

ایک نظم ''قومی یکجہتی'' میں نذیر تمام ہندوستان کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کرتے نظر آرہے ہیں۔نذیر تمام ہندوستانیوں کو نصیحت کرتے ہیں

اگر ہم دل سے بھارت کو وطن اپنا سمجھتے ہیں
ہم اس کے ذرے ذرے کو چمن اپنا سمجھتے ہے
تو پھر اے دوستو! ہندو مسلمانوں !قسم کھاؤ
اسی مٹی سے یکجہتی کی اک دنیا بسائیں گے
اسی مٹی کی خوشبو اپنی روحوں میں بسائیں گے

نذیرؔ کو سفر بے حد پسند ہے۔اسی لیے وہ اپنی زندگی کے سفر میں بھی بنار کے آگے بڑھتے جارہے ہیں اور بنا کسی ہم سفر کے منزلوں کے آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

میں وہ مسافر ہوں
جو ہم سفر کے بنا بھی
منزلوں کو روند کر
آگے بڑھنے کی
ساری ہنرمندیوں سے واقف ہوں

اپنی ایک نظم ''چکرویو'' میں نذیر نے امید اور فرض شناسی کی تلقین کرتے ہوئے سورج کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ

اپنے فرض سے سبکدوشی کے بعد

میں خود بھی دن کی

اداسیوں کا حصہ بن جاؤں گا

اور پھر

سورج کے انتظار میں

شام تک آنکھیں بچھاؤں گا

انسان کو اپنے حالات پر اختیار نہیں ہوتا ہے اور کمر توڑ محنت کرنے کے باوجود بھی اپنے مقصد کو حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسے خواب دیکھنے کا حق نہیں۔ ہاں کبھی کبھی یہ خواب انسان کی خواہش کے مطابق پورے نہ ہونے کے سبب بہت گراں گزرتے ہیں۔

نہ آنکھیں ہماری بنائی ہوئی ہیں

نہ نیندوں پر ہمارا اختیار ہے

اور خواب بھی

ہماری مرضی کے غلام نہیں

پھر بھی

خواب دیکھنے کی سزا تو

ہمیں ہی جھیلنی ہوتی ہے۔

نذیرؔ ملک کے حالات اور حکمراں طبقے کی ساری ستم آرائیوں سے واقف ہیں۔اس موضوع پر بہت باغیانہ انداز میں ''میں کویتا لکھ سکتا ہوں'' نام سے ایک نظم تحریر کی ہے۔اس نظم میں ان تمام مکار فریبی، چالباز اور چالاک سیاسی رہنماؤں کے ساتھ محکمہ پولیس کے بے ایمان افسران کے کالے کارناموں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ دونوں کس طرح عوام کو تکلیف میں ڈال کر مزے لوٹتے ہیں۔ان کی سازشوں کا نشانہ بیچارے غریب بنتے ہیں۔

تم عوام سے طاقت لے کر

عوام ہی کو کچلنے کے لیے

دن رات منصوبے بناتے رہتے ہو

اور

ہاتھوں میں سنگین اٹھائے

سرکاری جوتے پہنے

خاکی وردی والے

ہر موسم میں
تمہاری آواز سے آواز ملا کر گاتے ہیں
اور غریب پرندوں کو نشانہ بناتے ہیں
زمین پر خون بہاتے ہیں
گھونسلوں کو آگ لگاتے ہیں
اس کے بعد بھی تم دونوں
دیش کے سچے سیوک کہلاتے ہو۔

علم کی اہمیت افادیت اور معنویت سے ہر شخص بخوبی واقف ہے، نذیر بھی اسے شدت سے محسوس کرتے ہیں وہ اس بات کو بچوں کو ذہن نشین کروا دینا چاہتے ہیں کہ دنیا کی ہر دولت سے زیادہ قیمتی علم کی دولت ہے، ان کی نظر میں یہ وہ نور ہے جو انسان کی زندگی کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر ایک منور جہاں کی سیر کراتا ہے۔اس کے متعلق ان کا خیال ہے۔

ہے فروزاں علم ہی کے دم سے شمع زندگی
علم سے بڑھ کر نہیں دنیا میں کوئی روشنی

موسم بہار کی رنگینی اور لطافت دل کو مسرور کر دیتی ہے اکثر شعراء نے اپنی نظموں میں اس موضوع پر بہت ہی دلکش نظمیں تحریر کی ہیں۔نذیر نے بھی اس موضوع کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے ان کی نظموں میں بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج دونوں سنائی دیتی ہے۔

بادل کی چنگھاڑ عجب ہے
بجلی کی رفتار غضب ہے
ٹھنڈی آئی گرمی بھاگی
چاروں جانب خنکی جاگی

بہار کے موسم کی رونق کا بیان کرتے ہوئے نذیر نے ''وادی لوناولہ'' کی فضاؤں کا ذکر کس خوبی سے کیا ہے جو دل کو چھو لینے والا اور روح پرور ہے

چپہ چپہ پر مچلتی خواہشوں کا اژدہام
نور میں ڈوبی ہے صبح رنگ میں ڈوبی ہے شام
لہلہاتی ٹہنیوں پہ پھول مسکاتے ہوئے
تتلیوں کے کارواں آتے ہوئے جاتے ہوئے
مہکی مہکی سی ہوا ہے مہکی مہکی سی فضا
رقص کرتی ہے پہاڑوں پر ترے کالی گھٹا
حیرتوں میں ڈوب جاتی ہے نگاہ اعتبار
دیکھتی ہے جب پہاڑوں سے اترتے آبشار

بارشوں میں بہتے جھرنوں کے مناظر دیکھ کر
محو ہوجاتے ہیں اپنے آپ میں اہل نظر

نذؔیرامیدوں کے شاعر ہیں۔ ہمت اور حوصلہ ان کی شاعری میں بہتے دریا کے مانند رواں دواں ہیں ان کی نظمیں بھی اس حوصلے سے شرابور ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔

صبر آلام پر کیے جاؤ
شادماں شادماں جیئے جاؤ
منت چارہ گر سے کیا حاصل
اپنے زخموں کو خود سئے جاؤ

ہندوستان تہواروں کا ملک ہے۔ یہاں عید، ہولی، دیوالی، کے علاوہ بھی بہت سے تہوار منائے جاتے ہیں نذؔیر نے اپنی نظموں میں اکثر تہواروں کو موضوع بنایا ہے اور دلکش نظمیں تحریر کی ہیں۔ ایک نظم دیوالی کے موضوع پر بھی لکھی ہے عیداور ہولی پر بھی ان کی نظمیں موجود ہیں۔ نذؔیر کی نظر میں ''یوم جموریہ بھی ایک قومی تہوار ہے۔

بھلا کر باہمی رنجش مٹا کر آپسی جھگڑے
گلے سے دشمنوں کو بھی لگاؤ عید آئی ہے
بدن ہیں جن کے ننگے ان کو ملبوسات رنگیں دو
جو بھوکے ہیں انہیں کھانا کھلاؤ عید آئی ہے

محبت کی شمعیں جلانے کی شب ہے
دلوں سے اندھیرا مٹانے کی شب ہے
مٹاکر کدورت کا ہر نقش دل سے
یہ جشن مسرت منانے کی شب ہے

اس روز ہم مناتے ہیں جمہوریہ کا یوم
اس روز ہی ملا ہمیں اعزاز ملک قوم
برسوں کے بعد غم کے اندھیرے مٹائے تھے
ہر ایک گھر میں دیپ خوشی کے جلائے تھے

ہر انسان اپنے وطن سے پیار کرتا ہے۔ یہ جذبہ فطری بھی ہے کیوں کہ انسان جہاں پیدا ہوا، پرورش پائی اور جوان ہوا اس زمین سے اُسے یقیناً انسیت ہوگی۔ اکثر شعراء اپنے وطن سے محبت کا اظہار اپنے نام کے ساتھ وطن کا نام جوڑ کر کرتے ہیں۔ نذیر نے بھی یہ فرض نبھایا اور اپنے نام کے ساتھ اپنے وطن کا نام جوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنی غزلوں اور نظموں میں بھی وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ اکثر اپنے وطن عزیز فتح پور کی یادیں ان کے دل کو بیچین کر دیتی ہیں۔ جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوتا رہتا ہے۔

گھاؤ پہ کوئی مرہم نہ رکھ پائے گا
شہر میں کام کوئی نہیں آئے گا
اب تو سوچا ہے یہ گاوں کی اور چل
اے میرے دوست تو میرے ہمراہ چل
جب شام سہانی ہوتی تھی
کیا رات مزے میں سوتی تھی
کیا باتیں تھیں دل والوں کی
تہذیب تھی کیا چوپالوں کی
کیا قصے کہانی کہتے تھے
خوش بچے بوڑھے رہتے تھے
تاریخ و رانا سانگا کی
گویا کہ زبان پر سب کے تھی
پرتاب کی باتیں کرتے تھے
کب تلواروں سے ڈرتے تھے
پردیس میں کیا کیا یاد آیا
چوپال میں کھڑے ہوئے برگد کی ٹہنیاں
کہتی ہیں اب بھی ماضی کی دلکش کہانیاں
ساون کی سازشوں کا ہوئے اب کے یوں شکار
برسات میں بھی ہم کو ملیں سخت سردیاں
کھیتوں میں سبز سبز نظاروں کے سلسلے
صحرا میں بوند بوند ترستی اداسیاں
عقل وخرد کی پھوٹتی کومل سی کونپلیں
نابینا بوڑھی سوچوں کی وہ زرد پتیاں
کڑواہٹوں کی لذتیں اب بھی زباں پہ ہیں
کھائی تھیں ہم نے بھی ترے گھر کی نبولیاں
املی کو دیکھ پانی سے بھر آئے جن کا منھ
دیکھی ہیں ہم نے گاؤں میں ایسی چٹوریاں
نلکوں نے سارے گاؤں کو نابینا کردیا
پنگھٹ پہ اب نہیں ہے وہ سپنوں کی گوریاں

اس نظم میں نذیرؔ نے اپنے گاؤں کی بے حد جذباتی انداز میں ترجمانی کی ہے۔نظم جیسے جیسے پڑھتے جایئے راجستھان کے دہی علاقے کے منظر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔نذیرؔ جب بھی نظم لکھتے ہیں قلم کو کیمرہ بنا دیتے ہیں یہ ان کے تخلیقی ذہن کی خلاقی کا ثبوت ہے۔نذیر صاحب پونے سے رخت سفر باندھ کر اپنے گاؤں جانے کی تیاری کرتے ہیں تو ایک خوبصورت خواب پلکوں پر سجا لیتے ہیں۔اور جو تمنا کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل نظم میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ملے گا دوست بچپن کا
اسے غزلیں سناؤں گا
سخن کی داد پاؤں گا
پھر اک اڑتی ہوئی تتلی
اشارے سے دکھاؤں گا
تو بچپن لوٹ آئے گا
در دولت کی مسجد میں
کروں گا شکر کا سجدہ
اسی مسجد کے سائے میں
ملے گا مجھ کو ایک بندہ
نظر مجھ پر پڑے گی جب
وہ بندہ مسکرائے گا
خوشی کے گیت گائے گا
مجھے سب سے ملائے گا

اتنا ہی نہیں وہ اس گاؤں کو محبت اور عقیدت سے سلام بھی کرتے ہیں۔نذیرؔ کو وہ جنگل یاد آتا ہے جہاں سے بچپن میں وہ لکڑیاں چُن کر لاتے تھے۔ان کی ماں ان لکڑیوں سے چولہا جلایا کرتی تھی۔کس شدت کا احساس اور کس بلا کا حافظہ پایا ہے نذیرؔ نے اس عمر میں بھی وہ اپنے بچپن کے گاؤں کو بھول نہیں سکے اور ان اشعار میں ڈھال دیا۔

سلام اس گاؤں کی گلیوں کو جس میں بچپنا بیتا
سلام ان جنگلوں کو جن سے توڑی لکڑیاں اکثر
سلام ایسے کنوؤں کو جن سے پانی کھینچتے تھے ہم
سلام ایسے درختوں کو کہ جن کے سائے نے اکثر
سلگتی دھوپ کے موسم میں ہم کو آسرا بخشا
سکوں کی سانس بخشی امن کا بھی ذائقہ بخشا

سلام ان لوریوں کو جن کی خاطر جاگتے تھے ہم
سلام ان تتلیوں کو جن کے پیچھے بھاگتے تھے ہم
سلام اس مادر علم و ہنر پر جس کے کمروں میں
سبق ہم نے پڑھا تھا بھائی چارے کا محبت کا
کہ جو اسلامیہ اسکول کے نام سے ہے مشہور
سلام ان پر پڑھایا تھا جنہوں نے قائدہ ہم کو
اسی سے اب تلک پہنچا ہے سارا فائدہ ہم کو

یہ مادرِ علم و ہنر، وہی اسلامیہ اسکول عیدگاہ ہے جہاں سے نذؔیر نے درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی اور اسی تعلیم کے بل پر انہوں نے اردو شعر و ادب کی دنیا کو نہ صرف مسخر کیا بلکہ ہزاروں دلوں پر حکومت بھی کی اس اسکول سے متعلق وہ عظمت کا گیت اس طرح گاتے ہیں۔

سب کی خاطر کھلے تیرے در عید گاہ
تو محبت کا ہے ایک گھر عید گاہ
جس کے سائے میں بیتا ہے بچپن مرا
ہے وہ تعلیم کا ایک شجر عید گاہ
میرے دل میں ہے تیری عقیدت بہت
میری نظروں میں ہے معتبر عید گاہ
سب تیرے نام سے جانتے ہیں مجھے
ہے تعارف مرے مختصر عید گاہ
ہے اثر میرے اشعار کا ہر طرف
یہ ہے تیری دعا کا اثر عید گاہ

یکم جون ۲۰۰۰ء اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور شیخاواٹی کی صد سالہ تقریب کے موقع پر جشن صد سالہ کمیٹی کی جانب سے نذیر کا اسکول کے سابق طالب علم کی حیثیت سے عوامی استقبال کیا گیا اور معزز مہمانوں نے انہیں اعزاز سے سرفراز کیا۔ یہ ان کے لیے نہایت خوشی اور فخر کی بات تھی کہ جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی آج اسی تعلیم کے سبب ان کا اعزاز کیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے تاثرات منظوم انداز میں پیش کیے۔

آج یہ کس کی دعاؤں کا اثر کام آیا
تشنگی اوس کی بوندوں سے بجھی پھولوں کی
نکہت گل نے فضاؤں میں بکھیری خوشبو
آج محسوس ہوئی خود مجھے اپنی خوشبو
اس سے پہلے بھی نوازا گیا اس بستی میں
آج کی بات مگر اور ہی کچھ لگتی ہے

آج تو پیار کی شدت میں اضافہ دیکھا
آج تو اوجِ ثریا پہ نصیبہ دیکھا
اس بلندی سے بڑی اور بلندی کیا ہے
میرے احباب نے کندھوں پہ اٹھایا ہے مجھے
منظر خواب حقیقت میں دکھایا ہے مجھے

نذیر ۱۹۵۹ء کے قریب اپنا وطن چھوڑ کر پونہ آگئے تھے لیکن ان کا وطن آج بھی ان کے دل میں آباد ہے وہ آج بھی اپنے وطن سے محبت کے گیت گاتے نہیں تھکتے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے وطن ثانی پونہ سے محبت نہیں کرتے ان کی نظر میں یہ شہر عروس دکن اور پیار کی انجمن ہے۔جس کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔نظم ملاحظہ کریں۔

اے عروسِ دکن ،اے عروس دکن
شہر پونہ ہے تو پیار کی انجمن
خوبصورت پہاڑوں کا تو ہے شہر
جھومتے آبشاروں کا تو ہے شہر
مولا موٹھا تری مثل گنگ وجمن
اے عروسِ دکن ،اے عروس دکن
خوبیوں میں کوئی تیرا ثانی نہیں
ایسی دلکش کسی کی کہانی نہیں
تجھ کو سب کہتے ہے خوشبوؤں کا چمن
اے عروسِ دکن، اے عروس دکن

شہر پونہ کی خوبیاں گنواتے ہوئے نذیر آگے فرماتے ہیں۔دوسری نظم بھی حاضر ہے۔

زرخیز زر نگار ہے پونہ کی سر زمیں
کس درجہ باوقار ہے پونہ کی سر زمیں
سینے میں اس کے دفن ہیں کتنی روایتیں
تاریخی یادگار ہے پونا کی سر زمیں
جلتی ہیں ننھے ذہنوں میں اردو کی مشعلیں
تعلیم کا دیار ہے پونہ کی سرزمیں
شعرو ادب کے ہوتے ہیں ہر وقت تذکرے
شاداب وخوشگوار ہے پونہ کی سرزمیں

اک سمت ہیں پہاڑ تو اک سمت ندیاں
قدرت کا شاہکار ہے، پونہ کی سرزمیں
پہلو میں آیا جو اسے اپنا بنالیا
اس درجہ جاں نثار ہے پونہ کی سرزمیں

جب گجرات میں فرقہ وارانہ فسادات بھڑکے تو پورے ملک میں خوف ووحشت کا ماحول چھا گیا۔ گجرات کے اس خونی ماحول کو دیکھ کر ہر شخص کی آنکھ نم ہوگئی۔ لوگوں کے دلوں سے ہمدردی اور باہمی اختلاف تو جیسے ختم ہی ہو گئے تھے۔ وہ وقت ہمارے ملک کی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ نذیر نے بھی تہذیب اور انسانیت کے اس خوف ناک منظر کو شدت سے محسوس کیا۔ اور فساد کے سبب پیش آنے والے حالات کو اپنی نظم ''آؤ پھر انسان بننے کی ذرا کوشش کریں'' میں بیان کیا اور ماحول کو پرسکون بنانے کی جدوجہد کرتے ہوئے نظر آئے۔

پھر کسی مردہ تصور کو نیا احساس دیں
پھر چمن کے غنچہ وگل کو نئی بوباس دیں
پھر زمین کی دھڑکنوں کو دیں نئے قدموں کا لمس
پھر نئی مٹی تلاشیں پھر نیا انساں بنائیں
پھر کسی کوٹھے سے جاکر اک طوائف کو بلائیں
سبھیتا پلتی ہے جس کے گھر میں بچے کی طرح
پھر اسی کو آج کی تہذیب کی رہبر بنائیں
اس طرح ہم آگ کی تہذیب سے بچ جائیں گے
آؤ پھر انسان بننے کی ذرا کوشش کریں

دہشت گردی جو ہمارے ملک کے لئے ناسور بن گئی ہے اور ملک کو کھوکھلا بنا رہی ہے ملک کی ترقی اور خوشحالی کو برباد کرتی جارہی ہے دہشت گردی کے خوف ناک ماحول نے کشمیر جیسی خوبصورت وادی کو بھی تہس نہس کر دیا ہے۔ کشمیر کی خوبصورت وادیاں برفیلے پہاڑ، سرسبز میدان، جھیلوں کی رعنائیوں کو بھی اس خوف ناک ماحول نے غارت کردیا ہے، نذیرؔ نے اپنی ایک نظم ''کشمیر کی فریاد'' میں کشمیر کی زبانی اس کا درد کو بیان کیا ہے۔

سرحد پار سے آ کر کچھ
میرا حسن مٹاتے ہیں
میرے اندر والے بھی
مجھ کو آگ لگاتے ہیں
ٹھنڈے ٹھنڈے موسم کو
کس نے آگ مثال کیا
میں دھرتی کی جنت تھی

کیوں مجھ کو پامال کیا۔

ایک اورنظم میں وہ ان وحشت ناک مناظر کولفظی تصویراس طرح پیش کرتے ہیں۔

دورتک جلتے گھروں کی روشنی ہے بے پناہ
دورتک جھلسی ہوئی لاشوں کاانبارسیاہ
گولیابرسارہی ہے دورتک اندھی سپاہ
رزم گاہ عشق کا یہ کون سامعیار ہے
آدمی کے ہاتھ میں بارود کی تلوار ہے

اورایک تثلیث بھی ملاحظہ کریں۔

وقت خاموش ہے بارود بچھا ہے ہرسو
جانے کب آگ لگےاوردھماکہ ہوجائے
ختم انسان کی ہستی کاتماشہ ہوجائے

دہشت گردی، آپسی رنجش، گندی سیاست نے ماحول کوآلودہ کردیا ہے نذیرآنے والے وقت کوامن وسکون سے معمور دیکھنا چاہتے ہیں اوراسی لیےوہ آنے والی صدی سے امید کرتے ہیں کہ۔

گئی صدی نے تو کیا کیا ذلیل وخوار کیا
جو بے گناہ تھے ان کو بھی سنگسار کیا
خدا قبول کرے امن کی دعاؤں کو
زمین پہ خوف کے بادل نہ اب کبھی چھائیں
نہ کوئی آگ لگے برف کے پہاڑوں میں
خزاؤں سے نہ گلستاں کے پھول مرجھائیں
نئی صدی، نیا موسم ،نئی ہوا دینا
محبتوں کے چمن ہر طرف کھلا دینا

نئی صدی تجھے شاعرسلام کرتا ہے۔

اپنے وجود پر یقین، حوصلوں کی پروازرگوں میں دوڑتے لہو کی حرارت وغیرہ کونذیر نے اپنی نظموں میں بخوبی بیان کیا ہے۔

ابھی میں روشنی میں ہوں مرا کردار زندہ ہے
مر ی تحریر زندہ ہے مری گفتار زندہ ہے
ابھی سانسوں میں گرمی ہے ابھی گفتار زندہ ہے
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی دھار زندہ ہے
مصور کی قسم اس کا حسیں شہکار زندہ ہے

میں فطرت کا اجالا ہوں اندھیروں نے نہیں ڈرتا
میں حرف وصوت کے اندھے لٹیروں سے نہیں ڈرتا
خدائے برتر واعلیٰ کا دل میں پیار زندہ ہے
ابھی میں روشنی میں ہوں مرا کردار زندہ ہے
مصور کی قسم اس کا حسیں شہکار زندہ ہے

ایک نظم ملاحظہ کریں۔نذیؔر نے اس نظم میں جمع کا صیغہ استعمال کر کے اسے عالم انسانیت کے دل کی پکار بنادیا۔

اندھیروں کے گھنے سایوں کا ہم کو خوف کیا ہوگا
ردائے ظلمت نا دیدہ ہم کو کیا ڈرائے گی
اندھیری وادیاں مل کر کہاں تک منہ چڑائیں گی
سیہ بختی مقدر کی ہمیں کیا دن دکھائے گی
ہمارے سر پہ کتنے عزم کے مہتاب روشن ہیں
ہماری آنکھیں زندہ ہیں ہمارے خواب روشن ہیں

ماں کی محبت دنیا کی تمام دولتوں میں عظیم تر دولت ہے۔ماں کے سائے میں ہر بچہ بہتر پرورش حاصل کرتا ہے۔نذیر نے بھی اپنی ماں کی محبت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور اس کا اظہار انہوں نے اپنی ہر تحریر میں کیا۔ماں کی محبت ان کے لیے عظمتوں کی دنیا، رحمتوں کا سایہ، سکھ کا نرم گوشہ، پھول کا دوشالہ، پیار کا بتاشا، نیند کا بچھونا، صبر کا نمونہ اور دعا کا حرف ہے۔پوری نظم ماں کی محبت کے جذبے سے سرشار بہتے ہوئے جھرنے کی مانند ہے۔

چاہتوں کا دریا ماں — اور خود سے تشنہ ماں
زیر پا ترے جنت — عظمتوں کی دنیا ماں
زحمتوں کی نگری میں — رحمتوں کا سایا ماں
دکھ کے سخت جنگل میں — سکھ کا نرم گوشہ ماں
خارزار بستی میں — پھول کا دوشالہ ماں
تلخیوں کے موسم میں — پیار کا بتاشا ماں
ہے دلائی سپنوں کی — نیند کا بچھونا ماں
ہے کتاب شفقت کی — حرف ہے دعا کا ماں
تتلیوں کا بچپن ہے — پھول سا ہے چہرا ماں
چپ ہے سارے دکھ سہ کر — صبر کا نمونہ ماں
بخش دے خطا میری — میں ہوں تیرا بیٹا ماں
یاد آ گیا بچپن — میرا روٹھ جانا ماں
اور پھر محبت سے — وہ ترا منانا ماں

ماں نذیرؔ ماں ہے بس
اچھی اور بُری کیا ماں

ماں کی محبتوں، شفقتوں، عنایتوں اور ممتا بھرے روپ کو نذیرؔ نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے کہیں وہ اسے صبر کا نمونہ بتاتے ہیں تو کہیں رحمتوں کا سایا۔ اور جب یہی سایا ان کے سر سے اٹھ گیا تو نذیر اس بھری دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ ۲۳؍ اکتوبر ۲۰۰۱ء کی شام پانچ بجے ان کی ماں جنت کو کوچ کر گئیں۔ گھر میں سب سے بڑے ہونے کے سبب گھر کے ہر فرد کو ہمت و حوصلہ دینے کی ذمہ داری نذیر کی تھی اور اسے انہوں نے بخوبی نبھایا۔ لیکن ماں کے جانے کا غم انہیں اندر ہی اندر سلگا رہا تھا اور وہ ٹوٹ چکے تھے۔ بہت صبر و ضبط کے بعد وہ اپنے آپ کو اور باقی تمام افراد کو سنبھال پائے۔ ماں کے چلے جانے کے دو دن بعد نذیر نے ایک قطعہ قلم بند کیا ملاحظہ ہو۔

دعاؤں کے صحیفے پڑھ رہا ہوں
عبادت کے طریقے پڑھ رہا ہوں
مجھے یاد آ رہی ہے اپنی ماں کی
میں ممتا کے وظیفے پڑھ رہا ہوں

ماں کے چلے جانے سے ان کے دل کا جو حال تھا وہ اسے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

وہی رشتوں ناتوں کی باریکیاں ہیں
وہی شرینی ہے وہی تلخیاں ہیں
وہی سسکیاں ہیں وہی قہقہے ہیں
وہی غم، خوشی کے وہی سلسلے ہیں
وہی اشک ہے اور تبسم وہی ہے
وہی گیت ہے اور سرگم وہی ہے
میری ماں کے جانے سے کچھ بھی نہ بدلا
میری ماں گئی تو بس اتنا ہوا ہے
میرے سر سے ممتا کا آنچل گیا ہے
محبت کا لہراتا بادل گیا ہے
دعاؤں کے سب سائباں ڈھ گئے ہیں
پناہوں کے سب آسماں ڈھ گئے ہیں
میں اب پیاسے جنگل کی صورت پڑا ہوں
میں بے سایہ ہوں دھوپ میں جل رہا ہو ں
مری ماں کے جانے سے میں مرگیا ہوں

جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا اور اسے تہس نہس کر دیا تب دنیا کی کسی بھی طاقت نے امریکہ کے خلاف عراق کی حمایت میں آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کی انصاف پسندوں کی زبانوں پر تالے لگ گئے۔ دنیا خونی مناظر دیکھتی رہی اور لب سیے بیٹھی رہی ایسے میں ایک شاعر کا احساس زندہ رہا۔ اور امریکہ کے انسانیت سوز منصوبوں کے خلاف نذیرؔ نے اپنی تخلیقی بیداری کا ثبوت دیتے ہوئے نظم لکھی۔ ملاحظہ کریں۔

تشنگی کب بجھے گی صحرا کی
ابر کب چاہتوں کے برسیں گے
کب تلک اے عراق کی دھرتی
تیرے بچے دواکو ترسیں گے
موت کب تک سلائے گی آخر
لوریاں دے کے بے گناہوں کو
روک رکھے گا کب تلک کوئی
وقت کی سسکیوں کو آہوں کو
ظلم کا سد باب کب ہوگا
ختم دور عذاب ہوکب ہوگا

تاج محل محبت کی نشانی مانا گیا ہے۔ ہر شخص کو اس میں محبت کی داستان دکھائی دیتی ہے۔ جبکہ نذیر اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے پہلو پر بھی غور کرتے ہیں اور انہیں اس عمارت میں محبت کی داستان کے ساتھ ساتھ فنکاری فنکاری اور مزدور کی محنت بھی نظر آتی ہے۔

مجھ سے مت پوچھ کے میں تاج کو کیا سمجھا ہوں
ایک شاعر کے تخیل کی غزل ہے یہ تاج
ایک فنکار کے خوابوں کا محل ہے یہ تاج
ایک مزدور کی محنت کا بدل ہے یہ تاج
اس کے ہر نقش میں غربت کا لہو زندہ ہے
تاج اک شاہ کی عشرت کا نمائندہ ہے

تاج محل دنیا کی واحد عمارت ہے۔ جسے محبوبہ کی طرح دیکھا گیا۔ اور شعرا نے اس عمارت کی تعریف وتوصیف میں بے پناہ نظمیں سپرد قلم کیں۔ چند شعراء نے احتجاجی رخ اپنایا اس سلسلے میں ساحرلدھیانوی کی نظم مشہور ہوئی۔ نذیر کی مذکورہ نظم میں بھی احتجاجی رخ نظر آتا ہے۔ لیکن اس نظم کا موازنہ ساحر کی نظم سے نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ نذیر کے احتجاج کا انداز ان کا اپنا ہے یہ نظم تاج کی مخالفت میں نہیں بلکہ سردوروں کی حمایت میں نظر آتی ہے۔

محبت کا جذبہ ہر جواں دل کو سکوں بخشتا ہے۔ محبت کا احساس دوانجان لوگوں کو جوڑ دیتا ہے۔ اور اپنے محبوب کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ خوشی سے بھرا جنت کی سیر کرنے جیسا لطف دیتا ہے۔ لیکن اسی محبت میں ملی جدائی انسان کی زندگی کو جنت سے نکال کر اس دوزخ میں پہنچا دیتی ہے، جہاں بھلے ہی آگ دکھائی نہیں دیتی پر انسان اندر ہی اندر سلگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نذیر کی شاعری کے بیشتر حصے میں یہ آگ محسوس کی جاسکتی ہے۔ ممکن ہے زندگی کے کسی موڑ پر اس انجانی، اور ان دیکھی آگ سے نذیر کا سابقہ پڑا ہو۔ اس احساس کی لفظی تصویر اس نظم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

زندگی خار تھی پھولوں کی مہک تجھ سے ملی
میرے تخلیقی تصور کو چمک تجھ سے ملی
جتنے افسانے تھے منسوب کیے تھے تجھ سے

شعر در شعر تری یاد تھی انگلی تھامے
راہ تخلیق کی کاٹی تری ہمسفری میں
ہم بہت دور نکل آئے تھے بے خبری میں
دونوں آزاد فضاؤں میں اڑا کرتے تھے
دونوں ہی خواب کی دنیا میں رہا کرتے تھے
اب مگر اور ہی کچھ رنگ ہے افسانے کا
قینچیاں دل کی منڈیروں پہ لگی رہتی ہیں
آہ اور سسکیاں سینوں میں دبی رہتی ہیں
کوئی پرواز کا احساس نہیں ہے باقی
حبسِ بے جا میں مقید ہے ہماری ہستی
دونوں سمتوں میں نہیں کوئی ستارہ روشن
ہر قدم تیر گی ذہنوں سے لپٹ جاتی ہے
زندگی اپنے حصاروں میں سمٹ جاتی ہے

نذیؔر کی نظمیں محض واردات قلبی کا اظہار نہیں ۔نہ ہی وہ تصورات کی دنیا میں جینے والے شاعر ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کی حقیقتوں کی گہرہ کشائی بھی کی ہے۔ہندوستانی معاشرے میں شادیوں کے موقعوں پر بدائی کے گیت گائے جاتے ہیں۔دولہا کے لیے سہرا گایا جاتا ہے۔دونوں کو مبارکباد کے طور پر نظمیں بھی لکھی جاتی ہیں۔نذیؔر نے بھی اس موضوع پر نظمیں سپرد قلم کی ہیں۔لیکن یہ نظمیں محض رسمی نہیں ہیں بلکہ ان نظموں میں نذیؔر کا شاعرانہ لہجہ اوران کے اظہار کا منفرد انداز دکھائی دیتا ہے......

شادی پر:۔

تر ی تلاش کا حاصل بہم ملا تجھ کو
طویل راہ میں اک ہم قدم ملا تجھ کو
تری نظر کا تجسس ہی تیرے کام آیا
تجھے تلاش تھی جس کی وہ زیر دام آیا
فرسودہ شام نے پہنا لباس امنگوں کا
اداس رات نے گایا ہے گیت رنگوں کا
حسین سایا ملا گھر کے بھاگ جاگ پڑے
ترے لبوں پہ تبسم کے راگ جاگ پڑے
اندھیرے قافلہ در قافلہ نکل ہی گئے
حریم دل میں خوشی کے چراغ جل ہی گئے
نئی حیات نیا ہم سفر مبارک ہو

قدم کو چومتی ہر رہ گزر مبارک ہو

اسی گھر کی حالت کیا ہوتی ہے۔ جس گھر سے دلہن وداع ہوتی ہے۔نذیرؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں گھر کے ہر ایک فرد کے دل کی کیفیت بیان کی ہے۔ شاعر محض شاعر ہی نہیں ہوتا وہ مصور جذبات بھی ہوتا ہے۔نذیرؔ نے اشعار میں کتنی تصویروں کو منظر بنایا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

رخصتی کے بعد......

ہر کوئی تیری شوخ شرارت کا تھا طالب
ہر کوئی ترے پیار کے رنگوں کا تھا شیدا
دادا کی حویلی میں تھی رونق ترے دم سے
نانا کی حویلی میں تھی رونق ترے دم سے
ماں باپ کا آنگن بھی ہوا سونا ترے بن
چاچا کی حویلی میں تھی رونق ترے دم سے
سکھیوں کے جھمیلوں میں تھی تو چھیل چھبیلی
تھی بہنوں میں تو سب سے الگ سب سے نرالی
ہر بھائی تھا مرعوب ترے حسن عمل سے
ہمسایوں کے دل پہ تھی حکومت ترے دل کی
تھی کیسی محبت یہ تری کیسے تھے رشتے
سب کچھ تو بھلا بیٹھی ہے اک شخص کے پیچھے

غریبی انسان کے حواس باختہ کر دیتی ہے۔ جب سر ڈھانپنے کو آسرا نہ ہو، کھلے آسمان کے نیچے زندگی بسر کرنی پڑے، جسم کپڑوں سے محروم ہوں اور پیٹ میں کھانا نہ ہو تو انسان اپنی زندگی کو ان مشکلات کے ساتھ کیسے بسر کر سکتا ہے۔ کپڑے اور گھر کے بنا انسان شاید زندہ رہ بھی جائے لیکن کھانے کے بنا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ اور آج آسمان چھوتی ہوئی مہنگائی میں عام انسانوں کو دو وقت کا کھانا حاصل ہونا بھی محال ہو گیا ہے۔ ہر شخص دن بھر محنت مزدوری کی مشقت برداشت کرتا ہے لیکن پھر بھی اپنے گھر کے افراد کے لیے پیٹ بھر کھانا مہیا نہیں کر پاتا ہے۔ ان حالات پر نذیرؔ اپنی دو چھوٹی چھوٹی نظموں ''طلب'' اور ''آزادی'' میں روشنی ڈالتے ہیں۔

طلب:۔

ذائقہ ،رنگ، مہک گیہوں کی ، جو کی خوشبو،
لوگ حیران ہیں ان سب کی حصولی کے لیے
بجھ گئے بھوک کی آندھی سے فراغت کے دیے

آزادی:

'' پیار، احساس، وفا، وعدے، محبت، جذبے
وائے اب وجہ توجہ نہیں انساں کے لیے

پیٹ کی آگ میں جل بجھ کے سبھی خاک ہوئے‘‘

نذیؔر نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ میر تقی میر سے متاثر ہیں مثلاً ان کی غزل کا مطلع ملاحظہ کریں جس میں انھوں نے صاف طور پر اس سچائی کا اظہار کیا ہے۔

میؔر ہے تو نذیؔر باقی ہے   روشنی کی لکیر باقی ہے

لیکن اپنی پابند نظموں میں انہوں نے ساحر لدھیانوی سے متاثر ہو کر تاج محل ’’نظم کہی تھی۔ اس کے بعد مجاز لکھنوی کی مشہور نظم پر بھی انھوں نے ایک نظم کہی ہے۔ بلکہ اپنی اس نظم میں تو انھوں نے مجاز کے مصرعہ کو بنیاد بنا کر اس پر پوری نظم کی تضمین عمارت تعمیر کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ نذیؔر نے میر تقی میر کے بعد مرزا غالب سے اثر لیا ہے۔ لیکن بہت کم۔ یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت بھی ہے کہ نذیؔر کی یہ دونوں نظمیں ان کے ابتدائی دنوں کی ہیں جب انسان اپنے لیے راہ متعین کرنے میں سرگرداں رہتا ہے۔ تب اس کے قدم اپنے پیش رووں کے نقش قدم پر رکھے جاتے ہیں اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ یہاں بلا تبصرہ نذیؔر کی نظم کے تین بند پیش ہیں۔

جس پہ بھی ڈالوں نظر وہ شخص گھبرایا لگے
جس کو دیکھوں زندگی سے جیسے تنگ آیا لگے
غم کا مارا ہر کوئی خوشیوں کا ٹھکرایا لگے

ا اے غمِ دل کیا کروں، اسے وحشتِ دل کیا کروں

فاقہ مستی،تنگ دستی کا ہے چرچا چارسو
مرگئی ہے اب دلوں سے زندگی کی آرزو
ہوگیا ہے خشک انسانوں کے جسموں کا لہو

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بچے گلیوں میں پھریں آوارہ کتّوں کی طرح
اور سڑکوں پر بکیں کچھ جسم پھولوں کی طرح
کوئی تڑپے بھوک سے زخمی پرندوں کی طرح

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

لیکن اس کے باوجود نذیؔر ناامید و مایوس نہیں ہوتے ہیں اور ان سب تکالیف و پریشانیوں سے نجات کا راستہ تلاشنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک ایسے ہندوستان کے وجود میں آنے کی اُمید کرتے ہیں جہاں زمین فصلوں سے بھری ہو، کوئی بھوکا نہ رہے ماحول امن وسکون سے بھرا ہو۔

’’یوں زمیں جل تھل رہے
دھانی ہر جنگل رہے
کھیت میں اتنا اُگے
پیٹ سب کا بھر سکے

حد نہ ہو تو لید پر
خاطرِ امید پر
تب کہیں جاکر میاں!
آج کا ہندوستان
مسئلے سے بچ سکے
دھوم ہرسو مچ سکے
شہر میں اور گاؤں میں
گھر میں اور بازار میں
ہر طرف ہوشانتی
سرحدوں پر امن ہو
غیر کا خطرہ نہ ہو
گولہ و بارود پر
ایٹمی ایجاد پر
بے سبب صرفہ نہ ہو
تب کہیں جاکر میاں
آج کا ہندوستان!
پھر بنے جنت نشاں
اور سب ہوں شادماں

یہ نظم بھی نذؔیر کی زندگی کی ابتدائی دنوں کی تخلیق کردہ ہے۔اس میں شاعر کا لہجہ نذؔیر کی دوسری نظموں کے مقابلے میں تخلیقی طور پر کم طاقت ور نظر آتا ہے۔لیکن نذؔیر کے اظہار میں کہیں ترسیل وتفہیم کا مسئلہ نہیں ہے۔نذؔیر ۶۷/سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔انہوں نے جو کچھ لکھا ہے نہایت ذمہ داری کے ساتھ لکھا ہے۔وہ قلم کی خدمت کے پاسداری کو پسند کرتے ہیں۔

ادب پڑھنا اور ادب لکھنا دونوں ہی مفید کام ہیں کتابوں سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ہماری عملی زندگی کو بہتر ڈھنگ سے گزارنے میں مدد کرتی ہے۔نذؔیر کے خیال میں تصانیف تحریر کرنا عبادت محبت اور ملک وقوم کی خدمت کرنے کے مقابل ہے۔اور اسی لیے وہ ہر مصنف سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی تحریروں میں صداقت وسچائی کو ظاہر کرے اور جھوٹ کے چہرے سے نقاب اٹھائے۔

کتاب لکھنا کسی عبادت سے کم نہیں ہے
یہ کام ایسا ہے جو محبت سے کم نہیں ہے
یہ عام خدماتِ قوم و ملت سے کم نہیں ہے

اسی لیے سارے لیکھکوں سے
میری گزارش ہے صرف اتنی
کتاب لکھنا تواس میں سچائی درج کرنا
ورق ورق کو صداقتوں کے گہر سے بھرنا
جو لوگ نفرت کی آگ گھر گھر لگا رہے ہیں
جو لوگ مذہب کے نام پر خوں بہارہے ہیں
جو لوگ دھرتی کی مانگ میں خون بھررہے ہیں
جو لوگ بارود بن کے ہرسوں بکھر رہے ہیں
انہیں توہراعتبار سے بے نقاب کرنا
کتاب لکھتے ہوئے کسی سے بھی نہ ڈرنا
قلم کی طاقت کسی بھی طاقت سے کم نہیں ہے
کتاب لکھنا عبادت سے کم نہیں ہے

عشق کا تصور آتے ہی ذہن علامہ اقبال کی طرف راغب ہوجاتا ہے جہاں عشق بلاخوف آگ میں کودجاتا ہےاور عقل تماشا بین بنی کھڑی رہ جاتی ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

عشق نہ ہوتو آدمی پتھر مثال ہے۔عشق دل کونرم کرتا ہےاور روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔عشق ہی ایک ایسا دھاگا ہے جوسارے عالم کو جوڑسکتا ہے۔اس موضوع پرساحرلدھیانوی کی نظم بھی بہت مقبول ہوئی۔

نذیر فتح پوری نے بھی عشق کے اس تصور کو پیش کیا ہےان کے یہاں عشق۔

عشق اللہ کی بندگی ہے
عشق بھگوان کی آرتی ہے
عشق قرآن کے تیس پارے
عشق گیتا کے اشلوک سارے
عشق ہولی کے رنگوں کا موسم
عشق مذہب کے ہاتھوں کا پرچم
عشق ہے عید کا آنا جانا
عشق دنیا کا نغمہ پرانا

عشق واقعی دنیا کا سب سے پرانا گیت ہے۔جس نے بھی یہ گیت گایا ہے۔اس نے انسانیت کے دل میں اپنا مسکن بنایا ہے۔
عشق کی صفات بیان کرتے ہوئے نذیؔر فرماتے ہیں۔

عشق ہندو نہ کوئی مسلماں
عشق تو ہے فقط ایک انساں
عشق کی شان سب سے نرالی
عشق کا مرتبہ سب سے عالی
عشق گنگا کے دل کی روانی
عشق زمزم کا پاکیزہ پانی
عشق سے پیاس اپنی بجھانا
عشق دنیا کا نغمہ پرانا

نذیؔر کی یہ نظم مختلف زاویوں سے حالات وحقائق کی عکاسی کرتی ہے۔

عشق بیوہ کی آنکھوں کا آنسوں　　　　عشق دوشیزہ کے دل کی خوشبو

عشق کے ہمت اور حوصلے کو واضح کرتے ہوئے نذیر فرماتے ہیں۔

عشق دنیا سے ڈرتا نہیں ہے
عشق روکے سے رکتا نہیں ہے
عشق نے تاج کو زندگی دی
عشق نے فن کو اک روشنی دی
عشق سونی کا کچا گھڑا ہے
عشق دنیا میں سب سے بڑا ہے
عشق کی شان ہے خسروانہ
ہو سکے تو اسے گنگنانا

اس نظم میں بلا کی روانی ہے۔لفظوں کے موتی اس طرح پروئے گئے ہیں کہ ہر بند ایک قیمتی ہار نظر آتا ہے۔یہ نظم نذیؔر کی بہت سی کامیاب نظموں کے زمرے میں شمار کی جانی چاہیں۔

نذیؔر کی نظم نگاری کے مختلف پہلو ہیں۔جہاں وہ ایک طرف عشق کے نغمے الاپتے نظر آتے ہیں دوسری طرف زندگی کی سفاک سچائیوں کے اظہار سے بھی گریز نہیں کرتے۔جدید آدمی کا المیہ،نذیؔر کی ایسی ہی سچائیوں کے برملا اظہار کرنے والی نظم ہے"جدید آدمی کا المیہ" واقعی نذیر نے جدید اسلوب اور نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

برقی رفتاری سے آگے بڑھ رہی زندگی جینے کے لیے آدمی کو ہزار مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے سینکڑوں پریشانیوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔زندگی بسر کرنا محال ہو گیا ہے۔نذیر کو آدمی کے اس درد کا شدت سے احساس ہے جسے وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

دھوپ اوڑھے پھر رہا ہے آدمی
پھر بھی سایا ڈھونڈتا ہے آدمی
اپنے ہی فطری تقاضوں کے خلاف
اپنی رو میں بہہ رہا ہے آدمی
اپنے غمخواروں سے رشتہ توڑ کر
ٹوٹے رشتے جوڑتا ہے آدمی
وحشتِ دل کی تسلی کے لیے
اپنا ہی قاتل رہا ہے آدمی
اپنی سانسوں کے شجر کی شاخ کا
خشک پتّا بن گیا ہے آدمی
راکھ میں بھی کچھ نشاں ملتا نہیں
کس کی خاطر جل بجھا ہے آدمی
کائناتوں پر نظر رکھتے ہوئے
ذات سے نہ آشنا ہے آدمی
جانے ہے کس کے گناہوں کا بدل
جانے کس کی بد دعا ہے آدمی
اس سے بڑھ کر اور کیا تمثیل دوں
صرف زخموں کی قبا ہے آدمی

نظم ''سفر'' کے عنوان سے نذیؔر کی پابند نظموں کا مجموعہ ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا ہے اس مجموعہ کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد مختلف جذبات و کیفیات کی حامل نظمیں بدلتی کیفیتوں کی حامل نظر آتی ہے۔

ہندوستان میں دہلی کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ کیوں کہ ملک کا نظام اس شہر سے چلتا ہے اور ملک کے کونے کونے میں رائج کیا جاتا ہے۔ دہلی شروع سے ہی اہمیت کی حامل رہی ہے کیوں کہ قدیم زمانے میں بھی بیرونی ملک سے آنے والے حملہ آوروں نے دہلی کو اپنا نشانہ بنایا اور اس کے تخت پر قبضہ کیا۔ یہ ہزاروں بار اُجاڑی گئی اور پھر سے بسائی گئی۔ لیکن اس کی عظمت و وقار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ نذیر دہلی کی اسی عظمت و وقار کے متعلق فرماتے ہیں۔

کتنی بار اُجاڑا تجھ کو، کتنی بار بسایا ہے
اچھی اور بری قسمت کا دلّی تجھ پر سایا ہے
تخت و تاج کی دنیا تجھ کو راس ہمیشہ آئی ہے
تیرے سر پر تو جھنڈے کی چنری ہی لہرائی ہے
میرؔ کا شعر و نغمہ تو نے قدم قدم پر گایا ہے

غالبؔ کے احساس نے تیرا آئینہ چمکایا ہے
داغؔ کی غزلیں سن سن کر جھومے ہیں تیرے بام و در
دادِ سخن کے کیا کیا منظر دیکھ چکی ہے تیری نظر
اُردو جس کا نام ہے وہ تیری ہی گود کی پالی ہے
باغِ سخن میں تیرے دم سے روش روش ہریالی ہے

یوں محسوس ہوتا ہے نذیرؔ کے دل میں عظمت ووقار کے احساس کے ساتھ دلی کی پامالی کا درد بھی ہے۔لیکن آج دلّی کی وہ تہذیب نہیں رہی جس پر دلّی والے فخر سے سینہ تان لیا کرتے تھے اور دلّی کی تہذیب اوراس کے تمدن کے چرچے دور دور تک تھے۔اردو زبان اوراس کا شعروادب بھی دلّی کی تہذیب کا ایک حصہ تھا۔لیکن آج تہذیبوں کے سارے بام ودر منہدم ہو چکے ہیں۔دلّی کے موضوع پر لکھی گئی نظموں میں نذیرؔ کی یہ نظم بھی اہم ہے۔

نذیرؔ اپنے حساس دل اور گہری فکر کے سبب ہر چیز کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ان اداروں کو بھی اپنی نظموں میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جنھوں نے ملک وقوم اور تعلیم تعلم کے میدان میں خدمت انجام دی ہے۔ایسے ہی دو ادارے حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونہ اور تنظیم والدین ہیں جن کی خدمات کے اعتراف میں نذیر فرماتے ہیں۔

ہم ادب کے پاسبان علم کے سپوت ہیں
حوصلوں کی ہیں چٹان، عزم کے سپوت ہیں
ہم کو دیکھ کراندھیرے راستے سنور گئے

روشنی قدم قدم بچھا کے ہم گزر گئے
آندھیوں سے لڑکے ہم نے راستے بنائے ہیں
یونہی منزلوں کے ہم نے کب سراغ پائے ہیں

ہم ادب کے پاسبان،علم کے سپوت ہیں

قومی ایکتا ہمارے خون میں اتر گئی
پیار پالیا تو اپنی زندگی سنورگئی
ہم نے اپنا عزم اپنا، حوصلہ دکھا دیا
دل سے اپنی قوم کے ہراک ڈر مٹادیا

ہم ادب کے پاسبان،علم کے سپوت ہیں

اپنے عزم کاکرشمہ یوں بھی ہم دکھائیں گے
اب جہالتیں ہرایک گھرسے ہم مٹائیں گے
علم بیٹیوں کو ہم سکھائیں گے،پڑھائیں گے

پھول علم وفن کے ہر چمن میں ہم کھلائیں گے

ہم ادب کے پاسبان، علم کے سپوت ہیں

مہاراشٹر کے خوبصورت شہر پونے میں مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ، اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ ہے، نذؔیر کا اس ادارے سے ادبی اور جذباتی رشتہ ہے۔ نذؔیر کی دو اہم کتابیں ''شعرائے پونہ۔ ایک تحقیق'' اور پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق'' اسی ادارے کے تحت شائع ہوئی تھیں۔ مندرجہ بالا اپنی نظم میں نذؔیر اس ادارے کے لیے اپنے جذبات کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔

پونہ میں ایک تعلیمی ادارہ تنظیم والدین بھی فعال ہے'' نذؔیر اس ادارے کے لیے بھی اپنے خلوص کا اظہار کیا ہے۔

شہر میں پھریں گے اور بستیوں میں جائیں گے
جو بھی دکھ اُٹھانا ہوگا بے خطر اُٹھائیں گے
لیکن اپنا عزم اپنا مدعا ہے بس یہی
چھوٹو اور بڑوں کو لکھنا پڑھنا ہم سکھائیں گے
یہ الف ہے، بے ہے یے، یہ ہے عین غین
تنظیم والدین
تنظیم والدین
اردو ہم پڑھائیں گے سکھائیں گے لکھائیں گے
اُردو ہی سے ہم دلوں کے فاصلے مٹائیں گے
اُردو سے سجائیں گے چمن کا گوشہ گوشہ ہم
ارود ہی کے گیت ہم قدم قدم پہ گائیں گے
فرض، پیار، بھائی چارہ سب اسی کی دین
تنظیم والدین
تنظیم والدین

عموماً ایک فنکار دوسرے فنکار کو داد وتحسین کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ لیکن نذؔیر ایک وسیع القلب اور وسیع الذہن فنکار ہیں یہی وجہ ہے کہ نذؔیر کے یہاں شخصیتوں پر کافی نظمیں مل جاتی ہیں۔ نذؔیر نے اپنی نظموں کے ذریعہ فلمی دنیا کے دو مشہور گلوکاروں جناب کندن لال سہگل اور محمد رفیع کو بھی یاد کیا۔ جناب کندن لال سہگل کی ۱۰۰ ویں سال گرہ کے موقع پر جناب بھگوان کھلنانی ساقی نے ان کی یاد منائی اس موقع پر نذؔیر نے یہ نظم پیش کی۔

پھول نہیں گلزار تھا سہگل — خوشبو کا بھنڈار تھا سہگل
سُر لہروں میں بہنے والا — اپنی دھن میں رہنے والا
گیتوں کا سنگھار تھا سہگل — سُر سنگت کا تھا وہ پارکھ
پھول نہیں، گلزار تھا گل
ساری فضا سے پیار تھا اس کو — بادصبا سے پیار تھا اس کو

اس کے جیسا کوئی نہیں ہے خود اپنا اوتار تھا سہگل

پھول نہیں، گلزار تھا گل

جادو گرتھا گیت غزل کا شیدائی تھا تاج محل کا

دل والوں کا شاہ جہاں تھا متوالوں کا یار تھا سہگل

پھول نہیں،گلزار تھا گل

کندن لال سہگل اپنے زمانے کا بڑا اداکار تھا، وہ ایک کامیاب گلوکار بھی تھا۔نذیؔر نے اپنی نظم کے ذریعہ سہگل کے اوصاف پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔سہگل کی فلم دیوداس اور تاج محل بہت مقبول ہوئی تھیں ان فلموں کے گیت تو آج بھی متاثر کرتے ہیں۔

نذیؔر نے محمد رفیع صاحب کے لیے بھی بطورِ نذرانہ یہ نظم اس وقت لکھی جب پونہ کے مشہور گلوکار جناب کیلاش کمار نے محمد رفیع کی سالگرہ پر ایک جلسہ منعقد کیا تھا۔اور پونہ کے لشکر محلے میں ایک چوک کا نام ''محمد رفیع چوک'' رکھا تھا۔جس دن چوک کا افتتاح ہوا اس کے بعد نذیؔر نے یہ نظم سامعین کے روبرو پیش کی۔نذرانے کے پھول ملاحظہ ہوں۔

کہنے کو تو چلا گیا وہ دنیا سے

لیکن اس کی یاد دلوں میں زندہ ہے

لوگوں سے یہ اکثر سنتے رہتے ہیں

مار کے اس کو موت بھی خود شرمندہ ہے

ساز کا اور آواز کا سنگم اس کی ذات

گیتوں میں ڈھلتی تھی اس کے دل کی بات

گیت غزل کا ہنر بہت دکھلایا تھا

بھجنوں میں بھی اس نے رنگ جمایا تھا

ہر نفرت کو دور بھگانے والا وہ

پیار کے ہردم پھول کھلانے والا وہ

اس کی کیا تعریف کریں ہم سوچو تو

دشمن کو بھی گلے لگانے والا وہ

بے گانوں کی لبستی میں وہ اپنا تھا

سچ پوچھو تو وہ ہر آنکھ کا سپنا تھا

آنکھ کھلی اور اپنا سپنا ٹوٹ گیا

اور سنگیت کا راجا ہم سے روٹھ گیا

فلمی گیتوں کے بے تاج بادشاہ مرحوم محمد رفیع کے اوصافِ حمیدہ کا اندازہ نظم پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔نذیؔر کی نظموں سے ان کے مشاہدے کی طاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ جس شخصیت پر یا جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے کردار اور کارناموں پر کھلے دل سے روشنی ڈالتے ہیں۔وہ کسی کی خوبیوں کو تسلیم کرتے وقت بخل سے کام نہیں لیتے۔

قحط اور زلزلوں کو بھی نذیر نے موضوعِ نظم بنایا اور ان آفتوں کے سبب جو حالات رونما ہوئے، انہوں نے محسوس کیے اور اپنی نظموں میں بیان کر دیے کیونکہ زلزلوں اور قحط نے انسان کی زندگی کو پامال کر دیا جن کی تصویریں نذیر نے کچھ یوں بیاں کی ہیں۔

کہاں میری ہمت کے ماتم کدوں کو میں شادی کی صورت میں تبدیل کر دوں
کہاں مجھ میں طاقت کہ سورج کی مانند میں برفوں کو پگھلا کے پانی بنا دوں
ٹھٹھرتی ہوئی سرد راتوں کے دل میں میں گرمی کے احساس کو پھر جلا دوں
کہاں میری وقعت کہ میں ابر بن کر تباہ حال فصلوں کو پھر تازگی دوں
کسانوں کے مایوس دیدہ و دل کو نیا ولولہ دوں، نئی زندگی دوں
کہاں میری وقعت کہ بھٹکے ہوؤں کو میں رستہ بتا دوں، یا منزل دکھا دوں
کہاں میری طاقت کہ میں غمزدوں کو غمِ زندگی سے خلاصی دلا دوں

یہ نظم نذیرؔ نے اس وقت لکھی تھی جب ۱۹۷۳ء میں مہاراشٹر میں قحط پڑا تھا۔ اس کے علاوہ جب عثمان آباد میں زلزلہ آیا تو اس سے متاثر ہو کر نذیرؔ نے مندرجہ ذیل نظم لکھی۔

فسادی موت کا جب شنکھ دھرتی پر بجاتے ہیں
نہتوں پر محافظ گولیاں جس دم چلاتے ہیں
برہنہ کر کے تہذیبوں کو جب سڑکوں پہ لاتے ہیں
انا کی عصمتوں کے جب کھلونے توڑے جاتے ہیں
ہماری بستیوں میں زلزلے اس وقت آتے ہیں

خود اپنے ہاتھ سے گلچیں مسل دیتا ہے کلیوں کو
مٹا دیتا ہے جب وہ صفحۂ ہستی سے پھولوں کو
ٹھکانے پنچھیوں کے باغباں جب خود جلاتے ہیں
ہماری بستیوں میں زلزلے اس وقت آتے ہیں

بسر کی سجدہ گاہوں کو کھنڈر کرتا ہے جب شیطاں
عنانِ رہبری جب قاتلوں کے ہاتھ آتی ہے
محافظ ہی کے ایوانوں میں تلوار سیاست سے
عقائد کے گلے جب دن دہاڑے کاٹے جاتے ہیں
ہماری بستیوں میں زلزلے اس وقت آتے ہیں

اس نظم کے اس آخری بند میں بابری مسجد کی شہادت کی جانب اشارا ملتا ہے۔

اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ نذیرؔ کی نظموں کے مطالعہ سے ان کے دل کی بدلتی کیفیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نذیرؔ یک موضوعی شاعر نہیں ہیں۔ ان کے موضوعات نہ آسمان کے اوپر کے ہیں نہ زمین کے نیچے۔ وہ جب بات کرتے ہیں زمینی سچائیوں پر ان کی نظر ہوتی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں مسائل بھی اٹھاتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے ہی قائم کردہ سوالات کے اشاروں کنایوں میں جوابات بھی دیتے ہیں۔ لیکن ہر حال میں ان

کا قلم انکا ذہن، ان کی فکر اور ان کی تخلیقی پرواز زمینوں سچائیوں کے ارد گرد ہی منڈراتی نظر آتی ہیں۔

اُردو زبان کی شیرینی اور لطافت سے دنیا کا ہر شخص واقف ہے۔ یہ کسی ایک مذہب اور فرقہ کی زبان نہیں ہے۔ جنگ آزادی میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد اسے در کنار کر دیا گیا۔ اور تعصب کا نشانہ بنا کر بیگانوں جیسا سلوک کیا گیا۔ اور انتہا تب ہوئی جب ان لوگوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا جو اپنے آپ کو اس کا شیدائی بتاتے ہیں۔ نذیؔر نے اپنی نظم اردو کا المیہ آزادی کے بعد' میں بڑی تفصیل سے ایسی صداقتوں کا اظہار کیا ہے۔

دل چاہتا ہے میرا
جو سچ ہے وہ بتادوں
اُردو کے قاتلوں کے
چہرے ذرا دِکھادوں
اردو کے شاعروں پر
کیسا عذاب آیا
جتنے بھی ملک میں ہیں
بکھرے پڑے ہوئے ہیں
نغمہ وشاعری کی
اس قوم کوضرورت
پہلے تھی اب نہیں ہے
لگتا ہے جیسے اپنا
احساس مرگیا ہے
زندہ دلی کا جذبہ
منقود ہو چکا ہے
علم وادب کی ساری
تہذیب مٹ رہی ہے
غالبؔ کے فکر وفن کی
توقیر کم ہوئی ہے
ہم لوگ ہیں کہ جیسے
پتھر کے بن چکے ہیں
سب اپنے اپنے اندر
بے حس پڑے ہوئے ہیں
حرکت نہ کوئی جنبش

ہلچل نہ کوئی نعرہ
کیا ہو گیا وتیرہ
اس دور میں ہمارا
سچ پوچھئے توہم پر
بارِ گراں ہے اردو
ہم پھر بھی کہہ رہے ہیں
سب کی زباں ہے اردو
لیکن کہاں ہے اردو

پھراس کے بعد نظم میں ان تمام شعراء، نثر نگاراور اردو اساتذہ کوملامت کا نشانہ بنایا جواردو سے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتے ہیں لیکن اس کی بقاء کے لیے کوئی مضبوط قدم نہیں اٹھاتے۔

نذؔیر کی نثری اور آزاد نظموں کا مطالعہ

''دوسری کربلا'' نذؔیر کی ایک طویل نظم ہے۔ جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں سطوتِ عظمی اقبال نے بڑے دل نشین انداز میں Another anguished battle ground کے نام سے کیا اس نظم کا موضوع عراق اور امریکہ کی ہولناک جنگ ہے۔ نظم میں نذیر نے عراق پر ہوئے امریکی حملہ کا منظر پیش کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

''اے خدا!
اس مقدس زمین کو بچا
ہم کو دے وہ جسارت کہ ہم روک دیں
سرحدیں توڑنے والے ناپاک قدموں کو
ایک کی ہٹ دھرمی اور پوری عراقی قوم کا نقصان؟
ابھی ابھی ریڈیو نے یہ جانکاہ خبر دی ہے کہ
بارودی عقابوں نے
اس کارخانے کو زمین دوز کردیا
جس میں معصوم بچوں کے لئے دودھ بنایا جاتا تھا
نسل کشی کا اس سے بھیانک روپ، اس سے پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملا
بربریت کی یہ تصویر دیکھ کر بھی، دنیا خاموش ہے
خدا بھی خاموش ہے
خدا اس وقت بھی خاموش تھا، جب چودہ سو برس پہلے

معصوم بچوں کے سوکھے گلے، تیروں سے چھیدے گئے تھے......

دھماکہ، پھر دھماکہ، پھر دھماکہ

بارود کی بوچھار

ٹینکوں کی یلغار

فوجیوں کی لاشوں کے انبار

موت کا بہیمانہ رقص

بے گناہ شہریوں کے جسم، بوٹی بوٹی بن کر ریت کے سینے پر

تڑپ رہے ہیں......

اس جنگ میں، انسان زیادہ مرے یا جانور

کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا......''

''ایک بوڑھی عراقی عورت کی دعا'' کے زیرعنوان نذیر نے بغداد کے جنگی اور خونی پس منظر کو قاری کے سامنے جسارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بوڑھی عورت محض علامت ہے اس کے منھ سے نذیر نے وہ دعا پیش کی ہے جو نذیر خدا سے مانگنا چاہتے تھے۔

''ربِ کعبہ!

دونوں جہاں کا مالک ہے تو

قادرِ مطلق

تیری صفت ہے

تو جو چاہے کر سکتا ہے

مٹھی بھر مٹی کے بدن میں

روحِ آدم بھر سکتا ہے

ذرے کو اک پل میں سورج

کر دینا ہے تیرے بس میں

بادل، بجلی، آندھی، طوفاں

شعلہ، شبنم، پھول اور بھنورے

ندی، نالے، تال، سمندر

ہرے بھرے پُر لطف سے منظر

سب کچھ، تیری قدرت میں ہیں

ربِ کعبہ!

تجھ سے یہ فریاد ہے میری

مری دعا ہے......!!!

سرزمین عراق اور وہاں کی بدحال زندگی سے متعلق ایک اور نظم ''دعا'' کے عنوان سے تحریر کی گئی ہے اس نظم میں نذیر عراق کی زمین کے لیے خدا سے امن وسکون کی التجا کرتے ہیں کہ

''تو آدمی کی رگِ جاں سے قریب تر ہے
ترا احساس معتبر ہے
عجز
انکسار
عبدیت
تیری معبودیت کے
پسندیدہ عناصر ہیں
دریدہ دامن
کشکول بنے ہاتھ
خمیدہ پیشانی
آبشار نما آنکھیں
تجھ سے یہی التجا کرتی ہیں
عراق کی سرزمین سے
ظلمتوں کے سائے مٹادے
اور امن وسکون کے چراغ جلادے۔''

نذیؔر کی اس نوعیت کی نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں پوری انسانیت کے لئے درد ہے۔ یہ درد اگرچہ وہ کم نہیں کر سکتے لیکن اس کو محسوس کر کے اپنی نظموں کے پیکر میں ڈھال سکتے ہیں۔ یہ کام ان کے اختیار میں ہے جسے وہ اپنا فرض سمجھ کر پورا کرتے ہیں۔ ایسی تخلیقات سے ان کی انسانیت نوازی کا ثبوت ملتا ہے۔

یہ سچائی ہے کہ جو لوگ اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں۔ اپنے ہی زخموں پر مرہم لگاتے ہیں اور اپنے ہی مفاد کے لئے تگ ودو کرتے ہیں۔ وہ آفاقی احساس سے محروم رہتے ہیں۔ نذیؔر محض اپنی ذات کے حصار تک محدود نہیں ہیں۔ وہ ساری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ کر جینے کا ہنر رکھتے ہیں۔

انسانی کرب کو بیان کرنے کے لیے نذیؔر اکثر اپنی ذات کو مرکز بنانے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی مندرجہ ذیل نظم جس کا عنوان ''چکرویو'' ہے۔ اس نظم کا فکری سطح پر جائزہ لیا جائے۔ تو اس میں شاعر کا کردار ایک بہادر سورما کی مانند نظر آتا ہے۔ یہ دنیا کے سارے انسانوں کی علامت ہے۔ انسان کی امانت داری کا ثبوت اس نظم سے ملتا ہے۔ انسان رات بھر سورج کی امانت کو سنبھال کر رکھتا ہے یہ امانت کیا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے نظم ملاحظہ ہو۔

’’آج دن کی ساری اداسیوں کو

پی کر جب

سورج رخصت ہوا تو

جاتے جاتے اپنا سارا کرب

میری آنکھوں کے حوالے کر گیا

اب سورج کے آنے تک

اسی کی امانت سنبھال کر رکھنا

میرے فرائض میں شامل ہو گیا ہے

کل!

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ

اپنے فرائض سے

سبکدوشی کے بعد

میں خود بھی

دن کی اداسیوں کا حصہ بن جاؤں گا

اور پھر

سورج کے انتظار میں

شام تک آنکھیں بچھاؤں گا‘‘

نذیؔر کی غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی تتلی موجود ہے۔ راقمہ اپنے محدود مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتی ہے کہ کسی اور شاعر کے یہاں تتلی اتنی شدت سے نظر نہیں آتی جتنی شدت سے اس رنگ بہ رنگی نرم و نازک پرندے کو نذیؔر نے محسوس کیا ہے۔ نذیؔر کے غیر مطبوعہ نظموں کے مجموعہ ’’پہلے دکھ کا نزول‘‘ میں چند طویل نظمیں تتلی کے عنوان سے ملتی ہیں۔

تتلی کا احساس نذیؔر کے تصور میں ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ تتلی کے رنگ نذیر کی زندگی کو بھی رنگین بناتے ہیں۔ بچپن کی یاد اور تتلی کے پر دونوں نذیر کی یادوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ تتلی سے متعلق ان کی ایک دلکش نظم ملاحظہ ہو۔

’’وہ تتلی

ہاں وہی تتلی

مرے نادان بچپن کے

جو بے احساس ہاتھوں سے

کسی دن اڑ گئی تھی جو

فضا میں کھو گئی تھی وہ

وہ تتلی آج بھی میرا تعاقب کرتی رہتی ہے

وہ تتلی آج بھی میرے لہو میں بہتی رہتی ہے
وہ تتلی آج بھی میرے تصور میں ہے رقصندہ
وہ تتلی آج بھی میرے تخیل میں ہے رخشندہ
مری تخلیق کا چہرا
اس تتلی کے رنگوں سے مزین ہوتا رہتا ہے
مرا احساس اس تتلی سے روشن ہوتا رہتا ہے
وہ تتلی
ہاں وہی تتلی !!!

نذیؔر کے اس غیر مطبوعہ مجموعے میں نذیؔر کی نظمیں شامل ہیں طوالت کے باعث ساری نظموں کا جائزہ پیش کرنا راقمہ ضروری نہیں سمجھتی۔

نذیؔر کی ایک نظم ہے ’’کہ تم شاعر نہیں بھائی‘‘ اس نظم میں نذیؔر نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ایک غیر فنکار انسان ایک فنکار کے زخموں کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکتا، اسے یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ ایک فنکار اپنے افکار کو کس طرح صفحہ قرطاس پر اتار دیتا ہے۔ کسی خیال کو بیان کرتے وقت فنکار جس کرب سے گزرتا ہے اس سے غیر فنکار واقف نہیں ہوتا۔

نذیؔر کی نظمیں اردو نصاب میں

نذیؔر کی تین نظمیں راجستھان راجیہ پاٹھیہ پستک منڈل جے پور کے اردو نصاب میں برائے درجہ چہارم، درجہ ششم، اور درجہ دہم میں شامل کی گئیں تھیں۔ جن کا جائزہ حسب ذیل ہے۔

’’ہم پر وطن کو ناز ہے‘‘ کے زیر عنوان سے ایک نظم راجستھان کے درجہ چہارم کے نصاب میں ۲۰۰۰ء میں شامل ہوئی تھی۔ اس کتاب کی تعداد اشاعت ۱۵۰۰۰ تھی۔ اس نظم میں نذیؔر نے اقبالؔ، چکبستؔ، غالبؔ، ٹیگورؔ، اور گاندھی کی شخصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ نظم کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ بچے اسے با آسانی سمجھ جائیں۔ نظم ملاحظہ ہو۔

اقبال اور چکبست کے — خوابوں کی ہم تعبیر ہیں
ٹیگور کی ہیں ہم ادا — غالبؔ کی ہم تقدیر ہیں
ہم پر وطن کو ناز ہے

دیر و حرم کے پاسباں — ہم قوم کے معمار ہیں
کردار کے غازی ہیں ہم — گفتار کی تلوار ہیں
ہم پر وطن کو ناز ہے

ہم ہیں اذانوں کا بھرم — ہم ہیں جرس کی آبرو
ہم سے عبادت کا چمن — پوجا میں ہم سے رنگ و بو
ہم پر وطن کو ناز ہے

ہم آسمانِ دہر پر — چمکیں گے بن کر کہکشاں

گو آج کے مسکن ہیں ہم　　　لیکن ہیں کل کے نوجواں

ہم پر وطن کو ناز ہے

دوسری نظم ''بچو آؤ گیت سنائیں'' راجستھان کے اردو نصاب کے درجہ ششم میں شامل کی گی تھی۔ یہ نظم قومی یکجہتی، کا درس اور اتحاد و اتفاق کے جذبات کو لیے ہوئے ہے اور بچوں کو مل جل کر رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ نذیر کی یہ نظم ان کی تصنیف ''بچو آؤ گیت سنائیں'' میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بچو آؤ گیت سنائیں　　　گیت سنا کر دل بہلائیں
زینت آؤ رادھا آؤ　　　گوپی آؤ بابا آؤ
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی　　　سب کو یہ پیغام سنائیں

بچو آؤ گیت سنائیں

بھارت کے ہم رہنے والے　　　سچی باتیں کہنے والے
مسجد، مندر ہو یا گرجا　　　آپس کی تفریق مٹائیں

بچو آؤ گیت سنائیں

نانک اپنے چشتی اپنے　　　گوتم اپنے گاندھی اپنے
اپنے پاس ہے ساری دولت　　　غیروں کے کیوں ناز اُٹھائیں

بچو آؤ گیت سنائیں

اپنا باغ ہے، اپنا مالی　　　اپنی ہے، ساری ہریالی
اپنے جھولے پیڑ ہیں اپنے　　　گلشن میں ہم پھول کھلائیں

بچو آؤ گیت سنائیں

آپس میں تم لڑتے کیوں ہو　　　لڑتے اور جھگڑتے کیوں ہو
اپنے وطن کے بچے ہیں ہم　　　سب کو یہ احساس دلائیں

بچو آؤ گیت سنائیں

بچوں اور بڑوں کے لیے نذیر کا احساس ایک جیسا ہے۔ ہر حال میں وہ ایکتا اور یکجہتی کے علمبردار نظر آتے ہیں مل جل کر رہنے اور مل بانٹ کر کھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

''وطن کی مٹی'' کے زیرِ عنوان نذیر کی ایک نظم راجستھان کے درجہ دہم کے نصاب میں شامل کی گئی تھی۔ ان کی یہ نظم ان کی تصنیف ''یہ زمین میری ہے'' میں شامل ہے، اس نظم کے تحت نذیر نے اس خیال کو اجاگر کیا کہ ہمارے وطن کی مٹی ہم لوگوں سے مذہب کے نام پر کوئی فرق نہیں کرتی اور اسی لے ہمیں بھی مل جل کر رہنا چاہیے۔ لہٰذا ملاحظہ ہو۔

یہی مٹی ہمارا دل، یہی مٹی تمہارا دل
اسی مٹی میں پوشیدہ ہے اپنے پیار کی منزل

اسی مٹی سے مندر کے درودیوار بنتے ہیں
اسی مٹی سے مسجد کے حسین مینار بنتے ہیں
یہ مٹی جس میں تفریق و تعصب کا نہیں عنصر
ہویدا ہے اسی مٹی سے یکجہتی کا ہر منظر
یہ مٹی میرے بھارت کی عقیدت اس میں پوشیدہ
محبت اس میں پوشیدہ شرافت اس میں پوشیدہ
اگر ہم دل سے بھارت کو وطن اپنا سمجھتے ہیں
ہم اس کے ذرّے ذرّے کوچمن اپنا سمجھتے ہیں
توپھر اے دوستو! ہندو، مسلمانو! قسم کھاؤ
اسی مٹی سے یکجہتی کی اک دنیا بسائیں گے
اسی مٹی کی خوشبو، اپنی روحوں میں بسائیں گے

ہندوستانی تہذیب اور معاشرے میں اس مٹی کو اہم سمجھا جاتا ہے جہاں انسان پیدا ہوتا ہے۔جس مٹی میں کھیل کراس کا بچپن جوانی، کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ جومٹی فصل اگاتی ہے، مندرجہ بالا نظم میں نذیؔر نے اسی مٹی کا گن گان کیا ہے۔ہمیں فطری فنکاروں کے یہاں مٹی کے گیت کثرت سے مل جاتے ہیں۔نذیؔرایسے مصور ہیں جولفظوں سے تصویر بنانے کا ہنر جانتے ہیں اس لیے انھوں نے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی فطرت کی تصویر بنائی ہیں اس رخ سے نذیؔر کی شاعری کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔اس سے شاعری فکر کے ایسے گوشے نمایاں ہوسکتے ہیں جوہنوز پردوں میں ہیں۔

نذیؔر نے اپنی ایک نظم ’’ایک پتھر اک خودساختہ آئینے پر میں ایک ایسے شاعر وادیب کونشانہ بنایا ہے جو بظاہر تو سب سے محبت کرتا ہے مگر اس کے دل میں نفرت بھری پڑی ہے اور وہ حسد کی آگ میں جل رہا ہے۔ ہر وقت اس کا ضمیر صرف اپنے لیے بھلا اور دوسرے کے لیے برا سوچتا ہے وہ ہر حال میں صرف خودکو ہی برتر واعلیٰ سمجھتا ہے اور دوسروں کے وجود کونکارتا ہے۔ وہ سچ سے غافل ہے نذیؔر اسے اس سچ سے آشنا کروانا چاہتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہوں۔

پیش آئینہ

بہت لکھتے ہیں افسانے
کہانی،تبصرے،ناٹک
بہت اس کے تخیل کی ہیں
پروازیں بلندی پر
اڑاتا ہے بہت لفظوں کے پنچھی
آسمانوں میں
بہت کرتا ہے باتیں

قلم کا جھوٹ
کالی روشنائی کے لبوں سے
پھوٹتا دیکھا
جودل میں کھوٹ ہے
اس کا ملمع چھوٹتا دیکھا
قلم قرطاس کی پاکیزگی
عصمت کے دروازے سے

وسعتِ احساس کی ہر پل
باہر جھانکتی دیکھی
بہت گہرے سمندر سے
وہ خود چلتا ہے پھولوں پر
جواہر چن کے لاتا ہے
مگر احباب کے دل میں
وہ اپنے فکر وفن کی
چبھوتا ہے ہمیشہ
خود ہی دنیا ئیں سجاتا ہے
خار کے ''نشتر''
وہ اپنے منھ سے
اور اس کے بعد خوش ہوتا ہے
اپنی خودسری کے گیت گاتا ہے
اپنی کامیابی پر
بظاہر اس کی سوچوں کی
پسِ آئینہ یہ کردار اس کا
کوئی حد ہی نہیں دیکھی
کون دیکھے گا
بظاہر اس کے دل میں
اگر دیکھا کسی نے بھی تو
کوئی سرحد ہی نہیں دیکھی
آخر کون بولے گا

پس آئینہ

مگر جب جب پسِ آئینہ دیکھا تو
مقید ہیں زبانیں مصلحت کے
قلم قرطاس کے خودساختہ
قید خانوں میں
مقبول چہرے پر
چلواب وقت آیا ہے
عداوت کے، حسد کے، خودفریبی کے
عقوبت کے حصاروں سے
بہت دھبے نظر آئے
نکل کر جھوٹ کے اس آئینے پر
سچ کا پتھر مارتے ہیں ہم

راقمہ نے نذیؔر کی نظموں کا جائزہ لیتے وقت اپنی ہی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ جس طرح نذیؔر کی غزلوں اور گیتوں پر بے شمار حوالے موجود ہیں اس طرح ان کی نظموں پر کثرت سے نہیں لکھا گیا ہے۔ ان نظموں پر صرف ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا ایک مضمون ملتا ہے۔ جو ''نظم سفر'' کا دیباچہ ہے۔

نذیؔر کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اپنے مضمون ''نذیر فتح پوری کی نظموں میں اصوات و مفاہیم'' میں فرماتے ہیں۔

> ''نذیؔر فتح پوری اپنی نظموں میں توانائی، صلاحیت اور قوت سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے بھی کہ وہ شاعر کے ساتھ نقاد ہیں، لیکن انہوں نے اپنی نظموں کو فلسفیانہ نظریوں اور کلیوں کے بیان کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود ان کی نظموں کو پڑھنے والا قدرتی طور پر پہلے خیالات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔
>
> اور قدرتِ اظہار، زبردست شعری کیفیت اور تاثیر سے اثر لیتا ہے۔ خارقِ عادت واقعہ، عرق ریزیٔ فکر، ذہانت و بیدار مغزی اور تنقید نفس کے اعلیٰ نمونے نذیر فتح پوری کی نظموں میں ملتے ہیں ان کی صنائی اور تراش خراش سے

مہتم بالشان شاعرانہ شخصیت سامنے آتی ہے۔ ہیئت (Form)، موضوع (Content)، ساخت (Structure)، اور بناوٹ (Texture) کی ہم آہنگی سے وہ اپنی نظموں کا ڈھانچہ

سامنے لاتے ہیں پھر علامت کی آمیزش سے پیکر تیار کرتے ہیں۔'' (٦١)

نذیؔر فتح پوری کی توشیحی نظمیں

علم بیان کی ایک ایسی صنف جس میں اشعار کا پہلا حرف یا ہر پہلے مصرعہ کا شروع کا ایک لفظ پڑھا جائے تو وہ کسی عبارت یا نام کے طور پر ہمارے ذہن میں رونما ہوتا ہے انہیں ''توشیحی نظمیں کہا جاتا ہے' توشیحی نظم میں شاعر اکثر کسی شاعر و ادیب کے القاب و آداب، تصانیف، رسائل وجرائد اور اسمائے گرامی کے ناموں کے پہلے حروف سے شعر کی شروعات کرتے ہیں اور اپنے خیالات کے اظہار میں فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں ان کا یہ عمل ان کی شاعری میں جدت اور ندرت پیدا کرتا ہے توشیحی نظموں کا پہلا مجموعہ ''توشیحی نظمیں'' کے نام سے شائع ہوا اس کے خالق جناب امین حزیں ہیں۔

نذیؔر فتح پوری نے بھی کثرت سے توشیحی نظمیں تحریر کی ہیں اور اس صنف سخن میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان نظموں سے ان کی فنی ہنرمندی اور لفظی دسترس کا ثبوت ملتا ہے اپنے رسالے ''اسباق'' کے ذریعہ نذیؔر نے بہت سے گوشہ نشین اور معروف شعراء پر گوشے شائع کیے ہیں۔ جن پر انہوں نے توشیحی نظمیں لکھ کر ان کے اوصاف گنوائے اور اپنی فنی تخلیقیت کا ثبوت دیا۔

نذیؔر نے توشیحی نظموں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے جس میں محترمہ سلطانہ مہر، غلام مرتضیٰ راہیؔ، ڈاکٹر وزیر آغا اوراق، رفیق جعفر پیر پاشاہ، حسینی انعام دار، منور پیر بھائی، میر خواجہ تاش ساحر شیوی، ابراہیم جلیس، مجتبیٰ حسین، محبوب حسین جگر، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، جاوید اختر چودھری، افسانہ نگار دیپک بدکی، حکیم رازی ادیبی، ناول اور افسانہ نگار آنند لہر، اظہر جاوید، مدیر تخلیق لاہور، وغیرہ کے علاوہ خاندیش، تاریخی، تہذیبی ادبی مطالعہ، اردو زبان اردو شاعری کل آج اور ہمیشہ او ہفت روزہ بیباک مالیگاؤں وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ توشیحی نظموں کی مثال ملاحظہ کیجیے۔

اُردو زبان، اردو شاعری کل آج اور ہمیشہ

ا — اللہ کا رساز کی تعریف کیجیے — پھر اس کے بعد نام محمد کا لیجیے
ر — روحوں میں جس نے نور کا احساس بھردیا — ظلمت کدوں کو قمقمہ بردوش کردیا
د — دامن دریدہ فکر کی بخیہ گری ہوئی — زخمی انا کو مرہمی سوغات مل گئی
و — وحشت پرستوں کو سکونِ دروں ملا — قلبِ حزیں میں چین کا اک باب کھل گیا
ز — زیب سخن کے واسطے اعراب مل گئے — عریانیت کو اطلس و کمخواب مل گئے
ب — بندوں کو رب نے دولتِ ادراک بخش دی — اظہاریت کی ہمت بے باک بخش دی

ا — اردو زبان کا تحفۂ نایاب پھر دیا — افکارِ نو کا ایک عجب سلسلہ چلا
ن — نکہت بدوش ہو گیا احساسِ شاعری — ذہن وخرد میں کھل گئی تخلیق کی کلی
ا — انسانیت کے درد کا درماں سخن ہوا — یعنی نشاط و کیف کا ساماں سخن ہوا
ر — رخصت ہوئی حیات کے چہرے سے تیرگی — ہر ہر قدم پہ کھل اُٹھی لفظوں کی چاندنی
د — دیواردور پہ مرزاؔ نے سبزہ اگا دیا — اور میرؔ نے بھی طرز سخن کا پتہ دیا
و — واہوگئی حیات کی مسدود رہ گزر — پھر قافلۂ فہم ہوا مائلِ سفر
ش — شیشے میں کائنات کاچہرہ ابھر گیا — عکس سخن ورق کے بدن پر اُتر گیا
ا — اقبالؔ کے شعور نے پیمانے بھردیے — اسرار بے خودی کے کھلے سب کے واسطے
ع — عمرسخن بلند ہوئی مثل کہکشاں — بانگِ درا سنی توہوئے قافلے رواں
ر — رنگ سخن نے رنگِ تغزل کیا قبول — یہ دیکھ یاسیت کے ہوئے دیوتا ملول
ی — یہ سچ ہے رسم کہنہ سخن کی بدل گئی — غزلوں کی جو بھی طرز تھی نظموں میں ڈھل گئی
ک — کم فہمیوں کو شدت تفہیم مل گئی — ناخواندگی وقت کو تعلیم مل گئی
ل — لازم حصولِ مقصدِ ادراک ہو گیا — انساں کچھ اور پہلے سے بے باک ہو گیا
آ — آفاق سے زمیں کابڑا مرتبہ ہوا — ذکر سخن نے نطق کا رتبہ بڑھا دیا
ج — جذبات کی شعائیں بڑا کام کر گئیں — نبضیں حیاتِ نو کی شدائد سے بھر گئیں
ا — افسانہ ادب میں نیا موڑ آگیا — جو ماجرائی وصف تھا قاری کو بھاگیا
و — واقف ہوئے ہیں رمز وکنایہ سے یا رلوگ — بے جا علامتوں کے ہوئے کچھ شکار لوگ
ر — راہ سخن کا قافلہ آگے کو جب بڑھا — محفل میں رہ کے آدمی تنہا ساہو گیا
ہ — ہمت جواب دے گئی سخ بستہ دل ہوئے — مقتل میں سرنگوں ہوئے عظمت کے قافلے
م — محشر ادب میں پھر سے اٹھانے چلے ہیں لوگ — مابعد جدتوں کو جگانے چلے ہیں لوگ
ی — یہ بھی سخن طراز عمل ہے قبول کر — منزل نئی ملے گی نہ اس رہ کو بھول کر
ش — شمس و قمر سے دورہے، احساس کامقام — تخلیق کی تلاش میں نکلے ہیں تیز گام
ہ — ہمت نئی ہے، عزم نیا، حوصلے نئے — بڑھ جائیں گے ستاروں کے یہ قافلے لئے

نذیرؔ کی مذکورہ نظموں کا مسودہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ نذیرؔ نے اپنے اس مجموعے کا عنوان ''میری توشیحات'' رکھا ہے اس مجموعہ کا پیش لفظ ڈاکٹر اسلم حنیف نے لکھا ہے جوخود میں اس صنف کے اہم شاعر ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

''موشحہ اور توشیح کے لغوی معنی ہار پہنانے ہیں۔ یہ الفاظ ماخوذ ہیں ''وشاح'' سے جس کے معنی ہیں قیمتی اور رنگارنگ جواہرات سے مزین ہار یا وہ گلوبند جوعرب عورتیں ایک کاندھے سے ترچھا لٹکا کر دوسرے کاندھے

پر ڈال لیا کرتی تھیں۔ اہل عرب قیمتی نقش ونگار والے کپڑوں کو ثوب موشح کہتے ہیں اور ایسی مادہ نیز جس کی گردن اور سینہ سفید ہو کر ''وشاح'' کہتے ہیں''

(پیش لفظ۔از ڈاکٹر اسلم حنیف۔مسودہ ''میری توشیحات'' از نذیر فتح پوری)

نذیر فتح پوری کی توشیحات کے تعلق سے ڈاکٹر اسلم حنیف کی رائے ملاحظہ کریں۔۔

''نذیر فتح پوری کی توشیحات کا معیار بلند ہے اور وہ اردو کے دوسرے عظیم توشیح نگار کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔''

(پیش لفظ۔از ڈاکٹر اسلم حنیف)

نذیر اپنی تجربہ پسند طبیعت کے پیش نظر توشیحات میں بسا اوقات تجرباتی انداز اپنایا ہے۔

''اکثر توشیحات کو آخر میں زائد اشعار کو دعائیہ عنوان سے پیش کر کے نذیر فتح پوری نے اجتہاد کو ایک نیا رنگ وقالب عطا کر دیا ہے۔''

اس تجربے کے برعکس نذیر فتح پوری نے بعض توشیحات کے آغاز کے لئے افاضی اشعار تخلیق کرنے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ توشیح کی ابتداء میں لائے گئے ان اشعار پر ابتدائیہ کا عنوان چسپاں کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ بھی اس صنف میں خوشگوار اضافے کا احساس دلاتا ہے۔''

(پیش لفظ۔از ڈاکٹر اسلم حنیف)

نذیر کی سہ سطری نظمیں

نذیر نے سہ سطری نظموں کا بھی تجربہ کیا ہے۔ ان نظموں میں تین مصرعوں میں پورا مضمون ادا کر دیا جاتا ہے۔ نذیر نے خوشی، غم، غصہ، بارش، تاریخ، غریبی، گاؤں، پانی کی قلت، جہیز، گرمی، مثلاً اکثر موضوعات پر قلم اٹھایا۔ مثال ملاحظہ ہو۔

یہ فرق شعوری ہے آنکھوں کی حفاظت کر سانپوں کا بسیرا ہے
فنکار ہیں سب یکساں مت دیکھ میرے بھائی چندن کے درختوں کو
افکار میں دوری ہے یہ زہر بھرے منظر آفات نے گھیرا ہے

یہ کیسی قیامت ہے انگریز کو کاٹے گی بارش میں یہ ہوتا ہے
جلتی ہوئی دھرتی کو تلوار ہے ٹیپو کی سیلاب ہے سڑکوں پر
پانی کی ضرورت ہے پر تیز کو کاٹے گی دل آگ میں جلتا ہے

تحریر ادھوری ہے بیٹی کی محبت میں ایڑی میں جو آیا ہے
دل ایسے صحیفے کی سب دے دیا باپو نے گرمی کی تمازت سے

تفسیر ادھوری ہے اک دولہے کی قیمت ہے چوٹی کا پسینہ ہے

آزر بھی نہیں ملتے اک کرب مسلسل ہے سوکھے ہیں نہ گیلے ہیں
اس دور میں پہلے سے ہلچل ہو اگر دل میں گھر ہم سے غریبوں کے
پتھر بھی نہیں ملتے ہر چیز میں ہلچل ہے بس ریت کے ٹیلے ہیں

نذیؔر حقیقت میں زمین سے جڑے ہوئے شاعر ہیں۔ وہ انسانی جذبات کا بہت گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر تخلیقی توانائی کو بروئے کار لاکر اپنے جذبات شعروادب میں کاغذ پر تحریر کردیتے ہیں۔ راقمہ نے پورے مقالے کی تحریر کے دوران جگہ جگہ اس بات کو محسوس کیا ہے۔ نذیؔر کی شاعری میں انسانی کرب کی جو تصاویر دیکھنے کو ملتی ہیں وہ انہیں ایک انسانیت نواز شاعر تسلیم کرنے کے لیے کافی ہے۔

نذیؔر فتح پوری اور ادب اطفال

اُردو زبان میں شاعری اور نثر نگاری کے حوالے سے جو ادب تحریر کیا گیا وہ ہمارا ادبی سرمایہ ہے۔ اس میدان میں کسی نے مشکل زبان کا استعمال کیا تو کسی نے نہایت آسان زبان استعمال کرکے اپنا فرض ادا کیا، دلکش وسادہ زبان کا استعمال کرکے کچھ شعراء اور ادباء نے بچوں کے لیے نصیحت آموز ادب تحریر کیا لیکن یہ اتنا سہل کام نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے بچے کی طرح سوچنا پڑتا ہے اور اپنے ذہن کی بچے کے ذہن تک رسائی کروانی پڑتی ہے۔ ایک شاعر کے لیے بچوں کے لحاظ سے ردیف وقافیہ استعمال کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ بچوں کے لیے ادب لکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا لوہے کے چنے چبانا۔ بچوں کے لیے ادب لکھنے کے لیے شاعر کو سادہ اور سلیس زبان کے ساتھ مانوس اور رواں دواں لفظوں کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان دلکش ہونی چاہیے۔ خیال اور شعر عام فہم ہونے چاہیے۔ گیت یا نظم کے بول ایسے ہوں کہ بچوں کو باآسانی ذہن نشین ہوجائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ بات خاص طور پر شامل ہو کہ بچوں کو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دی جائے۔ نظموں اور گیتوں کے ذریعہ ان کو بہتر اخلاق کی تعلیم دی جائے، اگر کسی شاعری میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں تو وہ صحیح معنوں میں بچوں کے لیے مفید ہے۔

نذیؔر کی ایک تصنیف ''بچو آؤ گیت سنائیں'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ تصنیف اصل میں بچوں ہی کے ادب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں بچوں کے لیے نصیحت آموز انداز میں نظمیں تحریر کی گئیں ہیں اور اسی نسبت سے یہ دوبار یعنی ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی نذیر کی اس تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد فرماتے ہیں۔

''نذیؔر صاحب کی ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے یہ نظمیں کہتے وقت بچوں کی نفسیات کا پوری طرح سے خیال رکھا ہے۔ اور دوسرا شعر کے پردے میں بچوں کے ساتھ کام کی باتیں کی ہیں۔ انہوں نے اس بات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے کہ ہمارے دیس میں بچے بڑے ہوکر مثالی شہری بنیں چنانچہ ان کی نظموں میں حمد اور نعت بھی شامل ہیں اخلاقیات اور ماں باپ کی عزت کو بھی انہوں نے موضوع بنایا ہے اور حبّ وطن کو بھی۔ نظموں کی زبان سادہ اور دلکش ہے اور یہ ان نظموں

کی بڑی خوبی ہے زبان کی دلکشی کے باعث بچے ان نظموں کو زبانی یاد کرلیں اور جب یہ انہیں زبانی یاد ہو جائیں گی تو ان میں بیان کیے ہوئے مضامین ان کے رگ و پے میں اتر جائیں گے۔‘‘(۶۲)

اردو میں بچوں کے لیے جو ادب تحریر کیا گیا۔ وہ دریا میں قطرہ کی مانند ہے۔ اس طرف شدت سے توجہ کرنے والے شعراء میں شفیع الدین نیّر، حامد اللہ افسر میرٹھی، حفیظ جالندھری، اسمٰعیل میرٹھی، اور تلوک چند محروم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں علامہ اقبال نے بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھیں لیکن ان نظموں کی زبان بچوں کی فہم سے باہر ہے۔ ’’بچو آؤ گیت سنائیں‘‘ کے ذریعہ نذیر بھی اس فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ نذیر نے جب بچوں کے لیے نظمیں لکھیں تو وہ خود، بھی اپنے بچپن کے واقعات کو یاد کرنے لگے اور اپنے ان احساسات وجذبات کو انہوں نے صفحہ قرطاس پر اتار دیا۔ مثال کے طور پر چند غزلوں کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بات جب چل پڑی ہے پھولوں کی
سب نے تعریف کی ہے پھولوں کی
سب کو بانٹے ہے بے طلب خوشبو
کیسی دریا دلی ہے پھولوں کی

ڈال ڈال پہ مہکا ہوں
میں بھی پھول کے جیسا ہوں
امی اکثر کہتی ہیں!
میں اک چاند کا ٹکڑا ہوں
دھن دولت کی فکر نہیں
علم و ادب کا رسیا ہوں
بہنوں کے دل کا ہوں چین
اور بھیّا کا پیارا ہوں
کتنی اچھی عادت ہے
ہر دم خوش خوش رہتا ہوں
روز سویرے اُٹھتے ہی
سیدھے مکتب جاتا ہوں
سارے بچوں میں ہر سال
پہلا نمبر آتا ہوں
مجھ سے سب کرتے ہی پیار
سب کا راج دُلارا ہوں‘‘

نذیؔر نے اپنے اس مجموعے میں تہواروں کے متعلق بھی نظمیں کہیں اور بچوں کو ان تہواروں کی اہمیت وافادیت سے واقف کروایا اور اس

کے ساتھ ہی قومی یکجہتی، بھائی چارہ اور وطن سے محبت کے لیے بھی نصیحت کی، جس کا اندازہ ان نظموں سے ہو جاتا ہے۔

دیش کی آزادی کا سپنا
یہ ہے ترنگا جھنڈا اپنا
اس میں جتنے رنگ سجے ہیں
پریم پیار کے سنگ سجے ہیں
بھارت ماں کی شان یہی ہے
اور ہماری آن یہی ہے
دیش ہے اپنا پیارا ہم کو
جھنڈا جتنا پیارا ہم کو
آزادی کا ایک نشان !
اپنا جھنڈا اپنی شان
لاکھ مصیبت آئے لیکن !
یہ نہ جھکنے پائے لیکن
بچو ! اس کو اونچا رکھنا
جھنڈا گویا سر ہے اپنا
آؤ بچو ! مل کر گائیں !
سب کو ایک ہی گیت سنائیں
جھنڈا اونچا رہے ہمارا
ہم سب کو ہے جان سے پیارا

نذؔیر کے اس مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور افسانہ نگار جوگندر پال فرماتے ہیں ۔

''ایمان کی بات ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے پڑھتے پڑھتے صفحوں پر بے اختیار جھکے ہوئے مجھے اپنے باطن میں اپنے اسی اولین معصوم آپ کا سراغ مل گیا جو نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ ان ننھے منے جذبوں کی گدگداہٹ سے میں آنکھیں ملتے ہوئے اپنے بچپن کے بیچوں بیچ جاگ پڑا۔'' (٦٣)

نذؔیر کا قوتِ مشاہدہ اور محسوسات بہت وسیع ہے، وہ عالم تصور میں بھی بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں اسی لیے نذؔیر نے بچوں کو جنگل اور وہاں کے ماحول سے واقف کروانے کے لیے ایک نظم ''جنگل کا گیت'' عنوان سے تحریر کی جو بچوں کے ماہنامہ اُمنگ میں نومبر ۲۰۱۱ء کے شمارے میں صفحہ نمبر ۴۰ پر شائع ہوئی۔ اس نظم میں نذیر نے مناظر قدرت کو بڑے ہی خوبصورت اور دلکش انداز میں بچوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ جہاں پہاڑوں سے بہتے ہوئے جھرنوں کا نغمہ، بل کھاتی ندیاں، کوئل کی کوک، پپیہے کی ہوک، گھنگھور گھٹائیں، ساون کی ٹھنڈی ہوائیں۔ اُڑتی ہوئی تتلیاں اور جنگل میں رہنے والے جانوروں کا ذکر ان کی خصوصیات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ نظم ایسی مکمل اور مسلسل ہے کہ پوری نظم سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

لہٰذا نظم حاضر ہے۔

جنگل کا گیت

جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
بچوں کے لیے لائے ہیں منگل کی کہانی

پانی کا یہ بہتا ہوا جھرنا ذرا دیکھو   موجوں کا پہاڑوں سے اُترنا ذرا دیکھو
بل کھاتی ہوئی ندیا کی بے چین جوانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
ایک مور کا ہم ناچ دکھائیں تمہیں بچو!   کوئل کا بھی اک گیت سنائیں تمہیں بچو
سنوائیں پپیہے کی مدھر تان سہانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
گھنگور گھٹا لائی ہے برسات کا موسم   بھیگے ہوئے پتوں پہ ہے جذبات کا موسم
ہر بوند کے ہونٹوں پہ ہے بادل کی کہانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
تتلی کی اُڑانوں کا نظارا ذرا کرلو   پھولوں کا مہکتا ہوا چہرا ذرا دیکھو
کچھ گیت بھی سن لو ذرا کلیوں کی زبانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
پانی کے لیے دوڑتا یہ ایک ہر ن ہے   خرگوش ادھر اپنی ہی دنیامیں مگن ہے
ہے لومڑی جیسے ہو کوئی بچوں کی نانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
گوریلا جسے کہتے ہو تم، نام ہے میرو   لگتا ہے کہ جنگل کا ہو جیسے یہی ہیرو
دشمن کے لیے ہوتا ہے یہ دشمنِ جانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
ہاتھی کا یہ چنگھاڑنا طوفان کے جیسا   ہے پیار بھی اس میں کسی انسان کے جیسا
اونچا ہے یہ جیسے ہو پہاڑوں کی جوانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
یہ شیر ہے جنگل کا جسے کہتے ہیں راجا   اک پل میں یہ دشمن کا بجا دیتا ہے باجا
وہ دور رہے جس کو ہو جاں اپنی بچانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
انسان کا بچہ ہے جسے کہتے ہیں ٹرزن   ہیں دوست سبھی اس کے،نہیں کوئی بھی دشمن
ہے دوسرے بچوں سے جدا اس کی کہانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی
کرتب تمہیں کچھ ایسے یہ دکھلائے گا دیکھو   اس ڈال سے اُس ڈال پہ یہ جائے گا دیکھو
اُڑتا ہے ہواؤں میں یہ جنگل کا پرانی   جنگل کی کہانی ہے یہ جنگل کی کہانی

(بچوں کا ماہنامہ امنگ ص ۴۲ نومبر ۲۰۱۱ء)

بچوں کی شاعری میں جنگل کی ایسی دل آویز اور حقیقت کشا نظمیں کم مطالعہ میں آئی ہیں۔واقعی نذیؔر نے قلم کو کیمرہ بنا دیا اور ایک منظر کی لفظی تصویر بنا کر صفحہ قرطاس پر سجا دی، نذیؔر کا ایک اور گیت ’’بچوں کا ماہنامہ اُمنگ‘‘ میں شائع ہوا جس میں بہت ہی آسان اور سلیس زبان میں ایک پنچھی کی پیاس اور گرمی کے ماحول کو بیان کیا گیا ہے، بچو کی فہم کے لحاظ سے اس گیت میں الفاظ بھی ایسے آسان استعمال کیے گئے ہیں جنہیں ایک بار پڑھتے ہی مطلب سمجھ میں آجائے۔شاید سہلِ ممتنع میں بلاغت اسی کا نام ہے۔گیت ملاحظہ ہو!

پانی پینے آیا پنچھی
پانی پینے آیا
دھوپ کی لپٹیں سہہ کر
مرتا مرتا جینے آیا
پنچھی پانی پینے آیا
پیاس میں ڈوبا من
جلتا ہے تن من
سانسوں کی الجھن
ہردے کی تڑپن
ایسے دکھ دائک موسم میں
گرتا پڑتا جینے آیا
پنچھی پانی پینے آیا
جلتی ریت کا تھال
سوکھا کال، اکال
پاؤں میں ہے بھونچال
رستے میں جنجال
ایسے دشمن سمے سے ڈرتا
ڈرتا جینے آیا

پنچھی پانی پینے آیا

(بچوں کا ماہنامہ اُمنگ) نئی دہلی۔ص ۳۶۔جنوری ۲۰۰۹ء جلد۔۲۳۔شمارہ ۱)

بچوں کے لیے نذیؔر فتح پوری نے شاعری کے حوالے سے جو کچھ تحریر کیا ہے۔ وہ اہمیت کا حامل ہے۔کوئی نظم یا کوئی گیت حقیقت سے دور دکھائی نہیں دیتی۔ نذیؔر کی بچوں کی شاعری بھی ان کی سنجیدہ شاعری کی طرح زمین سے جڑی ہوئی ہے، انہوں نے بچوں کو بھوت اور پریوں کی مصنوعی کہانی سنا کر کبھی فریب نہیں دیا۔خوف ناک جنگلوں میں جن اور بھوتوں کے منظر درشا کر کبھی بچوں کو ڈرانے کی کوشش نہیں کی۔اوپر راقمہ نے دو نظمیں پیش کی ہیں۔ان کو ملاحظہ کریں تو راقمہ کی رائے کی دلیل مل جائے گی۔

نذیؔر بحیثیت مثنوی نگار

ایسی طویل نظم جس میں کوئی قصہ، کوئی خیال، کوئی واقعہ تسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے وہ مثنوی کہلاتی ہے۔کیوں کہ ایک مثنوی میں ایک پورا قصہ بیان کیا جاتا ہے اس کے لیے کئی باتوں کو ذہین نشین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں سب سے پہلی یہ ہے کہ مثنوی کو لکھنے سے قبل ہی پورے قصے کا خاکہ ذہن میں تیار ہونا چاہیے۔اس کے بعد پوری مستعدی کے ساتھ اسے تکمیل کو پہنچایا جائے۔ واقعہ کو اس چابک دستی سے مربوط کیا جائے جس سے تسلسل بنا رہے۔ زبان دلکش ہو تو قاری ایسی طویل نظموں کو خوشی خوشی پڑھتا چلا جاتا ہے۔

واقعہ نگاری مثنوی کا اہم جزو ہے۔ مثنوی میں فطری وفوق الفطری دونوں ہی واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔مثنوی میں عشق، فلسفہ، اخلاق، رزم و بزم، وغیرہ تمام موضوعات کو شامل کیا گیا ہے۔موضوعات کے لحاظ سے مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

صنف مثنوی میں پورے قصے کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے جہاں غزل میں رمز و کنایے کے پیرائے میں بات کہی جاتی ہے وہیں مثنوی میں واقعات کا بیان صراحت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

کردار نگاری بھی مثنوی کا لازمی جزو ہے۔ بہترین کردار نگاری کے لیے ضروری ہے مثنوی نگار انسانی نفسیات اور اس کی پیچیدگیوں سے

بخوبی واقف ہوں۔ کرداروں کا اندازِ گفتگو اور زبان مختلف ہوسکتی ہے۔ اور اسی لیے مثنوی نگار کو یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیے کہ کون سا کردار کس وقت کیا بات کہے گا۔ کردار نگاری کے علاوہ جذبات نگاری، کالمہ نگاری، محاکات اور منظر نگاری بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

مثنوی دو قسم ہوتی ہیں۔ بیانیہ مثنوی اور داستانی مثنوی، بیانیہ مثنوی مختصر ہوتی ہے اور سادگی اور دلکشی کے ساتھ کسی خاص موضوع پر قلم بند کی جاتی ہے میرؔ کی مثنوی دربیانِ ہولی، اور حالی کی مثنوی برکھا رُت اسی زمرے میں آتی ہیں۔ علاوہ ازیں جن مثنویوں میں کوئی قصہ یا داستان بیان کی جائے داستانی مثنویاں کہلاتی ہیں۔ یہ مثنویاں طویل ہوتی ہیں۔

اردو مثنوی کی بنیاد دکن میں پڑی۔ فخر الدین نظامی بیدری کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے صنف مثنوی کی ابتداء مانی گئی۔ پھر نویں صدی ہجری میں خوب محمد چشتی کی ''خوب ترنگ'' اور شاہ میراں جی شمس العشاق کی مثنویاں خوش نامہ، خوش نغز، اور شرح مغروب القلوب وغیرہ سامنے آتی ہیں ان کے علاوہ منفعت الایمان، وصیت الھادی، ارشاد نامہ، قصہ بے نظیر، خاور نامہ، ہشت بہشت، یوسف زلیخا، گلشن عشق، علی نامہ، قطب مشتری، ظفر نامہ، سیف الملوک وبدیع الجمال، ستونتی، طوطی نامہ، پھول بن، من لگن، پنچھی باچھا اور دیپک پتنگ دکن کی ناقابل فراموش مثنویاں ہیں۔

شمالی ہند میں بھی مثنوی شعراء کی توجہ پا گئی اور موعظ آرائش معشوق از شاہ مبارک آبرو، شاہ نامہ از سید حیدر بخش حیدری، مناجات، تعریف پنگھٹ، اور تعریف جوگن از فائز دہلوی، دریائے عشق اور ہجو در خانہ خود از میرؔ تقی میر، درپیل راجہ نرپت سنگھ اور در ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال از مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواب وخیال از میرؔ اثرؔ، سحر البیان، گلزار ارم اور رموز العارفین از میر حسن، بحر محبت، شعلہ عشق، جذبہ عشق اور گلزارِ شہادت از مصحفی، کارستانِ الفت اور حسن وعشق از جرأت، گلزارِ نسیم از دیاشنکر نسیم، حزنِ اختر از نواب واجد علی شاہ، بہارِ عشق، زہر عشق، اور فریبِ عشق از نواب مرزا شوقؔ، نظم سراج از ناسخؔ، نورِ تجلی اور ابرِ کرم از امیرؔ، فریادِ داغ، از داغؔ دہلوی! حب وطن اور برکھارت از حالی، صبح امید از شبلی نعمانی، اسمٰعیل میرٹھی کی چھوٹی چھوٹی مثنویاں، شاہنامہ اسلام از حفیظ جالندھری، ساقی نامہ از علامہ اقبالؔ، ترانۂ جمہور از علی سردار جعفری وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نذیرؔ نے بھی ایک مثنوی جوابِ زہر خند تحریر کی ہے۔ اصل میں یہ مثنوی نور کوہلی کی مثنوی ''زہر خند کے جواب میں تحریر کی گئی تھی۔

مثنوی پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔ عظیم الحق جنیدی فرماتے ہیں۔

''مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جو مسلسل ہو بہو اور اس میں کوئی واقعہ یا داستان وغیرہ نظم کی جائے۔'' (۶۴)

مثنوی کی صنف پر اظہار خیال کرتے ہوئے نورالحسن نقوی فرماتے ہیں۔

''مثنوی ایک بیانیہ صنف ہے۔ اس میں خیال مربوط رہتا ہے بات سے بات نکلتی ہے اور قصہ بتدریج آگے بڑھتا ہے گویا مثنوی ایک ایسی صنفِ شاعری ہے جس میں ایک طویل مربوط، اور مکمل شعری کارنامہ وجود میں آنے کے امکانات موجود ہیں۔'' (۶۵)

مثنوی جوابِ زہر خند کی ابتدا سنجے بھاردواج کے لیے لکھے گئے ایک گیت سے ہوئی ہے جس میں نذیرؔ نے قومی یکجہتی اور اتحاد واتفاق سے رہنے کی بات کہی ہے۔ یہ گیت انہوں نے اپنے گیت کے مجموعے ''مرے گیت اکیلے رہ گئے'' اور اپنی دوسری تصنیف ''یہ زمین میری ہے'' (جو ہندی رسم الخط میں ہے) میں بھی شامل کیا ہے۔ اس کے بعد ایک گیت ''دہشت گردی کے نام'' ہے کہ ہمیں دہشت گردی کو مٹا کر اپنی زمیں سے محبت کا رشتہ استوار کرنا ہے، اس گیت کا عنوان ہی ''دھرتی سے پیار کرو لوگو'' ہے یہ گیت بھی ''مرے گیت اکیلے رہ گئے'' میں شامل ہے۔

اس کے بعد ایک اور نظم نما گیت ہے جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور بے انتہا خوبیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ بعد ازیں اسلم مرزا اور نذیرؔ فتح پوری کے مثنوی سے متعلق خیالات کو قلم بند کیا گیا ہے۔

مثنوی کی ابتداء میں حمد اور نعت رسول ﷺ پیش کیے گئے۔ پھر نور کوہلی سے خطاب کیا گیا۔ اس کے بعد مختلف عنوانات کے ذریعہ مثنوی میں جواب تحریر کیے گئے ہیں، مثلاً مسلم حکمرانوں کے جواب میں، بابر کے جواب میں، اکبر اعظم کے جواب میں، عالمگیر کے جواب میں، عالم گیر دکن میں، تاج محل کے جواب میں، جنگ آزادی کے جواب میں، اردو سے چشم پوشی، ہندو پاک کے تناظر میں، گجرات کا منظر نامہ، بھارتی مسلمان، دہشت وادی کون، فن کا فقدان بھی ہے اس میں بہت، اور آخر میں نذیرؔ آؤ پیار چھلکائیں'' شامل ہیں۔

مثنوی کے صفحہ ۳۶ پر ایک نوٹ تحریر کیا گیا۔

''یہ جوابی مثنوی آج ۴/مارچ ۲۰۱۰ء کو بروز جمعرات صبح ساڑھے نو بجے مکمل ہوئی۔'' (۶۶)

اس کے بعد ایک منظوم خط یعقوب نازؔ فتح پوری کے نام شامل ہے اس خط میں ان کے کسی خط کا جواب تحریر کیا گیا ہے۔ یعقوب نذیرؔ کے ہم وطن ہیں اور کویت میں قیام پذیر ہیں۔ وہاں ان کی ملاقات پاکستانی شعراء سے ہوئی ان سے نذیر کے بارے میں سن کر یعقوب ناز کو بے حد خوشی ہوئی اور اس سے بھی زیادہ اس بات پر افسوس ہوا کہ ہم ''ہم وطن'' ہو کر بھی نذیرؔ کو اتنا نہیں جانتے جتنا دوسرے ممالک کے شاعر و ادیب ان کو جانتے ہیں۔

نذیرؔ نے اپنی مثنوی جوابِ زہر خند میں نورؔ کی مثنوی کے کچھ حصوں کا جواب تحریر کیا ہے اس میں نور کے اس الزام۔ کہ بادشاہ بابر نے تمام ہندوؤں پر ظلم کیے، مندروں کو توڑا اور چاروں سمت اس نے ظلم کی انتہا کر دی۔ ان سارے الزام کے باوجود نورؔ آگے لکھتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(مثنوی زہر خند ص ۱۵)

تو نذیرؔ اس خیال کے جواب میں اپنے خیال کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بہت ظالم ہو تو اللہ اس کی دعا نہیں سنتا ہے اور بقول نور بابر کی دعا قبول ہوئی ہے کہ خدا ان کی جان کے عوض میں ان کے فرزند کو زندگی عطا فرما دے۔ اور کیونکہ خدا نے بابر کی اس دعا کو قبول فرمایا ہے تو پھر بابر ظالم کیسے ہو سکتا ہے۔

تم نے دیکھا مگر نہ غور کیا

ہے کہاں تک درست یہ قصہ

ہر کسی کے دھرم میں ہے لکھا
ظالموں کی خدا نہیں سنتا
منہ سے ظالم کے جو دعا ہوگی
کیسے مقبول وہ دعا ہوگی

(مثنوی جواب زہر خند ص۲۴)

نوؔر نے باشادہ اکبر پر بھی الزام لگائے کہ انہوں نے ہندوؤں کو اپنا غلام بنا کر رکھا اور تمام ہندوؤں پر بہت ظلم کیے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(مثنوی زہر خند ص۔۲۰)

نوؔر کے اس الزام پر نذؔیر اپنی رائے پیش کرتے ہیں کہ جس مغل بادشاہ نے تمام ہندوستانیوں کو خوشیاں تقسیم کرنے میں کوئی کسرنہیں چھوڑی، راجپوتوں کی بیٹی سے شادی بھی کی اور سبھی قوموں کے ساتھ یکساں سلوک کیا وہ بھلا کسی خاص مذہب کے لوگوں پر ظلم کیوں کرے گا۔

دورِ اکبر میں بھی غلام تھے تم
وہ کیا خوب ”بے کلام“ تھے تم
تم نگوں تھے اور فوق تھا اکبر
یعنی گردن میں طوق تھا اکبر
التفاتات اس کے سارے بھول گئے
تم یہ کیسی انا میں پھول گئے
اپنے دامن میں جھانک کر دیکھو

باوفا کس قدر ہو تم سوچو
کس قدر تم پہ مہر بان تھا وہ
اپنی گردن کا اس کو طوق لکھو'

(جواب زہر خند۔ص ۲۵)

ان جوابی دلائل کے بعد وہ اکبر کے اوصاف کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ جتانے کی کوشش میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں کہ اُس نے تمہارے ساتھ جو اچھا سلوک کیا اُسے تم بھول گئے۔

پھول جس نے تمہیں بہت بانٹے
اس کے دامن میں بھر دیئے کانٹے
جو دھابائی سے اس نے شادی کی
اس پہ بھی تم نے ضرب کاری دی
راجپوتوں سے خوف کھاتا تھا
اس لیے اس نے یہ کیا رشتہ

(جواب زہر خند ص ۲۴)

نوؔر نے اورنگ زیب پر بھی یہ الزام لگایا کہ اس نے تمام ہندوؤں پر جزیہ لگا کر ان کی زندگی کو پریشانیوں میں ڈال دیا۔ اور ان کا جینا محال کر دیا، اس نے بہت سارے مندروں کو توڑ دیا اور ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی پرزور کوشش کی اپنے الزامات انوؔر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(مثنوی زہر خند۔ص ۳۳)

نوؔر کے اس لزام کے جواب میں نذیؔر نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اگر اورنگ زیب جزیہ لیتا تھا تو وہ اس جزیہ کو رعایا پر ہی خرچ کرتا تھا، رعایا کا ایک پیسہ بھی اس نے اپنے عیش و آرام پر خرچ نہیں کیا اس نے یہ قدم رعایا کی بھلائی کے لیے ہی اُٹھایا تھا۔ اور اگر اورنگ زیب اتنا ظالم تھا کہ جب تک سوا من جنیؤ ہندوؤں کے گلے سے اُتار کر اُنہیں مسلمان نہ بنا دے تب تک وہ شام کا کھانا نہیں کھاتا تھا تو اُس نے پچاس سال ہندوستان

پرحکومت کی ہے اگر وہ ایسا کرتا تو آج ہندوستان میں ایک بھی ہندو باقی نہیں بچتا سب اسلام قبول کر کے مسلمان بن گئے ہوتے۔

دورِ اور نگ کے کبھی تم نے
تاریخی واقعے نہیں دیکھے
جزیہ اور نگ نے لگایا تو کیا
جزیہ لے کر نہ خود کبھی کھایا
جو رعایا سے تھا لیا جاتا
وہ رعایا ہی کو دیا جاتا
وہ خدا سے تھے اس قدر ڈرتے
خرچ خود پر کبھی نہیں کرتے۔"

(جواب زہر خند۔ص ۲۶)

"کی حکومت پچاس سال تلک
کوئی ایسی ملتی نہیں ہے ایک جھلک
مان لیں گر تمہاری بات بھلا
اک جینیو میں بوجھ کتنا تھا
اس کا بھی کچھ حساب کرتے ہیں
پھر سوا من پہ دھیان دھرتے ہیں
سوچ کر تم ذرا یہ بتلا دو
یہ حقیقت ہمیں بھی سمجھا دو
روز کے کتنے ہندو تھے ایسے
دھرم تبدیل اپنا کرتے تھے
کم نہیں ہیں پچاس سال میاں
ہندو ملتا نہیں تھا ایک یہاں

(جواب زہر خند ص ۲۷)

اس کے آگے نذیر لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب تقریباً ۲۵ سال دکن میں رہا اُس وقت بھی وہاں مندروں میں ہندو جاتے تھے اور عبادت کرتے تھے اور ہر طرف امن وسکون کا ماحول تھا۔

جنگ آزادی میں تمام ہندوستانیوں نے حصہ لیا تھا اور سبھی نے اپنی مادرِ وطن کے لیے اپنی جان تک سے گریز نہیں کیا تھا سبھی قومیں مل جل کر تحریک آزادی میں شامل ہوئیں۔ مگر نوؔر نے تمام قوموں میں مسلمانوں کو ہی نشانہ بنایا اور جنگ آزادی میں جو اتنے مسلم شہید ہوئے ان میں سے کچھ ایک کے نام ہی نوؔر نے اپنی مثنوی میں شامل کیے جن میں عبدالحمید، عثمان اشفاق، ٹیپو سلطان اور حیدر علی کے نام لیے ہیں۔

ویر عبد الحمید اور عثمان

اوراشفاق اللہ دلیش کی شان (مثنوی زہر خند ص-۵۷)

اس کے برعکس ہندوؤں کے نام چُن چُن کر گنوائے ہیں اوران کی شان میں بڑھ چڑھ کر قصیدہ خوانی کی ہے۔

نذؔیر نے نوؔر کے اس تعصّبانہ رویہ کے جواب میں لکھا کہ ۔

تاریخوں کے ورق جلا ڈالے
خاک میں سارے سچ ملا ڈالے
جو وطن کے لیے شہید ہوئے
ان مسلماں کو کیسے بھول گئے
علماء دیوبند کے جو تھے
وہ بتاؤ کہاں شہید ہوئے

(جواب زہر خند ص۔۲۷)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی دلائل نذؔیر نے مسلمانوں کی حمایت میں پیش کی ہیں۔

نوؔر نے جہاں تمام مغل بادشاہوں کی مذمت کی ہے اُن کی عیب جوئی کی ہے وہیں انہوں نے اُن کی بنائی ہوئی پاکیزہ عمارت تاج محل کو بھی نشانہ بنایا ہے۔اوراس عمارت پر بھی یہ الزام لگایا کہ جہاں یہ عمارت بنی ہوئی ہے وہاں شیو کا مندر تھا اوراس مندر کو نیست و نابود کر کے یہ محل بنوایا گیا یہ سب انہوں نے اوک کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے کی تصدیق میں نوؔر لکھتے ہیں کہ ۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(مثنوی زہر خند ص۲۶)

نذؔیر نے نوؔر کی اس بات کو بھی غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔اور اپنی دلیل پیش کی۔

اوک کی بات کتنی سچی ہے
بات یہ ساری دنیا جانتی ہے
فتنہ و شر تھا اوک کا شیوہ
اوک پرتم نے کرلیا تکیہ‘‘

(جواب زہر خند ص۲۸)

نوؔر نے اپنی مثنوی میں اسلام مذہب کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی نہیں چھوڑا۔نوؔر نے زبانِ اُردو کے ساتھ بھی بدسلوکی کی۔انہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لینے والی زبانوں کے نام بتائیں جن میں تیلگو،تمل، مراٹھی، گجراتی اور ہندی کا تو نام لیا مگر اُردو کو تنہا چھوڑ دیا۔جبکہ اُردو نے بھی تحریک آزادی میں اپنا پورا پورا تعاون کیا تھا۔اردو میں دیا ہوا ایک نعرہ جو تحریک آزادی میں تمام ہندوستانیوں کا حوصلہ بنا اُسے نوؔر بھول گئے۔وہ

نعرہ تھا۔ انقلاب زندہ باد۔ یہاں تک کہ نوؔر یہ بھی کہہ گئے کہ اُردو میں جتنے بھی جریدے ہیں وہ سب کے سب مرثیے اور قیصدے ہیں۔

♏●♎♦●♏□♎♏♒♦♏■♍♋

♏●♎♏♓♏□♎♏♒♦♏■♍♋

(مثنوی زہر خند ص ۱۰۷)

نوؔر کے ان تمام الزامات کے جواب میں نذؔیر نے اردو کی حمایت میں اپنے دلائل کو الفاظ کا جامہ پہنا کر ثابت کر دیا کہ اردو ادب میں صرف مرثیے اور قصیدے ہی نہیں لکھے گئے بلکہ اس زبان میں وہ ادب بھی لکھا گیا جو قومی یکجہتی کی بہترین مثال پیش کرتا ہے اس زبان کی شیرینی دلوں کو گرویدہ بنا لینے والی ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ زبان ہمیں تعصب کرنا نہیں سکھاتی ہے۔

آج بھی نقش چھوڑ تی ہے یہ
ہندومسلم کو جوڑتی ہے یہ
بھائی چارے کی بات کرتی ہے
پیار سے یہ دلوں کو بھرتی ہے

شیرینی بے مثال ہے اس کی
ہر ادا باکمال ہے اس کی
دشمنی ہے اس تعصب سے
اس نے تو بول پیار کے بولے

(جواب زہر خند۔ص ۳۱)

ہندو پاک کی تقسیم کے تناظر میں نوؔر نے اپنی مثنوی میں ایک بات یہ تحریر کی ہے کہ۔

♋♦♏♎♏♍♏♏♎♏♍♏♦♦♏♍

□♏♎♏♏♎♏□♎♏●♏□♏♎♍

(مثنوی زہر خند ص ۶۳)

نذؔیر فتح پوری نے اس کے جواب میں اپنی دلیلیں پیش کی ہیں جس میں انہوں نے بتایا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے والا کون تھا، یہ تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی، کہ ہندو مسلم کے بیچ یہ پھوٹ ڈالنے والا کون تھا؟ وہ انگریز ہی تھے جو ہمیں بانٹ کر ملک کے دو ٹکڑے کرا گئے اور جنت جیسی خوبصورت کشمیر کی پرسکون وادیوں میں بھی نفرت کی ایسی آگ بھر گئے جو آج تک سرد نہیں ہو پا رہی ہے۔ تقسیم وطن کی وجہ سے جو حالات صوبۂ کشمیر میں رونما ہوئے ان حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

آج کشمیریوں کا حال ہے کیا
ان پہ نازل ہوا وبال ہے کیا

عصمتیں بٹ رہیں ہیں جوں قاشیں
جھیل میں تیرتی ہیں اب لاشیں
گھر جوانوں سے ہوگئے خالی
اب وہاں عید ہے نہ دیوالی''

(جواب زہرخند۔ص۳۱)

اس کے بعد نذیؔر نے گجرات کے حالات پر بھی نظر ڈالی ہے کہ جب گجرات میں فساد چھڑے تو وہاں کی عوام کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا گیا مثلاً حاملہ عورتوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا گیا، نوجوانوں اور بزرگوں کو بے رحمی سے قتل کردیا گیا اس نفرت کی آگ میں بزرگوں کے مزار بھی جلائے گئے جن میں ولی کا مزار بھی شامل ہے۔ مزار تو مزار زندہ لوگوں کو بھی نہیں بخشا گیا ان کو بھی آگ میں زندہ جلا دیا گیا ان تمام ظالمانہ حرکتوں کو نذیؔر نے اپنی جوابی مثنوی میں پیش کیا ہے۔

حاملہ عورتوں پہ وار کیا
ان کی عصمت کو تار تار کیا
پیٹ میں پل رہا تھا جو بچہ
ظالموں نے اسے شہید کیا
کتنے پیر و جوان مار دیئے
جسموں میں کتنے تیر اُتار دیئے

(جواب زہرخند۔ص۳۲)

نوؔر نے اپنی مثنوی میں چند ایک موقعوں پر مسلمانوں کی تعریف کی ہے تو اکثر موقعوں پر انگلیاں بھی اُٹھائی ہیں۔ اسلام کو دہشت گردی کا مرکز بتایا ہے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(مثنوی زہر خند۔ص ۹۵)

جب نوؔر نے مذہب اسلام پر اُنگلیاں اُٹھائیں اور اسے دہشت گرد مذہب قرار دیا اور اس کے ماضی اور حال کو خوں چکا اور خوں فشاں بتایا تو نوؔر کے اس حد درجہ پست الزام کے جواب میں نذؔیر نے جو دلیل پیش کی وہ یہ ہے کہ ۔

لکھ کے یہ بات تم نے لی ہے داد
صرف اسلام میں ہے دہشت واد
بھالے ترشول سارے بھول گئے
رہ گئے یاد سیف کے قصے‘

(جواب زہر خند۔ص ۳۴)

اس طرح تمام مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کے الزام کے جواب میں نذؔیر نے تمام مسلمانوں کی طرف داری کرتے ہوئے ان کی بے بسی کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح تمام مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھائے جا رہے ہیں اور انہیں بدنام کیا جا رہا ہے۔

جب کوئی بم اُڑایا جاتا ہے
سارا الزام ہم پہ آتا ہے
جیل کی کوٹھری ہماری ہے
اب یہی زندگی ہماری ہے
کون انصاف ہم کو دیتا ہے
اب خبر کون اپنی لیتا ہے
بے وجہ بے سبب ستاتے ہیں
آنکھیں ہم کو سبھی دکھاتے ہیں‘

(جواب زہر خند۔ص ۳۳)

نوؔر نے عیسائیت پر بھی وار کیا ہے اور ان کو بھی برا بھلا کہنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اپنی مثنوی میں وہ عیسائی مشنریوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(مثنوی زہر خند۔ص ۸۲)

نوؔر کی ان زہریلی باتوں کا بھی نذؔیر نے مدلل جواب دیا ہے۔

بات عیسائیت کی کرتے ہو
اپنے سائے سے خود ہی ڈرتے ہو
دھرم مرضی سے جو بدلتے ہیں
وہ کہاں دوسروں کی سنتے ہیں
تم کو عیسائیت سے خطرہ ہے
اوراسلام سے بھی دھوکہ ہے

(جواب زہر خند ص ۳۴)

نذؔیر نے اس جواب کے ساتھ ہی ایک سچے مذہب کی بہت خوبصورت نشانی بھی پیش کی ۔

دوسروں کے دکھوں کو اپناؤ
غیر کے زخم کا علاج کرو
سچا مذہب یہی سکھاتا ہے
دھرم قربانیوں سے آتا ہے

(جواب زہر خند۔ص ۳۵)

نذؔیر نے نور کی مثنوی میں فن کے لحاظ سے بھی بہت سی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے، بہت سے مصرعے اوزان کی پابندیوں پر پورے نہیں اترتے اور بحر سے خارج ہوگئے ہیں، ہندی الفاظ تلفظ کے لحاظ سے بہت مشکل ہیں اوران کے معنی سمجھنے میں بھی پریشانی آتی ہے۔ جبکہ نور کو ہلی خاندانِ داغ سے تعلق رکھتے ہیں پھر بھی ان کی مثنوی میں زبان اورفن کے لحاظ سے بہت سی کمیاں رہ گئی ہیں۔

بحر سے کتنے مصرعے خارج ہیں
حرف کتنے سخن میں حارج ہیں
ہندی الفاظ کے تلفظ کو
واضح کرنے میں کتنی مشکل ہو

(جواب زہر خندص ۳۵)

نذؔیر نے نور کی مثنوی کے جواب میں جو مثنوی لکھی ہے وہ ایک مختصر سا جواب ہے حالانکہ نذیر نے نور کی مثنوی میں شامل جن الزام تراشیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اوران کا جواب لکھا ہے وہ درست ہے لیکن جہاں نور نے حق بات کہی ہے وہاں نذیر نے غورنہیں کیا۔ مثلاً انہوں نے اگر تمام مغل بادشاہوں کوظالم قرار دیا ہے تو بادشاہ اکبر کی تعریف بھی کی اوراسے رعایا کا غمخوار بھی بتایا ہے۔ تحریک آزادی میں جب کہ دونوں قوموں نے پورے طور پر دل وجان سے حصہ لیا تھا وہاں انہوں نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ اس لڑائی میں دونوں قوموں نے مل جل کراور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ حالانکہ نور نے جتنے بھی رہنماؤں کے نام لیے ہیں ان میں اکثر وبیشتر ہندو ہیں وہ مسلم رہنماؤں کو بھول گئے نور نے جب سیاسی پارٹیوں کی بات کی تو جتنی انگلیاں کانگریس میں پر اُٹھائیں اُتنی ہی دوسری پارٹیوں پر بھی اُٹھائیں جس کا ثبوت ان کی مثنوی کا یہ بند ہے۔

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

(مثنوی زہر خند۔ص ۷۶)

لیکن یہ سب کہنے کے باوجود بھی وہ بھاجپا کی حمایت سے پیچھے نہیں رہے۔اور اس پارٹی کی تعریفوں کے پل ان الفاظ میں باندھتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(مثنوی زہر خند ص۔۷۷)

نور نے جہاں مغل بادشاہوں اور مسلمانوں کی مذمت کی ہے وہیں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعریف بھی کی ہے ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(مثنوی زہر خند ص۸۳)

نور کوہلی کی اس بات کو بھی نذیرؔ نے تسلیم کیا۔وہ لکھتے ہیں۔

''نور کوہلی کی اس کتاب میں صرف ایک متن ایسا ہے جو مسلمانوں کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔

جس میں نور کوہلی نے ہر لحاظ سے مسلم قوم کے حق میں بات کہی ہے۔'' (٦٧)

اس مثنوی کے اختتام پر نذیرؔ نے جو بند لکھے ہیں ان میں قومی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق سے رہنے کی نصیحت کی گئی ہے انہوں نے تمام ہندوستانیوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ ہمیں یہ بھول کر کہ ہم ہندو ہیں یا مسلم ہیں صرف اور صرف یہ یاد رکھنا چاہے کہ سب سے پہلے ہم انسان ہیں یہ

احساس دل میں رکھ کر ہی ہم غیروں کے دکھ درد کو اپنے دامن میں سمیٹ لیں مذہب کے نام پر پھیلی ہوئی نفرت کو بھول کر پیار محبت سے رہیں محبت ہی انسانیت کو قائم رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ ان تمام موتیوں کو نذیرؔ نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں لڑی میں پرو دیا ہے۔

آدمی کی ادا سیاں سمجھو　　زیست کی بد حواسیاں سمجھو
پہلے تو سارے لوگ، انساں ہیں　　بعد میں ہندو یا مسلماں ہیں
درد محسوس دوسروں کا کرو　　اپنے دامن میں یوں خوشی بھرلو
وقت کی نبض کو ذرا سمجھو　　کس طرف کی ہے یہ ہوا سمجھو
نفرتوں کی نہیں ہے عمر کوئی　　پیار کی عمر ہے بہت لمبی
صوفی سنتوں کا یہ طریقہ ہے　　پیار جینے کا ایک سلیقہ ہے
پیار انسانیت کی پونجی ہے　　پیار ہی آدمی کی ہستی ہے

اے نذیرؔ آؤ پیار چھلکائیں
پیار ہی سے فضا کو مہکائیں''

(جواب زہر خندص۔۳۶)

فنی لحاظ سے بھی ''مثنوی جواب زہر خند'' قابلِ تعریف ہے مصرعہ ایک دوسرے سے پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہر ایک بات کو بعنوان ادا کیا گیا ہے جو پس منظر کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے ہندی اردو الفاظ ایک دوسرے میں شیر وشکر کی طرح ہیں۔

نذیرؔ نے اپنے جذبات وخیالات اور دلائل سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں لیکن اُن میں ایک سادگی ودلکشی موجود ہے۔

جناب وقار قادری اس مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''جناب نذیرؔ فتح پوری نے مدلل انداز میں اس زہریلی مثنوی کا جواب لکھ کر قابل تعریف قدم اُٹھایا ہے۔ نور کی مثنوی ''زہر خند'' کذب تعصب اور جھوٹ کا پلندہ ہے، جس کی مذمت نذیر فتح پوری نے کھل کر کی ہے۔ فرقہ پرستی کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اس میں قلمی فرقہ پرستی بہت خطرناک ہے۔ ''جواب زہر خند'' میں نذیر فتح پوری محبت، خلوص اور قومی یکجہتی کا پیغام دے رہے ہیں۔'' (۶۸)

پھر آگے لکھتے ہیں۔

''مثنوی میں موضوع کے اعتبار سے شروع سے آخر تک نہ ٹوٹنے والا ایک تسلسل ہے۔'' (۶۹)

نذیرؔ فتح پوری کی مثنوی ''جواب زہر خند'' جو کہ نورؔ کوہلی کی مثنوی ''زہر خند کے جواب میں لکھی گئی کے متعلق جناب اسلم مرزا کا خیال ہے کہ

''نور کوہلی کی مثنوی جو دروغ کا پلندہ ہے۔ شدید مزمت کے قابل ہے۔ ایسی تحریروں کا جواب از حد ضروری ہے۔

میری ناقص رائے میں جناب نذیر فتح پوری نے یہ احسن قدم اُٹھایا اور بڑے مدلل انداز میں اس مثنوی کا جواب لکھا ہے۔ یہ مثنوی اور اس کا دیباچہ ایک سچے راست اور وفادار ہندوستانی مسلمان کے دل کی آواز بن گئی ہے۔'' (۷۰)

اس پس منظر میں ہم نے بھی نذیر کی مثنوی کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے نذیرؔ نے نور کی مثنوی کے جواب میں یہ مختصر سی مثنوی لکھ کر اپنے قومی نظریے کی وضاحت کی ہے۔ موجودہ دور میں سیاسی ماحول کی آلودگی دور کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

نذیؔر فتح پوری کی ماہیہ نگاری

اُردو ادب میں غزل ونظم جیسی قدیمی اصناف کے ساتھ ساتھ جدید اصناف سخن نے بھی جگہ بنائی ہے،ان میں ماہیہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ماہیہ تین مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں اس کی جائے پیدائش سرزمین پنجاب کو مانا جاتا ہے۔اس کے متعلق جناب حیدر قریشی فرماتے ہیں۔

''ماہیہ سرزمین پنجاب کا عوامی گیت ہے۔ماہیہ کا لفظ ماہی سے نکلا ہے،لیکن یہ اردو والا ماہی (مچھلی) نہیں ہے۔پنجابی میں بھینس کو ماہی کہتے ہیں۔چرانے والے کو اسی نسبت سے ماہی کہا جاتا ہے۔''(۷۱)

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ آگے فرماتے ہیں۔

جب محبت کے قصوں میں رانجھے اور مہوال کو اپنے اپنے محبوب تک رسائی حاصل کرنے کے لئے چرواہوں (گوالہ) بنا پڑا تو پھر ان کرداروں کی رومانی کشش نے لفظ''ماہی'' کو چرواہے کی سطح سے اٹھا کر نہ صرف ہیر اور سوہنی کا محبوب بنادیا بلکہ ہر محبت کرنے والی مٹیار کا محبوب''ماہی'' قرار پایا اسی''ماہی'' کے ساتھ اپنے پیار کے اظہار کے لیے ماہیہ عوامی گیت بن کر سامنے آیا۔''(۷۲)

نذیر نے بھی اردو ماہیہ میں طبع آزمائی کی اور ان کا''ماہیوں'' کا پہلا مجموعہ ۱۹۹۷ء میں پنجاب ادبی مرکز گوجرانوالہ پاکستان سے ''ریگ رواں'' کے زیرعنوان شائع ہوا۔اس کا پیش لفظ جناب حیدر قریشی (جرمنی) نے تحریر فرمایا ہے۔اور نذیر کے اس مجموعہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

''اُردو ماہیہ نگاری کے اس فعال دور میں وہ بھارت کے اردو کے سب سے پہلے ماہیہ نگار ہیں۔''(۷۳)

صنف ماہیہ سے محبت اور اس کو فروغ و دوام بخشنے میں نذیؔر نے جن پریشانیوں کا سامنا کیا ان پریشانیوں نے ہی ان کا حوصلہ اور بلند کیا جس کے متعلق وہ ایک قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''جن دنوں میں اردو ماہیے کو فروغ دینے کے کام میں ڈوبا ہوا تھا۔اس کے چاروں طرف چرچے تھے مقامی طور پر کچھ شعراء اس سلسلے میں میرا مذاق اڑانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ایک بار ایک مقامی شعری نشست میں جب میرا جانا ہوا تو پہلے سے موجود چند شعراء میں سے ایک شاعر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ماہیا آرہا ہے''

کہنے والے نے استہزاہیہ انداز میں اپنی بات کہی تھی لیکن میں نے اس کا مثبت اثر لیا۔مجھے خوشی ہوئی کہ جو کام میں کر رہا ہوں، میں اس کی علامت بن گیا ہوں۔'' (۷۴)

جناب حیدر قریشی نے ریگ رواں کو ہندوستان کا پہلا ماہیہ کا مجموعہ قرار دیا ہے۔اردو میں ماہیہ نگاری کی شروعات فلموں سے ہوئی جہاں قمر جلال آبادی نے فلم فاگن کے لیے ایک گیت لکھا جس کے بول یہ تھے۔

تم روٹھ کے مت جانا

تجھ سے ہے کیا شکوہ

دیوانہ ہے دیوانہ

(یہ زمین میری ہے۔ص ۹۷)

اس کے بعد ساحر لدھیانوی اور باقی دوسرے شعراء نے بھی ماہیے کہیے نذؔیر نے بھی اس صنف کی طرف رخ کیا اور شروعات اس ماہیہ سے کی جو مثاوالوزن تھا۔

کیا کیا نہ بھرم ٹوٹے

جب ریت گھروندوں پر

آندھی کے ستم ٹوٹے

پھر حیدر قریشی کی نشان دہی اور مشوروں پر عمل کرتے ہوئے وزن کی درستگی کی طرف نظر کی اور ایک سال کے وقفہ میں تقریباً ۵۰۰ سے زائد ماہیے لکھ ڈالے جو ''ریگِ رواں'' میں شامل ہیں، ان کے ماہیوں کا دوسرا مجموعہ ''مٹھی بھر ماہیے'' کے زیر عنوان ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ دوحصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت فن اور ادبی کاموں پر تبصرہ کیا گیا ہے تو دوسرے حصے میں ان کے ایک مصرعہ پر مزید دو مصرعے نظم کر کے ماہیہ تخلیق کیے ہیں اور انہیں تضمینی ماہیوں کا نام دیا گیا۔

نذؔیر کے علاوہ ساحر شیوی انور مینائی، شاہد جمیل، امین خیال، فراز حامدی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، نذیر قیصر، وپین ہانڈا، قتیل شفائی، اور نقش لائل پوری نے بھی صنف ماہیہ میں طبع آزمائی کی۔

چونکہ نذؔیر کی جائے پیدائش سرزمین راجستھان ہے اس لیے یہاں کی مٹی سے لگاؤ ہونا لازمی ہے اس لیے وہ اپنے ماہیوں میں راجستھان کی ریتیلی اور خشک زمین سے محبت اور اپنے جذبات کا بیان بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے دعا گو بھی ہوتے ہیں۔

ہر آدمی ترسے گا

ابر کرم تیرا

جب تک نہیں برسے گا

کیا روٹھ گیا پانی

ابر نہیں برسے

کیا خشک ہوا پانی

یہ گاؤں کی حالت ہے

ریت گھروندوں پر

آندھی کی حکومت ہے

سینے سے اٹھتے ہیں

درد کے یہ بادل

آنکھوں سے برستے ہیں

کب ابر برستے ہیں

صحرا میں صدا دینا

ریگ رواں والے ایسے لگا جیسے
پانی کو ترستے ہیں بہرے کو دعا دینا

نذیؔر کی اس خوبی کے متعلق جناب حیدر قریشی فرماتے ہیں۔

’’نذیر فتح پوری راجستھانی شاعر ہیں۔ان کے ہاں پنجاب کے دریائی اور میدانی مزاج کے بجائے صحرائی مزاج ملتا ہے۔ماہیے کے مزاج میں صحرائی اثرات کی مکمل نفی تو نہیں کی جاسکتی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ماہیے کے مزاج کا غالب عنصر میدانی اور پنج دریائی ہے۔‘‘(۷۵)

فطرت کی رنگینیاں نذیؔر کو خوب بھاتی ہیں۔قدرت کی ہر شہ میں فطرت کی خوبصورتی جلوہ گر ہے۔جسے نذیر نے مختلف انداز میں بیان کیا۔

خوابوں کا سویرا ہے کیا صبح کا منظر ہے
مور کے پنکھوں میں اوس کی خوشبو سے
رنگوں کا بسیرا ہے ہر چیز معطر ہے

شاعری میں فاختہ امن وسکون کی علامت تسلیم کی گئی ہے اور بارود کو تباہی کی نشانی۔نذیؔر نے ان علامات کے ذریعہ موجودہ زمانے اور گندی سیاست پر وار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

بارود پہ بیٹھی ہے بارود بچھاتے ہو
میرے زمانے کی امن کی دھرتی پر
یہ فاختہ کیسی ہے کیوں آگ لگاتے ہو

اپنے ماہیوں میں نذیؔر نے منظر نگاری کے بھی بہترین مرقع پیش کیے ہیں۔

ہل لے کے چلا ساجن
سر پہ سجنیا کے
روٹی سے بھرا برتن

دوسروں کے درد کو بانٹنے والا شخص بھی نذیر کو بے حد پسند ہے۔

یہ درد کی دھارا ہے
اس میں جو بہہ جائے
وہ آدمی پیارا ہے

نذیؔر نے اپنے ماہیوں میں وزن کی درستگی پر بھی پورا پورا دھیان دیا۔اس طرف ان کو حیدر قریشی نے توجہ دلائی۔ماہیہ کے درست وزن۔

مفعول مفاعیلن

فعل مفاعلین

مفعول مفاعیلن

وزن کا نذیؔر نے پورا خیال رکھا اور اپنے ماہیہ کو اسی وزن میں لکھا۔ نذیؔر کی اس خوبی کے متعلق حیدر قریشی کا خیال ہے کہ ۔

’’بھارت کے شاعروں میں نذیؔر فتح پوری اور رشید اعجاز نے ایک ساتھ اور باقی سارے ماہیہ نگاروں سے پہلے درست وزن میں ماہیہ نگاری کی۔‘‘ (۷۶)

نذیؔر نے اپنے ماہیوں میں خدا اور اس کے رسول سے محبت و عقیدت کا اظہار بھی بخوبی کیا۔

یہ ورد منور ہے	بندوں کا بھرم رکھنا
میری زباں پر تو	تجھ سے گزارش ہے
اب اللہ اکبر ہے	محتاجِ کرم رکھنا
کس دل سے دعا مانگوں	دن اپنا ہے رات اپنی
تجھ پہ عیاں سب ہے	اُنؐ سے تعلق ہے
کیا تجھ سے خدا مانگوں	پُر نور ہے ذات اپنی

نذیؔر نے باقی اصناف سخن کی طرح اپنے ماہیوں میں بھی ہر مضمون کو بیان کرنے کی صحت مند کوشش کی ہے۔ حمد، نعت، محبت، غم، جدائی، یاد، تنہائی، درد، ہمت و حوصلہ، بچپن، تتلی مور، قومی یکجہتی وطن دوستی غرض کے سبھی عنوانات کو اپنے ماہیوں میں سمودیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

کیوں درد بڑھاتے ہو	بچپن کی نشانی لکھ
دوستو! بچپن کی	یاد کے کاغذ پر
کیوں یاد دلاتے ہو	تتلی کی کہانی لکھ
جو پل بھی گزرتا ہے	اشکوں کی روانی لکھ
بے تابی کے عالم میں	نیند اُچٹ جائے
وہ شعر میں ڈھلتا ہے	تب دل کی کہانی لکھ
سردی ہے مکانوں میں	سچائی کی مظہر تھیں
آگ برستی ہے	نور تھا سینوں میں
برفیلی چٹانوں میں	تب آنکھیں منور تھیں

نذیؔر نے اپنے ماہیوں میں ان لامحدود مضامین کو بیان کیا جس کے متعلق جناب حیدر قریشی فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری کی جرات کی داد ضرور دینی چاہے کہ انہوں نے ماہیے سے اپنی محبت کے باعث ماہیہ نگاری میں نئے موضوعات لا کر ماہیے کے دامن کو وسیع کرنے کی کاوش کی ہے۔''(۷۷)

نذیرؔ کی اسی تخلیقی خوبی پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب امین خیال فرماتے ہیں۔

''ان کے ماہیوں میں اپنی تہذیب وتمدن کا رچاؤ، ارضی رشتوں کی مہکار اور فطری مناظر کی دلکشی دکھائی دیتی ہے اور مروجہ رومانوی فضا کے ساتھ ساتھ ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد، معاشرتی عدم استحکام، کشمکشِ حیات، اضطرابِ غم، احساسِ تنہائی اور دیگر جدید موضوعات بھی یکساں نظر آتے ہیں۔'' (۷۸)

نذیرؔ فتح پوری کی ماہیہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب امین خیال مزید یوں رقم طراز ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری کا شمار اردو کے اُن معدودے چند شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے پوری تندہی اور لگن کے ساتھ پنجابی کی اس مشہور و مقبول صنف کو اردو میں متعارف کروایا اور درست اوزان کو اپنا کر اپنے اشعار کو تازہ افکار کی دروں بینی سے سجایا اور اردو شاعری میں نکھار پیدا کیا۔''(۷۹)

نذیر کی ماہیہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیلہ عرشی فرماتی ہے۔

''نذیرؔ نے ماہیے لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں۔ان کے اردو ماہیے مختلف موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں نذیرؔ فتح پوری نے ماہیا کی مختصر سی شعری صنف میں حمد و نعت کے موضوعات کو بھی بڑے سلیقے سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔''(۸۰)

نذیرؔ کی ماہیہ نگاری کے متعلق مالتی شرما صاحبہ کا ماننا ہے۔

(۸۱)

نذیرؔ کی تصنیف مٹھی بھر ماہیے پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب کمال جعفری صاحب فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری نے وزیر آغا کی شخصیت اور فن کو اپنے ماہیوں کے ذریعہ منوانے کی ایک مثبت کوشش کی ہے جس کے لیے وہ اہل اردو کی جانب سے بے حد مبارک باد کے مستحق ہیں۔''(۸۲)

(نذیرؔ فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک ص۔۱۷۰)

نذیرؔ نے اپنے ماہیوں میں الفاظ کی سادگی پر بھی بہت زور دیا جس کے متعلق جناب شارق جمال ناگپوری کا خیال ہے کہ۔

''آج کا قاری جس طرح کے الفاظ میں شعری تخلیق کو پڑھنا پسند کرتا ہے اسی طرح کے الفاظ اور اسلوب میں ریگِ رواں کے شاعر نے ماہیے تخلیق کیے ہیں۔'' (۸۳)

نذیرؔ فتح پوری کی ماہیہ نگاری پر سلیم انصاری ان الفاظ میں رقم طراز ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری نے اپنی غزلوں کی طرح اپنے ماہیوں میں بھی ایک ایسی تخلیقی فضا خلق کرنے کی کوشش کی ہے جس میں طائران معانی و مفاہیم خوشگوار اڑانوں کی خبر دیتے ہیں۔'' (۸۴)

نذیرؔ کے ماہیوں کے متعلق ڈاکٹر سیفی سرونجی فرماتے ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری کے ماہیے جو کہ مختلف موضوعات پر ہیں ان میں آزادی بھی ہے زندگی بھی ہے عشق محبت کے جذبات بھی ہیں، ساون کے جھولے بھی ہیں، پنجاب کی لہلہاتی فصلیں بھی ہیں، غرض یہ کہ زندگی کا کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جس پر نذیرؔ فتح پوری کے ماہیے پورے نہ اترتے ہوں۔'' (۸۵)

ذیل میں نذیرؔ کے دیگر ماہیے بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔

جب کوئی دعا مانگو
آسماں والے سے
دھرتی کا بھلا مانگو

چوپال کا برگد ہے
کاٹ نہ اس کو تو
یہ پیار کی سرحد ہے

کس کس کو جگاتی ہے
رات کی نوٹنکی
کیا کھیل دکھاتی ہے

کچھ ربط دعا سے رکھ
دیپ جلائے تو
پہچان ہوا سے رکھ

الفاظ کی صناعی
ماہیا کہنے میں
یہ کام بہت آئی

جینے کا مزہ لینا
درد کی دولت کو
مل بانٹ کے کھا لینا

رحمت کے فرشتے ہیں
اس میں ہی اتریں گے
جس گاؤں میں بچے ہیں

یہ کیسا جیالا ہے
کوئی بھی موسم ہو
سر نیزے پہ رکھتا ہے

ہے رائے مری ہمدم
کہنے کو پرانی ہے
سب کو نہیں ہوتا
عمرِ گذشتہ کی
عرفانِ غم موسم
ہر یاد سہانی ہے

نذیرؔ فتح پوری کے یہ ماہیے ڈاکٹر فرازؔ حامدی کی تصنیف ''راجستھان میں اردو ماہیے کا تخلیقی سفر'' میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔

☆ مندرجہ بالا تمام حوالوں اور مثالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نذیرؔ فتح پوری ہندوستان میں درست وزن میں ماہیا تخلیق کرنے والے پہلے شاعر ہیں اور ابتدا میں ان کے دوست رشید اعجاز مرحوم نے ان کا بھر پور ساتھ دیا۔

☆ نذیرؔ فتح پوری چونکہ راجستھان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے خمیر میں ریگستانی آب وہوا کی خوبی بسی ہے اس لیے پنجاب کی تہذیب سے زیادہ وہ راجستھانی ماحول کی عکاسی میں کامیاب نظر آتے۔

☆ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے، یہ زبان ان کو طویل تخلیقی ریاضت کے بعد حاصل ہوئی ہے جس کا انہوں نے ہر صنف سخن میں بھر پور استعمال کیا ہے۔

☆''ریگِ رواں'' کسی بھی ہندوستانی ماہیا نگار شاعر کا پہلا ماہیوں کا مجموعہ ہے۔جو پنجاب ادبی مرکز گجراں والا پاکستان کی جانب سے حباب امین خیال نے شائع کیا تھا۔

نذیرؔ فتح پوری کی گیت نگاری

گیت نگاری شاعری کی تمام اصنافِ سخن میں اہمیت کی حامل ہے۔صنف گیت کا تعلق ہندی شاعری سے ہے۔اور وہیں سے یہ اردو شاعری میں شامل ہوئی۔ ہماری زبان میں گیت لکھنے کا رواج بھی اسی وقت سے ہے جب سے شاعری کا آغاز ہوا ہے۔نور الحسن نقوی اپنی تصنیف ''تاریخ ادب اردو'' میں گیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''گیت شاعری کی وہ صنف ہے جس میں موسیقیت یعنی نغمگی کی فراوانی ہوتی ہے۔اور اس میں شخصی جذبات یا دلی کیفیات سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔'' (۸۶)

جناب اطہر علی فاروقی گیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

''رومان پرور شاعروں نے شباب کے ولولہ انگیز جذبات سے متاثر ہو کر اس صنف کو اپنایا۔عام طور سے گیتوں میں وہ رومان زدہ نوجوان ہیں جو سماجی قیود و رسوم کی وجہ سے ایک نہ ہو سکے نہ ہونگے۔وہ ایک ایسی دنیا ڈھونڈتے ہیں جو مثالی ہو اور جہاں دیر و حرم کے پہلو میں میخانے اور پری خانے ہوں۔'' (۸۷)

گیت سے عام طور پر وہی گیت مراد لیے جاتے ہیں جو عوام میں گائے جاتے ہیں۔ گیت مرد اور عورت کے درمیان اظہارِ محبت کا ذریعہ بنتے ہیں ان گیتوں میں برج بھاشا، کھڑی بولی اور اودھی الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے۔ آج بھی ہندوستان کے کئی علاقوں میں عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر گیت گاتی ہیں یہ وہ گیت ہوتے ہیں جو انہیں اپنی بزرگ عورتوں سے وراثت ملے ہیں۔

کچھ گیت ایسے بھی ہیں جو قلم قرطاس سے آگے نہ جا سکے۔اس کے برعکس کچھ گیت ایسے بھی ہیں جو فلمی گیت بن کر عوام میں از حد مقبول

ہوئے۔ساحرلدھیانوی، مجروح سلطانپوری، حسرت جے پوری، شکیل بدایونی، آروزلکھنوی، سردار جعفری، آنند بخشی، جاوید اختر یہ وہ نام ہیں جن کے گیت فلموں میں بہت مقبول ہوئے۔

ادبی گیت لکھنے والوں میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا، اختر شیرانی، عرش ملسیانی، آرزو لکھنوی، حفیظ جالندھری، میراجی، بیکل اتساہی، زبیر رضوی، سید محمد خلیل، مقبول جبین احمد پوری فراز حامدی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر گیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''جذبہ جب رس میں تبدیل ہوجائے جسم کی پکار کوملتا کا رنگ پکڑے اور حسن جب برہا کی آگ میں جلنے لگے تو گیت جنم لیتا ہے۔''(۸۸)

ڈاکٹر عظیم الحق جنیدی صنفِ گیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''گیت عورت کے جذبہ آزادی سے جنم لیتا ہے اور جب عورت شعورِ ذات سے آشنا ہوجاتی ہے تو اپنے پتیم پتی تک پہنچنے کو تیار ہوجاتی ہے اور جب اس میں ناکام ہوتی ہے تو بے اختیار اس کی زبان سے فراق (جدائی) کا نغمہ پیدا ہوتا ہے اور یہی گیت ہے۔''(۸۹)

پروفیسر محفوظ الحسن اصناف گیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''گیت کا تعلق جذبات واحساسات سے ہے ایسے جذبات واحساسات سے جن میں سادگی، معصومیت، چاہت پوشیدہ ہوتی ہے، جن میں صداقت ہوتی ہے خلوص ہوتا ہے، خودسپردگی کا جذبہ ہوتا ہے، جاں نثاری ہوتی ہے۔گیت میں مدھرتا ہوتی ہے، کوملتا ہوتی ہے، دلفریبی ہوتی ہے، لوچ ہوتا ہے۔الھڑپن ہوتا ہے۔ روٹھنے کی ادا اور منانے کا سلیقہ ہوتا ہے۔گیت میں اُمنگ ہوتی ہے، ولولہ ہوتا ہے، جوش ہوتا ہے، گیت کا تعلق گانے اور گنگنانے سے ہوتا ہے اسی لیے اس میں ایک خاص قسم کا آہنگ ہوتا ہے۔گیت کا یہ مخصوص آہنگ اسے دوسری ادبی اصناف سے ممتاز ومنفرد بناتا ہے۔''(۹۰)

گیت کی ہیئت پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر انور مینائی فرماتے ہیں۔

''گیت کے لیے کوئی مخصوص بحروزن کی قید نہیں ہوتی۔عموماً چھوٹی رواں دواں بحوروا وزان کا استعمال کیا جاتا ہے۔گیت بے وزن مصرعوں کو بھی گوارا کرلیتا ہے۔اور یہ مقفّی بندوں پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔اس کے قوافی کی اپنی الگ ترتیب ہوتی ہے۔بند کے آخر میں عموماً ٹیپ کی پنکتی ہوتی ہے۔یہ ہر بند کے آخر میں دہرائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایک یا ڈیڑھ مصرعے کی پنکتی کے ساتھ بڑھادی جاتی ہے۔ٹیپ کی پنکتی کا کوئی طول مقرر نہیں ہے۔ اگر ٹیپ کی پنکتی امدادی مصرعے سے ہم قافیہ ہوتی ہے تو اسے گیت کہتے ہیں۔''(۹۱)

اصناف گیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیلہ عرشی نے لکھا ہے۔

''گیت شاعری اور موسیقی کا حسین سنگم ہے۔گیت کا مرکزی حسن غنائیت ہے۔جب شاعر اپنے جذبات واحساسات کو مترنم الفاظ کے تسلسل کے ساتھ لے میں پروتا ہے تو گیت کا جنم ہوتا ہے۔اصطلاح عام

میں گیت گانے سے منسوب ہے جس میں الفاظ کا رکھ رکھاؤ، تسلسل اور لے ہوتی ہے اور شعری دنیا میں گیت غنائیہ شاعری میں شمار ہوتا ہے'' (۹۲)

نذیر نے اپنے تخلیقی سفر کی ابتداء میں ایک دو گیت لکھے تھے۔مگر افسوس وہ محفوظ نہ رہ سکے۔ ۱۹۷۴ء میں ان کا پہلا ناول ''چٹانوں کے بیچ'' شائع ہوا تو اس میں انہوں نے تین گیت لکھے جس میں ایک بھجن یہ بھی شامل تھا۔بھجن ملاحظہ ہو۔

گیتا سچی ، وید ہے سچا ، سچا ہے قرآن
سچا رب کا نام رے بابا جھوٹا ہے انسان
جھوٹے کو دنیا میں ہم نے موج اُڑاتے دیکھا
اور سچے کو ہم نے پگ پگ ٹھوکر کھاتے دیکھا
سچائی کا گلی گلی میں ہوتا ہے اپمان
سچا رب کا نام ہے بابا جھوٹا ہے انسان

(میرے گیت اکیلے رہ گئے۔ص۔۶۸)

اس کے بعد اپنے افسانے ''آخری گیت'' کے لیے ایک گیت لکھا جس کے بول یوں ہیں۔

جس گلی میں محبت سسکتی پھرے
جس گلی میں وفا زر کے بدلے بکے
جس گلی میں نہ مفلس کی کوئی چلے
اس گلی سے ہمیں کچھ تعلق نہیں

یہ گیت انہوں نے فلم ''کٹی پتنگ'' کے گیت ''جس گلی میں ترا گھر نہ ہو بالما'' کی طرز پر لکھا تھا،انہوں نے اور بھی بہت سی فلموں کے لیے گیت لکھے مگر کوئی بھی کاغذی کاروائی سے آگے بڑھ کر منظر عام پر نہ آ سکے۔اس کے بعد انہوں نے فلمی گیتوں سے ہٹ کر ادبی گیتوں کی طرف رُخ کیا ان کا پہلا ادبی گیت یہ ہے۔

برہن کب تک برہا گائے آگ سے کھیلے کب تک کھیل
کب آؤ گے جانے والے کب تک ہو گا اپنا میل

(مرے گیت اکیلے رہ گئے۔ص۱۴)

اسی گیت کو مالتی کلکرنی نے مع ترنم ایک محفل میں گایا تھا۔

ایک روز نذیر کے دل میں اُٹھے طوفان نے جب گیتوں کی شکل اختیار کی تو اپنی اس حالت کو بیان کرتے ہوئے نذیر فرماتے ہیں۔

''نیتا پارک کے ایک فلیٹ میں ایک رات اچانک ذہن و دل اور قرطاس و قلم پر گیتوں کی برسات شروع ہوگئی لفظ بوندوں کی طرح کاغذ کے جسم پر ٹپکنے لگے، جذبات اُمنڈ اُمنڈ کر آنے لگے، درد سے لبالب ہواؤں نے زخموں کو جگا دیا اور ''گیت در گیت'' کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا صبح جب شمار کیا تو پورے آٹھ گیت وجود میں آ چکے تھے۔گویا گیتوں کی پہلی بارش ہی نے شرابور کر دیا۔'' (۹۳)

گیتوں کو ہندوستانی معاشرت کا آئینہ دار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا لیکن اس صنف کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کی یہ حقدار ہے بہت سے شعراء اسے منفرد مقام دلانے میں دل وجان سے لگے ہوئے ہیں ان میں نذیؔر فتح پوری بھی شامل ہیں جنہوں نے گیت لکھ کر اس صنف میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ان کے گیتوں کا مجموعہ ''مرے گیت اکیلے رہ گئے'' سن ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا جس میں مختلف کیفیات اور حالات کے غماز ۵۷ گیت شامل ہیں۔انہوں نے اپنی محبت وکاوش سے اس مجموعہ کو ترتیب دیا ہے۔نذیؔر کے گیتوں میں ملن کی خوشیاں مستی، سرشاری کے جذبات کو فروغ دینے کا وسیلہ ہے۔تصنع اور تکلف نہیں ہے، انہوں نے اپنے گیتوں میں معاشرتی سیاسی معاشی اور وطن سے محبت کو بڑی بے باکی اور خلوص کے ساتھ سے پیش کیا ہے مثال ملاحظہ ہوں۔

جس کی آستیں دیکھو
اس میں ایک خنجر ہے
دوست ہو کہ دشمن ہو
سب کا ایک منظر ہے
قاتلوں کی ہوتی ہیں
کب الگ الگ ذاتیں
یہ لہو کی برساتیں'

(میرے گیت اکیلے رہ گئے۔ص۴۴)

یہ کیسی لوگوں کی ہے دوڑ
لگتی ہے ہتھیاروں کی ہوڑ
کرتے ہیں سب اہل سیاست
لہو کا کاروبار
محبت بھول گئے سب یار
ہوا ہے برسوں سے بیمار''

(میرے گیت اکیلے رہ گئے۔ص۴۵)

''بی کام ہے ڈگری
کس کام کی ہے ڈگری
رشوت کے اس جہاں میں
بس نام کی ہے ڈگری

رادھا کو جس طرح سے
گھنشیام کی طلب ہے

ہمیں کام کی طلب ہے

(میرے گیت اکیلے رہ گئے۔ص ۶۹)

گنگا جمنا والا دیش

پریم جوت کا ہالہ دیش

اس کی شان نرالی ہے

سب دیشوں سے اعلیٰ دیش

بھارت دیش نرالا دیش‘‘ (میرے گیت اکیلے رہ گئے)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

دھرتی سے پیار کرو لوگو

دھرتی سے پیار کرو لوگو

یہ دھرتی دل کی دھڑکن ہے

یہ دھرتی پیار کا گلشن ہے

کلیاں بھی اسی پر کھلتی ہیں

شمعیں بھی اسی پر جلتی ہیں

یہ خوشبو کا وردان بھی ہے

یہ مالک کا احسان بھی ہے

مت اس پر وار کرو لوگو

دھرتی سے پیار کرو لوگو

(مرے گیت اکیلے رہ گئے۔ص ۴۷)

قومی یکجہتی کے جذبے کو نذیؔر نے اس انداز میں اپنے گیتوں میں سمو دیا ہے۔

ملا بھی اسی پر پلتا ہے

پنڈت بھی اسی پر چلتا ہے

مسجد بھی اسی پر بنتی ہے

مندر بھی اسی پر بنتا ہے

سب دھرموں کا گہوارہ ہے

یہ دھرتی پیار کی دھارا ہے

مت اس پر وار کرو لوگو

دھرتی سے پیار کرو لوگو

(میرے گیت اکیلے رہ گئے۔ص۴۷)

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی،

بھارت کی ہیں شان

کہلاتا ہے اسی لیے تو

بھارت دیش مہان

او، ساتھی

بھارت دیش مہان

(مرے گیت اکیلے رہ گئے۔ص۶۲)

نذیؔر کے گیتوں کا بغور مطالعہ کرنے پر ہم اس بات کو تسلیم کر سکتے ہیں کہ اکثر گیتوں کا رنگ ادبی ہے اور یہ ادب سے گہرا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔لیکن پھر بھی ان کے گیت پیکر تراشی کے لحاظ سے عوامی رنگ میں رنگے ہوئے لگتے ہیں۔ان گیتوں میں مختلف موضوعات کو پیش کیا گیا ہے جن میں ایک طرف حالات حاضرہ کے مسائل اور دورِ جدید کے تقاضوں کی عکاسی نظر آتی ہے تو دوسری طرف روایت سے رشتہ استوار کیا گیا ہے جن میں انسانی احساسات اور جذبات خصوصاً ہجر وصال کی کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے نذیؔر کے گیتوں میں جن موضوعات کو قلم بند کیا گیا ہے ان کی وضاحت چند مثالوں سے ہو جائے گی۔

نذیؔر نے اپنے گیتوں میں ایک برہن کے اپنے پریتم، اپنے محبوب سے جدائی کے احساس اور جذبات کو نہایت دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے گیت ''برہن کا گیت'' میں اس جذبے کا اظہار کس شدت سے کیا گیا ہے۔

''برہن کب تک برہا گائے آگ سے کھیلے کب تک کھیل
آس کے سپنے کب تک دیکھوں کب تک ہوگا اپنا میل''
دل کی ڈال پہ درد کا پنچھی پریم کی بولی بول رہا ہے
تو سے ملن کی آس میں پریتم تن میں میرا ڈول رہا ہے
کب آؤ گے جانے والے پلک بچھائے باٹ نہاروں
سانجھ بھئے جب چندہ دیکھوں تجھ کو سو سو بار پکاروں

نذیؔر کے ایک گیت ''ہم روتے ہیں'' میں بھی اسی جدائی کو موضوع بنا کر ایک عورت کے درد کا برملا اظہار کیا گیا ہے۔

انسون سے انکھیاں دھوتے ہیں
ہم اُن سے بچھڑ کر روتے ہیں
ہم روتے ہیں ہم روتے ہیں
یہ کیسی شام ہے جیون کی
اب قاتل ہے رُت ساون کی
سب پھول ہمارے گلشن کے
کانٹوں کے جیسے ہوتے ہیں
ہم روتے ہیں ہم روتے ہیں

ایک عورت جب اپنے شوہر سے بہت دور ہوتی ہے اسے دیکھ بھی نہیں پاتی ہے۔ تب وہ جدائی کی آگ میں جلتی رہتی ہے اور اس کا دل اپنے محبوب اپنے شوہر سے ملنے کے لیے تڑپتا ہے اس کے یہ جذبات جو صرف محسوس کئے جا سکتے ہے نذیؔر نے انہیں الفاظ کا جاما پہنا دیا ہے اس کی ایک مثال انکا گیت ''بن تجھے دیکھے جیا مانے نا'' ہے جس کے چند بول ملاحظہ ہوں۔

تو ہی مرا میت رے
پاگل یہ پریت رے
بن تجھے دیکھے جیا مانے نا
دل کی دھڑکن یاد کرے ہے
رو رو کر فریاد کرے ہے
ہار گئی من میت رے
ہو گئی تیری جیت رہے
کوئی بھی دکھڑا جانے نا
بن تجھے دیکھے جیا مانے نا

....

جان لیوا جدائی تری

دوں کہاں تک دہائی تری

زخم دل میں ترے نام کا

ایک سایہ گھنی شام کا

ہے یہ دشمن مرے نام کا

ایک سایہ گھنی شام کا

ایک عورت جو اپنے شوہر سے جدا ہوگئی ہے وہ پڑھنا لکھنا بھی نہیں جانتی ہے وہ ایک خط کو لے کر بہت بے قرار ہے، اور ڈاکیے سے اس خط کو پڑھوانا چاہتی ہے تا کہ یہ جان سکے کہ وہ خط اسے کس نے بھیجا ہے کیوں کہ اسے یہ اندیشہ ہے کہ شاید وہ اس کے شوہر کا خط ہے۔ نذؔیر نے اس عورت کے جذبات کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

ساجن کا یہ خط ہے شاید

بسے ہیں جو پردیس

پڑھ کر اتنا تو سمجھا دے

کیا ہے یہ سندیس

تا کہ سن کر میرے دل کو

مل جائے آرام

بتادے خط ہے کسی کے نام

کالا اکشر بھینس برابر

میں تو پڑھ نہیں پاؤں

لیکن شبدوں کی خوشبو سے

اک اک بات سمجھ جاؤں

تبھی تو کہتی ہوں پریتم کا

خط ہے میرے نام

خط کو لانے والے پڑھ دے

کیا ہے یہ پیغام

بتادے خط ہے کس کے نام

نذؔیر نے اپنے گیتوں میں مختلف ہیئتوں کا استعمال کرتے ہوئے ایک ہی موضوع پر مختلف انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہجر کی

اسی کیفیت کو وہ اپنے گیت نکل گیا کس اور،، میں مختلف ہیئت میں بیان کرتے ہیں۔

جیون کی لمبی راہوں پر ملا تھا جو چت چور
قسمیں کھا کر ساتھ چلا تھا نکل گیا کس اور

مائی نکل گیا کس اور

اب ساون کو کیسے جھیلوں ، کیسے عمر بتاؤں
تنہائی میں کب تک اپنے آپ کا من ڈسواؤں

مائی اپنا من ڈسواؤں

مختلف ہیئت کی ایک مثال اور ملاحظہ ہوں۔

آ ج د ل ا کیلا ہے
سا تھ ہے ا گر کو ئی
اس بھرے ز مانے میں
غم کا ا ک جھمیلا ہے
آ ج د ل ا کیلا ہے
یا ر ہے نہ یا ر ا نہ
دل سے گھر کے کمرے تک
ا یک سا ہے و یر ا نہ
د کھ کا ا یک میلا ہے
آ ج د ل ا کیلا ہے

جب ایک دوشیزہ اپنے شوہر سے اپنے محبوب سے جدا ہو جاتی ہے تو اسے ہر پل ہر لمحہ بہت گراں گزرتا ہے۔ساون کا مہینہ تو اس پر قہر کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اور وہ جدائی میں تڑپتے ہوئے اپنے آپ کو بہت زیادہ غم زدہ محسوس کرتی ہے۔بارش کی بوندیں اس کے تن من میں آگ بھڑکا دیتی ہیں اور وہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے اور زیادہ بے قرار ہو جاتی ہے۔اس غم زدہ دوشیزہ کے حالات نذیر نے ان الفاظ میں بیان کئے ہیں

سا و ن نے ملہا ر سنا یا
مو ر نے کیسا نا چ دکھا یا
کوئل کیسے بول رہی ہے
کا نوں رس گھول رہی ہے
نس نس میں اک آگ لگائی
تم نہ آئے با رش آ ئی

زندہ ہوں پر کسی زندہ

جیسے ہوں خود سے شرمندہ

تم آؤ تو جینا آئے

دل میرا پھر جھوم کے گائے

ہو جائے ہر پیر پرائی

تم نہ آئے بارش آئی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی گیت کی شناخت اور فن کو سمجھنے کے لیے ابراہیم اشک کے گیتوں پر اپنی رائے کو ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں

’’گیت کسی بھی بحر میں ہوسکتا ہے عموماً چھوٹی بحر استعمال کی جاتی ہے۔اس کا مکھڑا ایک بحر میں ہوتا ہے اور اس کے بول مختلف بحر میں ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت دوسری صنف میں جائز اور مروّج نہیں ہے۔اس کا مکھڑا دہرایا جاتا ہے۔مکھڑے کا ربط بول سے ہوتا ہے۔وغیرہ۔‘‘(۹۴)

یہ تمام اعضاء ہیں جن کی موجودگی سے گیت وجود میں آتا ہے۔اور نذیر کے گیت ان خوبیوں کو ایک حد تک پورا کرتے ہیں۔

نذیر کے بعض گیتوں میں غزل کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ایسے گیتوں کو وہ گیت غزل کا نام دیتے ہیں۔ان کے گیت کے مجموعے میں ایک گیت اسی نام سے ہے اس کا عنوان ہی ’’گیت غزل‘‘ ہے۔جس میں غزل کے تمام ارکان یعنی قافیہ، ردیف، مطلع اور مقطع ہیں۔ایک خوبصورت مثال ملاحظہ ہو۔

تقدیر کے آگے بس نہ چلا تدبیر کے بندھن ٹوٹ گئے

تھی جن سے ہمیں امید کرم وہ چین ہمارا لوٹ گئے

میں اور غم جاناں دونوں چلتے ہیں وفا کی راہوں میں

اور اس کے علاوہ دنیا کے تھے جتنے سہارے ٹوٹ گئے

وہ جب سے روٹھے ہیں ہم سے محسوس یہی ہوتا ہے نذیرؔ

یا خوشیاں ہم سے روٹھ گئیں یا بن کے مقدر پھوٹ گئے

نذیرؔ نے اپنے ایک گیت میں دنیا کے مکروفریب سے نقاب اٹھایا ہے۔اور ایسے لوگوں کے اصلی چہرے بے نقاب کئے ہیں جو دکھاوے کی اور جھوٹی دوستی کا جذبہ دکھا کر لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔اس گیت میں دنیا کو سانپوں کا بازار بتایا گیا ہے اسے ایک استعارے کے طور پر لیا گیا ہے جس سے گیت کے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے معنی صاف صاف سمجھ میں آجاتے ہیں اس گیت سے ایک بند ملاحظہ ہو۔

یہ دنیا سانپوں کا بازار

بڑ بڑے تاجر کرتے ہیں

وش کا کاروبار

جو کل تھی سوچوں کی زنبیل

بنی ہے وش کی وہ قندیل

جہاں جہاں بھی اجیارا ہے

وہاں ہے سانپ ہزار

یہ دنیا سانپوں کا بازار

معنوی لحاظ سے سانپوں کا بازار سب سے بہتر استعارہ ہے۔

آج کے اس تیز رفتار زمانے میں جہاں ایک طرف ٹیکنالوجی نے انسان کو اپنے آپ میں مصروف کر دیا ہے وہیں دوسری طرف انسان اپنوں سے دور ہو گیا ہے اور تنہائی کے کرب میں مبتلا ہے۔ یہ تنہائی انسان کی زندگی کو کھوکھلا کرتی جارہی ہے اور ایک ناسور بنتی جارہی ہے۔

نذیر نے اپنے گیتوں میں اس احساس تنہائی کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنوں سے دور ہو جانے کے بعد انسان جس طرح تنہائی کے عالم میں ڈوب جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس تنہائی سے باہر نہیں نکال پاتا ہے اس کی تصویر ان کے گیت ''آج دل اکیلا ہے'' میں بخوبی نظر آتی ہے۔

آج دل اکیلا ہے

ساتھ ہے اگر کوئی

اس بھرے زمانے میں

غم کا اک جھمیلا ہے

آج دل اکیلا ہے

غیر کی پناہوں میں

آج کھو گیا ہے وہ

جو تھا میری باہوں میں

یہ بھی درد جھیلا ہے

آج دل اکیلا ہے

''اس کا جھوٹا نکلا پیار'' اس گیت میں نذیر نے ایک ایسی عورت کے جذبات کا اظہار کیا ہے جو اپنے محبوب کے چلے جانے کے بعد تنہائی کے احساس میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس احساس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہے۔

دکھ کے کالے ناگ

بن گئے میرا بھاگ

زہریلے احساس نے میرے

دل پہ کیا ہے وار

اس کا جھوٹا نکلا پیار

تنہائی کے گیت

تنہائی کے میت

تنہا تنہا سہنا پڑا ہے

تنہائی کا وار

اس کا جھوٹا نکلا پیار

اگر تنہائی کا احساس ایک بار کسی کی زندگی میں داخل ہو جائے تو وہ اس کا سارا صبر و سکون لوٹ لیتا ہے اور صرف آنسوؤں اس کا مقدر بن کے رہ جاتے ہیں اس احساس کو نذیر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

رو رو کے کریں گے یاد تجھے

اب ترے دیوانے رات اور دن

اشکوں سے لکھیں گے چاہت کے

انمول فسانے رات اور دن

تنہائی میں آنسو بوئیں گے

ہم تجھ سے بچھڑ کر روئیں گے

درپن سے کہیں گے رو رو کر

ہم تیرے فسانے رات اور دن

جب کسی انسان کے اپنے پرائے ہو جاتے ہیں اور انہیں اس پرائے پن کا احساس تک نہیں ہوتا، وہ لوگ زندگی کی دوڑ میں اپنوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اس ااحساس کو نذیر نے اپنے گیت ''سنائیں کس کو من کا گیت'' میں بیان کیا ہے۔

اپنے دکھ اپنی تنہائی

اپنے میت امیت

سنائیں کس کو من کا گیت

سمے کا پنچھی بول سنائے

اپنے ہوئے پرائے

یہ موسم راس نہ آئے

نذیر کے شعری مجموعے ''میرے گیت اکیلے رہ گئے'' میں باعنوان ''التماس'' ایک گیت شامل ہے اس گیت میں وہ اپنے دوست یا محبوب سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ بھی ان کے ساتھ گزارے ہوئے زمانے کے ان خوبصورت دنوں کو یاد کریں جو انہوں نے ساتھ بتائے تھے وہ خوبصورت موسم کی یادیں دہراتے ہیں۔

تم جس دن میرے ساتھ رہے

اس دن کا موسم خوب رہا

جو پل بھی تمہارے ساتھ جیا

وہ پل مجھ کو محبوب رہا

اس پل کو پل بھر یاد کرو

ہم لوگ مسافر تھے جس کے

اس راہ کو پھر آباد کرو

احساس محرومی انسان کی زندگی کو جہنم سے بھی بدتر بنا دیتا ہے نذیر نے ایک گیت ''کالا جنگل کالی رات'' میں اسی خیال کو جذب کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمت اور حوصلہ بھی اس گیت کی خاصیت ہے انہوں نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں ان احساسات کو اس اگیت میں سمو دیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

قافلے والے چھوٹ گئے

سب رکھوالے چھوٹ گئے

اب ہے تنہا اپنی ذات

کالا جنگل کالی رات

پربت سے ٹکرانا ہے

آخر منزل پانا ہے

کوئی لاکھ کرے اب گھات

کلا جنگل کالی رات

آزادی کو بھی موضوع بنا کر نذیر نے ایک گیت ''آزادی کا گیت'' عنوان نظم کیا ہے اس میں آزادی کے جشن منانے کے ساتھ ساتھ تمام افراد کو پیار اور محبت سے رہنے کی تلقین بھی کی ہے۔

جشن مناؤ آزادی کا

مل کر گاؤ گیت

اپنا دشمن کوئی نہیں ہے

سب ہیں اپنے میت

او ساتھی سب ہیں اپنے میت

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی

بھارت کی ہیں شان

کہلاتا ہے اسی لیے تو

اپنا دیش مہان

او ساتھی بھارت دیش مہان

پیار کیا ہے پیار کریں گے

پیار سے ہوگی جیت

او ساتھی سب ہیں اپنے میت

عید کا دن خوشیوں کی سوغات لے کر آتا ہے اس دن اپنے احباب و اقارب خاص طور پر یاد آتے ہیں ایسے میں محبوب کی یاد تو قہر برپا کردیتی ہے۔ ایسے موقع پر اگر محبوب کے آنے کی خبر ملے تو اس کا انتظار اور بھی شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس خیال کا نہایت خوبصورت اظہار ان کے گیت ''وہ عید پہ آئیں گے'' میں ملتا ہے۔

پردیس سے خط آیا

ساجن کا سندیسہ ہے

وہ عید پہ آئیں گے

مدت سے نہیں دیکھا

ساجن کا حسیں چہرا

پہچانوں گی میں کیسے

یہ سوچ کے حیراں ہوں

بے روزگاری کا مسئلہ آج ہندوستان میں سب سے بڑی آفت بنا ہوا ہے اور تمام نوجوانوں کے سر پر مصیبت بن کر منڈرا رہا ہے یہ پریشانی تمام ڈگری یافتہ نوجوانوں کے لئے اندھیری رات کے مانند ان کی زندگی میں بھی اندھیرا کرتی جارہی ہے۔ اس صورتِ حال کو ''بیکاروں کا گیت'' میں اس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

نہ سلام کی طلب ہے

نہ کلام کی طلب ہے

بے کار لوگ ہیں ہم

ہمیں کام کی طلب ہے

بی کام ہے ڈگری

کس کام کی ہے ڈگری

رشوت کے اس جہاں میں

بس نام کی ہے ڈگری

دھرتی سے پیار کرو لوگو، اس گیت میں نذیر نے حکیمانہ انداز میں اپنی مادر وطن سے محبت کرنے کی ہدایت دی ہے اس کا عنوان ہی اس گیت کے موضوع کو حرف بہ حرف بیاں کردیتا ہے۔ اور لوگوں کو آپسی ایکتا و اتحاد سے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

یہ دھرتی دل کی دھڑکن ہے

یہ دھرتی پیار کا گلشن ہے

کلیاں بھی اسی پر کھلتی ہیں

شمعیں بھی اسی پر جلتی ہیں

یہ خوشبو کا وردان بھی ہے

یہ مالک کا احسان بھی ہے

ملا بھی اسی پر پلتا ہے

پنڈت بھی اسی پر چلتا ہے

مسجد بھی اسی پر بنتی ہے

مندر بھی اسی پر بنتا ہے

سب دھرموں کا گہوارہ ہے

یہ دھرتی پیار کی دھارا ہے

مت اس پر وار کرو لوگو!

دھرتی سے پیار کرو لوگو!

ربا کوئی ہمدم دے، اس گیت میں نذیر نے ایک ایسی غم زدہ عورت کی آرزو کو الفاظ کی شکل میں ڈھالا ہے جسے ایک ایسے غمخوار کی تلاش ہے جو اس کے تمام غموں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔

یہ داغ ہیں برہا کے

رونے سے نہیں مٹتے

یہ گھاؤ ہیں یادوں کے

گننے سے نہیں گھٹتے

ان گاؤں کو مرہم دے

ربا کوئی ہمدم دے

نذیر کے گیتوں میں تصوف کا رنگ بھی نمایاں ہے ان کے ایک گیت 'وقت کی ندیا بہتی جائے' میں تصوف کے اس رنگ کی بخوبی نشاندہی ہوئی ہے اس گیت میں انہوں نے دو کرداروں مانجھی اور ساتھی کے ذریعہ زندگی کو گزارنے میں آنے والی تمام مشکلوں اور پریشانیوں کو دل اور دماغ ،عقل اور ضمیر، شاگرد اور درویش کی شکل میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مانجھی عقل کی شکل میں ہے جو اپنی کشمکش اپنے ساتھی یعنی ضمیر کو بتاتا ہے اور ضمیر اسے صحیح راستہ دکھاتا ہے۔

مانجھی...... گہرائی کو کون کھنگالے

کون نکالے موتی رے

اس اندھے پانی کے بھیتر

کون جلائے جیوتی رے

کون چھپے بھیدوں کو پائے

کون خزانہ لائے رے

لہروں لہروں جیون نیا

آگے بڑھتی جائے رے

ساتھی... چل چلا چپو چلا

ساتھی مل کر ہاتھ بڑھا

طوفانوں کو دور بھگا

نذیؔر کے گیتوں میں عصری ماحول کی عکاسی بھی بھرپور انداز میں ہوئی ہے انہوں نے حالات حاضرہ کے متعدد مسائل کو اپنے گیتوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے گیت ''سمندر گہرا ہے'' اور ''لوری'' کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ان گیتوں میں عصری حسیت کی آنچ بھڑک رہی ہے ایک اور گیت ہے ''پیار کا کوئی مول نہیں'' اس گیت میں جو قدر مشترک ہے وہ عصری آگہی کی عکاسی کرتا ہے اس گیت کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

دنیا کے دکھ سہہ لے ہنس کر، منہ سے کچھ فریاد نہ کر

اپنی آنکھوں کے پانی کو، رورو کر برباد نہ کر

دنیا کے بازار میں پگلے، ان اشکوں کا مول نہیں

دھن دولت کے سامنے پگلے دل کی باتیں تولی نہیں

نذیؔر لوک ادب سے بھی بہت متاثر ہوئے ہیں ان کو عام عوام کی زندگی سے گہری دلچسپی ہے اور وہ عوام کے تمام مسائل و پریشانیوں کو سمجھنے اور ان کو دور کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اسی لئے ان کے گیتوں میں عوامی رنگ کی جھلک ملتی ہے اور انسانی دکھ درد کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

مانجھی...... تیز ہوائیں تیری دشمن

موجیں تیری قاتل رے

طوفانوں میں پوشیدہ ہے

تیرے پیار کی منزل رے

جیت کا پرچم ہمت ہی کے

ہاتھوں میں لہرائے رے

لہروں لہروں جیون نیا

آگے بڑھتی جائے رے

ساتھی...... چل چلاؤ چپو چلا

ساتھی مل کر ہاتھ بڑھا

طوفانوں کو دور بھگا

شعری صداقت سے مراد شاعری میں ایسی پر لطف شے کا داخل ہونا ہے جو قاری اور شاعر کے بیچ میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور شاعر وقاری کے بیچ اظہار وابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے۔نذیر کے گیتوں میں اس شے کا وجود پوری شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جو کل تھی سوچوں کی زنبیل

بنی ہے وش کی وہ قندیل

جہاں جہاں بھی اجیارا ہے

وہاں ہیں سانپ ہزار

یہ دنیا سانپوں کا بازار

نذؔیر کی شاعری ادراک کی شاعری ہے اپنے غم کو خوشیوں کے پیرائے میں ڈھال کر سہہ لینے کی شاعری ہے یہ شاعری خوشی اور غم میں ہماری ہمت بندھاتی ہے، محبت کے خوابوں سے سجی شاعری ہے ایسے دکھ درد و تکلیف کے بیچ بھی نذیر امید کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں اور نئے عزم وحوصلے کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔

تم آؤ تو ہل جوتیں گے

کھیتوں میں سپنے بوئیں گے

ہریالی کے لب چومیں گے

مل جل کر جھولا جھولیں گے

نذؔیر کے گیتوں میں ایک رنگ، جمالیات کا بھی ہے، زبان کی شیرینی اور لہجے کی گھلاوٹ ان گیتوں کو دلکش ودل پسند بنا دیتی ہے۔

نذؔیر نے اپنے گیتوں میں ان حالات کو بھی موضوع بنایا ہے جو آج ہمارے معاشرے کو کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں اور ہمارے معاشرتی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے ان میں ایک موضوع اولاد کی ماں باپ سے ناوابستگی بھی ہے آج ماں باپ اولاد کو بے حد گراں معلوم ہونے لگے ہیں اس احساس کو نذیر نے ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

یہ کیسی اولاد

کرے جو گھر برباد

چھوڑ کے اپنے ماتا پتا کو

بیوی کے سنگ ہو لے

بول نذیرا بولے

یہ کیسی لوگوں کی ہے ڈور

لگی ہے ہتھیاروں کی ہوڑ

کرتے ہیں سب اہل سیاست

لہو کا کاروبار

محبت بھول گئے سب یار

ہوا ہے برسوں سے بیمار

''نیا پار لگا'' اس گیت میں نذیرؔ ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ہمیں ہمت وحوصلہ اور خود اعتمادی کا جذبہ ہمیشہ اپنے دل میں رواں دواں رکھنا چاہیے ہمیشہ اس بات کا خیال رہے کہ ہماری ہمت اور حوصلے پست نہ ہوں۔

جیون کی اس کشتی کو اب

لے جانا ہے ساحل تک

تب تک ہمت باقی رکھو

پہنچو نا جب منزل تک

طوفانوں کے سینے کچلو

چپو تیز چلاؤ

متوا

نیا پار لگاؤ!

نذیرؔ تجرباتی ذہن کے مالک ہیں۔ یہ تجربے انہوں نے اپنے گیتوں میں بھی کئے ہیں۔

نذیرؔ کے گیتوں کی ایک خاص خوبی ہیت میں تبدیلی بھی ہے اگر ان کے گیتوں پر ذرا غور کیا جائے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اکثر گیتوں میں پہلا بند آخر میں بھی دہرایا گیا ہے! اکثر گیتوں میں پہلے بند کا جزوی حصہ آخری بند کے بعد نمایاں ہوتا ہے۔ یہ گیت کے تاثر کو برقرار رکھنے اور قاری کو متاثر کرنے میں اپنا پورا تعاون کرتا ہے۔ ان کے گیتوں میں نرم ونازک سبک ہندی الفاظ بھی قاری کو بہت متاثر کرتے ہیں، جیون، نیا، ہوہیا، اونچے، ممکن، ہتھیاروں کی ہوڑ، پھولوں کی پچارن، جل کچھ، البیلا شاؤں، جلمی سنگیت، چت چور، کجراری آنکھیں، بیاکل منوا، شبدوں کی خوشبو، ابھاگن وغیرہ ان تمام موضوں الفاظ کے پیرائے میں نذیر کے گیت ان کے زخمی دل کی آواز بن کر صفحہ قرطاس پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

برہن کب تک برہا گائے آگ سے کھیلے کب تک کھیل

آس کے سپنے کب تک دیکھوں کب تک ہوگا اپنا میل

دل کی ڈال پر درد کا پنچھی پریم کی بولی بول رہا ہے

تو سے ملن کی آس میں پریتم تن من میرا ڈول رہا ہے

ان گیتوں کے حوالے مضمون کی ابتدا میں بھی آچکے ہیں۔ دراصل ان گیتوں میں مٹھاس اور ان میں درد زیریں لہریں بار بار دامن دل کو

کھینچنے لگتی ہیں۔

نذؔیر نے اپنے گیتوں میں صوفیانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔اور بہت سے گیتوں میں اپنے علامتی انداز میں بھی بیان کی ہے۔

من کا مول چکا کر بابا

تن کا قرض ادھورا رکھ

تو اپنی ابھیلاشاؤں کو

آدھا اور پورا رکھ

ہاتھ بڑھا کر دنیا سے تومت کر کوئی سوال

دنیا اک چوپال رے بابا

دنیا اک چوپال

نذؔیر کے گیتوں میں الفاظ کا صوتی حسن بھی سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے آوازوں کی تکرار سے ایک عجب سا لطف پیدا ہو کر سماعتوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔لیکن شاعر کا فنی رکھ رکھاؤ کہیں متاثر نہیں ہوتا ان کا مشہور گیت ''دنیا اک چوپال رے بابا'' کا ایک بند پہلے درج کیا جا چکا ہے دوسرے گیت ''ابھی دکھ جھیل'' کا ایک بند ملاحظہ کریں۔

قدم قدم شعلوں کی برکھا

قدم قدم پر آگ مسافر

قدم قدم پر آگ

جیون کی مایا ہے جب تک

انگاروں سے کھیل

ابھی دکھ جھیل مسافر جھیل

ایک اور گیت کا بند ملاحظہ کریں۔

تنہا تنہا دکھ جھیلیں گے

تنہا تنہا م رولیں گے

تنہا تنہا تنہائی کے

سارے زخم ٹٹولے گے

تنہائی کی بات

کریں گے ہر موسم کے ساتھ

سمے کی گہری گھات

ہوئی ہے اپنے دل کے ساتھ

''مرے گیت اکیلے رہ گئے'' میں کچھ گیت ایسے ہیں جو خالص نظم کے فارم میں لکھے گئے ہیں ان میں ''کب ابر برستا ہے، آزادی کا گیت وہ عید پہ آئیں گے، جگنو اور برہن کا گیت وغیرہ کے نام خاص طور سے لیے جا سکتے ہیں۔

نذیؔر کے گیت مشرقی تہذیب اور معاشرتی ماحول کے آئینہ دار ہیں ان کے گیتوں میں مشرقیت کی خوشبو رچی بسی ہے۔

ان گیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب بیکل اتساہی فرماتے ہیں۔

''ان کے گیتوں میں ملن کی خوشیاں، بدمستی، سرشاری کے جذبات کو فروغ دینے کا وسیلہ ہے۔ نذیر صاحب نے گیتوں میں تصنع آمیزی سے کام نہیں لیا بلکہ اس سلسلے میں ان کا برتاؤ قطعی فطری اور حقیقت پسندانہ رہا ہے ان کا مشاہدہ سچا اور ان کا جذبہ صداقتوں کی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ انہوں نے بلا جھجھک اپنے گیتوں کے ذریعے معاشرتی، سیاسی، معاشی، حالات کو پیش کرنے کا جرات مندانہ قدم اٹھایا ہے۔'' (۹۵)

آگے چل کر بیکل اتساہی ان لفظوں میں نذیر کے گیتوں کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری سیدھی سادی شاعری کے قائل ہیں ان کے یہاں نہ لفظوں کا گورکھ دھندا ہے اور نہ علامتوں کا مبہم جال، وہ براہ راست اپنی بات کہنے میں زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان کے یہاں تکلف و تصنع نہیں پائے جاتے یہ بہت بڑا وصف ہے۔'' (۹۶)

نذیؔر کی شاعری سے متعلق ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ان الفاظ میں اپنی رائے دیتے ہیں۔

''نذیؔر فتح پوری کے باطن میں سائنٹفک نقطہ نظر کی روشنی ہے تکنیکی تجزیے کی بالغ نظری ہے۔ شعریا اور جمالیات کی دیدہ ریزی اور بے باکی ہے اور اظہار اور تفہیم کی نکتہ رسی ہے۔ عمیق مطالعہ اور لسانی دروبست کی وجہ سے وہ شاعر ہیں ناقد ہیں، محقق وناول نویس ہیں اور صحافی ہیں شاعری میں ان کے زیر قلم نئی اصناف ہیں جن میں تجربے کی صداقت، مشاہدے کا ادراک ہے، جذبے کا وفور ہے۔ فکر کی وارفتگی ہے اور کیفیات کا تموج ہے۔'' (۹۷)

رفعت سروش نذیر کے مجموعے میرے گیت اکیلے رہ گئے پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری نے اچانک اپنے دکھ، درد اور زندگی کے مسائل اور غم کو، اور زندگی کے اکیلے پن کو'' ''مرے گیت اکیلے رہ گئے'' میں پیش کر کے اردو گیتوں کے سرمایے میں ایک قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔ نذیر شاعری میں ابھی اپنی پہچان بنا رہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ گیت ان کے مزاج کی عکاسی پوری طرح کر سکتے ہیں۔ پچاس سے زیادہ گیت لکھ کر انھوں نے اس صنف ادب کو نئی معنویت دینے کی کوشش کی ہے۔'' (۹۸)

ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نذیر کے مجموعے میرے گیت اکیلے رہ گئے کے گیتوں کی قصیدہ خوانی میں اپنے منظوم خیالات اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

''پیام شوق اور تسکین کا عالم ہے گیتوں میں
بیان زخم غربت، چارۂ مرہم ہے گیتوں میں

محبت اور رفاقت جاں سپاری جاں نثاری ہے
جو آنکھوں کے تقاضے ہیں تو دل کی رازداری ہے
حیا و شرم کی پاکیز گی ہے ان کے گیتوں میں
نگہ شرمائے وہ دوشیزگی ہے ان کے گیتوں میں
مہکتے موسموں کی ان کے گیتوں میں ہے انگڑائی
دھلی ہو گنگا جل سے ایسی ہر جذبے کی گویائی (۹۹)

نذؔیر کے گیتوں میں ہندی الفاظ و محاورات اردو الفاظ کے ساتھ ایسے پیوست ہیں کہ ان کو ہٹا کر دوسرے الفاظ رکھنا ناممکن ہے۔جیون نیا، بھیتر، جیوتی، انمول، بھوجن، کامنا، بھیدوں، چوپال، ابھلاشا، انائے یہ تمام الفاظ اپنی جگہ اس طرح جڑے ہیں جیسے کسی زیور میں نگینے جڑے ہوں۔اسی طرح بہت سے ہندی محاورات بھی استعمال کیے ہیں جن میں ،کالے اکھشر بھینس برابرا، اندھے کنویں میں ڈالنا،لوگوں کی پگڑی اچھالنا،سونے کو مٹی کے سنگ تولنا، کجراری آنکھوں کا جادو سر پر چڑھ کر بولنا وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

نذؔیر کے گیتوں کی ہیئت پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر انور مینائی فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری کے گیتوں کی ہیئت پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کے ہاں گیت کا پہلا بند آخر میں دہرایا گیا ہے۔کہیں کہیں گیت کے پہلے بند کا جزوی یا وافر حصہ آخری بند کے بعد نمایاں ہو جاتا ہے۔ جو گیت کے وحدت تاثر کو قائم رکھنے اور قاری کو متاثر کرنے میں معاوٗن ہوتا ہے۔''(۱۰۰)

جناب اقبال انصاری نذؔیر کے گیتوں کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''نرم آواز میں شدت احساس کا غنائی اظہار گیت ہے۔اس طرح گیت کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں نرم آواز،شدتِ احساس اور غنائی زبان۔گیت (Lyric) قطعی طور پر ذاتی (Personal) ہوتا ہے۔ یہ تمام خوبیاں نذؔیر فتح پوری کے گیتوں میں موجود ہیں۔''(۱۰۱)

نذؔیر کے گیتوں میں ان کی ذاتی زندگی کا عکس بھی جھلکتا ہے جس کے متعلق لبنیٰ انصاری لکھتی ہیں۔

''کبھی کبھی نذیر کے گیت ان کی ذاتی زندگی کا آئینہ محسوس ہوتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ نذؔیر اپنی بیتی ہوئی زندگی اور اس کی تمام یادوں کو اپنے گیتوں کے سانچے میں ڈھال دینے کے خواہش مند ہوں۔''(۱۰۲)

ڈاکٹر انور شیخ نذؔیر کے گیتوں کی جادو بیانی کے متعلق فرماتے ہیں۔

''نذؔیر فتح پوری کے گیتوں میں ایک نشہ ہے جو ہر شخص پر اس کے ذوق کی نسبت سے اثر انداز ہوتا ہے اس میں حسن و جمال کی مٹھاس اور محبت کی بے اعتنائیوں کی تڑپ بھی ہے نیز ہر گیت سے ایک ایسی گونج سنائی دیتی ہے جو ذہن کو اپنے صوتی اور مصنوعی جادو کی گرفت میں لے لیتی ہے۔''(۱۰۳)

نذؔیر نے اپنے گیتوں میں محاوروں کو بھی استعمال کیا ہے جس کے متعلق جناب پروفیسر محمد محفوظ الحسن فرماتے ہیں۔

''نذؔیر فتح پوری نے محاورات کے استعمال میں حسن کاری کے ساتھ ساتھ فنکاری کا کمال دکھایا ہے۔''(۱۰۴)

نذیر فتح پوری کے گیتوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری کے گیتوں کا مطالعہ ذہن و دل پر اس حقیقت کو واضع اور نمایاں کرتا ہے کہ نذیر فتح پوری سیدھی سادی شاعری کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے گیتوں میں لفظوں کو پیچیدہ بنا کر قطعی استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے سیدھے سادے واضح انداز میں صاف ستھرے طریقے سے اپنے دل کی باتوں کو گیت کے سانچے میں ڈھالنے میں نذیر فتح پوری نے فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔''(۱۰۵)

نذیر کے گیت عوام کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں اس کے متعلق شفیق احمد شفیق کا خیال ہے۔

''نذیر فتح پوری لوک ادب سے بھی بہت متاثر ہیں اور ان کے گیتوں کے الگ رنگ اور ڈھنگ اس بات کی جا بجا تصدیق کرتے ہیں کہ ان کو عوام کی سادہ زندگی سے گہری دلچسپی ہے اور ان کے چھوٹے بڑے مصائب و مسائل کو سمجھنے، جانچنے اور ان کے سلجھانے کی تخلیقی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں وجہ سے جہاں ان کے گیتوں میں محبت کی رنگینی، نازک جذبوں کی عکاسی، ہجر و فراق کی کہانیاں مختلف موڑ اور متعدد کروٹوں کے ساتھ موجود ہیں۔ وہیں زندگی کی حقیقی تلخیوں، کلفتوں، افلاس کی سفاکیوں اور منفی اقدار کی اذیتوں کے گہرے نقوش بھی ہیں۔ زندگی کے ہر رنگ ہر پہلو اور ہر زاویے کا بڑے عمق کے ساتھ مشاہدہ کر کے انہوں نے ان کی ماہیت اور در و بست کی رسائی کا ذائقہ حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عوامی رنگ بھی ہے اور عوام کے درد و کرب کی عکس پذیری اور نغمہ سازی بھی۔''(۱۰۶)

نذیر فتح پوری کے گیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رفیق شاہین فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری اپنے گیتوں کو مبہم علامت اور نامانوس استعارات سے دور ہی رکھتے ہیں، ان کے یہاں ترسیل و ابلاغ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے گیتوں کی عام فہم اور سادہ زبان نغمگی اور شیرینی اور حلاوت اور لطافت سے معمور ہوتی ہے۔ ان کے میٹھے الفاظ، لہجے کی حلاوت اور اسلوب کی ندرت میں ڈھلے گیت ہمیں مست و بے خود کر دیتے ہیں۔''(۱۰۷)

نذیر کے گیتوں کی خاصیت پر نظر ڈالتے ہوئے جناب قمر سنبھلی فرماتے ہیں۔

''نذیر کے گیتوں میں تمام تر گیتو کی روایتی فضا موجود ہے۔ زبان بھی گیتوں کے لیے نہایت مناسب اور گنگا جمنی استعمال ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے گیتوں میں تاثر بڑھ گیا ہے۔''(۱۰۸)

دیوان حنان خان اپنے مضمون ''نذیر فتح پوری کے گیت، مشترکہ تہذیب کے عکاس'' میں نذیر کے گیتوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ان کی شاعری ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی قدروں کی آئینہ دار ہے۔ ان کے گیتوں میں مشرقیت پائی جاتی ہے۔ ہندوستان روز بروز ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ مغربی تہذیب اپنے پنکھ پھیلا رہی ہے۔ سماجی قدریں بدل رہی ہیں۔ جدیدیت مابعد جدیدیت کا نعرہ سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

ایسے ماحول میں نذیرؔ فتح پوری آج بھی اپنی روایتی تہذیب سے جڑے ہوئے ہیں۔ان کے گیتوں میں ہماری مشترکہ تہذیب کا عکس ہندوستانی لفظیات اور مصطلحات کا استعمال تخلیقی رچاؤ کے ساتھ ملتا ہے۔''(۱۰۹)

نگار عظیم صاحبہ اپنے ایک خط جو انہوں نے نذیرؔ کو ۲۴۔۴۔۲۰۰۵ء کو تحریر کیا تھا میں نذیرؔ کی گیت نگاری پر ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

''آپ کے گیت اکیلے نہیں ہیں پڑھتے وقت قاری بھی ان گیتوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ان میں جھرنوں کی روانی ہے۔موسم کی کہانی ہے۔درد کی بیانی ہے۔جھیل کی خامشی ہے۔دل کی بے ثباتی ہے۔جگنو کی چمک ہے۔پیار کی ترنگ ہے۔عید کی اُمنگ ہے۔''(۱۱۰)

ہاجرہ رحمان صاحبہ اپنے ایک خط میں نذیرؔ کے گیت کے مجموعے ''میرے گیت اکیلے رہ گئے'' کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتی ہیں۔

''زیرِ نظر مجموعہ ''میرے گیت اکیلے رہ گئے'' نے بصارت و بصیرت کی جو بلند سطحیں اور معیارات قائم کئے ہیں وہ گیتوں کے جہاں میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔''(۱۱۱)

اندرا شبنم صاحبہ اپنے مضمون [illegible] میں نذیرؔ کے گیتوں کے متعلق فرماتی ہیں۔

[illegible]

(۱۱۲)

یہ تھی نذیرؔ فتح پوری کے گیتوں کی کہانی، کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے نذیرؔ صرف گیت نگاری ہی کرتے اور کچھ نہیں کرتے تب بھی اردو کی ادبی دنیا میں ان کا نام اور تخلیقی شخصیت یاد رکھی جاتی۔''میرے گیت اکیلے رہ گئے'' جیسی کتاب نے ایک جہاں کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ اس کتاب پر جی کھول کر لکھنے والوں نے لکھا، الگ الگ زاویوں سے ان گیتوں کی شرح بیان کی اور ان گیتوں کو انسان کے زخموں کا مداوا انسانیت کے دکھوں کا علاج تسلیم کیا۔یہ بڑی بات ہے۔نذیرؔ کو ایک کامیاب گیت نگار تسلیم کرانے میں ''میرے گیت اکیلے رہ گئے'' کا بڑا ہاتھ ہے۔

نذیرؔ فتح پوری کی تکونیاں

ادب میں نئی نئی اصناف شامل ہوتی جارہی ہیں اور اپنی جگہ بناتی جارہی ہیں۔نذیرؔ نے بھی اپنے ذخیرۂ شاعری میں ایک اور اصناف

کا اضافہ کیا ہے جو تکونی کے نام سے جانی جاتی ہے۔تکونی کی وضاحت کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر صابر آفاقی فرماتے ہیں۔

''ماضی بعید میں اہل قلم دو چیزوں یا وصفوں کا مناظرہ کرواتے تھے مثلاً جنگ اور امن، قلم اور تلوار وغیرہ۔اسی کو آج تکونی کا نام دیا گیا ہے۔موجودہ شکل میں اردو میں تکونی کو آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔گوجری زبان میں تکونی کہنے کا تجربہ میں نے ۱۹۷۰ء میں کیا تھا۔اردو میں یہ صنف غالباً بعد میں آئی ہے۔

تکونی میں دو چیزیں عدالت میں پہنچتی ہیں۔دلائل پیش کرتی ہیں اور پھر منصف فیصلہ سناتا ہے۔''(۱۱۳)

اس قول کی روشنی میں تکونی کی تصویر ہماری آنکھوں میں صاف اُتر جاتی ہے۔نذیرؔ نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور خود منصف بن کر قلم اور قرطاس شاہ اور بھکاری، دن اور رات آنکھ اور منظر، آدمی اور شیطان اور کتاب اور قاری کے درمیان صحیح فیصلہ سنایا ہے۔ان تکونیوں میں ان کا منصفانہ انداز ملاحظہ ہو۔

آدمی اور شیطان

آدمی، شیطان سے

اشرف المخلوق ہوں میں ،ہے مرا رتبہ بڑا — کون مسجودِ ملائک ہے بتا میرے سوا
نیکیوں کا میں پیمبر، میں ہدایت کا چراغ — میری ہستی ہے زمیں پر نور کا اک سلسلہ
جو بھی دنیا میں ہے رونق وہ مرے ہی دم سے ہے — میں نہ ہوتا تو کہاں ملتا اُجالوں کا پتا

ہیں زمیں پر جس قدر اچھائیوں کی چھاؤنی
میرے ہی کردار سے قائم ہے اُن کی روشنی

شیطان، آدمی سے

ہنس کے یہ شیطان بولا، ابنِ آدم سن ذرا — آج کے اس دَور میں ،کیا شان، کیا رتبہ ترا
کام جتنے مجھ کو سونپے تھے خدائے پاک نے — اب وہ میرے کام سارے آدمی کرنے لگا
جو بھی تھی دنیا میں رونق، وہ تو کب کی مٹ چکی — سب چراغوں کو بجھا کر تو ہے اب بیٹھا ہوا

بج رہا ہے ہر جگہ ڈنکا ترے ہی نام کا
سچ بتا دوں رہ گیا شیطان میں بس نام کا

شاعر

آدمی میں اور شیطاں میں اَزل سے جنگ ہے — نور کا ظلمت کا پہلے روز ہی سے سنگ ہے
یہ بھی سچ ہے آدمی کا اب بھی ہے رتبہ بڑا — یہ بھی سچ ہے آدمی شیطاں سے ہم آہنگ ہے
خیر ہو یا شر ہو، دونوں کی ہیں اپنی رونقیں — زیست کے چہرے پہ ان دونوں کا گہرا رنگ ہے

دونوں ہی کے دم سے قائم ہے جہاں میں روشنی
اہمیت دونوں کی ہے، شیطان ہو یا آدمی

قلم اور قرطاس

قلم، قرطاس سے

میرے چلنے ہی سے چلتا ہے جہاں میں تیرا نام — میں نہ لکھوں تو تری ہستی کا مطلب کچھ نہیں
میرے لفظوں نے بڑھایا ہے سدا تیرا وقار — میری ہی تحریر نے تجھ کو بنایا ہے حسیں
جانتے ہیں سب مری ہستی ہے سورج کی طرح — میرے ہی پرتو سے روشن ہے تری دنیا ودیں
میرے ہی لطف وکرم سے تو جہاں میں شاد ہے
میرے ہی احسان سے تو شاد ہے آباد ہے

قرطاس، قلم سے

اے قلم! تجھ کو غرورِ رنگ و بو ہے کس لیے — مجھ پہ یہ احسان کا تیرا تخیل خام ہے
اس حقیقت کا تجھے احساس آخر کیوں نہیں — روشنائی ہو نہ تجھ میں تو تو خالی جام ہے
میں نہ لکھنے کی اجازت دوں تو ہے بیکار تو — میری ہستی ہی تری ہستی کی صبح و شام ہے
تو نہیں واقف تو کیا، واقف ہیں سب اس بات سے
تیرے لفظوں کا بھرم زندہ ہے میری ذات سے

شاعر

ہاں یہ سچ ہے کہ قلم، قرطاس کا محتاج ہے — اور ہے قرطاس بھی محتاجِ ہستی قلم
منحصر اک دوسرے پر ہے سبھی کی زندگی — روشنائی ہو اگر مفقود تو دونوں عدم
فیصلہ میرا سنو، اس بحث پر ہے بس یہی — آدمی کے ہاتھ میں ہے ان کی ہستی کا علم
آدمی کو لکھنے پڑھنے سے اگر رغبت نہیں
پھر ''قلم قرطاس'' کی ہستی کا کچھ مطلب نہیں

نذیرؔ کی تکونی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صابر آفاقی فرماتے ہیں۔

''نذیرؔ کی زبان شستہ، دلائل قوی ومتین اور فیصلہ صائب ہے۔ان خصوصیات نے نذیرؔ کی تکونیوں کو موثر بنا دیا ہے۔جو شعراء تکونی کو ترقی دے رہے ہیں ان میں نذیرؔ فتح پوری کا نام سرفہرست رہے گا۔'' (۱۱۴)

نذیرؔ کی تکونیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب رؤف خیرؔ فرماتے ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری نے چند تکونیاں کہی ہیں جو ان کی مخصوص فکر کی نمائندہ تخلیقات کہی جاسکتی ہیں۔ان تکونیوں کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے جو دو مختلف کردار وضع کیے ہیں۔ان پر بحیثیت شاعر ہی تبصرہ کرتے ہیں یعنی مبصر بجائے خود شاعر ہیں۔'' (۱۱۵)

نذیرؔ نے اپنی کثیر الکلامی کے باوجود ابھی تک اپنی عادت کے مطابق تکونی کا کوئی مجموعہ شائع نہیں کیا۔انھوں نے جتنی تکونیاں لکھی وہ ان کی پابند نظموں کی کتاب 'نظم سفر' میں شامل ہیں۔

نذیرؔ نے اپنی تکونیوں میں بھی سچائی سے آنکھ ملانے کی پوری کوشش کی ہے۔دو کرداروں کے درمیان مقدمے کے جو فیصلے نذیرؔ نے ایک شاعر کی حیثیت سے کیے ہیں ان میں کہیں ناانصافی یا حق تلفی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نذیرؔ نے کرداروں کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔یا وہ کسی سیاسی ،سماجی یا مذہبی دباؤ کے تحت فیصلہ سنانے میں جھجھکے ہوں۔نذیرؔ کا یہی منصفانہ کردار ان تکونیوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔اور اس طرح چند تکونیوں کی تخلیق ہی میں وہ ایک کامیاب تکونی نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرتے نظر آتے ہیں۔

نذیرؔ فتح پوری کی کہہ مکرنیاں

کہہ مکرنی اس نظم کو کہتے ہیں جو دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔اس کے پہلے حصہ میں کوئی بات کہی جاتی ہے اور دوسرے حصے میں اس بات سے انکار کر دیا جاتا ہے۔اسی لیے اس کا نام کہہ مکرنی یعنی کہہ کر مکر جانا رکھا گیا۔یہ سوال و جواب کی صورت میں ہوتی ہے۔کئی شاعروں نے اس صنف میں پہیلیاں بھی کہیں ہیں۔امیر خسرو کا نام کہہ مکرانی کے پہلے شاعر کے طور پر لیا جاتا ہے ان کی کہہ مکرانیاں خاص و عام میں مقبول ہیں اور آج بھی حوالوں مثالوں میں استعمال ہوتی ہیں۔جو مختلف کتابوں میں موجود ہیں۔

''سکھی ساجن'' کے نام سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ایک تصنیف مرتب کی ہے جس میں جدید شعراء کی کہہ مکرنیاں شامل کی گئی ہیں جن کا موضوع عصری مسائل ہے۔امیر خسرو کے بعد تقریباً سات سو سال کی مدت میں اس صنف پر کسی نے قلم نہ اٹھایا۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی فرمائش پر سراجؔ روحی، ش۔م۔عارفؔ، فیضی سُنبل پوری، ساحر شیوی، شاہد جمیلؔ، ضمیرؔ یوسف، منصور عمر، انجمؔ عظیم آبادی، نسیم عزیزی، ساگر چاپدانوی، نسیم اختر، شارق جمال، شمیم انجم وارثی، یونسؔ احمر، احمد کمال اور نذیرؔ فتح پوری کے نام شامل ہیں۔

نذیرؔ فتح پوری نے اردو شاعری کی اس قدیم صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور تکونیوں کی طرح کہہ مکرنیاں تخلیق کیں۔لیکن یہ ان کے عزیز دوست مناظر عاشق ہرگانوی کے کہنے پر ہوا۔جس کا اعتراف نذیرؔ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے پہلی بار ''کہہ مکرانیاں'' کہنے کی کوشش کی ہے۔
یہ ہلکے پھلکے انداز کی کویتائیں اگر آپ کے دل پر اثر کر گئیں تو میں سمجھوں گا میری محنت کامیاب ہو گئی۔''(۱۱۶)

کہہ مکرنیوں کو لوک ادب میں شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ اس کے فنی تقاضے وہی ہیں جو لوک ادب کے ہوتے ہیں نذیرؔ نے اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی کہہ مکرنیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ان کے شعری مجموعے ''نیا دن پھوٹ کر نکلا'' میں کل چودہ کہہ مکرانیاں ہیں۔اور ان کی تصنیف ''یہ زمین میری ہے'' میں آٹھ کہہ مکرانیاں شامل کی گئیں ہیں۔نذیر نے اس صنف پر اتنی توجہ نہیں کی جتنی دوسری اصناف پر کی ان کے متعلق مالتی شرما صاحبہ کا خیال ہے۔

''کہہ مکرنی کہنے میں نذیر صاحب کو اپنے باقی چھند پر یوگوں جیسی کامیابی نہیں ملی ہے۔''(۱۱۷)

کہہ مکرنیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صنف دو سہیلیوں کی گفتگو پر منحصر ہے۔جس میں ایک سہیلی اپنی دوسری سہیلی سے کوئی سوال کرتی ہے اور دوسری سہیلی اس کا غلط جواب دیتی ہے پھر پہلی سہیلی اسے اس سوال کا صحیح جواب دیتی ہے۔نذیر کی کہہ مکرنیاں اسی انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔جو قاری کے لئے دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

☆ ☆

ساون آئے تو تڑپائے
بادل چھائے تو تڑپائے
اس کی یہی ہے بس اک ریت
اے سکھی ظالم؟
نہ سکھی۔ میت

☆

دھیرے دھیرے پیار لٹائے
سوکھی دھرتی کو مہکائے
رہے نہ یہ آنکھوں کو موند
اے سکھی۔ دریا؟
نہ سکھی۔ بوند

☆

باغوں کی یہ شان بڑھائے
زلفوں زلفوں اڑتا جائے
اس کا اپنا ایک اصول
اے سکھی! بھنورا
نہ سکھی! پھول

☆

دل کی بات سنائے سب کو
لفظوں سے بہلائے سب کو
اس کی باتیں پیار سمان
اے سکھی! ملا
نہ کوی! جان

☆

نیندوں میں وہ لوری بھر دے

سب کو اس کا ہونا بھائے
خود چمکے اور جگ چمکائے
اس کے آگے سب کچھ ماند
اے سکھی، جگنو؟
نہ سکھی۔ چاند

☆

ہونٹوں پر جب یہ بس جائے
اور بھی حسن کی شان بڑھائے
رنگ بھری اس کی مسکان
اے سکھی۔ لالی؟
نہ سکھی! پان

☆

راتوں میں یہ آئے اکثر
آنکھوں کو چمکائے اکثر
سب سے انوکھی اس کی بات
اے سکھی! نندیا؟
نہ سکھی! خواب

☆

آئے تو لے جائے سب کو
اپنے سنگ بہائے سب کو
اس کو روکے، وہ بلوان
اے سکھی! آندھی!
نہ! طوفان

☆

چپ چپ دل کو روگ لگائے

پہلو کو وہ بستر کر دے
دیمک کے جیسا کھا جائے

اس کا پہلو راحت جاں
ایسا قاتل، اس کا رخ

اے سکھی! عورت
اے سکھی! گھن ہے

نا سکھی! ماں
نا سکھی! دُکھ

نذیؔر کی ان کہہ مکرنیوں میں بھی ان کے تخلیقی جمال کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے بلکہ لمحہ استعجاب ہے کہ نذیؔر نے جس صنف سخن پر نظر ڈالی اسے تخلیقی طور پر ایک طرح سے جاوداں بنا دیا۔ یہاں قلت اور کثرت پر کوئی بحث نہیں۔ ادب میں جتنی وقعت اور احترام غالبؔ کے ایک دیوان کو حاصل ہے اتنی عزت واحترام میر تقی میرؔ کے چھ دیوانوں کو حاصل ہے۔ غالب کی عام فہم غزلوں کا انتخاب کیا جائے تو دیوانِ غالبؔ سے ہمیں مٹھی بھر غزلیں ہی دستیاب ہوتی ہیں لیکن جب ہم میرؔ کے نشتروں کا انتخاب ان کے چھ دوانیں سے کرتے ہیں تو حجم دیوان غالب کے حجم سے بڑھ جائے گا۔ نذیؔر کی پوری شعری کائنات سے ہم عرق ریزی کریں تو ہمیں قطعی مایوسی نہیں ہوگی۔

نذیؔر فتح پوری کے دوہے

اردو ادب نے ہندی ادب سے بڑا فیض اٹھایا اور گیت کی طرح صنف دوہا کو بھی اپنالیا، دوہا قدیم ہندی ادب کی مشہور ومعروف صنف سخن ہے۔ قدیم زمانے میں اسے دوہک۔ دوہرا اور دہا بھی کہا گیا لیکن اس کی اصل پہچان دوہا کے نام سے ہوئی۔ ہندوستان میں اس کی روایت امیر خسرو سے بھی پہلے کی ہے۔ ان سے پہلے صوفی سنتوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اس صنف کو وسیلہ بنایا راجستھان میں بھی جان کوی نعمت خان اور بادشاہ اکبر کی بیگم تاج بی بی نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اسے تخلیقی طور پر اپنایا۔

اردو میں صنف دوہا کو عظمت و وقار بخشنے والوں میں، جمیل الدین عالی، رشید قیصرانی، شاعر صدیق۔ افضل پرویز، امین خیال فراز حامدی، اور نذیر فتح پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

''میرے دوہے میرے گیت'' نذیؔر کی دوہوں اور گیتوں پر مشتمل تصنیف ہے جو ۲۰۱۵ء میں ہندی رسم الخط میں شائع ہوئی۔ ۱۴۳ صفحات پر مشتمل اس تصنیف کے ناشر ادھومہاجن بسملؔ ہیں۔ پیش لفظ ڈاکٹر سُنیل دیودھر نے تحریر کیا ہے۔ دوہوں گیتوں کے علاوہ اس تصنیف میں ماہیہ گیت اور کچھ نظموں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

نذیؔر نے اپنے لفظوں کو اپ بھرش اور ہندی زبان کے الفاظ سے سجایا ہے اور دوہا کے لیے جو وزن رائج ہے یعنی فعلن فعلن، فاعلن، فعلن فعلن ''فاع''، میں ہی اپنے دوہے تحریر کیے۔ اس صنف میں وہ سنت کبیر سے بے حد متاثر ہیں۔ جس کا اعتراف وہ اپنے ایک شعر میں کرتے ہیں۔

زندہ ہے مجھ میں آج بھی اک سنت آدمی
میں آج بھی کبیر کے دوہوں کے ساتھ ہوں

ان کے دوہوں میں ہندوستانی تہذیب رواں دواں ہے جس کے متعلق خود اعتماد کرتے ہیں کہ۔

''میری دوسری شاعری کی طرح میرے دوہے بھی ہندوستانی سبھیتا کے رس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔'' (۱۱۸)

نذیر کی دوہا نگاری کے متعلق مالتی شرما کا خیال ہے کہ۔

''فتح پوری جی کے دوہوں میں زندگی کی سچائیاں جیسے آج ہی ایک تارے پر بجتی ہوں۔ایسے روشن ہوتی ہیں۔

کچھ اُپمائیں اُن کی دیہاتی گھروں کے درشیہ اُپستھ کرتی ہوئی من میں اتر جاتی ہیں۔'' (۱۱۹)

جب ایک شخص مضبوط حوصلہ کر کے آگے بڑھتا ہے تو پھر وہ کسی بھی مشکل سے نہیں گھبراتا ہے اور اپنی منزل کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھ جاتا ہے۔نذؔیر ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اپنا چاہا دن کرے اپنی چاہی رات

دھن کے پکے دیوتا مانے کس کی بات

نذؔیر کے دوہوں میں کہیں سچ کی خوبی بتانے کے لیے خشکی اور تری کی مثالیں دی گئیں ہیں تو کہیں خانہ بدوش لوگوں کی زندگی کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

خشکی میں بھی پائے گا تو پانی تتکال

سچ کی رسّی باندھ کر، ڈول کوئیں میں ڈال

پاؤں سے لپٹے راستے، کاندھوں پر گھر بار

بنجاروں کے بھاگ، میں کیسا سکھ سنسار

نذؔیر کے دوہوں میں کہیں پوری دنیا کو دورنگی بتایا ہے تو کہیں ''جو جیسا کرے گا وہ ویسا بھرے گا'' اس کہاوت کو دوہے کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔

دو رنگی سنسار کا، تہذیبی احساس

مل جائے تو پھول ہے، نہیں ملے تو گھاس

کانٹے سے کانٹا ملا پھول کے بدلے پھول

جیون دھرتی سے ملا، کرموں کا محصول

نذؔیر ایک انسانیت نواز شاعر ہیں۔ ملک سے محبت، انسانوں سے ہم دردی کے ساتھ ہی ان کے دوہوں میں قومی یکجہتی کی خوبصورت مثالیں بھی ملتی ہیں۔

پنڈت نے قرآں پڑھا، ملاجی نے وید

شاعر نے دیکھا سین مٹ گیا سارا بھید

پنڈت اپنا پادری، مُلّا اپنا سنت

ہو جائے تو ہو جائے ہر نفرت کا انت

نذؔیر نے اپنے دوہوں میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ فصل کی پیداوار میں زمین کے ساتھ ساتھ آسمان اور بارش کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے تو کہیں گھر کے جھگڑوں سے ہونے والی افراتفری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فصل کٹائی ہوگئی ڈھیروں لدگیا دھان

دھرتی پھولی ایک دم امبر کا احسان

گھر میں اٹھا جس گھڑی دیواروں سے شور

دھیان گیا بے ساختہ چوراہوں کی اور

نذیرؔ نے اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عصر تمام شعراء اور ادباء کی بھی تعریف کی ہے جو اپنی تخلیقات میں حقیقت بیاں کرتے ہیں۔ نذیرؔ نے اسے تخلیقی احساس کا اصول قرار دیا ہے۔

کانٹے کو کانٹا لکھے، پھول کو لکھے پھول

تخلیقی احساس کا اپنا ایک اصول

شہروں کے بہت سے لڑکے گاؤں میں جا کر وہاں کی سیدھی سادی لڑکیوں کے ساتھ عشق محبت کی باتیں کر کے ان کی معصومیت کا فائدہ اُٹھاتے ہیں اور بعد میں ان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر نذیرؔ لکھتے ہیں۔

جاری چھوری گاؤں کی مت کہہ من کی بات

ورنہ بابو شہر کا دے جائے گا مات

زیر مطالعہ مقالے میں نذیرؔ کے مشاہدے کی بات بار بار کہی گئی ہے۔ نذیرؔ نے دوہوں کی تخلیق میں بھی مشاہدے کی مشعل کو روشن رکھا ہے۔ مندرجہ بالا دوہا اس کا ثبوت ہے زندگی جینے کا ہر انسان کا اپنا طریقہ ہے۔ دوہے کی شکل میں نذیرؔ نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

کس کس کو سمجھایئے جیون کا سنگیت

اپنی اپنی بانسوری اپنا اپنا گیت

سچائی کبھی نہیں ہارتی، سچ بولنے والے ہمیشہ پُر عزم دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ فتح وکامرانی ایک دن انہیں کے دامن میں آئے گی۔

سچ کے ساتھی جب ہوئے، پھر کیوں ہو بھیبھیت

آج نہیں تو کل میاں، ہوگی اپنی جیت

والدین جب اپنی اولاد کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں تو ان کی محنت اس وقت رنگ لاتی ہوئی نظر آتی ہے جب وہ بچے جوان ہو کر ان کا سہارا بن جاتے ہیں اس خوبصورت احساس کو نذیرؔ نے اس طرح سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

بوڑھی فقریں ڈوبتی اوپر اٹھ آئیں

بیٹے جس دم باپ کی بیساکھی بن جائیں

نذیرؔ نے صرف بیٹوں کو ہی باپ کی بیساکھی کہا ہے جبکہ آج کے دور میں بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔

نذیر کے دوہوں میں تشبیہات کی بھی بہترین مثال نظر آتی ہے۔

چھاؤں ہماری آتما، جسم ہمارا دھوپ

ہم ایسے فنکاروں کے کیسے کیسے روپ
میں سپنوں کا پالنا، تو نیندوں کی ڈور
ہم دونوں کے پریم کا، اور نہ کوئی چھور
ایک اجالا صبح کا، ایک اندھیری شام
اس سے بڑھ کر کچھ نہیں جیون تیرے نام

نذیرؔ نے دوہوں میں چھند، بحر اور وزن کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔

ٹوٹی مالا پریم کی، بکھرا من کا ہار
سمئے نے لوٹا ٹوٹ کر، گوری کا سنگھار
رات بھئی تو یاد نے لوٹا من کا چین
باٹ نہارے آپ کی، متوارے دو نین

دنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو اپنے دل سے نفرت کو کبھی ختم نہیں کر پاتے، اسی سبب یہ دنیا کانٹوں سے بھری ہوئی ہے، ہم سارے کانٹے نہیں چن سکتے لیکن ایک کام ضرور کر سکتے ہیں کہ کم سے کم اپنی راہ میں آنے والے کانٹوں کو چن لیں۔ اگر ہر شخص ایسا کر لے تو دنیا سے ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔ اس کے متعلق نذیرؔ کا خیال ہے کہ ۔

کانٹے سے کانٹا ملا، پھول کے بدلے پھول
جیون دھرتی سے ملا، کرموں کا محصول

نذیرؔ نے اپنے دوہوں میں دورِ حاضر کے گہرے اور پیچیدہ رویوں مثلاً چالبازی، فریب کاری، خود غرضی، خود فراموشی جیسے تمام موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔

بھولے بسرے درد نے کروٹ لی جب رات
ساون بھادو بن گئے، گوری کے جذبات
ایک اجالا صبح کا ایک اندھیری شام
اس سے بڑھ کر کچھ نہیں جیون تیرے نام

دیکھے ایسے بھی کئی، ہم نے کوی کپتان
خود کو غالبؔ کہہ کرے، غالبؔ کا اپمان
کون دکھی کا دکھ ہرے، رکھے کون خیال
نام کے جگ میں رہ گئے، سارے دین دیا

سوکھی لکڑی جل گئی، گیلی ناچ نچائے
پھونکوں، پھونکوں دھور سے، سارا گھر بھر جائے

جہاں نذیؔر نے دوہوں میں وزن وآہنگ کا خیال رکھا ہے وہیں ان میں رومانیت اور غزل کا انداز بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگلی پکڑی حرف کی، شبد قلم میں تھام
ہم نے دل کے پتر پر لکھا تیرا نام
چٹھی آئی شہر سے، گوری پڑھ شرمائے
اک اک شبد پہ ہاتھ سے، منوا نکلا جائے
پنگھٹ اس سے دو دھیا، چندہ سی وہ نار
جب تک تھی تھا گاؤں میں، آنکھوں کا آدھار
سجنی بیٹھی سوچ میں رہ رہ آئے دھیان
ساجن آئے تب ملے املی کا پکوان
لب پر ہے فریاد تو آنکھیں ہے حیران
ہم سے روٹھی کس لیے وہ الہڑ مسکان

نذیؔر کی دوہا نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب فراز حامدی کا خیال ہے کہ۔

''نذیؔر فتح پوری نے کئی اصنافِ سخن کو گلے لگا رکھا ہے اور دوہا پر بھی ان کی طبع آزمائی جاری ہے ان کے دوہوں کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ شوقیہ طور پر ذائقہ شاعری بدلنے کے لیے دوہے نہیں کہتے ہیں بلکہ دوہے کی روح میں ڈوب کر اسے اظہار وسیلہ بناتے ہیں اور دوہے کی قدیم مسلمہ بحر سے انحراف نہیں کرتے۔''(۱۲۰)

نذیؔر نے شاعری کی تقریباً ہر صنف مثلاً غزل، آزاد غزل، حمدیہ، نعمت، نظم، توشیحی نظم، سہ سطری نظم، مثنوی، دوہے، ماہیے، گیت، تکونیاں، اور کہہ مکرنیاں، وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان سبھی اصناف میں نذیؔر نے زندگی کے ان تمام نشیب وفراز کو بطورِ موضوع پیش کر دیا جو ہر شخص کو کبھی نہ کبھی پیش آتے ہیں۔ ہر شخص ان تمام حالات سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ انسان کا دل ان جذبات کو محسوس کرتا ہے اور جب وہ اپنے جذبات کی تصویر ان اشعار میں پڑھتا ہے تو اس کا دل تڑپ اُٹھتا ہے کہ یہ حالات تو اس پر بھی گزرے ہیں۔

نذیؔر کی دوہا نگاری پر بے لاگ تبصرہ کیا جائے تو بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ دورِ جدید میں قدیم ہندوستانی صنف دوہا کے کامیاب شاعر ہیں

☆☆☆

حوالہ جات

باب سوم

حوالہ نمبر	نام کتاب/ رسالہ	مصنف/مرتب	صفحہ نمبر	سنِ اشاعت
(۱	لمحوں کا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۷	۱۹۸۴ء
(۲	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۲۰۶	۲۰۰۶ء
(۳	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۲۰۸	۲۰۰۶ء
(۴	ششماہی-جدیدادب، جرمنی	-	۲۵۱	جنوری تا جون ۲۰۱۲ء
(۵	سفرتاسفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۱	۱۹۹۱ء
(۶	سفرتاسفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۲	۱۹۹۱ء
(۷	سفرتاسفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۲	۱۹۹۱ء
(۸	سفرتاسفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۱	۱۹۹۱ء
(۹	سہ ماہی-اسباق، پونہ	-	۹	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء
(۱۰	تیسرا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۲۱	۱۹۹۳ء
(۱۱	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۲۰۴	۲۰۰۶ء
(۱۲	سفرمدام سفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۸	۲۰۰۸ء
(۱۳	سہ ماہی-رنگ، دھنباد	-	۱۳۲	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
(۱۴	تتلیوں بھرا آسمان	نذیرؔ فتح پوری	۱۵	۲۰۱۲ء
(۱۵	تتلیوں بھرا آسمان	نذیرؔ فتح پوری	۱۷	۲۰۱۲ء
(۱۶	دیوانِ نذیرؔ فتح پوری	نذیرؔ فتح پوری	۴	۲۰۱۲ء
(۱۷	دیوانِ نذیرؔ فتح پوری	نذیرؔ فتح پوری	۱۳	۲۰۱۲ء
(۱۸	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	نذیرؔ فتح پوری	۱۰۶	۲۰۰۶ء
(۱۹	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۱۰۷	۲۰۰۶ء
(۲۰	ادبی معاصرین کا مطالعہ	معین الدین عثمانی	۱۱۷	۲۰۰۹ء
(۲۱	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۱۰۳	۲۰۰۶ء

۲۲)	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۱۰۴	۲۰۰۶ء
۲۳)	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۸۸	۲۰۰۶ء
۲۴)	تیسرا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۶	۱۹۹۳ء
۲۵)	نذیرؔ فتح پوری،ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۶۴	۲۰۱۳ء
۲۶)	محبوبؔ و نذیرؔ-فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہیؔ	۱۱۹	۲۰۱۳ء
۲۷)	نذیرؔ فتح پوری،ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۳۳	۲۰۱۳ء
۲۸)	لمحوں کا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۷	۱۹۸۴ء
۲۹)	لمحوں کا سفر	نذیرؔ فتح پوری	پس پشت	۱۹۸۴ء
۳۰)	ادبی معاصرین کا مطالعہ	معین الدین عثمانی	۱۱۶	۲۰۰۹ء
۳۱)	نذیرؔ فتح پوری،ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۳۰	۲۰۱۳ء
۳۲)	ادبی معاصرین کا مطالعہ	معین الدین عثمانی	۷۲	۲۰۰۹ء
۳۳)	ادبی معاصرین کا مطالعہ	معین الدین عثمانی	۷۳	۲۰۰۹ء
۳۴)	لمحوں کا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۸	۱۹۸۴ء
۳۵)	لمحوں کا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۳	۱۹۸۴ء
۳۶)	لمحوں کا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۵	۱۹۸۴ء
۳۷)	دیوان نذیرؔ فتح پوری	نذیرؔ فتح پوری	۱۴	۲۰۱۲ء
۳۸)	دیوان نذیرؔ فتح پوری	نذیرؔ فتح پوری	۱۷	۲۰۱۲ء
۳۹)	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۱۰۰	۲۰۰۶ء
۴۰)	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۱۱۴	۲۰۰۶ء
۴۱)	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۲۰۶	۲۰۰۶ء
۴۲)	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۲۱۰	۲۰۰۶ء
۴۳)	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۲۱۲	۲۰۰۶ء
۴۴)	نذیرؔ فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۲۱۸	۲۰۰۶ء
۴۵)	نذیرؔ فتح پوری،خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ڈاکٹر حسن آرا	۳۷	۲۰۱۱ء
۴۶)	غزل اندر غزل	نذیرؔ فتح پوری	۱۱	۱۹۸۸ء

۴۷)	غزل اندر غزل	نذیؔر فتح پوری	۱۴	۱۹۸۸ء
۴۸)	غزل اندر غزل	نذیؔر فتح پوری	۱۴	۱۹۸۸ء
۴۹)	غزل اندر غزل	نذیؔر فتح پوری	۱۹	۱۹۸۸ء
۵۰)	غزل اندر غزل	نذیؔر فتح پوری	۲۰	۱۹۸۸ء
۵۱)	غزل اندر غزل	نذیؔر فتح پوری	۲۳	۱۹۸۸ء
۵۲)	محبوبؔ ونذیؔر- فنکاروبے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہؔی	۱۲۹	۲۰۱۳ء
۵۳)	نذیؔر فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۱۳۱	۲۰۰۶ء
۵۴)	اکرام	نذیؔر فتح پوری/محبوب راہؔی	۳	۱۹۹۸ء
۵۵)	نذیؔر فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۷۲	۲۰۰۶ء
۵۶)	نذیؔر فتح پوری-شخص،شاعرومدیر	رفیق جعفر	۷۳	۲۰۰۶ء
۵۷)	نذیؔر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۴۷	۲۰۱۳ء
۵۸)	نذیؔر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۴۷	۲۰۱۳ء
۵۹)	یہ زمین میری ہے	نذیؔر فتح پوری	۲۶	۲۰۰۳ء
۶۰)	یہ زمین میری ہے	نذیؔر فتح پوری	۹	۲۰۰۳ء
۶۱)	نظمِ سفر	نذیؔر فتح پوری	۱۰/۹	۲۰۱۴ء
۶۲)	بچو آؤ گیت سنائیں	نذیؔر فتح پوری	۶	۱۹۸۷ء
۶۳)	بچو آؤ گیت سنائیں	نذیؔر فتح پوری	۵	۱۹۸۷ء
۶۴)	اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۳۷	۱۹۷۷ء
۶۵)	تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی	۳۸	۲۰۰۹ء
۶۶)	جوابِ زہر خند	نذیؔر فتح پوری	۳۶	۲۰۱۱ء
۶۷)	جوابِ زہر خند	نذیؔر فتح پوری	۱۹	۲۰۱۱ء
۶۸)	سہ ماہی-اسباق،پونہ	-	۵۸	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۶۹)	سہ ماہی-اسباق،پونہ	-	۵۹	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۷۰)	ماہنامہ-رنگ وبو،حیدرآباد	-	۴	اکتوبر ۲۰۱۱ء
۷۱)	یہ زمین میری ہے	نذیؔر فتح پوری	۹۶	۲۰۰۳ء

۷۲)	یہ زمین میری ہے	نذیرؔ فتح پوری	۹۶	۲۰۰۳ء
۷۳)	ریگِ رواں	نذیرؔ فتح پوری	۱۳	۱۹۹۷ء
۷۴)	ڈاکٹر وِدّیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ	نذیرؔ فتح پوری	۲۵	۲۰۰۸ء
۷۵)	ریگِ رواں	نذیرؔ فتح پوری	۱۰	۱۹۹۷ء
۷۶)	ریگِ رواں	نذیرؔ فتح پوری	۹	۱۹۹۷ء
۷۷)	ریگِ رواں	نذیرؔ فتح پوری	۱۲	۱۹۹۷ء
۷۸)	ریگِ رواں	نذیرؔ فتح پوری	پس پشت	۱۹۹۷ء
۷۹)	ریگِ رواں	نذیرؔ فتح پوری	پس پشت	۱۹۹۷ء
۸۰)	نذیرؔ فتح پوری، خواتینِ اہل قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آرا	۹۰	۲۰۱۱ء
۸۱)	یہ زمین میری ہے	نذیرؔ فتح پوری	۹	۲۰۰۳ء
۸۲)	نذیرؔ فتح پوری - ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۷۰	۲۰۱۳ء
۸۳)	نذیرؔ فتح پوری - شخص، شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۲۹	۲۰۰۶ء
۸۴)	نذیرؔ فتح پوری - شخص، شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۳۰	۲۰۰۶ء
۸۵)	نذیرؔ فتح پوری کی ادبی فتوحات	ڈاکٹر صفی سیرونجی	۷۲	۲۰۱۴ء
۸۶)	تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی	۲۳۰	۲۰۰۹ء
۸۷)	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۴۱۶	۲۰۰۴ء
۸۸)	نذیرؔ فتح پوری نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانی	۱۸	۲۰۰۹ء
۸۹)	نوائے اردو	فریدہ بانو	۲۳۰	۲۰۰۷ء
۹۰)	نذیرؔ فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۵	۲۰۰۸ء
۹۱)	نذیرؔ فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۰۵	۲۰۰۸ء
۹۲)	نذیرؔ فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۵۹	۲۰۰۸ء
۹۳)	میرے گیت اکیلے رہ گئے	نذیرؔ فتح پوری	۱۴	۲۰۰۴ء
۹۴)	نذیرؔ فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۱	۲۰۰۸ء
۹۵)	میرے گیت اکیلے رہ گئے	نذیرؔ فتح پوری	۹	۲۰۰۴ء
۹۶)	میرے گیت اکیلے رہ گئے	نذیرؔ فتح پوری	۱۲/۱۱	۲۰۰۴ء

۹۷) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۵	۲۰۰۸ء
۹۸) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۲	۲۰۰۸ء
۹۹) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۷	۲۰۰۸ء
۱۰۰) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۰۶	۲۰۰۸ء
۱۰۱) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۲۲	۲۰۰۸ء
۱۰۲) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۳۰	۲۰۰۸ء
۱۰۳) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۴۱	۲۰۰۸ء
۱۰۴) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۶۰	۲۰۰۸ء
۱۰۵) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۶۹	۲۰۰۸ء
۱۰۶) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۸۲	۲۰۰۸ء
۱۰۷) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۴۶	۲۰۰۸ء
۱۰۸ نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۷۸	۲۰۰۸ء
۱۰۹) نذیر فتح پوری - نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۸۰	۲۰۰۸ء
۱۱۰) نذیر فتح پوری خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آرا	۱۳۰	۲۰۱۱ء
۱۱۱) نذیر فتح پوری خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آرا	۱۳۱	۲۰۱۱ء
۱۱۲) نذیر فتح پوری خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آرا	۱۳۹	۲۰۱۱ء
۱۱۳) نظم سفر	نذیر فتح پوری	۱۱۵	۲۰۱۴ء
۱۱۴) نظم سفر	نذیر فتح پوری	۱۱۵	۲۰۱۴ء
۱۱۵) نذیر فتح پوری - شخص، شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۴۷	۲۰۰۶ء
۱۱۶) یہ زمین میری ہے	نذیر فتح پوری	۱۱۰	۲۰۰۳ء
۱۱۷) یہ زمین میری ہے	نذیر فتح پوری	۱۰	۲۰۰۳ء
۱۱۸) یہ زمین میری ہے	نذیر فتح پوری	۸۴	۲۰۰۳ء
۱۱۹) یہ زمین میری ہے	نذیر فتح پوری	۹	۲۰۰۳ء
۱۲۰) نذیر فتح پوری - شخص، شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۳۸	۲۰۰۶ء

☆☆☆

باب چہارم

نذیر فتح پوری بحیثیت نثر نگار

نذیرؔ بحیثیت ناول نگار

اُردو میں ناول کی ابتداء ڈپٹی نذیرؔ احمد نے ۱۸۶۹ء میں 'مراۃ العروس' لکھ کر کی۔ ۱۹ رویں صدی کے ناول نگاروں میں پنڈت رتن ناتھ سر شار، عبدالحلیم شرر، منشی سجّاد حسین، مرزا محمد ہادی رسواؔ، راشد الخیری اور پریم چند وغیرہ کے نام خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی شروعات میں جنگِ آزادی اپنے دورِعروج پر تھی اسی دوران ترقی پسند تحریک کے پرچم تلے ادیبوں نے اپنے ناولوں میں ملک کے بدتر حالات کی نشاندہی کی، ان ناول نگاروں میں قاضی عبدالغفار، سجّاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، عبداللہ حسین، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی، جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، اور انتظار حسین وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

راجستھان کے موجودہ ناول نگاروں میں ڈاکٹر ثروت خان، جناب حبیب کیفی، جناب احمد رشید خان اور ڈاکٹر عمر جہاں، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں نذیرؔ فتح پوری کا نام بھی شامل ہے۔ ۱۹۷۵ء میں نذیرؔ فتح پوری نے اپنا پہلا ناول ''چٹانوں کے بیچ'' تحریر کیا اور اسی کے ساتھ وہ ناول نگاروں کی صف میں شامل ہوئے۔ یہ ان کی پہلی نثری تصنیف تھی جو شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی، حالانکہ انہوں نے پہلے شاعری کی دنیا میں قدم رکھا تھا، لیکن شعری مجموعے سے پہلے ان کی نثری تصنیف شائع ہوئی۔

''چٹانوں کے بیچ'' انکا پہلا ناول ہے جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ناول ''زخم اور آہیں'' ۱۹۷۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ''زخم اور آہیں' کے بعد انہوں نے دو ناول ''چلتے چلتے'' اور ''کرن کا پیار'' بھی تحریر کیے مگر وہ زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکے۔

''چٹانوں کے بیچ'' اس ناول کا موضوع، راجپوت معاشرے سے لیا گیا ہے۔ راجپوت جس آن بان اور شان کے لیے مشہور ہیں وہی شان وشوکت اس ناول میں موجود ہے۔ ناول کا ہیرو امر سنگھ اور ہیروئن رجنی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور اپنی پاک محبت کو شادی کے پاک رشتے میں باندھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اس کے برعکس کچھ ایسا ہوتا ہے جس میں دونوں کی زندگیاں برباد ہو کر موت کے بھیانک انجام تک پہنچ جاتی ہیں۔

راجپوتوں کی یہ خوبی کہ ''پران جائے پر بچن نہ جائے، یہ بات اس محبت کی جدائی کی وجہ بنتی ہے کیوں کہ رجنی کے بھائی گلاب سنگھ اس کی شادی رگھوناتھ کے بھائی ہردیال سے طیہ کر دیتا ہے اور ہردیال یہ بات جانتا ہے کہ رجنی امر سے محبت کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے ہردیال امر سے بدلہ لینے کی خاطر اسے مار دینا چاہتا ہے پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، میلے میں لاٹھی کے مقابلے میں ہردیال امر کو مارنے کے مقصد سے میدان میں اترتا ہے اور خود ہی امر کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اور امر کو بیس ۲۰ سال کی قید بہ مشقت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد رجنی کا بیاہ ہردیال کے بھائی رگھوناتھ سے کر دیا جاتا ہے، بے چاری رجنی اپنے خاندان کی عزت کی خاطر اپنے ارمانوں کی قربانی دیتی ہے اور رگھوناتھ سے شادی کر لیتی ہے، پر اس شادی کے بوجھ کو زیادہ دنوں تک نہیں ڈھو پاتی اور ایک بچّی کو جنم دے کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔

بیس ۲۰ رسال بعد جب امر کی سزا پوری ہو جاتی ہے تو وہ اپنی محبوبہ رجنی سے ملنے کی خاطر اپنے گاؤں ہری منڈی آتا ہے۔ لیکن وہاں اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ وہ ہر جگہ رجنی کو تلاشتا ہے لیکن وہ بھی اسے نہیں ملتی، آخر میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ رجنی اب اس دنیا میں نہیں رہی، یہ خبر سن کر وہ بدحواس ہو جاتا ہے اور وہیں جا کر اپنی جان دے دیتا ہے جہاں دونوں نے مل کر اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور جہاں رجنی نے اپنی موت کے بعد اپنی

چتا جلانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

پورا ناول پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ نذیرؔ نے فنی چابکدستی سے ماضی اور حال کی کڑیوں کو جوڑ دیا ہے۔ جہاں جہاں امر اپنے ماضی کی یادوں سے نکل کر اپنی حال کی دنیا میں آتا ہے اس کے لئے وہ لمحہ بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ نذیرؔ ایک ہی جملے میں ان دونوں زمانوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ ناول کی ابتداء جیل میں امر سنگھ اسمٰعیل چاچا اور رنجیت کے درمیانی گفتگو سے ہوتی ہے اور خاتمہ امر سنگھ کی موت اور اس کے بعد امر اور رجنی کی روحوں کے پاک ملن سے ہوتا ہے، لیکن ان دونوں واقعوں کے درمیانی وقفہ میں ان تمام حادثوں کا ذکر کیا گیا جو امر سنگھ کی زندگی میں پیش آتے گئے ہیں۔ ناول کا پلاٹ چست اور گٹھا ہوا ہے، ابتداء میں دھیما پن ضرور ہے لیکن اس کے بعد کے واقعات ایک دوسرے میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ناول کی کردار نگاری پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نذیرؔ نے کرداروں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتی ہے۔ ویسے تو اس ناول کے خاص کردار امر، رجنی، اور ہردیال ہیں پر ان کے علاوہ امر کا دوست سلیمان رجنی کا بھائی گلاب سنگھ اور اس کی سہیلیاں رکما، درگا، زبیدہ، گلاب سنگھ کا دوست رگھوناتھ، راموموچی اور اس کی بیٹی رکمنی، اسمٰعیل چاچا اور رنجیت یہ سب جیتے جاگتے کردار ہیں اور ہر کردار اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ابھر کر آتا ہے اور اپنی خاصیت کے ساتھ ناول میں جگہ بناتا ہے۔

جس طرح نذیرؔ نے کرداروں کے انتخاب میں احتیاط برتی ہے اسی طرح مکالمہ نگاری پر بھی بہت دھیان دیا ہے اور الفاظ کے انتخاب سے جملوں کی شان بڑھائی ہے، کرداروں کے ذریعہ موقع محل کے لحاظ سے مکالموں کی ادائیگی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جملوں کی ادائیگی میں زبان بھی سادہ اور دلکش استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً جب رجنی امر سے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے تو اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ قاری کے دل میں پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہاں اسمٰعیل چاچا اور رنجیت امر سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں تو دل بھر آتا ہے۔ ناول میں منظر نگاری بھی بہترین انداز سے کی گئی ہے، جب ہم کسی منظر کو پڑھتے ہیں تو پورا کا پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ جب ہردیال اور امر مقابلے کے لیے میدان میں اتر رہے ہوتے ہیں اس وقت کا پورا نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے۔ ناول کی ان خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب عزیز قیصری نذیرؔ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ یہ الفاظ انہوں نے گیارہ جنوری ۱۹۷۵ء کو تحریر کیے تھے۔

> ''چٹانوں کے بیچ'' ان کی پہلی کتابی کوشش ہے، جس کے سرسری جائزے سے بھی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے
> کہ مصنف دورِ حاضر کے رجحانات سے واقف ہیں، کہانی کے پلاٹ میں ربط پایا جاتا ہے۔ کردار اپنی جگہ
> موزوں ہیں۔ اور جہاں مکالمہ ہے اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ادائیگی کا حق حسن وخوبی سے کیا گیا ہے۔''(۱)

مذکورہ ناول میں ذات پات کے مسئلہ کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اپنے آپ کو اونچی ذات کا مان کر کسی پر ظلم کرنا کہاں کا انصاف ہے راموچمار اور اس کی بیٹی رکمنی کے ذریعہ اسی برائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جہاں رامو کے چمار ہونے کے سبب اسے نیچ ذات کا سمجھا جاتا ہے اور ہردیال اس کی بیٹی کی آبروریزی کرتا ہے اور اسے اتنا بھی حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنی بیٹی کی عزت بچاسکے، یا اس کے لیے زیادکر سکے۔ یہ ایک جذباتی ناول ہے اسی لیے نذیرؔ نے اس کا انتساب ایک ایسے شخص کے نام کیا ہے جو فلمی دنیا میں ''ٹریجڈی کنگ'' کے نام سے جانے جاتے ہیں، انتساب کی عبارت۔ ''شہنشاہِ جذبات دلیپ کمار کے نام'' (چٹانوں کے بیچ۔ص۳)

اس ناول کے عنوان پر غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ کہانی کے لحاظ سے اس سے بہترین اور کوئی دوسرا عنوان ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ ہیرو ہیروئن کی پہلی ملاقات ہری مندر کے باہر چٹانوں کے بیچ میں ہوتی ہے، وہیں وہ ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی جگہ رجنی امر

کو مقابلے کے لیے جاتے وقت اس کی آرتی کر کے فتح کی دعا کرتی ہے، پھر اپنی موت کے بعد رجنی انہیں چٹانوں کے بیچ آخری سفر پر روانہ ہو جاتی ہے، اور پھر جب امر کو رجنی کی موت کی خبر ملتی ہے تو وہ بھی انہیں چٹانوں کے بیچ کود کر اپنی جان دے دیتا ہے اور اس کی لاش کو بھی وہیں نذر آتش کر دیا جاتا ہے اس طرح دونوں جیتے جی تو نہیں مل سکے لیکن موت کے بعد اسی جگہ ایک ہو گئے، جہاں ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کر کے محبت کے رشتے میں بندھے تھے۔ دلدار ہاشمی اس ناول کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

''اس ناول میں ناول نگار نے زندگی کی نئی اور پرانی بنتی اور مٹتی قدروں پر انتہائی بیداری اور چابکدستی سے قلم اٹھایا ہے جہاں جہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی انسیت کا ذکر آتا ہے قاری کو تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔''(۲)

آگے ناول کی تکنیکی خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ۔

''ناول کے ابتدائی حصہ میں دھیما پن ضرور ہے مگر واقعات کے تسلسل نے اس میں خوبصورتی دلکشی اور کشش پیدا کر دی ہے جہاں ایک کڑی ٹوٹتی ہے وہاں فوراً ہی دوسری جڑ جاتی ہے اور قاری کی یکسوئی اور دلچسپی میں فرق نہیں پڑتا۔''(۳)

اس ناول کی ایک اہم خوبی قومی یکجہتی ہے جو ہندوستانی معاشرے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس کی ہندوستانیوں کو شدید ضرورت ہے، مختلف مذاہب میں عقیدت رکھنے والے لوگ تبھی مل جُل کر رہ سکتے ہیں جب ایک دوسرے کے مذہب کے لیے دلوں میں احترام ہو اور آپس میں دلوں میں پیار ہو، اس ناول میں اس بات کا بار بار احساس دلایا گیا ہے۔ جناب جلیس سہسوانی اس ناول کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''چٹانوں کے بیچ'' ان کا ایسا فن پارہ ہے جس کی کہانی راجپوتانہ آن، اور راجپوتانہ شان کے اردگرد گھومتی ہے۔ اور نذؔیر کے حسّاس دل کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے یہ مقبول کہانی دو مقدس اور محبت بھرے دلوں کی کہانی کے ساتھ۔ ساتھ نذؔیر کے دل کی عکاس بھی ہے لیکن انفرادیت کے ساتھ۔''(۴)

ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیفی سرونجی کی رائے ہے کہ۔

''ناول کو پڑھ کر ان کی ناول نگاری کی فنی مہارت کا پتا چلتا ہے، نذؔیر فتح پوری کو ناول لکھنے کے فن میں اور کہانی کے تسلسل کو قائم رکھنے میں اس کی فنی تکنیک کو برقرار رکھنے میں کمال حاصل ہے، ناول کا پلاٹ کیا ہونا چاہیے کیسا ہونا چاہیے، یہ ناول کے کرداروں سے پتہ چلتا ہے سماج میں ہونے والی ناانصافیوں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے کردار اس ناول میں دکھائی دیں گے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آخر تک کہانی قاری کو اپنی طرف نہ صرف متوجہ رکھتی ہے بلکہ پوری طرح باندھے رکھتی ہے۔''(۵)

''زخم اور آہیں''

نذؔیر فتح پوری کا دوسرا ناول ''زخم اور آہیں'' کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک رومانی اور بے حد جذباتی ناول ہے ناول کا انتساب کچھ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ قاری ناول کو پڑھنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔

’’اُس بے وفا لڑکی کے نام جس نے محبت پر دولت کو ترجیح دی‘‘

(زخم اور آہیں۔ص ۵)

ناول کا قصہ ایک خوبصورت محبت بھری داستان ہے لیکن اس کا انجام بہت بھیانک اور دل دہلانے والا ہے جہاں عارف، شہہ نظر سے محبت کرتا ہے اس کے ساتھ اپنے مستقبل کے سنہرے خواب سجاتا ہے، لیکن ہوتا کچھ اور ہی ہے اور شہ نظر دولت کے لالچ میں آکر عارف کو ٹھکرا دیتی ہے اور ایک امیر لڑکے اشفاق سے شادی کر لیتی ہے اور اپنے محبوب کو تنہائی کی آگ میں جھونک دیتی ہے عارف اپنی ناکام محبت کو ہی اپنا مقدر سمجھ لیتا ہے اور پھر کبھی کسی اور لڑکی کو اپنی زندگی میں وہ مقام نہیں دے پاتا جو اس نے شہ نظر کو دیا تھا۔ یہاں تک کہ محبت سے اس کا بھروسہ ہی اُٹھ جاتا ہے، اُسے شبانہ سچی محبت دینا چاہتی ہے اور دل و جان سے چاہنے لگتی ہے تو وہ اس پر بھی یقین نہیں کرتا اور ناول کے آخر میں اس کی محبت ٹھکرا کر چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی پہلی محبت اور اس کے انجام سے آج تک باہر نہیں آپایا تھا۔ ادھر شہ نظر کا انجام بھی بہت بھیانک ہوتا ہے وہ دولت کے لالچ میں جس لڑکے سے شادی کرتی ہے وہ نہایت آوارہ اور مکار قسم کا شخص تھا، شراب، جوا، اور طوائفوں کے کوٹھوں کو آباد کرنے والا، وہ شہہ نظر پر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور جس وقت شہ نظر کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اسی وقت وہ اُسے درد سے کراہتا ہوا چھوڑ جاتا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ دلکش اور مربوط ہے۔ اس کی شروعات دو دوستوں عارف اور نندلال کی ملاقات سے ہوتی ہے اور خاتمہ عارف کے شبانہ کو چھوڑ کر چلے جانے کے ساتھ ان دونوں حادثوں کے درمیان ہی پوری کہانی لکھی گئی ہے، ناول کا ہیرو اپنی داستانِ عشق شبانہ کو ایک بیاض کی شکل میں دیتا ہے، وہ اسے پڑھتی ہے اور انہیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کہانی میں ایک اور کہانی شروع ہوگئی ہو لیکن اس کے باوجود واقعات میں تسلسل ہے اور کہیں جھول جھال نظر نہیں آتا۔

ناول کی کردار نگاری پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر کردار ناول میں ہیرے کی مانند معلوم ہوتا ہے۔ تنویر عرف عارف، مہر عرف شہ نظر، نجمہ، رشید، شبانہ، نندلال، عارف کی امی اور بھائی، شہ نظر کے والدین، نجمہ کے والدین اور اس کا خالہ زاد بھائی، اشفاق یہ سبھی کردار اصل زندگی میں جیتے، جاگتے معلوم ہوتے ہیں اور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ناول میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ کردار نگاری کے ساتھ ساتھ مکالمہ نگاری بھی کمال کی ہے کرداروں کے مکالمے ان کے دلی جذبات کی حالت اور کیفیت کو قاری کے ذہنوں میں پیوست کر دیتے ہیں، مکالموں کی ادائیگی کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے کے بعد ایک عرصے تک اس احساس سے الگ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جب عارف شہ نظر سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے یا شبانہ، عارف کو اپنی بیتی زندگی کے پلوں سے آشنا کرواتی ہے، جب عارف اپنے دوست نندلال سے محبت اور اپنائیت بھرے لہجے میں گفتگو کرتا ہے تو اس وقت قاری اس گفتگو کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہے۔ ناول میں منظر نگاری بھی بہترین انداز کی ہے اور ہر منظر پھر چاہے وہ عارف کا کمرہ ہو یا باغ کا منظر اسے اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ پورا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ یہ ناول عشق کی ناکامی کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی کا پیغام بھی سناتا ہے، عارف اور نندلال دونوں مختلف مذہب میں عقیدہ رکھتے ہیں، اس لیے دونوں کی دلی محبت قومی یکجہتی کا پیغام دیتی ہے۔ مثلاً۔

> ’’میری کوئی ذات نہیں پیارے! تیری کوئی ذات نہیں، دنیا میں کسی کی کوئی ذات نہیں، سب ایک ہی مٹی سے بنے ہوئے ہیں، بھلا مٹی کی بھی کوئی ذات ہوتی ہے؟ جب مٹی کی کوئی ذات نہیں تو پھر اس مٹی سے بنائے گئے آدم زاد کو الگ دھرموں اور جد اجد اذاتوں میں کیوں تقسیم کیا جاتا ہے؟ نندلال نے گہرائی میں ڈوب کر کہا۔‘‘(۶)

یہ ایک اصلاحی ناول بھی ہے، اور زندگی کے کچھ خاص پہلوؤں پر قاری کی توجہ مرکوز کرتا ہے مثلاً عارف کی پاک محبت، شہ نظر کا لالچی ذہن، نجمہ کے بدلے کی آگ اور اشفاق کی عیاش زندگی۔ یہ سب معاشرے کے وہ جیتے جاگتے نمونے ہیں جو ہمیں اس ناول کے باہر بھی نظر آتے ہیں اس ضمن میں نذیرؔ فرماتے ہیں۔

''یہ زمین کی کہانی ہے، آج کے سماج کی کہانی ہے، دھرتی کے سینے پر رینگنے والے آدمیوں کی روئیداد ہے۔ دنیا میں بڑھتی ہوئی آزادی اور عریانیت کا نوحہ ہے۔ میں تو کہوں گا کہ یہ آپ کی کہانی ہے یہ میری کہانی ہے۔ اس کہانی کے تمام کردار آپ میں اور ہم میں موجود ہیں۔ ہمارے دوش بدوش چلتے پھرتے ہیں۔ مگر ہم انہیں پہچان نہیں سکتے۔ فرض کرو پہچان بھی لیں تو اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیتے ہیں کیوں کہ جو ہمارے سامنے ہوتا ہے وہ ہمارے ہی چہرے کا عکس ہوتا ہے اور اپنا جرم قبول کرنے کی ہمت ہم میں کہاں۔'' (۷)

یہ بیان ناول نگار کا ایک ایسا سچ ہے جس سے ہم اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ جناب جلیس سہسوانی نذیرؔ کو ان الفاظ میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

''نذیرؔ صاحب کا دوسرا زیرِ نظر ناول ''زخم اور آہیں'' ہے، پتھر دلوں کو پگھلا کر لوحِ گیتی پر بکھر جانے والی آہیں! تشکیک نہیں کہ مذکورہ ناول (چٹانوں کے بیچ) سے کہیں صاف ستھرا ہے۔ دلکش اور جاذب نظر آتا ہے، پلاٹ کے اعتبار سے بھی آفادی پہلو کا حامل نظر آتا ہے۔ اس میں نذیرؔ کی شخصیت ہی نہیں، جدتِ فن اور ندرتِ فطرت کو بھرپور طور پر اُبھرنے کے موقع فراہم ہوئے ہیں، اس لیے یقین ہے کہ ان کا یہ ناول بے حد مقبول ہوگا۔'' (۸)

ویسے تو اس ناول کے سبھی کردار نذیرؔ کے دل کے بہت قریب ہیں لیکن اس میں موجود ایک کردار ''شبانہ'' کے بارے میں وہ اپنے احساس کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

''شبانہ میرا آئیڈیل ہے اس نام سے مجھے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ میرے پہلے افسانے کی ہیروئن کا نام بھی شبانہ تھا۔ ''زخم اور آہیں'' کا یہ کردار آپ کو بے حد متاثر کرے گا کیوں کہ اس کردار کو میں نے دل کی گہرائیوں سے تخلیق کیا ہے۔ اور جو چیز دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے وہ یقیناً دلوں پر نقش چھوڑ جاتی ہے۔'' (۹)

ان تمام خوبیوں کے ساتھ یہ ناول منظر عام پر آیا اور اس نے خاطر خواہ پذیرائی حاصل کی، اس ناول کو اردو ناول کے سرمایہ میں ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ نذیرؔ کے دونوں شائع شدہ ناولوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ادے سرن ارمان اپنے ایک خط میں نذیرؔ کو اسی انداز میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

''چٹانوں کے بیچ'' جو آپ کا سب سے پہلا ناول ہے تھیم کے لحاظ سے بہت اچھا ناول ہے۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے نہایت کامیابی کے ساتھ لکھا ہے۔ شاعر نثار کم ہوتے ہیں اور اچھے شاعر اچھے نثار ہوں یہ بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے، رب العالمین نے آپ کو یہ دونوں صفات عطا فرمائی ہیں ایسے معیاری اور اصلاحی ناول کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایسے ناولوں پر فلمیں بنے اور سرکار انعام سے نوازے تو دیش کی کایا پلٹ ہو جائے۔ مگر افسوس ہمارے ملک میں قدرداں ہی نہیں ہیں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب سیاست کی ساحری سے متاثر ہو کر

ہو رہا ہے۔''(۱۰)

حالانکہ نذیر کے چار ناولوں میں سے دو ہی ناول شائع ہوئے ہیں۔ باقی کے دو۔ چلتے چلتے اور کرن کا پیار چند وجوہات کے سبب شائع ہو کر قارئین تک نہیں پہنچ پائے۔ لیکن راقمہ کو ناول چلتے چلتے کے غیر مطبوعہ مسودہ کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے اس لیے اس ناول پر بھی اظہار خیال کا موقع میسر آ گیا۔ ذیل میں ''چلتے چلتے'' ناول کا اختصار میں جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

''چلتے چلتے''

ناول ''چلتے چلتے'' اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے بہترین ناول ہے۔ جس میں کئی کردار مثلاً نواب حسن جمال، بیگم جمال، ان کے تین بچے، امجد، شمیم آرا، نسیم آراء، شکیل، نعیم، مضطر دہلوی، دو بدمعاش شا کا اور سوفی، روپا انیل، دینا ناتھ، ایک اجنبی لڑکی، ٹیکسی ڈرائیور، وغیرہ شامل ہیں، اس کے علاوہ کچھ ایک کردار اور ہیں جو اپنا مختصر رول ادا کرنے کے بعد دوبارہ دکھائی نہیں دیتے۔ قصہ جنتا ایکسپریس کے ایک کمپارڈمیٹ سے شروع ہوتا ہے اور وہیں یہ سارے کردار ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ شمیم آراء شکیل کی موت کے بعد بیوگی کا کرب جھیل رہی ہے۔ اس کی دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے، لیکن اس اندھیرے کو اُجالے میں تبدیل کرنے کے لیے خدا نعیم کو بھیج دیتا ہے، جو شمیم آراء کی ایک ہی جھلک پا کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے، فسادیوں نے نفرت کی آگ میں شکیل کو جھونک دیا تھا۔ شمیم آرا، اس حادثہ کو نہیں بھول پائی اور اپنی محبت کی موت کے غم میں ڈوب کر اسی کو اپنا مقدر بنا بیٹھی۔ ادھر نعیم بھی دینا ناتھ کی نفرت کا شکار ہو کر غریب الوطنی کا کرب جھیلنے پر مجبور ہو گیا۔ دینا ناتھ نے اپنے دل کی نفرت گاؤں والوں کے دل میں انڈیل دی اور نعیم کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کیوں کہ گاؤں والوں نے اس کے اور اس کی منہ بولی بہن روپا کے پاک رشتے پر انگلیاں اٹھائی تھیں۔ روپا کی عزت کی خاطر اس نے گاؤں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔ اس نے گاؤں چھوڑ کر ممبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ ٹرین میں اس کی ملاقات مضطر دہلوی سے ہوئی جو شاعر تھے اور وقت اور حالات کے مارے اور بیروزگاری سے ہارے تھے۔ وہ بھی اپنے عزیز دوست کے بلاوے پر تلاش معاش کے سلسلے میں ممبئی جا رہے تھے۔ لیکن یہاں آ کر بھی انہیں دربدری کا شکار ہونا پڑا۔ اور اسی اثناء میں ان کی معصوم بیٹی ملیریا کی شکار ہو کر راہی ملک عدم ہو گئی، ادھر نعیم، شمیم آراء کو شا کا اور سوفی جیسے خونخوار غنڈوں سے بچاتا ہے اور اسی نسبت سے نواب صاحب اور امجد اسے اپنی دوکان پر ملازم رکھ لیتے ہیں، اور اپنی حویلی کے بیرونی حصے میں اس کی رہائش کے لیے انتظام بھی کر دیتے ہیں۔ نعیم کی نیک سیرت اور شمیم آراء کے لیے اس کی محبت کو امجد محسوس کر لیتا ہے اور اسے اپنی بہن کے غموں کا مداواہ جان کر اس کا نکاح اپنی بہن سے کروانا چاہتا ہے۔ آخر کار امجد کی محنت رنگ لاتی ہے۔ اور اس کے والدین شمیم کا عقد ثانی نعیم سے کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ناول کا آدھا حصہ فلیش بیک کی تکنیک پر منحصر ہے۔ اس ناول میں محبت کے پاکیزہ جذبات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے مسائل مثلاً فرقہ وارانہ فساد سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی، غریبی اور بے روزگاری، مکر و فریب اور جالسازی، چند روپیوں کے لیے لوگوں کے بکتے ہوئے ایمان، لوگوں کے دل سے ختم ہوتی جا رہی اپنائیت و محبت، وغیرہ جیسے موضوعات پیش کئے گئے ہیں۔ اس ناول کے تمام کردار الگ الگ جگہوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ممبئی کے ریلوے اسٹیشن پر آتے ہی سارے کردار ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں

ناول کے تمام کردار دل کو چھونے والے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والے ہیں، اس ناول کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں بھی نذیر نے اپنے محبوب کردار ''شبانہ'' کو جگہ دی ہے حالانکہ شبانہ نام کا کوئی کردار اس ناول میں نہیں ہے البتہ شمیم آراء ہی اس وقت شبانہ بن

جاتی ہے جب نعیم شمیم آراء تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے ''شبانہ کے نام'' عنوان سے نظمیں لکھتا ہے۔ منظر نگاری کے اعتبار سے بھی ناول مکمل اور بھرپور اور مکالمے بھی موقع ومحل کے لحاظ سے پورے اترتے ہیں، مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول اپنے موضوع اور عنوان کے لحاظ سے ایک قابل ذکر ناول ہے اور فنی لحاظ سے اردو ناول نگاری کے سرمائے میں اضافے کی حیثیت کا حامل ہے۔

خلاصہ

نذیر فتح پوری کے تینوں ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار قومی یکجہتی کا علم بردار ہے وہ سماج کے سارے مذاہب کے ماننے والوں کو دوش بدوش لے کر چلتا ہے۔ تین ناولوں میں اس قسم کے نظارے قارئین کو دیکھنے کو ملتے ہیں اس سے نذیر فتح پوری کی ذہنی فکر اور انسانیت کے لیے ان کی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ باتیں مثبت سوچ کی حامل ہیں۔ اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناول نگار بڑے ذہن کا مالک ہے، وہ انسانیت کے ساتھ ساتھ اپنے ملک سے بھی محبت کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ سارے انسان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور اپنائیت سے پیش آئیں۔

دوسری بات جو نذیر کے ناولوں کی کہانی کی بنیاد ہے وہ ہے ''محبت'' اگر چہ یہ اردو ناولوں کا روایتی موضوع ہے، لیکن اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ محبت کسی بھی روپ میں ہو اہم ہوتی ہے۔ دوسری طرف یوں بھی لگتا ہے کہ ناول نگار نے محبت کرنے والے اپنے کرداروں میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہو۔ ناول نگار ان کرداروں کی زبانی اپنا درد بیان کررہا ہو۔ دنیا کے سامنے اپنے جذبات پیش کررہا ہو۔ کہانی ہو یا افسانہ، ناول ہو یا شاعری، لکھنے والا جب تک ان میں اپنا خون جگر شامل نہیں کرتا تب تک اس کے تخلیقی فن پارے عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کرسکتے۔ نذیر فتح پوری کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ انہیں ادب کے ہر مقام پر خاص وعام کی طرف سے قبولیت کی سند ملی ہے، نذیر نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ وہ خود کے لئے لکھتے ہیں یا عوام کے لیے۔ لیکن ان کے تمام فن پاروں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کا لکھا جتنا خود کے لیے ہوتا ہے اتنا ہی عوام کے لئے بھی ہوتا ہے۔ نذیر کی تحریریں ایسا آئینہ ہے جس میں بے شمار لوگ اپنا عکس دیکھ سکتے ہیں یہی خوبی ان کے ناولوں میں بھی نظر آتی ہے۔ اگر وہ کثرت سے ناول نگاری کے فن کو اپناتے تو اردو کے مقبول ترین ناول نگاروں میں ان کا شمار ہوتا۔ اس کے باوجود ان کی ناول نگاری کی پذیرائی ہوئی اور انہیں پسند کیا گیا۔ ☆☆☆

نذیر فتح پوری بحیثیت افسانہ نگار

راجستھان کے اردو ادب میں بحیثیت افسانہ نگار بھی نذیر اہمیت کے حامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر روشن اختر کاظمی۔

> ''راجستھان کے افسانہ نگاروں میں نذیر فتح پوری (مدیر اسباق) کا نام بھی قابل توجہ ہے انہوں نے اپنی افسانہ نگاری کا سفر ''خاتونِ مشرق'' سے شروع کیا تھا۔'' (۱۱)

ڈاکٹر روشن صاحبہ نے نذیر کا شمار راجستھان کے افسانہ نگاروں میں کیا ہے جبکہ نذیر کو اس حد میں رکھنا مناسب نہیں۔ ابتداء میں نذیر کے اکثر وبیشتر افسانے ''خاتونِ مشرق'' کے شماروں میں ''شبانہ کے نام'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ ''محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا فرض کا موتی'' خاتونِ مشرق میں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے اپنا یہ افسانہ تحریر کرکے اصلاح کے لیے اپنے استاد عکسی برنی صاحب کو دکھایا۔ انہوں نے افسانہ پڑھ کر بنا کوئی اصلاح کیے ایک نوٹ لکھ کر واپس نذیر کو دے دیا۔ نوٹ کی تحریر کچھ یوں تھی۔

”اگر اسی طرح لکھتے رہے تو ایک دن بہترین ادیب بن جاؤ گے، جس طرح آدمی گاتے گاتے گویا بن جاتا ہے۔“

اپنے استاد کی اس حوصلہ افزائی کو نذیر نے دل کی گہرائیوں میں جذب کر لیا اور ایک کے بعد ایک موضوعات پر افسانے لکھنے شروع کر دیئے۔ ان افسانوں کی اشاعت پر قارئین نے خوب داد سے نوازا۔ نذیر کے افسانوں میں جذبۂ محبت کو مرکزیت حاصل ہے اور انہوں نے معاشرتی موضوعات پر بھی افسانے قلمبند کیے ہیں۔ ان کے افسانوں میں نوجوان لڑکیوں اور خواتین کے مسائل کو پیش کیا گیا، خاتونِ مشرق میں ان کی اشاعت کی یہی وجہ تھی۔ ”خاتونِ مشرق“ کے ذریعہ ان کے افسانوں کو خواتین میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اس سلسلے میں راقمہ نے ایک بار نذیر سے دریافت کرنا چاہا تو انہوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔ ”کہ ایک روز وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر کی طرف سٹی بس سے روانہ ہوئے۔ ان کے پیچھے والی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر تقریباً ۲۰/۲۲ سال رہی ہوگی اس کے ساتھ ایک چھ، سات سال کا بچہ تھا۔ اس عورت نے نذیر سے سوال کیا۔

کیا آپ نذیر فتح پوری ہیں؟

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں“

وہ جواب سن کر بولی کہ ”میں نے خاتونِ مشرق“ میں آپ کے وہ افسانے پڑھے ہیں جو آپ نے ”شبانہ کے نام“ عنوان سے تحریر کیے ہیں۔ وہ آگے کہنے لگی۔

”آپ کا تخلیق کردہ کردار شبانہ بھی بیوہ ہے، میں بھی بیوہ ہوں، اس کی عمر بھی ۲۲ رکے قریب تھی میری عمر بھی اتنی ہی ہے۔ اس کا بھی ایک چھ سات سال کا بیٹا ہے۔ میرا بھی چھ سات سال کا بیٹا ہے۔“

نذیر کی زبانی اس عورت کے حالات سن کر مجھے یہ احساس ہوا کہ ان کے افسانوں کے کردار فرضی اور مصنوعی نہ ہو کر حقیقی ہیں جو اصل زندگی میں باآسانی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

نذیر کے جن افسانوں میں درد و کرب پایا جاتا ہے ایسے افسانوں میں ”گلشن مر کر بھی زندہ ہوگئی“ ”فغاں درویش“ اور ”التجائے دردِ دل“ جیسے افسانے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ نذیر کا کوئی افسانہ جب ”خاتونِ مشرق“ میں شائع ہوتا تو انہیں اور رسالے کے مدیر کو قارئین کی جانب سے کافی خط ملتے۔ ان میں سے ایک خط یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ جو ”خاتونِ مشرق“ میں شائع ہوا تھا۔

”مسٹر نذیر فتح پوری کے نام“

”ایک طویل عرصے سے میں آپ کے افسانے، مضامین اور غزلیں پڑھتی چلی آ رہی ہوں، کتنی دلچسپی سے پڑھتی ہوں اس کا کسی کو کیا علم، میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ یہ شبانہ صاحبہ کون ہے؟ امید ہے کہ آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے۔ ویسے شاید یہ کہانی جھوٹی ہوگی یا مزاحیہ، اور اگر حقیقت ہے تو بڑے رنج والم کی بات ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک افسانہ ”التجائے دردِ دل“ آپ کا لکھا ہوا میری نظروں سے گزرا جس کا ہر لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا اور افسانے کی ہر لائن التجا کر رہی تھی کہ کہاں ہے میری شبانہ؟ وہ کس کونے میں چھپ گئی ہے؟ ”مگر تو سنتی نہیں گیت پیار کے میں تھک گیا تجھ کو پکار پکار کے غزل کا بھی ہر لفظ اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں میں آنسوں آ گئے، خدا جانے دنیا میں کتنے بے درد لوگ رہتے

ہیں، برانہ مانئے میں مجبور انسانوں کے بارے میں کہہ رہی تھی۔ آپ کی غزل ’’شبانہ کے نام‘‘ پڑھنے کے بعد رہا نہ گیا اور آپ کا یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔؟

آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ معلوم کرنے بیٹھ گئی۔ آپ کے افسانوں میں بلا کا جادو ہے، حسن ہے درد ہے، اور قلم میں بے پایاں جان ہے دل میں ایک طوفان اٹھا اور مجھ سے شبانہ کے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔ اور لکھنے بیٹھ گئی، نذؔیر صاحب اگر آپ اس طرح کے افسانے لکھتے رہے تو آپ کی شبانہ ضرور دیوانی ہو جائے گی، جس قدر خوبصورت افسانے اور غزلیں آپ لکھتے ہیں ان کی تعریف کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ لیکن میں آپ کو ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مبارک باد دیتی ہوں۔ نذؔیر صاحب کیا واقعی شبانہ اس پریشانی میں ہے جو آپ نے بیان کی ہے آپ ایسے افسانوں میں اتنا درد کیسے پیوست کرتے ہیں۔ کیا واقعی محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے جو آپ کے افسانوں میں ہوتا ہے۔ آپ کے افسانوں سے نہ جانے کتنی ہی شبانا‌ؤں کا بھلا ہوتا ہوگا اور ہر وقت ان کو آپ کے افسانے پیغامِ الفت دیتے ہونگے۔ آپ کے افسانے آپ کی شبانہ کے زخم دل کے مرحم بن جاتے ہوں گے۔ میں آپ کے خط کا انتظار کروں گی۔ اگر میں آدابِ حدود سے گزر گئی ہوں تو خدارا معاف فرمائیں۔‘‘ (۱۲)

اس خط کی تحریر سے قارئین کا ’’شبانہ‘‘ کے بارے میں جاننے کا تجسس اور نذؔیر کے افسانوں کی مقبولیت دونوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نذؔیر کا ایک اور افسانہ ’’گھر کا بھیدی‘‘ خاتونِ مشرق‘‘ میں شائع ہوا۔ اس افسانے پر قارئین نے خوب اعتراض کیا یہاں تک کہ نذؔیر کو ’’خاتونِ مشرق‘‘ کے مدیر اعلیٰ مولانا عبداللہ فاروقی صاحب اور یوپی کے ایک شہر کے پولس انسپکٹر صاحب نے نذؔیر پر مقدمہ چلانے کی بات کہی، یہ ان کا آخری افسانہ تھا جو خاتون مشرق میں شائع ہوا اس کے بعد نذؔیر کی افسانہ نگاری کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

ایک طویل عرصے کے بعد نذؔیر نے اس سلسلے کو دوبارہ شروع کیا ہے ان کے افسانے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہونے لگے ہیں جن میں سے کچھ کا جائزہ حسب ذیل ہے۔

’’افسانہ نگاری کا دوسرا دور‘‘

افسانہ ’’فن اور سماج‘‘ میں نذؔیر نے ایک فنکار کے درد کو بیان کیا ہے کہ سماج نے ہمیشہ فنکاروں کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور انہیں ہمیشہ خریدنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ فن وہ قیمتی ذخیرہ ہے جسے کسی بھی قیمت پر نہیں خریدہ جا سکتا ہے تصویر ملاحظہ ہو۔

’’سماج کے وہ ٹھیکدار جو دنیا کی ہر چیز کو دولت سے خریدنا چاہتے ہیں۔ میرے فن کو مصلوب کر کے مجھے آپ ہی کی طرح خریدنے آئے تھے کہنے لگے، تم یہ تمام تصویریں ہمیں دیدو، ہم تمہیں منھ مانگی قیمت دیں گے۔‘‘ (۱۳)

لیکن سچا فنکار بھی کہاں اپنے فن کو بیچنے والا ہوتا ہے وہ اپنے فن کو کسی بھی قیمت پر بیچنے کے لیے راضی نہیں ہوتا ہے اور آخر میں فتح کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے۔ اور وہ پوری دنیا کو ایک پیغام بھی دیتا ہے۔

’’میں تو اس وقت سے خاموش ہوں جس دن میرے فن کی آتما مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ مگر آپ میری خاموشی کو توڑنے کے لیے ایسی کنجی کا استعمال کر رہے ہیں جس کا استعمال سماج کے ٹھیکیداروں نے میری زبان مقفل

کرنے کے لئے کیا تھا لیکن انکی سونے کی کنجی میری آواز کو مقفل کرنے میں ناکام رہی تھی آپ کو بھی اس میں کامیابی نہیں ملے گی۔ میرے فن کو نہ وہ لوگ خرید سکتے تھے نہ آپ خرید پائیں گے۔ میں جا رہا ہوں، میرے جانے کے بعد اور دنیا کے ختم ہونے تک، دولت کے سہارے کسی بھی فنکار کو کوئی خریدنے کی کوشش نہ کرے۔ میرا یہ پیغام ساری دنیا تک پہنچا دیں۔''(۱۴)

اس افسانے میں مذہب کے نام پر پھیلی ہوئی منافرت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''مطلب یہ کہ جس کا نام رام ہے وہ ہندو ہے اور جس کا نام رحمٰن ہے وہ مسلمان۔ آج دنیا صرف ناموں کے چکر میں پھنس کر رہ گئی ہے، مندر اور مسجد میں صرف ناموں کی مالا جپی جاتی ہے۔ عدالتوں میں صرف ناموں پر فیصلے سنائے جاتے ہیں۔ دنیا کے بازار میں صرف ناموں پر تجارت ہوتی ہے دنیا کا ہر میلہ صرف نام پہ لگتا ہے۔''(۱۵)

اس افسانے میں مہذب سماج کی غیر مہذب تصویر پیش کی گئی اور ساتھ ہی یہ پیغام دیا گیا ہے کہ کسی سچے فنکار کو خریدنا ناممکن ہے اس کا فن خرید وفروخت کی شے نہیں ہے۔

یہ بھی ایک کہانی ہے'' کے عنوان سے نذیرؔ نے ایک افسانہ تحریر کیا ہے جس میں ایک کہانی کار کہانی لکھنے کے لیے ایک پرسکون جگہ کی تلاش میں پورا دن یہاں وہاں بھٹکتا ہے لیکن آخر تک وہ اسی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے کہ کاش اسے ایسی کوئی جگہ میسر آجائے جہاں بیٹھ کر وہ اپنی کہانی کو انجام تک پہنچا سکے۔ اسی درمیان اُسے ایسے حالات سے سابقہ پڑتا ہے جن سے اسے احساس ہوتا ہے کہ اپنے اندر کے کہانی کار کی وجہ سے اسے کتنا نقصان پہنچا، نہ وہ اپنے مالک کے خلاف اخبار میں سچ چھپواتا اور نہ آج اس کی یہ حالت ہوتی اور نہ گھر میں بیوی بچے بھوکے ہوتے، اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔''

''میں نے ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی اور مالک کا کچا چٹھا اخبار میں چھپوا دیا۔ مالک نے ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ زندگی کا یہ رخ میرے سامنے پہلی بار آیا تھا۔ لاکھوں کا حرجانہ میں کہاں سے بھر پاؤں گا جب مجھے اپنے بے بسی کا احساس ہوا تو میں نے کمپنی کے مالک سے معافی مانگ لی۔ اس نے مجھے اس شرط پر معاف کیا کہ میں نوکری سے استعفیٰ دے دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا، اس اندھے قانون کی بے بسی، اہل زر کی جابرانہ کارستانیاں، سفید کھدر پوش نیتاؤں کے کالے کارناموں کا کچا چٹھا اپنی کہانیوں کے ذریعہ عوام کے سامنے پیش کرنے لگا۔ میں قلم کا غذ اور قارئین کے درمیان الجھ کر رہ گیا۔ دوسری طرف دھیرے دھیرے گھر کی ساری پونجی ختم ہونے لگی۔ جیسے جیسے برے دن میرے قریب آنے لگے کہانی مجھ سے دور جانے لگی، ایک رات جب میرا سارا گھر بھوک سے سو نہیں سکا تو میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ میرے احساس کی چنگاریاں بجھ سی گئیں۔''(۱۶)

یہ افسانہ ایک بے بس کہانی کار اور ظالم سماج کے درمیان پرورش پانے والے انتقام کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ ''کردار کا انتقام'' جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پورا افسانہ ایک ایسے مصنف کے اردگرد گھومتا ہے جس کے تخلیق کردہ کردار اس سے انتقام کی غرض سے اس کے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جن کو افسانہ نگار نے حد درجہ مظلوم کردار بنا کر پیش کیا تھا۔ اور اب یہ کردار اس سے اپنے اوپر گزرے

ظلم وزیادتی کا بدلہ لینے کے لیے آئے ہیں۔اقتباس ملاحظہ کریں۔

’’تم کون ہو۔؟‘‘

’’میں تمہارے پہلے افسانے کا کردار ہوں۔آتمارام۔‘‘ ’’کون آتمارام؟‘‘ ’’وہی آتمارام‘‘ جس کو تخلیق کرتے وقت تم نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا تھا۔‘‘ ’’میں کسی آتمارام کو نہیں جانتا۔‘‘ یاد کرو! اپنے پہلے افسانے کے اس بے بس اور غریب آتمارام کو، جس کے کردار کو اپنی جھوٹی شہرت کے لیے نہ صرف تم نے بگاڑ دیا تھا بلکہ اس کے ہاتھوں ناحق قتل کروا کے اسے پھانسی کی سزا بھی دلوائی تھی۔ ہاں! میں وہی آتمارام ہوں جس کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑتے ہی قانون کی بے نور آنکھیں روشن ہوگئی تھیں۔ دنیا میں انصاف کا سر اونچا ہو گیا تھا اور جس کے خون کے ایک ایک قطرے سے تمہارے افسانے کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور تم راتوں رات ایک مشہور افسانہ نگار بن کر ابھرے تھے۔‘‘(۱۷)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ افسانے کا رخ کسی جانب ہے، اس افسانے کی ابتداء بھی متجسس ہے اور اختتام بھی بہت دلچسپ ہے۔اختتام ملاحظہ کریں۔

’’اس نے گھبرا کر آئینے کو پلٹ دیا اور خود کو دیکھ کر ڈر گیا اور دوسرے ہی پل میز سے پیپر ویٹ اٹھا کر آئینے پر دے مارا۔آئینہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھر گیا۔اس نے آئینے کے ٹکڑوں میں خود کو دیکھنے کی جب کوشش کی تو ہر ٹکڑے میں اسے اپنا ہی چہرہ دکھائی دیا۔اور پھر ہیولے کے مسلسل قہقہے اس کی سماعت میں خوف انڈیل نے لگے، اسے اپنے پیروں میں لڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گر جاتا ہیولیٰ نے اس کا گریباں پکڑ لیا۔اور وہ ایک غیر مرئی طاقت کے سامنے بے بس ہو گیا، اس کا ٹینٹوا ہیولیٰ کی گرفت میں تھا۔وہ چیخ مارنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔اور پھر اس کا مردہ جسم ہیولیٰ کی بانہوں میں جھول گیا۔ ہیولیٰ نے اسے اٹھا کر آئینے کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں پہ دے مارا۔ایک دھماکہ ہوا اور افسانہ نگار کی آنکھ کھل گئی۔‘‘(۱۸)

اس افسانے کا پلاٹ چست اور گھٹا ہوا ہے، افسانے کا قصہ دو ہی کرداروں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے لیکن دونوں ہی کردار اپنے آپ میں مکمل ہیں اور قاری کو باندھے رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اس افسانے میں منظر نگار کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔

’’ریزہ ریزہ دل‘‘ (افسانچوں کا مجموعہ)

نذیؔر فتح پوری کے مختصر افسانچوں کا مجموعہ ’’ریزہ ریزہ دل‘‘ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔اس کتاب میں ان کے تقریباً ۹۸ افسانچے شامل ہیں جو مختلف عنوانات پر لکھے گئے ہیں۔

جہیز وہ بیماری ہے جو ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرتی جا رہی ہے۔یہی وہ لعنت ہے جس کی وجہ سے والدین اپنی بیٹیوں کی شادی نہیں کر پاتے اور اگر کر بھی دیتے ہیں تو اسے سسرال میں تکلیف دی جاتی ہے اور کبھی کبھی تو جان ہی سے مار دیا جاتا ہے۔’’خوابوں سے پرے‘‘ اور ’’نجات‘‘ میں اسی سماجی لعنت کو اجاگر کیا گیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ماں میری شادی کب ہو گی؟

جب اسے جہیز میں دینے کے لیے ہمارے پاس ٹی، وی ہو گا اسکوٹر ہو گا، اور بہت سا...... بنک بلنس ہو گا۔'' (۱۹)

غریبی وہ بیماری ہے جو ہمارے ملک کی ترقی کی راہ میں دیوار بن کر کھڑی ہے۔ اسی موضوع پر دو افسانچے ''تنخواہ کا دن'' اور ''تیسرا آدمی'' اہمیت کے حامل ہیں، افسانہ تیسرا آدمی میں ایک ایسے شخص کا المیہ پیش کیا گیا ہے جو بھیک مانگ کر اپنا گزر بسر کرتا ہے لیکن نفرت کی آگ میں جل کر ہندوؤں نے مسجد اور مسلمانوں نے مندر کو توڑ دیا اور وہ شخص بھیک مانگنے سے بھی محروم ہو گیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو زبان کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہے اس کی گونج نذیر کے افسانچوں میں صاف سنائی دیتی ہے آزادی ملنے کے بعد اردو کو درکنار کر دیا گیا جبکہ ملک کو آزادی دلانے میں اردو نے بھی اہم رول ادا کیا تھا، ''انقلاب زندہ باد'' کا بلند نعرہ اردو نے ہی ہندوستانیوں کو دیا ہے۔ ''خواب سے حقیقت تک'' اور ''لاوارث'' وہ افسانچے ہیں جو اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ افسانہ لاوارث سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

''بنگال میں بنگالی زبان پھولوں کی طرح مہک رہی ہے، تاملناڈو میں تامل، کیرلا میں ملیالم، راجستھان میں مارواڑی زبان اپنے پورے وجود کے ساتھ زندہ ہے۔ اور ہندی کی تو بات ہی کیا ہے؟ یہ تو پورے بھارت ورش کی ناک کا بال ہے۔

مجمع میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔

''اور اردو؟'' (۲۰)

فرخ صابری (پاکستان) نذیر کے اس افسانچویں مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں۔

''نذیر فتح پوری کے ہاں، موضوعاتی تنوع کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ کیوں کہ بصارت اور بصیرت کے حامل یہ افسانچے متعدد جہات کے عکاس ہیں۔ گہری معنویت اور اجتماعی صورتحال کے سبب ''ریزہ ریزہ دل'' کے کئی افسانچے اپنے عہد سے بلند ہو کر، ہر عہد کے لیے بامعنی ہو گئے ہیں۔'' (۲۱)

اس مجموعے میں نذیر نے کردار نگاری کا بھی خاص خیال رکھا ہے اس لحاظ سے بھی یہ مجموعہ قابلِ ذکر ہے۔ نذیر نے اپنے افسانچوں کے قصوں کو پیش کرنے کے لیے جو کردار منتخب کیے۔ ان کرداروں نے افسانچے کی روح کو قاری کے ذہن تک رسائی نہایت آسان کر دی۔ اور قاری کو سوچنے پر آمادہ کر دیا پھر چاہے وہ میدان حشر کا خانہ داری کے بوجھ تلے دبا شخص ہو یا ''خوابوں سے پرے'' کی ماں بیٹی، یا ''انجام کار'' کا بستر پر ایڑیاں رگڑتا بیمار شخص۔ یہ سبھی آج کے سماج اور حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور قاری کے ذہن میں اپنا عکس چھوڑ جاتے ہیں۔

مراق مرزا اس مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ افسانے اپنے قارئین کو زندگی کے ایک بولتے ہوئے دلکش میوزیم کی سیر کراتے ہیں۔ جہاں، مکر، زمانہ سازی، اور موقع پرستی کی زہریلی ہوا بھی ہے اور خلوص و محبت شرافت اور انسانیت کی زندگی سے بھرپور صدا بھی۔ جہاں انسانی تہذیب اور کردار کے گرتے ہوئے معیار کی سسکتی کہانی بھی ہے اور پرانی قدروں کے مقابر پر بجھی ہوئی قندیل کی نشانی بھی۔ جہاں سمندر کی موجوں کا شور بھی ہے اور صحراؤں کا سکوت بھی۔ یہ افسانے ہمیں زندگی کے ان کرداروں سے روشناس کراتے ہیں۔ جنہیں ہم اپنے گردونواح روز ہی دیکھتے

ہیں مگر اپنے شعور کے طاقچوں پر کبھی سجاتے نہیں۔‘‘(۲۲)

افسانے کی کامیابی کا دارومدار بہت حد تک مکالمہ نگاری پر بھی منحصر ہوتا ہے۔نذیؔر بھی اس بات سے بخوبی واقف ہیں اور اسی لیے اپنے قلم کے جادو سے بہت مخصوص انداز میں انہوں نے مکالمے تحریر کیے ہیں۔ان افسانچوں میں انہوں نے بہت ہی مختصر مکالموں کے ذریعہ قصے کو قاری کے روبرو کر دیا اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی نصیحتیں دے گئے۔ان کی مکالمہ نگاری کا انداز ملاحظہ ہو۔

’’ امیر کی بیٹی نے گھر بلا کر غریب کے بیٹے سے کہا

’’میں تم سے پیار کرتی ہوں کیا تم مجھ سے شادی کرو گے۔؟‘‘

غریب کے بیٹے نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

’’تمہیں جہیز میں دینے کے لیے میرے پاس جوانی نہیں ہے۔‘‘

’’کہاں گئی تمہاری جوانی۔؟‘‘

’’تم جیسی ایک امیرزادی نے اسے پہلے ہی سے خرید رکھا ہے۔‘‘(۲۳)

منظر نگاری کے کے اعتبار سے بھی نذیؔر کے افسانچے مکمل نظر آتے ہیں۔انہوں نے بہت کم الفاظ میں اپنی بات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ منظر و ماحول مکمل طور پر اُبھر کر قاری کے سامنے پیش ہو جاتے ہیں۔اور پورا پس منظر قاری کے ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔اس ضمن میں ’’افسانچہ ’’نیندوں سے پرے‘‘ کا یہ منظر ملاحظہ کریں۔

’’میں اپنے محل میں فانوس روشن کر کے یہ بھول گیا تھا کہ میرے پڑوس کے جھونپڑے میں دیا بھی نہیں ہے۔‘‘(۲۴)

سیرت نگاری کے اعتبار سے بھی اس مجموعہ کے افسانچے قارئین کے سامنے بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔نذیر نے یہاں بھی اپنے قلم کا جادو جگایا اور سیرت نگاری کے بہترین مرقع پیش کیے ہیں۔اس کی مثال اس انداز میں آپ کے سامنے پیش ہے۔

’’ماں کی کہانی بھی کچھ عجیب ہے میں نے اس کی کوکھ سے جنم لیا تھا وہ تب بھی ماں تھی،اس کے بعد میرے بچے نے جنم لیا وہ تب بھی ماں تھی اور آج میرے بچے کے گھر جب ایک بچے نے جنم لیا وہ تب بھی ماں ہی ہے۔‘‘یعنی ماں۔‘‘(۲۵)

ان ساری خوبیوں کے باوجود کچھ کمیاں بھی اس مجموعہ میں محسوس ہوتی ہیں مثلاً افسانچے’’ فنکار کا دل‘‘ اور تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں‘‘ میں ان کا مخاطب کون ہے یہ معلوم نہیں ہو پاتا۔

نذیؔر کو اس افسانچوں کے مجموعے کو شائع کروانے کے لیے آمادہ کرنے والے جناب ڈاکٹر عظیم راہؔی تھے۔جنہوں نے’’ریزہ ریزہ دل‘‘ کو ترتیب دیا اور’’عرض مرتب‘‘ کے عنوان سے اس کا اعتراف بھی کیا،عظیم راہؔی اپنے اس فعالِ نیک کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

’’افسانچہ نگاری کی سمت ان کے اس رجحان کے پیش نظر فکشن کے اس میدان میں ان کے مجموعے کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور ان کے منی افسانوں و افسانچوں کے مجموعے کی اشاعت کے تعلق سے ان کی توجہ مبذول کرواتا رہا۔ابتداء میں انہوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی لیکن میرا اصرار مسلسل بڑھتا گیا اور جب انہوں نے میرے اصرار کو واقعی اخلاص پر مبنی پایا تو یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی‘‘(۲۶)

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نذیر کی اس تصنیف کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں۔

''ریزہ ریزہ دل'' آپ کے افسانچوں کا مجموعہ ہے ہر افسانچہ اپنے آپ میں مکمل ہے اور زندگی کے کسی نہ کسی رخ کی کامیابی کے ساتھ ترسیل کرتا ہے۔ یہ وہ فن پارے ہیں جن میں عام انسانی زندگی کی رمق ہے، دلوں کی دھڑکن ہے، تنگ وتاریک گوشے ہیں، طنز کے نشتر ہیں۔ تجسس اور تحیر کی لہریں ہیں۔ زندگی کے لیے جدوجہد، سماجی اقدار، اخلاقیات وغیرہ کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے سیاہ پہلو بدکرداریاں، بداعمالیاں وغیرہ کو یہ افسانے عمدگی سے پیش کرتے ہیں'' (۲۷)

اس مجموعہ کی اہمیت وافادیت مراق مرزا کے اس قول سے اور دوگنی ہوجاتی ہے جو انہوں نے اپنے مضمون ''نذیرؔ فتح پوری۔'' ریزہ ریزہ دل کی روشنی'' میں تحریر کیا ہے کہ۔

''ریزہ ریزہ دل'' کے کئی افسانچوں نے خلیل جبران کی کتاب The Mad Man کی یاد تازہ کردی ہے جو کئی برس قبل مطالعے میں آئی تھی اور آج بھی میرے بک شیلف میں موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نذیرؔ فتح پوری کے منی افسانے معیار ومزاج کے اعتبار سے بلا اشتباہ اس قابل ہیں کہ انہیں ورلڈ کلاس افسانوں کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔'' (۲۸)

نذیرؔ فتح پوری کے منی افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عظیم راہیؔ اپنے مضمون ''نذیرؔ فتح پوری کی افسانچہ نگاری'' ریزہ ریزہ دل کے آئینے میں'' میں رقمطراز ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری کے منی افسانچوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو بے حد قریب سے دیکھا پرکھا اور سمجھا ہے۔ سفر حیات میں وہ بے شمار تجربوں اور مشاہدوں سے گزرے ہیں لہٰذا ان کے افسانچوں میں زندگی کے مختلف رنگ وعکس نہایت متاثر کن انداز میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جنہیں قارئین دیکھ بھی سکتے ہیں اور اپنے احساسات کی وادیوں میں سجا بھی سکتے ہیں۔'' (۲۹)

نذیرؔ کے منی افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیفی سرونجی فرماتے ہیں۔

''یہ منی افسانے بھی زندگی کی ایسی ہی سچائیوں کو پیش کرتے ہیں جن میں لڑائی جھگڑے، فساد، رشوت خوری، سیاست، جوڑ توڑ یعنی زندگی کے سارے مسائل سے جھوجھتی ہوئی یہ منی کہانیاں نہ صرف سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ زندگی کی کئی ایسی تصویریں بھی پیش کرتی ہیں جن میں ہم اپنا عکس صاف طور پر دیکھ اور محسوس کرسکتے ہیں۔'' (۳۰)

ان تمام اقوال کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''ریزہ ریزہ دل'' اردو افسانچوں کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے اور منی افسانے کے سرمائے میں اہمیت کا حامل ہے۔

''میرا دیش مہان:۔(بچوں کے لئے کہانیاں)

''میرا دیش مہان کی کہانیاں ادب اطفال میں ایک قیمتی اضافہ ہے یہ کہانیاں بھائی چارہ، اپنائیت، غریبوں سے محبت، ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی کا سبق دیتی ہیں۔اور حسد کے جذبے سے پاک رہنے کی تاکید کرتی ہیں۔اس تصنیف میں نذیرؔ نے بچوں کے لیے مختصر مگر دلچسپ کہانیاں نصیحت آموز انداز میں بیان کی ہیں، جو بچوں پر تھوپی نہیں گئی ہیں بلکہ بہت ہی پیار سے ان کے دلوں میں جذب ہونے والے انداز میں لکھی گئی ہیں اس مجموعہ میں ۲۳ کہانیاں شامل ہیں جن کے عنوان بھی منفرد ہیں اور مواد بھی۔کتاب کا آغاز ''بچوں سے باتیں'' سے ہوا ہے۔ابتداء میں ہی نذیرؔ بچوں سے یوں مخاطب ہیں۔

> ''ہمارے دیش کو پیار کی ضرورت ہے، یہ پیار ایک کہانی کار اور ایک شاعر ہی دے سکتا ہے۔یہ سچ ہے کچھ قلم کاروں نے آج اپنے قلم کو زہر میں ڈبولیا ہے۔لیکن محبت کرنے والے آج بھی زیادہ ہیں۔اور ہمیشہ رہیں گے نفرت نے ہمیشہ محبت کے سامنے ہار مانی ہے۔تم ان کہانیوں میں محبت تلاش کروگے تو تمہیں مایوسی نہیں ہوگی آؤ ہم سب مل کر محبت باٹیں اور اس دیش کو مہان بنائیں۔'' (۳۱)

نذیرؔ نے زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو قلم بند کیا۔ان کی کہانیوں میں کہیں وطن سے محبت کا اظہار ہوا ہے تو کہیں قومی یکجہتی کی گونج سنائی دیتی ہے ایسی کہانیوں میں سکھی رام کا راج، اکھا ہندوستان، دیا رام سارسوت، ایک سچّی کہانی، جھنڈا اونچا رہے ہمارا، آؤ بھارت جوڑیں اہمیت کی حامل ہیں۔آج ہمارے معاشرے میں مختلف قسم کی برائیاں سر اُٹھائے کھڑی ہیں ان میں دہشت گردی سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا نام جوڑا جاتا ہے اور دہشت گردی کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک خطرناک رجحان یہ بھی ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان بتا کر اس کے ساتھ بھی تعصب کا رویہ اپنایا جاتا رہا ہے۔اس درد کو نذیرؔ نے مادری زبان اور ''دہشت گرد'' میں بیان کیا ہے۔تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔تعلیم ہی انسان کو ترقی کی منزل تک پہنچاتی ہے۔مسلم قوم تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہے اس درد کو نذیرؔ نے ذاتی طور پر بھی برداشت کیا ہے کیونکہ وہ خود صرف درجہ پنجم تک ہی تعلیم حاصل کر سکے اس کمی کے نشانات بچپن سے ان کے ذہن نشین تھے اس لیے انھوں نے بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ کی زیر نظر تصنیف میں با بجا تعلیم کی اہمیت، ضرورت، اور محرومی نقصانات واضح کیے ہیں۔اور اس تصنیف کے ہر کردار میں کہیں نہ کہیں نذیرؔ کا بچپن جھلکتا نظر آتا ہے خاص طور سے پڑھائی کی ضد، رجو وغیرہ کہانیاں نذیرؔ کے بچپن کی منہ بولتی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ بھی تقریباً ہر کہانی میں تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب موجود ہے لیکن سیاست دانوں نے ذات پات کے فرق اور تعصب کو ایک بڑے مسئلہ کے روپ میں ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔نذیرؔ نے بھی تعصب کے خلاف آواز بلند کی ہے اور ملک کی ترقی کے لیے اس بیماری کو دور کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔''آتمارام'' ایک ایسی ہی کہانی ہے۔اس کہانی میں بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ برائی انسانیت کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

نذیرؔ نے اپنی ایک کہانی ''گیارواں بیٹا'' کے ذریعہ بچوں کو یہ بات ذہن نشین کروائی ہے کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں سے محبت کا جذبہ بھی دل میں روشن رکھنا چاہیے کیونکہ کبھی کبھی جانور بھی ہماری زندگی میں نہایت منفعت بخش رول ادا کر جاتے ہیں۔

آج سے کئی سال پہلے کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی تھی اور غریبوں اور مزدوروں کی حمایت کی تھی۔دنیا میں

آج بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی سرمایہ داری کے غرور میں غریب انسان کو انسان نہیں سمجھتے ہیں۔لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غریب اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے بلکہ خوشی محسوس کرتے ہیں اور ان کی مدد کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں بچوں میں بھی اس جذبہ کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ جب آج ان کا ذہن اس طرف مائل ہوگا تب کل وہ کسی کے لئے ہمدردی، ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے دل میں رکھ پائیں گے۔دوسری ٹیریسا، دوستی، ماں تیرے کتنے روپ' جیسی کہانیاں اسی احساس کا عکس ہیں۔

''آپس کی لڑائی'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی بچوں کی لڑائی میں بڑوں کی دخل اندازی بہت خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔جبکہ بچے ایک پل میں لڑتے ہیں اور اگلے ہی پل ایک ہو جاتے ہیں۔اصل میں یہ کہانی بچوں کے لیے تو فائدہ مند ہے ہی لیکن بڑوں کو بھی اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ہم بچوں کو محنت اور ایمانداری کی تلقین کرتے ہیں بچہ ان پر عمل بھی کرنے لگتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان نصیحتوں کو ہم ہی طاق میں رکھ دیتے ہیں ایسی ہی ایک دلچسپ داستان ''اندھیرے اُجالے'' میں بیان کی گئی ہے۔

ہندوستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ رہتے ہیں اور اسی نسبت سے ہمارے یہاں تہوار بھی مختلف ہیں ''تہوار'' میں نذیر نے ایسے ہی دو تہواروں ''گنپتی پوجا'' اور ''محرم'' کا ذکر کیا ہے۔دونوں تہواروں کی اہمیت بچوں کو سمجھانے کے لیے ان کا مختصراً طور پر جائزہ بھی لیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان سے جڑے ہوئے ان برے سانحہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو سیاسی پارٹیوں کے شاطر دماغ کے سبب وجود میں آئے۔نذیر ایسی سیاست جو لوگوں کو توڑنے اور ان کے بیچ فرق کرنے میں ہو اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔غلط سیاست ہی لوگوں میں تفریق پیدا کرتی ہے جبکہ اس کا صاف صاف الزام مذہب پر لگا دیا جاتا ہے اسی کے متعلق نذیر کا خیال ہے کہ۔

''ہمارے دیش کے لوگ آج بھی مل جل کر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔مالدار لوگ کتنی ہی کوشش کر لیں،
غریبوں کے بیچ میں دیوار نہیں اٹھا سکتے کیونکہ ہمارے دیش کا مسئلہ دھرم نہیں ہے، غریبی ہے، مہنگائی ہے،
دھرم ہم کو جوڑتا ہے سیاست ہم کو توڑتی ہے۔ہم کو جوڑنے کا کام کرنا ہے توڑنے کا نہیں۔''(۳۲)

''قصلو حاسد'' وہ کہانی ہے جس میں نذیر نے بچوں کے ذہن کو اس بات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ حسد کا جذبہ اپنے دل میں پالنے والا انسان زندگی میں کبھی بھی خوش نہیں رہ پاتا اور وہ سب کی نظروں سے گر جاتا ہے۔اس تصنیف کی کچھ کہانیاں مثلاً ماں کی یاد میں کہانی ایک شاعر کی ''گیارواں بیٹا'' اور ''پڑھائی کی ضد'' وغیرہ کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض کہانیاں نہیں بلکہ نذیر کی زندگی کے حصہ ہیں۔ان کی آپ بیتی ہے، ان کہانیوں میں کہیں وہ اپنی ماں کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں اپنی زندگی کی داستان سناتے نظر آتے ہیں، کہیں وہ پڑھائی کی محرومی سے ہونے والے درد کا بیان کرتے ہیں تو کہیں اپنے گھر کے افراد کو یاد کرتے نظر آتے ہیں۔کیونکہ نذیر نے اس تصنیف کو بچوں کے لیے تحریر کیا ہے اس لیے انہوں نے زبان کا خاص خیال رکھا ہے اور ایسی زبان اختیار کی ہے جو بچے با آسانی سمجھ سکیں۔سیدھی سادی سلیس زبان، ہندی اور انگریزی الفاظ کی آمیزش نے زبان کو خوبصورتی عطا کی ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ کہیں کہیں محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔جو سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہیں۔مجموعی طور پر نذیر کی ان کہانیوں میں عام انسانی زندگی کی ڈھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں سماجی قدریں اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے رنگ بھی ان میں موجود ہیں۔سیاسی بصیرت اور اقتصادی مسائل کی گونج بھی ان کہانیوں میں سنائی دیتی ہے۔

پشاور کی ۱۷ کہانیاں

ایک ماں کے لیے اس کا بچہ دنیا کی ہر نعمت سے برتر و بالا ہے۔ ہر ماں کا سکون بچے کی خوشی اور سلامتی میں پوشیدہ ہے۔ ماں کی انہیں دعاؤں کے ساتھ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو آرمی اسکول پشاور (پاکستان) کا ہر طالب علم اسکول میں داخل ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ اس دن ماں کی دعائیں اپنے معصوم بچوں کو دہشت گردوں کی گولیوں سے محفوظ نہ کر سکیں۔ اور اس اسکول کے تقریباً ۱۳۲ بچے اس ظالمانہ دہشت گردی کا شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس نے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کو غم کے سمندر میں غرق کر دیا۔ اس دردناک حادثے سے متاثر ہو کر نذیر فتح پوری نے ''پشاور کی ۱۷ کہانیاں'' کے زیر عنوان کتاب تحریر کی ہے۔ اس کتاب کا انتساب نذیر نے شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کے نام کیا ہے۔ دلیپ کمار کا تعلق پیشاور سے ہے اور یہ سانحہ بھی وہیں پیش آیا ہے شاید اسی لیے اس انتساب کو دلیپ کمار کے نام تحریر کیا ہے۔ اس کے پہلے بھی نذیر اپنے ناول ''چٹانوں کے بیچ'' کا انتساب دلیپ کمار کے نام سے منسوس کر چکے ہیں۔ اس تصنیف میں کہانیوں کے ساتھ اس اسکول کے خوفناک ماحول کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ ان تصاویر میں کلاس روم میں بکھری ہوئی کتابیں اور فرش پر پھیلا ہوا معصوم بچوں کا خون جیسے ہولناک منظر شامل ہیں۔ ان تصاویر کی شمولیت نے کتاب کے مواد کو مزید حقیقی انداز میں پیش کرنے میں مدد کی ہے کہانیوں کے متعلق مواد اور تصاویر کی فراہمی کے متعلق نذیر فتح پوری فرماتے ہیں۔

> ''زیر مطالعہ کتاب لکھتے وقت روزنامہ اردو انقلاب ممبئی کی خبروں سے استفادہ کیا گیا۔ چند تصاویر بھی انقلاب ہی سے لی گئی ہیں۔ میرے پوتے نعمان اقبال جوڈ نے انٹرنیٹ سے بھی کئی چیزیں فراہم کر کے کتاب میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔'' (۳۳)

اس کتاب کی کہانیاں مثلاً ''پرنسپل طاہرہ قاضی، ایک ٹیچر کی قربانی اور سحر افشاں کی بہادری'' اصل قصوں پر مبنی ہے، اور کچھ قصوں کو افسانوی رنگ عطا کر کے بیان کیا گیا ہے مگر جس پس منظر میں یہ کہاینان تحریر کی گئی ہیں اسے مدنظر رکھتے ہوئے ساری کہانیاں حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔

جب بچوں پر مصیبت آنے والی ہو تو ماں باپ کو اس کا اندازہ پہلے سے ہی ہو جاتا ہے اس خیال کو نذیر نے اس تصنیف کی کچھ کہانیوں میں انتہائی شدت سے بیان کیا ہے۔ دہشت گردی سے تمام عالم انسانیت کو نیست نابود کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ یہ دہشت گردی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہے اور نذیر اسے بہت بڑے اور برے جانور کے مدمقابل ٹھہراتے ہیں۔ کچھ کہانیوں میں نذیر نے تجسیم کا پیرایہ بھی اختیار کیا ہے مثلاً ''میں کتاب ہوں'' اور ''کلاس روم نمبر ۹'' وغیرہ ان کہانیوں میں کتاب اور کلاس روم کے ذریعہ وہاں کے حالتِ زار کا بیان کیا گیا ہے۔ ایک کہانی ''امام کا اعلانِ جنگ'' میں انہوں نے اپنے خیالات مسجد کے امام کے منھ سے ادا کروائے جس سے بات پُر اثر ہو گئی ہے۔ جب بھی دہشت گردی کا نام آتا ہے اسے اسلام اور مسلمانوں سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ جو کہ غلط ہے۔ کیوں کہ اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ لوگوں کی جان لی جائے۔ معصوموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہ سلامتی کا مذہب ہے اور ہمیں محبت اور اپنائیت سکھاتا ہے نہ کہ نفرت اور جنگ، نذیر اس دہشت گردی اور دہشت گردوں کے خلاف ہیں اور خدا سے دعا گو ہے کہ۔

> ''اے خدا!
>
> دنیا کے گوشے گوشے اور چپے چپے سے دہشت گردوں کا صفایہ کر دے۔ اے خدا! ان کلیوں کی

حفاظت کر جو ابھی پوری طرح کھلی نہیں ہیں ۔اے خدا! ان پھولوں کی حفاظت کر جو اپنی مہک اور رنگوں سے دنیا کو خوبصورت بنانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں ۔اے خدا! اس دنیا کو امن اور شانتی کی ضرورت ہے سکون اور اطمینان کی ضرورت ہے۔محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ یہ ساری دولت اس دنیا کو لٹا دے، یہ دنیا تیرا لگایا ہوا باغ ہے۔ یہ دہشت گرد کون ہوتے ہیں اس باغ کو اجاڑنے والے۔ اے خدا! اس باغ کی حفاظت کر اور ان بے درد جانوروں کے جیسے لوگوں کا خاتمہ کر جو تیرے کھلائے ہوئے پھولوں اور کلیوں کو نوچ رہے ہیں۔ تیرے رسول اللہ ﷺ نے جو مذہب ہمیں دیا ہے اس کا نام اسلام ہے۔ یہ سراسر سلامتی کا مذہب ہے۔ یہ دہشت گرد اسی مذہب کا جھنڈا اٹھا کر دہشت گردی پھیلا رہے ہیں۔اور اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔تو ان دہشت گردوں سے اپنے باغ کی حفاظت کر۔تاکہ پھر کوئی باغ نہ اُجڑے۔کوئی کلی کوئی پھول برباد نہ ہو۔'' (۳۴)

نذیر کی اس دعا پر ہم سب بھی ایک آواز ہو کر آمین کہتے ہیں اس قتل و غارت کے حادثے نے ہمارے ذہن میں ایک عجیب سی کشمکش پیدا کر دی۔نذیر نے ان حالات میں ہمارے سامنے یہ سوال پیش کیے ہیں جن کا جواب حاصل کرنا ہمارے لئے اشد ضروری ہے۔ یہ سوال ہیں۔

''کیا یہ خون رنگ لائے گا؟''

''کیا خولہ کی موت کے بعد دہشت گرد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔''

حالانکہ یہ کہانیاں نذیر نے ''بچوں کے لیے'' تحریر کی ہیں لیکن ان کہانیوں نے بڑوں کے دلوں کو بھی چھوا ہے، جس کے متعلق ڈاکٹر مقصود الٰہی شیخ فرماتے ہیں۔

''نذیر بھائی نے بڑے دکھ بھرے دل سے ایسی کہانیاں لکھیں ہیں جو ہر عمر کے پڑھنے والے کو تڑپا دیتی ہیں''۔ (۳۵)

اس کتاب کی کہانی ''میں روہت شرما ہوں'' اور'' میرا نام گربچن سنگھ ہے'' کے ذریعہ ہندوستانیوں کی پاکستانیوں سے محبت و اپنائیت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہم اس سانحہ میں پاکستان کے شریک غم ہیں اور اس کے متعلق اپنے یا یوں کہہ لیجئے کہ ہر ہندوستانی کے دل کا حال بیان کرتے ہوئے نذیر فرماتے ہیں۔

''ہم سرحدوں کے نام پر لڑتے ہیں لیکن آج پڑوسی ملک کے معصوم بچوں کی موت نے ساری دیوار توڑ دی تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے پیشاور ہمارے پڑوس میں ہو۔ ہمارے پنجاب کا ہی ایک حصہ ہو۔'' (۳۶)

نذیر کی اس تحریر اور تصنیف کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے حیدر قریشی فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری چونکہ بنیادی طور پر شاعر اور ادیب ہیں۔اس لیے انہوں نے ایک ہندوستانی ادیب ہونے کے ناطے اپنے حصے کا چراغ جلانے کی کاوش کی ہے۔مختصر سے مجموعہ میں انہوں نے چند کہانیوں کو واقعات کی صورت میں سانحہ پیشاور کے بارے میں اپنا دکھ بیان کرنے کی مخلصانہ کاوش کی ہے۔اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے انہوں نے ایک حد تک ہندوستان کے مختلف سماجی گروہوں کے دکھ کی ترجمانی بھی کی ہے۔'' (۳۷)

یہ کتاب نذیر فتح پوری کی آٹھ دنوں کی محنت کا نتیجہ ہے جو ۱۹ دسمبر ۲۰۱۴ سے شروع ہو کر ۲۵ دسمبر ۲۰۱۴ کو مکمل ہوئی۔رحمانی پبلی کیشنز کے زیر

اہتمام ۸۸صفحات پر مشتمل یہ تصنیف ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی۔نذیر کی تحریر نے اس کتاب کی ہر کہانی کو حقیقت کا رنگ دے دیا ہے ہر کردار اپنی پوری شخصیت کے ساتھ ہمارے دل میں گھر کر جاتا ہے اور اس کی شہادت ہمارے ذہن کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ آخر اس کی غلطی کیا تھی جو دہشت گردوں نے اسے موت کی سزا سنادی۔نذیر کی یہ کہانیاں انسان پرستی کا سبق دیتی ہیں اور دہشت گردی کو ختم کر کے محبت وامن کا پیغام سناتی ہیں۔

آخر میں ہم ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی اس رائے پر اکتفا کریں گے جو نذیر کی منفرد شخصیت کی غمازی کرتی ہے۔

''نذیر فتح پوری کچھ نہ کچھ نیا کرنے کے لیے ہمیشہ مضطرب رہتے ہیں۔اس بار انہوں نے پشاور سانحے کے درد وکرب کو بچوں کی زبانی، کہانی میں اس طور ڈھالا ہے کہ کہانیاں بچوں کو اسلام کی تعلیم بھی دیتی ہیں اور پوری دنیا کو سانحے کی عبرتناکی سے بھی روشناسی بھی کرواتی ہیں۔'' (۳۸)

خلاصہ:۔

نذؔیر نے افسانہ نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کا فرض اور فنکاری کا فرض پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا ہے۔ان کے افسانے بظاہر ان کی اپنی سوچ کے عکاس نظر آتے ہیں لیکن ان میں ماحول کی عکاسی بھی بھر پور ہوئی ہے، ہمارے اس تجزیے میں نذؔیر کے تین افسانے ایسے ہیں جو مختلف زاویوں اور جدا کرداروں کے ساتھ ایک افسانہ نگار کی زندگی کا قصہ بیان کرتے ہیں ''فن اور سماج، کردار کا انتقام' یہ بھی ایک کہانی ہے۔یہ تینوں افسانے مرکزی اعتبار سے ایک ہی نقطے کے گرد گردش کرتے ہیں لیکن تینوں افسانوں کی کیفیت اور مواد ومتن مختلف انداز سے پیش ہوئے ہیں اس سے نذؔیر کی ذہنی وسعت اور بیانیہ کی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کے افسانے، ماہ نامہ خاتون مشرق دہلی، ماہ نامہ ندائے فلسطین دلی، ماہنامہ شاعر ممبئی، سہ ماہی اسباق پونے، سہ ماہی تکمیل ممبئی، ایوانِ اردو دلی۔تحریر نو نوی ممبئی، سہ ماہی کاروانِ ادب۔بھوپال، سہ ماہی رنگ دھنباد، ماہ نامہ ہم سخن، بھوپال میں شائع ہو چکے ہیں۔لیکن ہنوز ان کے افسانوں کا مجموعہ جو انہوں نے ''جستجو کا کرب'' کے عنوان سے عرصۂ دراز سے مرتب کر رکھا ہے اس کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔حالانکہ نذؔیر جیسے کثیر الاشاعت قلم کار کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔جہاں مختلف موضوعات پر ان کی ۶۵ سے زائد کتابیں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں ان کا نام روشن کر چکی ہیں وہاں ایک افسانوی مجموعے کی اشاعت کوئی مشکل کام نہ تھا۔اس کے برعکس انھوں نے اپنے افسانچوں یا منی افسانوں کا مجموعہ شائع کیا۔خوشی ہے کہ ادبی حلقوں میں اس مجموعے کے افسانچوں کو بے حد پسند کیا گیا اور مطالعہ کے بعد اہل قلم نے اس پر مضامین اور تبصرے قلم بند کئے۔''میرا دیش مہان'' کے عنوان سے نذیر نے بچوں کے لیے ۲۳ کہانیاں لکھیں۔ان کہانیوں نے بھی ادب کی دنیا میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔بچوں کے لئے اس انداز کی کہانیاں شاید پہلی بار لکھی گئی ہیں۔اس کتاب پر مہاراشٹر اردو اکادمی اور بہار اردو اکادمی نے انہیں ادب اطفال کے انعام سے نوازا۔جب پاکستان کے آرمی اسکول پر دہشت گردوں نے حملہ کر کے ۱۳۲۔طالب علموں کو شہید کر دیا تو نذؔیر کے اندر کا کہانی کار مضطرب ہو اٹھا اور آٹھ دنوں میں نذؔیر نے ''پشاور کی ۱۷ کہانیاں'' عنوان سے بچوں کے لیے کتاب سپردِ قلم کرنے میں قطعی تاخیر سے کام نہ لیا۔یہ نذؔیر فتح پوری کی ذود پسند طبیعت کا ردّ عمل ہے جب ممبئی پر دہشت گردانہ حملے کے تنہا بچ جانے والے مجرم قصاب کو پھانسی لگی تو نذؔیر نے میرا دیش مہان کے عنوان سے بچوں کے لیے ۲۳ کہانیاں لکھ کر کتاب شائع کر دی اور اب پشاور کے حملے کے فوراً بعد اس موضوع پر مختلف عنوانات سے ۱۷ کہانیاں لکھ کر کتاب شائع کر چکے ہیں۔اس عمر میں بھی نذؔیر کا قلم تر وتازہ واقعات وحادثات پر کہانیاں لکھنے میں تاخیر نہیں کرتا۔ان کے ساتھ لکھنے والوں کا کیا حال ہے۔راقمہ کو اس کا کوئی اندازہ نہیں۔لیکن نذؔیر کا تخلیقی ذہن آج بھی بہار کے پہلے پھول کی

مانند کھلا کھلا ہے، معطر ہے، جس کی مہک نے ادبی ماحول کو مہکا رکھا ہے۔

نذیرؔ فتح پوری کی ڈرامہ نگاری

ڈرامہ اردو ادب کی مقبول صنف ہے اس کے تحت بہت خوبصورت ڈرامے تحریر کئے گئے اور ان میں اکثر کو اسٹیج بھی کیا گیا کچھ ڈراموں پر فلمیں بھی بنائی گئیں۔ جب تک سنیما کا چلن نہیں تھا تب تک ڈراموں کا فروغ اور ترقی عروج پر رہی۔لیکن سنیما کے آنے سے ڈراموں کو نقصان پہنچا۔ ورنہ اس سے پہلے تک ڈراموں کو خوب اسٹیج کیا جاتا تھا اور عوام بھی اس میں خوب دلچسپی لیا کرتی تھی۔ ڈرامے کے عروج وزوال کی داستان ہماری بحث کا موضوع نہیں ہے۔ ہمیں یہاں نذیرؔ کی ڈرامہ نگاری کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ نذیرؔ نے پانچ ڈرامے لکھے ہیں جن میں سے تین کو تو اسٹیج پر بھی پیش کیا گیا۔ ان کا جائزہ حسبِ ذیل ہے۔

نذیرؔ فتح پوری کا پہلا ڈرامہ ''شاہجہاں'' ہے جو ۱۹۸۰ء میں پونہ میں نہرو میموریل ہال میں اسٹیج کیا گیا۔ اس کا قصہ تاریخی انداز میں ہے جو ''تاج محل سے منسوب ہے۔ لیکن مکالموں کی تخلیق بڑی چابک دستی سے کی گئی ہے جو ڈرامے کو تازہ اور زندہ بناتے ہیں۔ یہ ڈرامہ تین ایکٹ پر منحصر ہے جسے اسٹیج کرنے کے لیے بہت خوبصورت اور قیمتی سیٹ لگائے گئے تھے۔ بہترین لائٹنگ کے ساتھ دوسرے سبھی ساز وسامان کا انتظام کیا گیا۔ اس ڈرامے میں کل ۲۲ کردار تھے جن میں سے کچھ کے نام۔ حنیف پہلوان، ایل ایم خان، مینا کاترے، ٹیکساس گائیکواڑ، اویناش گائیکواڑ، اقبال انصاری اور ان کے علاوہ اور بھی اداکاروں کو شامل کیا گیا تھا۔ ان اداکاروں میں کچھ اداکار نئے تھے۔ اس ڈرامے کے ڈائرکٹر جناب راج ٹھاکر تھے اور گیت جناب دلدار ہاشمی نے لکھے تھے۔ لیکن مہنگا سیٹ اور اداکاروں کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب اس ڈرامے کے صرف دو شو ہی اسٹیج ہو سکے۔ اس ڈرامے کو خوب پسند کیا گیا۔

نذیرؔ کا دوسرا ڈرامہ ''آخری جام'' ہے جو ۱۹۸۲ء میں نہرو میموریل ہال پونہ میں اسٹیج کیا گیا۔ اس کے ڈائرکٹر ٹیکساس گائیکواڑ تھے اور اس کے اداکاروں میں مینا کاترے، اقبال انصاری، انجنا، اور اسماعیل شیخ وغیرہ شامل تھے۔ اس ڈرامے میں شراب نوشی کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ لیکن چند وجوہات کے سبب اس ڈرامے کے بھی صرف دو ہی شو اسٹیج ہو سکے۔

نذیرؔ فتح پوری کا تیسرا ڈرامہ ''زینت محل'' ۱۹۸۴ء میں اسباق پبلی کیشنز کے تحت نہرو میموریل ہال میں ہی اسٹیج کیا گیا اور اس ڈرامے کا دوسرا شو تلک اسمارک ہال میں ہوا۔ ناکام محبت کے موضوع پر لکھے گئے اس ڈرامے کے ڈائرکٹر راج ٹھاکر تھے۔ اقبال انصاری، یوسف ندیم، آبو لی ٹھانے، ندیم شیخ، اقبال حمید اور مشتاق عرب نے اس ڈرامے میں اپنی اداکاری سے جان ڈال دی۔ بہت خوبصورت مکالموں نے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کیا لیکن صد افسوس کہ اس ڈرامے کے بھی دو شو سے زیادہ نہ ہو سکے۔

ان تین ڈراموں کے علاوہ دو ڈرامے ''کل کا سورج'' اور ''میں فنکار ہوں'' ہیں لیکن ان ڈراموں کو نہ تو اسٹیج کیا گیا اور نہ ہی انہیں کہیں کسی رسالے میں شائع کیا گیا۔ لیکن جو ڈرامے اسٹیج کیے گئے انہیں خوب پسند کیا گیا اور نذیرؔ کو ان ڈراموں کے رائٹر کے طور پر آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔

نذیرؔ کی ڈرامہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب ایم یوسف ندیم نے اپنے مضمون ''نذیرؔ ایک تاثر'' میں لکھا ہے۔

''وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار بھی ہے اُس کے اردو ڈرامے اسٹیج پر پیش ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکے ہیں۔
اُس کے افسانوں اور ناولوں کی طرح اس کے ڈرامے بھی زندگی کے ترجمان ہیں، اس کے کالموں میں ایسی

ادبی چاشنی ہوتی ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے سر دُھننے لگتے ہیں۔اس کے ڈراموں کی ایک قابلِ ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ وہ تمام ایسی بے ہودہ، مہمل فحش اور اخلاق سوز باتوں سے پاک ہیں۔ جو عام طور پر ڈراموں کو مقبولِ عام بنانے کے لئے عمداً ٹھونسی جاتی ہیں''۔(۳۹)

نذیرؔ بحیثیت سوانح نگار

نذیرؔ نے اپنی خودنوشت سوانح ''بیتے کل کا اک اک پل'' کے زیر عنوان تحریر کی ہے جو قسطوار ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور پاکستان اور سہ ماہی رنگ (دھنباد) میں شائع ہوئی۔اس کے تحت نذیرؔ نے اپنی بچپن کی زندگی کے حالات و کوائف قلم بند کیے ہیں۔انہوں نے اسے مختلف عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور اسی وجہ سے اس میں ربط و تسلسل نہیں ہے لیکن بے تکلفی موجود ہے موقع و محل کے لحاظ سے جو قصہ انہیں پہلے یاد آیا وہ اسے تحریر کرتے چلے گئے۔ یہ تمام واقعات ان کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس وقت کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حالات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اپنی سوانح سلسلہ وار نہیں لکھی ہے مگر پھر بھی وہ بے حد دلچسپ ہے کیوں کہ اندازِ بیان اتنا دلچسپ اور سادہ ہے کہ جب قاری اسے پڑھنا شروع کرتا ہے تو اُسے بیچ میں ادھورا نہیں چھوڑتا بلکہ پورا پڑھ کر ہی دم لیتا ہے۔نذیرؔ کی یادداشت بھی کمال کی ہے جب وہ اپنے بچپن کے واقعات کا ذکر کرتے ہیں تو ہر چھوٹی سے چھوٹی بات جو انہیں یاد ہے اسے وہ اپنی تحریر میں بڑی معصومیت سے بیان کر دیتے ہیں۔ حالات کے بیان میں کسی طرح کا بناؤ سنگھار نظر نہیں آتا۔

''میرے ادبی سفر کی پہلی شام'' ''میں اور میرا بچپن'' چودہ آنے یومیہ مزدوری'' ''میری پیدائش'' ''یادیں جنگل کی'' ''ہوم ورک'' ''کھیل کھیل میں'' ''ابھی کچھ کھیل باقی ہیں جہاں میں''۔ ''کوڑی کا لغت'' ''پتنگ بازی کی آخری بازی'' ''کچھ پتنگ کے بارے میں'' ''راجستھان کے درسی نصاب میں نظمیں'' ''مناجات اکبر وارثی'' ''فلمی گیتوں کی بک لیٹ'' ''قاضی رضا محمد'' ''دو رکعت کے امام وغیرہ عنوانات جیسے کئی اور عنوانات کے تحت نذیرؔ نے اپنی سوانح قلم بند کی ہے۔اس سوانح سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''بالکل ہمارے محلے کے قریب مٹرومل باجوریا سیٹھ نے اپنے بزرگوں کی پڑی ہوئی خالی زمین پر ایک عالی شان کوٹھی کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں میری والدہ کے ماموں حسین خان ٹھیکیدار کے وسیلے سے مجھے دس آنہ یومیہ مزدوری کا کام مل گیا۔میں دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر چنائی کرنے والے معماروں کو کبھی چونا اور کبھی اینٹوں کی سپلائی کرنے پر معمور کر دیا گیا۔ چھ دن مسلسل کام کرنے کے بعد پہلے ہفتے میں جب والدہ کے ہاتھ پر ایک ایک کے تین نوٹ رکھے تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ایک ماں کے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی کہ اس کا بیٹا حلال روزی کما کر اسے دے۔''

یہ اقتباس نذیرؔ کے معاشی حالات کا عکاس ہے۔انہوں نے اپنے حالات سادگی سے الفاظ کے پیرائے میں ڈھال دیے ہیں۔نذیرؔ کے اس کارنامے کو خراج تحسین عطا کرتے ہوئے جناب معراج احمد معراج فرماتے ہیں۔

> ''اگر واقعات کو ہو بہو اور سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیا جائے تو ان میں قاری کے لیے دلچسپی اور دلبستگی کی کمی رہ جاتی ہے اور یہ بوریت کے سامان بن جاتے ہیں۔نذیرؔ فتح پوری نے سارے

واقعات میں افسانوی رنگ بھر دیا ہے۔اور حقیقی واقعات بھی افسانے کی طرح قاری کو لطف اندوز کرتے ہیں۔'' (۴۰)

نذؔیر کی یہی خوبی ہے جوان کی سوانح کو اور بہتر بنا دیتی ہے اور قارئین میں تجسس پیدا کرتی ہے۔نذیر کی سوانح پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے معراج احمد معراج اپنے مضمون ''نذؔیر فتح پوری ایک کامیاب سوانح نگار، میں فرماتے ہیں۔

''نذؔیر صاحب کی سوانح نگاری'' بیتے کل کا اک اک پل'' کئی قسطوں میں شائع ہو چکی ہے اور ابھی کئی اقساط باقی ہیں۔قارئین کو آئندہ قسط کا انتظار بے قراری سے رہتا ہے۔واقعے کا ہر سلسلہ مفصل اور معلوماتی ہوتا ہے۔ وہ ہر واقعے کا تانا بانا اس طرح بنتے ہیں کہ دوسرا واقعہ اس سے گہرے طور پر جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ایک ایک واقعہ کی تفصیل اتنی سچائی اور صفائی سے پیش کی جاتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں سیدھے اتر جاتی ہے اور اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے،کوئی کوئی واقعہ تو ایسا ہوتا ہے جیسے یہ تجربہ سوانح نگار کا نہ ہو بلکہ خود قاری کا ہو میں نے کبھی کبھی ایسا ہی محسوس کیا کہ یہ واقعہ تو میری زندگی میں بھی پیش آچکا ہے۔گویا نذؔیر صاحب کی آپ بیتی اس طرح جگ بیتی بن جاتی ہے۔داد دینا ہوگی ان کے حافظے کی کہ بچپن کے واقعات بھی انہیں اچھی طرح یاد ہیں۔وہ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے دوسرے واقعے کی طرف اس طرح قاری کا ذہن موڑ دیتے ہیں جیسے کوئی لکزری کار اپنا راستہ بدلتی ہے۔تو مسافر کو کچھ پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ایک ایک کر کے ساری باتوں کی تفصیل وہ اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے کوئی بچہ ایک ہی سانس میں سو تک گنتی سنا دیتا ہے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سوانح نگار کے پاس الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ان کے ذہن میں خیالات کا اژدہام ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے احساسات وجذبات کو واضح طور پر بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔'' (۴۱)

معراج احمد معراج کی اس تحریر کی روشنی میں نذیر کی سوانح کی مختلف خوبیوں کی گرہ کشائی ہوتی ہے اور انہیں نذیر کی سوانح میں رپوتاژ کا رنگ دکھائی دیتا ہے جس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ۔

''نذؔیر فتح پوری کی جو خود نوشت ہے وہ ایک طرح کا رپورتاژ ہی ہے۔'' (۴۲)

ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں نذیر کی سوانح کتابی صورت میں شائع ہو کر قارئین کے مطالعہ کی میز تک پہنچ جائے۔

اسی طرح بحیثیت سوانح نگار نذیر کی نثر نگاری کی کئی خوبیاں سامنے آجاتی ہیں مثلاً واقعہ نگاری کی سادگی قاری کے دل کو موہ لیتی ہے۔اور نذؔیر کی آپ بیتی اس کی اپنی بیتی بن جاتی ہے۔تفصیلات سے نذیر کی زبان و بیان کی قدرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ساتھ ہی احساس اور جذبہ کی صداقت کو بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

نذؔیر بحیثیت فلم اسکرپٹ رائٹر

نذؔیر بھی فلموں کے لیے اسکرپٹ لکھنے کا شوق رکھتے تھے اور یہ شوق انہیں ان کے ڈراموں کی مقبولیت کے سبب پیدا ہوا۔مگر وہ اس میدان میں کامیاب نہ ہو سکے۔پونہ میں مصروفیاتِ زندگی کے سبب ممبئی جانا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا اور وہ پونہ میں رہ کر اس میدان میں کامیاب نہ ہو سکے۔جب ٹکساس گائیکواڑ (نذیر کے ایک ڈرامے کے ڈائرکٹر) فلم ڈائرکشن کے میدان میں آئے تو انہوں نے اپنی فلم کی اسکرپٹ نذؔیر سے ہی

لکھوائی اور نذیرؔ بھی اس کے لیے خوشی خوشی راضی ہو گئے اور اپنا خونِ جگر صرف کر کے اسکرپٹ لکھی۔ ڈائرکٹر اور پروڈیوسر دونوں کو اسکرپٹ پسند آئی اس فلم کے گانے بھی نذیر نے لکھے جن کی ریکارڈنگ ۹۷-۱۹۹۶ء کے درمیان ہوئی۔ ان گانوں میں سے ایک گانا جناب مہندر کپور اور دوسرا جناب شاہد رفیع (فرزند محمد رفیع) نے گایا موسیقی جناب لکشمن نے دی۔ لیکن اس فلم کا کام ان دو گانوں کی ریکارڈنگ سے آگے نہ بڑھا۔

نذیرؔ نے ایک ٹیلی فلم ''اور شمع جلتی رہی'' کی بھی اسکرپٹ تحریر کی تھی اور اس کے گانوں کے لیے اقبال دربار کی موسیقی کو بہتر پایا گیا مگر افسوس کہ اس فلم کا کام بھی گانوں کی ریکارڈنگ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ بڑے پردے کے ساتھ ساتھ نذیر نے چھوٹے پردے کے لیے بھی کام کیا۔ ایک سیریل ''اس کے لیے'' کے مکالمے نذیر نے ہی تحریر کیے مگر اس سیریل کا بھی وہی انجام ہوا جو باقی دو فلموں کا ہوا۔ دو قسطوں کی شوٹنگ تو ہوئی پر ٹیلی کاسٹ نہیں ہوا۔ نذیرؔ کو ممبئی سے کچھ ڈائرکٹروں نے گیت لکھنے کے لئے بھی بلاوہ بھیجا مگر پونہ میں اپنی مصروفیات کے سبب وہ نہ جا سکے اور اس طرح وہ فلمی دنیا سے دور ہی رہے۔

نذیرؔ کی فلموں کے میدان میں ناکامی ایک طرح سے سنجیدہ ادب کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ وہ اگر فلموں میں کامیاب ہو جاتے تو پھر نہ ان سے سنجیدہ شاعری ہوتی نہ افسانہ نگاری کے لیے وقت ملتا۔ نہ ہی تذکرہ اور تاریخ کی بنیادوں سے وہ ہیرے جواہرات تلاش کر کے لاتے۔ اور بچوں کے لیے انہوں نے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ بھی نہیں لکھی جاتیں۔ بچوں کے لیے امیر تیمور کی زندگی پر جو دو ناول سپردِ قلم کیے ہیں وہ بھی وجود میں نہ آتے۔ اور ان کا ادبی رسالہ سہ ماہی اسباق بھی اب تک دم توڑ چکا ہوتا۔ اس لئے قدرت کی طرف سے جو ہوتا ہے وہ بہتر ہی ہوتا ہے۔ آج نذیرؔ فلمی چکا چوند سے دور اپنے پونہ کے گھر میں بیٹھ کر اردو کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ بے مثال ہے، آج وہ اپنے مشن میں کامیاب ہیں۔ یہ کامیابی خود نذیر کے لیے تو باعثِ افتخار ہے ہی اس کے علاوہ اردو سماج اور معاشرے کے لیے بھی ان کی خدمات سودمند ثابت ہوئی ہیں۔

نذیرؔ فتح پوری بحیثیت سفرنامہ نگار

اردو کو فروغ و دوام بخشنے میں اگر شاعری نے اہم رول ادا کیا ہے۔ تو نثر بھی پیچھے نہیں رہی۔ داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، سوانح، ناولٹ، وغیرہ کے ذریعہ ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ جیسے جیسے اردو ترقی کی منازل طے کرتی گئی ویسے ویسے نثری اصناف میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ سفرنامہ انہیں اصناف میں سے ایک ہے یہ ایسی نثر ہے جس میں کسی ملک یا شہر کی رودادِ سفر قلم بند کی جائے جبکہ مصنف کسی سفر کے حالات اور اس کے ساتھ جڑے احساسات و جذبات کا بیان دلچسپ پیرائے میں کرے تو وہ سفرنامے کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ سفر کی تعریف بیان کرتے ہوئے خود نذیر فرماتے ہیں۔

> ''ویسے سفرنامہ سفر کی روداد ہی ہوتا ہے، آدمی سفر کے دوران جو کچھ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے اُسے صفحۂ قرطاس پر اتار دیتا ہے۔'' (۴۳)

اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خان کمبل پوش نے ''عجائباتِ فرنگ'' کے نام سے تحریر کیا۔ محمد حسین آزاد، محبوب عالم، قاضی عبدالغفار، خواجہ احمد عباس، سرسید احمد خان، پروفیسر احتشام حسین، رام لعل اور قرۃ العین حیدر نے بھی سفرنامے لکھے ہیں۔ اس فہرست میں ایک نام نذیرؔ فتح پوری کا بھی شامل ہے۔ نذیرؔ نے اپنا پہلا سفرنامہ ۱۹۷۵ء میں ''ایک سفر عمان کا'' کے نام سے تحریر کیا تھا جو دورِ حاضر میں ان کے رسالے سہ ماہی اسباق میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس سفرنامے کو بھی نذیر نے زبان کی سادگی اور بیان کی دلکشی سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ جس کی دلیل یہ اقتباس ہے۔

''کبھی کبھی مجھے جب دیر تک نیند نہ آتی تو قبرستان میں گونجنے والی جھینگروں کی آواز سنتا رہتا تھا،کیسی بے چین بے راحت راتیں تھیں۔تنہائی ، سناٹا ، ویرانی اور اندھیرا ایسے میں کبھی اٹھ کر تنہا ہی باہر آ جاتا اور سامنے پسرے ہوئے قبروں کے جنگل کو جب دیکھتا تو زندگی بے حقیقت نظر آنے لگتی جب زندگی کا انجام قبرستان ہے تو پھر یہ سجنا سنورنا یہ لوازمات زمانہ ، یہ بلند وبالا عمارتیں ، یہ زرق برق لباس ، یہ چمچماتی گاڑیاں یہ منصوبہ بند بے ایمانیاں یہ حق تلفیاں یہ دل شکنیاں یہ دل آویزیاں فریب کاریاں اور بہت کچھ جو ہمیں انسان ہونے کے ناطے نہیں کرنا چاہیے تھا ہم کرتے ہیں اور مسلسل کرتے ہیں۔اور اپنے اس عمل پر نادم ہونے کے بجائے فخر کرتے ہیں ہم سمجھ بیٹھے ہیں کہ عرب بہت دیانتدار ہوتے ہیں لیکن ایسا کچھ بھی یہاں مشاہدے میں نہیں آیا۔''(۴۴)

اس سے پہلے نذیؔر نے ایک مضمون ''ٹونک کا ادبی سفر'' کے زیرِ عنوان لکھا جو ان کی تصنیف ''لفظوں کے سائے تلے''(۱۹۹۵) میں شائع ہوا۔نذیؔر کے مطابق پونہ میں سب سے پہلے سفر نامہ لکھنے کا شرف انہیں کو حاصل ہے۔اس بات کی تصدیق وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''میں نے اپنا پہلا سفر نامہ ۱۹۷۵ء میں لکھا تھا جب میں صلالہ اور مسقط تلاشِ معاش کے سلسلے میں گیا تھا۔اور دوسرا مضمون ''ٹونک کا دبی سفر'' عنوان سے بھی لکھا تھا۔یہ دونوں سفر نامے میرے مضامین کی کتاب ''لفظوں کے سائے تلے'' میں شامل ہیں۔جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔اسی طرح پونے میں سب سے پہلے سفر نامہ لکھنے کا شرف راقم الحروف کو ہی حاصل ہے۔''(۴۵)

''پونے سے رانچی کا سفر'' یہ سفر نامہ نذیؔر نے اس وقت تحریر کیا جب وہ افسانہ نگار ایم۔اے حق صاحب کی بیٹی کی شادی میں ۲۰؍ فروری ۲۰۱۰ء کو رانچی شریف لے گئے تھے۔اس سفر نامہ کا منصوبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ذہن میں پل رہا تھا۔سفر نامے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس شادی کے موقع کو غنیمت جانا اور ایم۔اے حق صاحب کو اس کارِ خیر میں شامل کیا گیا۔حق صاحب نے اس موقع پر ادب کی درخشاں شخصیات کو شادی کا دعوت نامہ بھیج دیا۔ان اصحاب میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، جناب شان بھارتی، شاہد جمیل، فراز حامدی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، سالک جمیل، جلیل اشرف، محمد حسین خوشدل، ڈاکٹر عامر صدیقی، ڈاکٹر زین رامش، ڈاکٹر نذیؔر فتح پوری، غلام دستگیر ضیاء، اور اندرا شبنم اندو شامل تھے۔اس سفر نامے کی ابتدا نذیؔر نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام کے ساتھ کی اور ایک توشیحی نظم ان کے حضور میں پیش کی ہے، بعدازیں ان تمام اصحاب کے نام تحریر کیے گئے ہیں جو اس شادی کی تقریب میں شرکت کرنے والے تھے۔گفتِ باہمی کے عنوان سے انہوں نے اس سفر نامے کی تخلیق کے منصوبے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ساتھ ہی شادی کی کچھ تصاویر کو بھی شامل کیا گیا ہے۔جس سے کتاب کی دلکشی اور بڑھ گئی ہے۔اس کے بعد انہوں نے سفر نامے کی ابتدا کی ہے جس میں ''سفر سے پہلے کا دن'' اور ۱۸؍ فروری سفر پر روانگی'' کے حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس معاملے میں نذیر کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔وہ ایک ایک چیز پر بڑی گہرائی سے نظر ڈالتے ہیں اور صفحہ قرطاس پر اُتار دیتے ہیں۔نذیؔر کے مشاہدے اور مطالعہ کے متعلق جناب محبوب راہیؔ اپنے مضمون ''نذیر کا پونے سے رانچی کا سفر دلپذیر'' میں فرماتے ہیں۔

''ان تمام تقریبات میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے موعود متذکرہ بالا نامور اور نمائندہ ادبی شخصیات کے علاوہ علاقائی اور مقامی معززین کے بارے میں حسبِ ضرورت تعارفی کلمات قدم قدم پر پیش آنے والے دلچسپ اور ناقابلِ فراموش واقعات کے ساتھ نذیؔر فتح پوری نے جابجا عصری ادبی احوال وکوائف

پر زبان بیان کی شگفتگی کے ساتھ جس دلچسپ اور فنکارانہ انداز میں تبصرے کیے ہیں ان سے موصوف کے مطالعہ کی وسعت، مشاہدے کی ندرت اور اظہار و بیان کی غیر معمولی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔''(۴۶)

''جمشید پور''اس عنوان میں انہوں نے اپنے جمشید پور میں قیام اور پھر رانچی کے لیے روانگی کے حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے رانچی میں قیام، شادی کی تقریب، دوست احباب سے میل ملاقات وغیرہ، ان سب کا نقشہ نذیر نے ایسے سلیقہ اور ہنرمندی سے کھینچا ہے کہ ہر منظر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔شادی کے دوسرے روز رانچی میں مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر عبدالمنان طرزی اور نظامت ایم، زیڈ خان نے کی اس مشاعرے میں جن شعراء اور ادباء نے شرکت کی ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔علیم صبانویدی، ڈاکٹر فراز حامدی، شاہد جمیل، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، سالک جمیل مالیر کوٹلہ، نذیر احمد یوسفی، شان بھارتی محمد حسین خوشدل، اندرا شبنم اندو، ڈاکٹر نذیر فتح پوری اور ان کے علاوہ نظامت اور صدارت کے فرائض انجام دینے والے ایم زیڈ اخان اور عبدالمنان طرزی بھی شامل تھے۔

اس مشاعرے کے زیر اہتمام آٹھ شعراء اور ادباء کی تصانیف کا اجرا بھی وجود میں آیا۔اس واقعہ کا ذکر نذیر نے ''کتابوں میں خدا کی روشنی ہے'' عنوان سے کیا ہے اور ان تمام شعراء اور ادباء کا تعارف بھی پیش کیا ہے جن کی تصانیف کا اجرا عمل میں آیا اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا اور شعراء نے یکے بعد دیگرے اپنا کلام سامعین کے روبرو پیش کیا۔مشارے کا آغاز ملیح بدر کے استقبالیہ گیت سے ہوا۔''۲۲ رفروری کو رانچی سے روانگی'' عنوان سے نذیر نے رانچی سے پونہ کے لیے روانگی کے حالات قلم بند کیے ہیں۔''لوٹ کے شاعر گھر کو آئے میں انہوں نے اس سانحہ کا ذکر کیا جو پونہ لوٹتے وقت جمشید پور کے اسٹیشن پر واقع ہوا۔انہوں نے روانگی کے ٹکٹ بک کروا رکھے تھے پر تاریخ بدل جانے کے سبب اُن کے وہ ٹکٹ خارج ہوگئے۔اور انہیں نئے سرے سے دوسرے ٹکٹ خریدنے پڑے۔کتاب کا اختتام ''ماحصل'' کے ساتھ ہوتا ہے اس میں نذیر نے ان سبھی افراد کا شکریہ ادا کیا ہے جو اس سفر میں ان کے ہم سفر بنے، مگر ان سب سے پہلے شکریہ ادا کیا اس خدا کا جو پوری کائنات کا خالق ہے۔شکریہ کے پھول اس عقیدت کے ساتھ خدا کے حضور میں پیش کیے ہیں۔

''شکریہ خدا تیرا
تو نے یہ سفر بخشا
تجربوں کی راہوں سے
میں گزر کے آیا ہوں
کانٹے چھوڑ آیا ہوں
پھول ساتھ لایا ہوں''(۴۷)

اور کیونکہ سفر ہی زندہ ہونے کی اور مسلسل آگے بڑھنے کی علامت ہے اس لیے نذیر نے اس جملے کے ساتھ اس تصنیف کا اختتام کیا ہے۔

''سفر مدام سفر ہے، سفر سے کیا ڈرنا''

نذیر کے اس سفرنامے پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اپنے مضمون ''نذیر فتح پوری کی تصنیف۔پونے سے رانچی کا سفر کے حوالے سے سفرناموں میں سفرنامہ نگار کی موجودگی میں فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری نے اپنے اس مختصر سے سفرنامے میں اپنی تخلیق صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا ہے۔ان کی

رگِ ظرافت بھی اکثر پھڑک جاتی ہے اور وہ دلچسپ پیرائے تحریر کرتے ہیں۔'' (۴۸)

ڈاکٹر عظیم راہیؔ اپنے مضمون ''پونے سے رانچی کا سفر'' میں نذیر کی سفرنامہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری نے اس سے قبل دو سفرنامے اور بھی لکھے تھے۔ پہلا سفرنامہ گمشدہ ڈائری کے اوراق کے عنوان سے لکھا تھا ۱۹۷۵ء میں اور دوسرا ''ٹونک کا سفر'' عنوان سے قلم بند کیا تھا جو ان کے مضامین کی کتاب ''لفظوں کے سائے تلے'' (۱۹۹۰) میں شامل ہیں۔ اس طرح پونہ میں سب سے پہلا سفرنامہ لکھنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہے۔'' (۴۹)

اس تصنیف کی خوبیوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے ڈاکٹر عظیم راہیؔ فرماتے ہیں۔

''دراصل محبت اور خلوص کا یہ سفرنامہ اس قدر دلچسپ اور رواں دواں ہیں کہ پڑھنے والا ایک بار شروع کردے تو ختم کیے بغیر نہیں رہتا، سفرنامہ میں زبان سلیس سادہ مگر انداز نہایت شستہ و برجستہ، شگفتگی کے ساتھ بے ساختگی شوخی اور لطیف پیرائے میں طنز کی چاشنی اس طرح شامل ہے کہ پڑھنے والا لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اکثر چوٹیں ہم عصر شاعر و ادیبوں پر بڑے مہذب اور شائستہ انداز میں، نہایت جامعیت کے ساتھ بے ساختہ ورطہ تحریر میں آ گئی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔'' (۵۰)

ڈاکٹر عظیم راہیؔ صاحب نے یک طرفہ رائے نہیں دی ہے بلکہ اس تصنیف میں نظر آنے والی خامیوں پر سے بھی پردہ اُٹھایا ہے۔ مثلاً

''غالبؔ ان کی شخصیت پر اس قدر چھائے ہوئے ہیں کہ انہوں نے 'دھواں کہاں سے اٹھتا ہے'' کو غالبؔ کے نام لکھ دیا جبکہ میرؔ کا یہ مقبولِ عام مصرعہ ہے۔'' (۵۱)

اسی طرح ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ۔

''دلکش جملوں سے شریک سفر قلمکاروں کا خوب نقشہ کھینچا ہے البتہ کہیں کہیں تسامح ہو گیا ہے جیسے مظہر سلیم کا تعلق چالیس گاؤں سے نہیں ملکا پور سے ہے۔ اور دو ایک، اسٹیشنوں کے نام کی ترتیب بھی آگے پیچھے ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے سفرنامہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ یہ انداز تحریر اس قدر رواں دواں اور متاثر کن ہے کہ بس پڑھتے جائیے اور سر دھنتے رہیے۔'' (۵۲)

''نذیرؔ کا یہ سفر ان کے تجربات کا ہی آئینہ دار نہیں ہے بلکہ ان کے پختہ ذہن اور انفرادی اسلوبِ بیان کا بھی ترجمان ہے ادبی شخصیات اور دلچسپ واقعات جس شگفتہ بیانی سے پیش کئے ہیں اس سے نذیرؔ کی غیر معمولی قدرتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ہم ان کے شریک سفر بن جاتے ہیں۔ یقیناً یہ سفرنامہ کا ہی نہیں بلکہ تاریخ ادب اردو کے لیے بھی نادر و نایاب تحفہ تسلیم کیا جائے گا۔

نذیرؔ کا سفرنامہ ''ایک سفر عمان کا'' ہنوز کتابی صورت میں نہیں آیا۔ اس کی ۱۳ قسطیں اب تک اسباق میں شائع ہو چکی ہیں اسباق کے قارئین میں اس سفرنامے کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب نذیر نے تلاش معاش کے سلسلے میں عمان کے شہر صلالہ کا سفر کیا تھا۔ اس وقت ایک ڈائری میں کچھ احوال درج کر لیے تھے اس کی بنیاد پر وہ قسط وار سفرنامہ سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ پونے سے رانچی کا سفر'' اور ''ایک سفر عمان کا'' اپنے دونوں سفرناموں میں وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ بلکہ ان کی موجودگی نے ہی ان سفرناموں میں زندگی کے حقیقی رنگ بھر دیئے ہیں۔

نذیؔر بحیثیت مضمون نگار

نثرلکھنا جتنا آسان ہے اچھی نثر لکھنا اتنا ہی مشکل ہے۔اور خاص کر تب جب آپ کو کوئی ادبی مضمون تحریر کرنا ہو۔لیکن اردو ادب میں ایسے فنکار خاصی تعداد میں موجود ہیں جو اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی نثر لکھتے ہیں اور اپنی ادبی نثر کے ذخیرے سے اردو ادب کو مالا مال کیے ہوئے ہیں۔ایسے ہی ایک نثر نگار نذیؔر فتح پوری ہیں۔جو نثر میدان میں اپنے قلم کے جادو سے سحر انگیز کارنامے انجام دینے میں معروف ہیں ان کی سحر انگیزی کا پہلا نمونہ ’’لفظوں کے سائے تلے‘‘ادبی مضامین کا مجموعہ جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔اس کی اشاعت میں مسلم کوآپریٹیو بینک (پونہ) کا مالی تعاون بھی شامل ہے۔اس تصنیف کی زینت وہ گیارہ مضامین ہیں جو کل ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہیں۔ان مضامین کی خاصیت یہ ہے کہ یہ کسی نہ کسی ادبی رسالے یا جریدے میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں اور اب انہیں یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کردیا گیا ہے۔اپنی اس تصنیف کا انتساب نذیؔر نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی ’’منیبہ‘‘ کے نام تحریر کیا ہے پھر’’اپنی بات‘‘میں نذیؔر اپنے ان مضامین کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

’’جہاں تک ان مضامین کی اہمیت اور افادیت کا تعلق ہے اتنا ہی عرض کروں گا کہ میرے یہ مضامین کوئی اضافی حیثیت کے حامل نہیں ہیں۔نہ ہی ان کی کوئی تنقیدی اور تحقیقی حیثیت ہے۔تاہم یہ ایک جذبہ صادق کے تحت سپرد قلم کی گئی محبت کی تحریر ہے جسے پڑھ کر ادبی ضیافت کا لطف اُٹھایا جاسکتا ہے۔‘‘(۵۳)

اس کتاب کے کچھ مضامین اردو ادب کی جن مایہ ناز شخصیات پر لکھے گئے ہیں ان میں کالی داس گپتا رضا، عصمت چغتائی، جگن ناتھ آزاد، رشید اعجاز اور انور مینائی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ باقی مضامین ’’اردو افسانہ منظر اور پس منظر‘‘ میرے اساتذہ‘‘ٹونک کا سفر‘‘ گمشدہ ڈائری کے اوراق، اور پونہ کے شاعروں کے مشہور شعر کے زیر عنوان سے ضابطہ تحریر لائے گئے ہیں۔اور سب سے آخر میں ایک آزاد نظم ’’دوسری کربلا‘‘ کے زیر عنوان قلم بند کی گئی ہے۔یہ نظم نذیؔر نے مشہور افسانہ نگار شفق کے ایک افسانے سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔نظم اپنے آپ میں مکمل ہے اور موثر انداز میں سپرد قلم کی گئی ہے۔نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

’’خدا اس وقت بھی خاموش تھا جب چودہ سو برس پہلے
معصوم بچوں کے سوکھے گلے تیروں سے چھیدے گئے تھے
نہر فرات پر یزیدوں نے قبضہ جمالیا تھا
پانی کو ترس گئی تھی پیغمبر کی اولاد
خدا اس وقت بھی خاموش تھا
نہیں بیٹے!ایسا نہیں کہتے
یہ مشیت ایزدی ہے
خدا اپنے محبوب بندوں کا امتحان اسی طرح لیتا ہے
ہم زندہ ہیں
ہمارا ایمان زندہ ہے، ہمارے عزائم زندہ ہیں

اگر ہم ہار گئے تب بھی جیت ہماری ہوگی

کیونکہ ہر کربلا کے بعد

اسلام ایک نئے خون کے ساتھ زندہ ہوتا ہے

یہ کربلا

سب سے پہلے ہم پر ہی گذری تھی

اور آج بھی اس کے محبوبِ نظر ہم ہی ہیں

اس امتحان کے لیے ہمارا انتخاب

قدرت کی طرف سے ہماری قوم کے حق میں

ایک ایسا نشانِ امتیاز ہے

ایک ایسا بیش بہا اعزاز ہے

جو ہمارے سوا آج تک

کسی کو نہیں ملا

اس لئے بیٹے

جیت ہماری ہوگی!''

یہ اس نظم کی آخری سطریں ہیں اور انہیں پڑھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پوری نظم اسی جذبے سے معمور ہے۔ مضامین کے اس مجموعے میں اس نظم کو کیوں شامل کیا گیا؟ یہ بات تو راقمہ کی سمجھ سے باہر ہے لیکن ایک بات ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ نذیرؔ ایک کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ایک نثر نگار ہی نہیں، ایک اچھے قاری بھی ہیں جو انہوں نے کسی اور کی نثری تخلیق سے اثر قبول کر کے اس نظم کی تخلیق کر ڈالی۔ نذیرؔ نے مضامین کی اس کتاب میں آسان مگر دلکش زبان کا استعمال کیا ہے۔ چاہے جملوں کی ساخت کا معاملہ ہو یا انتخاب الفاظ کا مرحلہ یا پھر طرزِ تحریر کی دلکشی ہو، یہ تمام تر ہنرمندیاں نذیرؔ کی اس تصنیف میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

''اعتراف:۔

اعتراف ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس تصنیف کا انتساب نذیرؔ نے اپنے رفیق خاص ''ڈاکٹر محبوب راہی'' کے نام کیا ہے۔ اس تصنیف میں چھبیس (۲۶) مضامین شامل کیے گئے ہیں جن کے عنوان ''غالبؔ بچوں کے شاعر''۔ ''غالبؔ کا ایک گمنام شاگرد'۔ حکیم خداداد خان دہلوی پونہ میں''۔ کلام اِقبال میں طنز ومزاح ایک جائزہ'' کالی داس گپتا رضا چند حقائق'' حسرت موہانی اور دیگر شعراء شری کرشن کے دربار میں'' جگن ناتھ آزاد اور ذکرِ دکن، اردو ادب کے تین بھائی اور رفیق جعفر' زاویۂ نقد ونظر پر ایک نظر' انور قمر کے چند افسانے ایک مطالعہ' اُدے سرن ارمان ادبی کے افسانے'' ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی'' سترنگی لہجہ کا شاعر زاہد کمال' اظہر جاوید اور ان کی نظم نگاری' علیم اللہ حالیؔ کی شاعری''' وقار مانوی کی غزل کے عکس'' ساز ومضراب کی شاعری، دھنک رنگوں کے سامنے دھوپ کھلی ہے'' کے رنگ روپ صحرا میں گم ندی کی تلاش''' صبح کی دستک پر

ایک نظر، طاہر رزاقی رباعی کے حوالے سے، کبیر سے متعلق ایک کتاب، نور منیری کی شخصیت کے چند روشن پہلو، اردو شاعری میں طنز و مزاح، ایک جائزہ'' مہاراشٹر کے اردو رسائل اور ''نیا اردو افسانہ، ادبی صحافت کے مسائل ہیں۔

ان مضامین کے مطالعہ سے نذیرؔ کی تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ حالانکہ اکثر تحریروں میں نذیرؔ نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں سے خود ہی انحراف کیا ہے۔ راقمہ کے خیال میں یہ بات ''نذیرؔ کی سادگی یا کسرِ نفسی پر محمول کرنا چاہیے۔ کیوں کہ لفظوں کے سائے تلے سے لے کر اعتراف کے مضامین تک نذیر نے تجزیاتی اور تنقیدی سطح پر جس طرح شاعری اور افسانوں کی کتابوں پر اظہار خیال کیا ہے اور جس انداز سے فن پاروں کی ادبی انداز میں تفہیم کی ہے ان سے ان کی نقد و نظر کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ نذیرؔ ادبی رسائل میں شائع ہونے والے قلم کار رہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے اکثر مضامین کسی نہ کسی ادبی رسالے میں شائع ہو چکے ہیں۔ جس کی تفصیل مندرجہ دیل ہے۔

اوے سرن ارمان کے افسانے (سہ ماہی اسباق پونے) ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی مطبوعہ (ماہناہ بے باک مالیگاؤں) (روزنامہ ''اعتماد'' حیدرآباد) اور روزنامہ جنگ کراچی (سہ ماہی اردو۔ امراوتی، ساحر لدھیانوی نمبر) ساز و مضراب کی شاعری (ماہنامہ شاندار۔ اعظم گڑھ دھنک رنگوں کے سامنے (ماہنامہ پرواز لندن۔ پاکستان) ''دھوپ کھلی ہے'' کے رنگ و روپ (رسالہ سنت نرنکاری دہلی اگست ۱۹۹۶ء'' ''صحرا میں گم ندی کی تلاش (ماہنامہ رنگ و بو حیدرآبا) ''نور منیری کی شخصیت کے چند روشن پہلو'' (سہ ماہی تکمیل ممبئی) نمبر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ چند مضامین ایسے ہیں جو کسی نہ کسی سمینار یا ادبی جلسے میں پڑھے گئے۔ نذیرؔ فتح پوری کے اسلوب پر نظر ڈالی جائے تو اسلوب بے حد سادہ اور سلیس نظر آتا ہے۔ نذیرؔ نے اپنے خیالات خوبصورت اور پرکشش انداز میں صفحہ قرطاس پر اتار دیئے ہیں۔ اور پیش کشی کا انداز ایسا منفرد ہے کہ مطالعہ کرتے وقت دلچسپی اور تجسس قائم رہتا ہے زیر مطالعہ کتاب کے مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔'

''غالبؔ کا ایک گمنام شاگرد'' کے عنوان سے حکیم خداداد خان دہلوی کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں، زاہد کمال کو ''ستر نگی لہجے کا شاعر'' کے لقب سے نوازا تو ''ساز و مضراب کی شاعری'' کہہ کر جناب بی ایس جین جوہر کی شاعری کو چار چاند لگا دیئے۔ ''دھنک رنگوں کے سامنے'' کے زیر عنوان وسیم بٹ کی تصنیف دھنک کے سامنے پر تبصرہ تحریر کر دیا۔ کہیں ''دھوپ کھلی ہے'' کے رنگ و روپ'' لکھ کر منوہر لال آہوجہ بیدلؔ سرحدی کے شعری مجموعے پر اپنی رائے قلم بند کی ہے تو کہیں ''صحرا میں گم ندی کی تلاش'' کر کے فاروق انجینئر کی شاعری میں خوبیاں تلاش کر لیں۔ اور پھر جب شری ویریندرؔ پرکاش اکیلا کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو ''صبح کی دستک پر ایک نظر'' پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ آخر میں ''ادبی صحافت کے مسائل'' کے عنوان سے اردو صحافت کے مسائل پر بحث کی ہے۔ اور مسائل کے حل پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس مجموعے کا مضمون ''حسرت موہانی اور دیگر شعراء شری کرشن کے دربار میں'' ماہنامہ اردو دنیا'' کے نومبر ۲۰۱۰ء جلد۔ ۱۲/ شمارہ ۱۱ کے رسالے میں صفحہ نمبر ۲۸/ پر شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور مضمون اردو شاعری میں طنز و مزاح ایک جائزہ ''جدید فکر و فن'' ہماچل پردیش، سہ ماہی ادبی رسالے کے اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء جلد ۲۵/ شمارہ ۹۳/ کے صفحہ نمبر ۴۶ پر اسی عنوان کے ساتھ شائع ہوا۔ مجموعی طور پر اعتراف کے مضامین میں تنوع ہے مضامین میں تجزیاتی انداز بھی ہے، اور تنقیدی بھی، ساتھ ہی چند تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے۔ جس سے تخلیق کاروں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ملے گا۔ نذیرؔ کی اس تصنیف کے ابتدائی مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر عظیم راہیؔ کا خیال ہے کہ ۔

> ''کتاب کی ابتداء میں کلاسیکل شعراء جیسے غالبؔ، اقبالؔ اور حسرتؔ وغیرہ پر مضامین شامل ہیں اور خاص
> بات یہ ہے کہ اردو ادب کے ان مقبول اور اہم ستونوں پر انہوں نے ایک نئے زاویے اور ایک نئے انداز

سے لکھنے کی سعی کی ہے۔''(۵۴)

نذیرؔ کا ایک مضمون ''مسئلہ مالک رام کے مسلمان ہونے کا'' اس لیے اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس مضمون میں انہوں نے مالک رام کے متعلق ایک متنازع موضوع پر اپنی رائے پیش کی اور اس مسئلے کو چنگاری سے شعلہ نہ بنانے کی گزارش کی ہے۔ کیونکہ ان کی نظر میں مالک رام کے ہندو یا مسلمان ہونے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اردو کے اہم محقق اور سرکردہ ادیب تھے، نذیر لکھتے ہیں۔

''مالک رام ہماری نظر میں اس لیے بڑے نہیں ہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ اس لیے بڑے ہیں کہ اردو والے تھے۔ انہوں نے اردو میں سوچا، اردو میں لکھا اور اردو والوں کے حوالے کیا۔ اردو ادب میں جو بے مثال کارنامے وہ انجام دے کر گئے ہیں۔ کیا ان کو یاد رکھنے کے لیے وہ کافی نہیں ہیں۔ کس لیے ہم انہیں مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں کیا آج اردو والوں نے اپنی زبان کے سارے مسائل حل کر لئے ہیں؟ صرف ایک ہی مسئلہ رہ گیا ہے۔ مالک رام کے مسلمان ہونے کا۔؟''(۵۵)

نذیرؔ نے مالک رام کے اسلام قبول کرنے کے متعلق قیاس آرائی بھی کی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

''جہاں تک مالک رام کے اسلام قبول کرنے کی بات ہے۔ اس تعلق سے جو فسانے سنائے گئے ہیں ان سے لگتا ہے کہ یہ عقیدے کا نہیں دل کا معاملہ تھا کسی قادیانی خاتون سے ان کو عشق ہو گیا تھا ظاہر ہے کہ ہندو دھرم کے مطابق پہلی بیوی کی موجودگی میں کوئی ہندو دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ مالک رام نے بھی چوری چھپے ایسا کر لیا ہوگا۔ تب بھی وہ مسلمان کہاں سے ہوئے۔؟ قادیانی ہوئے۔ اگر قادیانیوں کو مسلمان سمجھا جاتا ہے تو پھر مالک رام مسلمان ہوں گے۔''(۵۶)

اس مضمون میں نذیرؔ نے کالی داس گپتا رضا کے حوالے سے بھی چند حقائق پیش کئے ہیں جس میں رضاؔ صاحب نے مالک رام سے ان کے قبولِ اسلام سے متعلق دریافت کیا تھا مگر کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ آخر میں نذیرؔ اس رائے پر اکتفا کرتے ہیں۔

''میری رائے یہ ہے کہ اس مسئلے کو ہوا دے کر بگولہ نہ بنایا جائے۔ اس طرح اردو کے سیکولر کردار پر آنچ آتی ہے۔ ویسے بھی اردو والوں کے ہاتھوں اس کا دامن بار بار جلایا جا چکا ہے اس کے باوجود یہ دامن محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کرنا ہمارا ادبی فریضہ ہے۔''(۵۷)

نذیرؔ نے اپنے استادِ محترم عتیق احمد عتیق کی غزل گوئی پر ایک مضمون ''عتیق احمد عتیق کی غزل گوئی'' لکھ کر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ اس مضمون میں انہوں نے عتیق صاحب کی غزل کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا ہے عتیق صاحب کی غزل نے ترقی پسند تحریک سے لے کر جدید غزل تک کا سفر طے کیا ہے۔ وہ اپنے استاد عتیق صاحب کے لیے فرماتے ہیں۔

''اردو کی جدید غزل جب اپنے معماروں کی فہرست مرتب کرے گی تو نادرہ کار، افکار نو بہار کے نگہدار عتیق احمد عتیق جیسے شاعر کا نام اس فہرست میں امتیازی حیثیت کا حامل قرار پائے گا۔''(۵۸)

نذیرؔ کی اطلاع کے مطابق ان کے ادبی مضامین کی تعداد ۱۰۰ ر سے زائد ہے۔ وہ اپنے مضامین کا تیسرا مجموعہ 'تائید و تردید' کے عنوان سے مرتب کر چکے ہیں۔ جس میں میر تقی میر، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، حسرت جے پوری، گلزار، اظہر جاوید، کے فکر و فن پر مضامین

شامل ہیں۔کتاب کے دوسرے باب، یعنی ''تردید'' کے حصے میں ان کا قلم جارح ہوگیا ہے انہوں نے یہ مضامین سپردِقلم کرتے وقت اپنی نرم خوئی کی عادت سے قدرے بغاوت کی ہے۔نذیؔر فتح پوری نے متعدد شعری اور افسانوی تصانیف کے پیش لفظ بھی سپردِقلم کئے ہیں اور بے شمار ادبی کتابوں پر ان کے تبصرے بھی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔یہاں تمام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔کیوں کہ نذیؔر فتح پوری نے نثر کے میدان میں بے تحاشہ لکھا ہے۔قلم برداشتہ لکھا ہے۔بے حد وحساب لکھا ہے۔موضوع کی ان کے یہاں کمی نہیں، الفاظ کا ذخیرہ بھی وافر تعداد میں ان کے پاس موجود ہے۔ان کے قلم میں روانی اور احساسات میں جوانی کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی تنوع کی چاشنی ہے۔وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو بس لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ان کے نثری فن پاروں کا ایک عمیق اور بسیط جہاں ہے۔جس سے سرسری گزرنے کے لیے بھی وقت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔

نذیر فتح پوری بحیثیت تاریخ، تذکرہ اور تحقیق نگار

تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی:-

شعری ادب زندگی کو خوشیوں سے معمور کردیتا ہے۔روح کو سکون پہنچاتا ہے اور دلوں کو تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔غزل، نظم قطعہ، رباعی مثنوی، مرثیہ قصیدہ سبھی نے ادب کے شیدائیوں کو مسرور کیا اور ان کے ذہن ودل کو خوشی سے بھر دیا۔اس کے ساتھ ہی ادب کے دوسرے پہلو یعنی نثری ادب نے بھی لوگوں کو سوچنے سمجھنے کی طاقت وقوت عطا کی۔جہاں شاعری نے خوابوں کی دنیا کو سجایا وہیں نثر نے حقیقت کی دنیا سے روشناس کیا۔ناول، افسانہ، ڈرامہ کے علاوہ تنقید وتحقیق اور تذکرہ نگاری نے بھی ہمیں ترقی کے راستے پر گامزن کیا۔تنقید نے جو لگام ادب پر کسی اسے تحقیق نے صحیح راستہ دکھایا۔اور تذکرہ کے ذریعہ ہمارے ماضی کا سرمایہ محفوظ رہا۔

راجستھان میں بھی بہت اہم تذکرے لکھے گئے راجستھان کا سب سے پہلا تذکرہ فرحت الشعراء ہے۔تذکرہ شعراء جے پور، تذکرہ شعرائے کوٹہ، تذکرہ شعراء ٹونک، تذکرہ شعراء جھالاواڑ وغیرہ بھی اپنے اپنے ضلع کے شعراء کا احاطہ کیے ہوئے ہیں ان میں ایک تذکرہ تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاوٹی بھی ہے جسے نذیر فتح پوری نے تحریر کیا ہے۔اس تصنیف میں فتح پور شہر کی تاریخ کے ساتھ ساتھ وہاں کے شعراء کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے کتاب کی ابتدا میں چند تصاویر شامل ہیں جن میں فتح پور کے نوابین ریلوے اسٹیشن نواب الف خان کا مقبرہ، مسجد حضرت عائشہ صدیقہ، باوڑی گیٹ، جین مندر، درگاہ نواب دردولت خان اور نذیر کے ساتھ چند دوست واحباب کی تصویریں بھی شامل ہیں کتاب کا انتساب نذیر نے اپنے عزیز دوست شبیر فراز فتح پوری کے نام کیا ہے۔بعدازیں ''ایک نظم فتح پور کے نام'' عنوان سے شامل ہے۔جس میں انہوں نے اپنے وطن عزیز سے محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے اس نظم میں وطن سے دوری کا درد شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

احساس وطن کا لہرایا

پردیس میں کیا کیا یاد آیا

یہ کیسی وطن کی یادیں ہیں

کچھ آہیں ہیں فریادیں ہیں
کیا اور لکھوں اس کاغذ پر
ہوں زخم لکھے جس کاغذ پر
تنہائی میں آنسوں ٹپکے ہیں
یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں
ان ٹکڑوں میں فریادیں ہیں
یہ میرے وطن کی یادیں ہیں
پردیس میں کیا کیا یاد آیا''

گفت باہمی میں نذیر نے اس کتاب کے متعلق اپنے احساسات وجذبات کا اظہار کیا ہے اور کتاب کی وجہ تصنیف پر روشنی بھی ڈالی ہے۔

''تذکرہ فتح پور شیخاوٹی کے عنوان سے ڈاکٹر فراز حامدی کا مضمون شامل ہے جو کافی اہم ہے کیوں کہ انہوں نے اس تذکرہ کو شیخاوٹی کا پہلا تذکرہ تسلیم کیا ہے۔ ساتھ ہی اپنے مضمون میں تذکرہ کی مختصرسی تاریخ بھی پیش کی ہے اس مضمون میں راجستھان کا اولین تذکرہ حدیقہ اردو کو تسلیم کیا ہے۔ تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی سے متعلق فراز لکھتے ہیں۔

''تذکرہ فتح پور شیخاوٹی ایک مکمل تذکرہ ہے۔ اور یہ تذکرہ فتح پور شیخاوٹی کی شعری ادوار کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تذکرہ نگار نے اس تذکرے میں شامل قدیم وجدید شعراء کی شخصیت اور فنی صلاحیتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ان کے حالات تحریر کرتے وقت نہایت خلوص، محبت اور سنجیدگی سے کام لیا ہے اور قدم قدم پر اپنی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔ جیسے جیسے مرتب کا قلم آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے اس کی خداداد صلاحیتیں اجاگر ہوتی گئی ہیں'' (۵۹)

اس کے بعد احمد علی خان منصور چوروی کا مضمون '' نذیر فتح پوری میری آنکھ کا آنسو'' شامل ہے۔ جس میں منصور صاحب نے نذیر سے اپنی رغبت ومحبت کا اظہار کیا ہے اور خاندانی رفاقت کی بنا پر نذیر کو اپنی آنکھ کا آنسو تسلیم کیا ہے۔

بعنوان ''اعتراف'' نذیر نے اس تصنیف کی تخلیق میں جن تصانیف سے فیض حاصل کیا ان کے نام بیان کیے ہیں اور ساتھ ہی ان اصحاب کا بھی ذکر کیا ہے جو اس تصنیف کی تخلیق میں مددگار ثابت ہوئے۔ نذیر ان کے شکر گزار ہیں بقول خود۔

''نوابوں کے واقعات لکھتے وقت میں نے صرف تین کتابوں پر انحصار کیا قائم راسا، قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس اور نگر فتح پور نگراں ناگر۔ فتح پور کے نوابوں کی مکمل تاریخ اردو میں نہیں ملی، البتہ فخر التواریخ میں مختصر حالات درج ہیں ان کتابوں سے من وعن واقعات بھی لیے ہیں۔ راجستھان اردو اکادمی کے سابق سکریٹری جناب معظم علی صاحب نے تذکرہ شعرائے جے پور تذکرہ شعراء کوٹا تذکرہ شعراء ادے پور اور تذکرہ شعراء بیکانیر فراہم کر کے مجھے تذکرہ نگاری میں مدد کی شبیر فراز غلام دستگیر ضیاء نے تذکرہ فتح پور شیخاواٹی کے لیے اول سے آخر تک ہر ممکنہ تعاون دیا۔ جان کوی نعمت خان اور تاج کو تیری سے متعلق ہندی ادب میں موجود تذکروں کی نشاندہی ڈاکٹر دکشت نے فرمائی اور ادھو

مہاجن بسمل نے کتابوں کی فراہمی میں مدد کی۔ میں ان تمام کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں'' (۶۰)

''موجودہ صورت حال'' میں انہوں نے فتح پور میں اردو کی حالت غیر پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ''قائم خانی قوم کی ابتداء'' میں قائم خانی قوم کے آغاز وارتقاء سے متعلق حقائق پیش کیے ہیں اور ساتھ ہی قائم خانی نوابوں میں پائی جانے والی خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے۔

فتح پور میں مسلمانوں کی تقریباً ۱۲۸ اٹھائیس برادریاں موجود ہیں جن میں سبزی فروش، تیلی، بیوپاری، خانجی، قائم خانی، خلیفہ انصاری، شیشہ گران، چھیپّا، بساطی، گجر، نیاریئے، شیخ، مراثی، لوہار، سید، اور منیار وغیرہ ہیں۔ یہاں کی اکثریت فکر معاش حاصل کرنے کے لیے بیرونی ممالک میں رہائش پذیر ہیں۔ اس بات کا ذکر نذیر نے ''باشندگان فتح پور'' میں کیا ہے۔

''فتح پور کے تاریخی تضادات'' اس عنوان میں نذیر نے مختلف تصانیف کے حوالے سے فتح پور کی بنیاد کے تاریخی تضادات کو پیش کیا ہے اس کے لیے انہوں نے محبوب علی خان کی تصنیف ''قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس اور جان کوی کی'' قائم راسا وغیرہ سے فیض حاصل کیا اور صحیح تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے مختصر تاریخ فتح پور شہر کے نوابین میں ان نوابوں کا ذکر کیا ہے جن کی سرپرستی میں فتح پور نے ترقی کی منازل طے کیں اور بعد میں رفتہ رفتہ ترقی کر کے موجودہ فتح پور وجود میں آیا فتح پور کو نواب فتح خان نے ۱۴۵۱ سموت ۱۵۰۸ میں آباد کیا اور اپنے نام کی نسبت سے فتح پور نام دیا ان کے بعد نواب جلال خاں، نواب دردولت خان، نواب ناہر خان، نواب فدن خان، نواب تاج خان، نواب الف خان، نواب دولت خان دوئم، سردار خاں، نواب دیندار خاں، نواب سردار خاں دوئم اور آخری نواب قائم خاں نے نوابی کے فرائض انجام دیے ۱۴۵۱ سے ۱۷۳۰ تک نوابین نے حکومت کی اور اسی کے ساتھ یہ سنہرا دور ختم ہو گیا۔ اس عنوان کے تحت نذیر نے فتح پور کے نوابین کے ادوار کو مستند حوالوں کے ساتھ پیش کیا۔

اس کے بعد ''شہنشاہ بابر فتح پور میں'' لکھ کر نذیر نے بابر کے فتح پور آنے کے واقعہ پر بحث کی ہے اس کی تصدیق کے لیے انہوں نے ''نگر فتح پور نگراں ناگر''، ''فخر التواریخ'' اور ''قائم راسا'' سے مثالیں پیش کی ہیں جو ایک تاریخی اور مستند سرمایہ ہے اور راجستھان کے اردو ادب میں قیمتی اضافہ ہے بعدازیں جان کوی نعمت خان، راسا میں فارسی الفاظ ''جان کوی نعمت خان کی کتابوں کے نام، راسا کی زبان'' جان کوی کا مذہب'' ''تاج بی بی کے عناوین سے نذیر نے جان کوی اور ان کی تصنیف قائم راسا کے حوالے سے معلومات فراہم کر کے ان کی خصوصیات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ جان کوی کی تصانیف کے نام بھی پیش کیے ہیں اور تاج بی بی جو فتح پور کے پانچویں نواب فدن خان کی بیٹی تھی اور مغل بادشاہ اکبر سے منسوب ہوئی تھیں وہ ایک اچھی شاعرہ تھی۔ اور تاج تخلص اختیار کرتی تھیں اور یہ انکشاف بھی کیا کہ ان کی تصنیف بیوی باندی کا جھگڑا ہندی رسم الخط میں شائع ہوئی اور ناقدین کے لیے موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔

فتح پور کے حکمراں کے عنوان سے نذیر نے شیخاوت حکمرانوں کا ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے قائم خانی نوابین کے بعد ریاست فتح پور کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالی قائم خانی نوابین کی حکومت ۲۸۰ سال یعنی ۱۴۵۱ سے ۱۷۳۰ تک تھی اس کے بعد ۱۷۳۱ میں راؤ شری شیو سنگھ نے شیخاوت حکومت کی بنیاد رکھی نگر فتح پور نگراں ناگر کے مصنف نے اس سچائی پر ان الفاظ میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جسے نذیر نے اپنی تصنیف شامل کیا ہے۔

> ''شیخاوت راجپوتوں کی ابتدا شیخا جی سے ہوئی ہے یہ شیخا جی کون ہیں؟ یہ کچھواہ خاندان کے ۱۴ ویں بزرگ نرسنگھ جی کے چھوٹے بھائی بالا جی کے بیٹے تھے۔ جو ایک مسلم فقیر شیخ برہان کی دعا سے پیدا ہوئے تھے۔ شیخ برہان تیمور لنگ کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کیلئے ہندوستان آئے تھے۔'' (۶۱)

''فتح پور۔۔مسجدوں کا شہر فتح پور، کنوؤں کا شہر، حویلیوں کا شہر خانجی کی حویلی، جدید طرز تعمیر کے نمونے ان عناوین کے تحت نذیر ان تمام خاص عمارتوں کا ذکر کیا ہے جو فتح پور کی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہیں۔اور اپنے میں ایک الگ پہچان بنائے ہوئے ہیں۔

''چیدہ چیدہ'' کے زیر عنوان نذیر نے ۱۳ مندرجہ عناوین بھی شامل کیے ہیں جو اس طرح سے ہیں (۱) کچھ اور نوابوں کے بارے میں (۲) فخر التواریخ (۳) پاکستان میں فتح پور کا تذکرہ (۴) آستانہ در دولت خان (۵) فتح پور کی آبادی (۶) موسم اور فصلیں (۷) کاروبار (۸) سواریا (۹) میلے اور تیوہار (۱۰) تیج اور گنگور (۱۱) بدھ گروجی کا میلہ (۱۲) بھوری مٹی (۱۳) منسٹر گاڑی ان سبھی عناوین میں فتح پور سے متعلق معلومات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ یہاں کے موسم، کاروبار، تہوار میلے ٹھیلے، آواجاہی کے لیے ملنے والی سواریاں اور یہاں تک کہ دور دور تک پھیلی ہوئی بھوری مٹی کا بھی ذکر کیا ہے اور منسٹر گاڑی کے عنوان سے جس راز سے پردہ اٹھایا گیا ہے وہ بھی کم دلچسپ نہیں، فتح پور میں اناج اور بوجھ ڈھونے کے لیے زیادہ تر گدھا گاڑی سے کام لیا جاتا ہے اور اسے ہی منسٹر کی گاڑی کہا جاتا ہے۔

فتح پور کی فضاؤں میں نغمگی کا جادو بکھرا ہوا ہے۔ پھر چاہے غزل کا سماں ہو یا محفل میلاد، یہاں کے شعرا اور میلاد خواں اصحاب نے اپنے ترنم کے جادو سے سب کو مسرور کیا ہے ان میں صدیق سیاں، حاجی عثمان غنی نیلگر، مرحوم میر نیلگر، محمود کھوکھر، یوسف غلام، محمد بکھید عرف یوسف لنگڑا، یوسف محمد بخش، کا گلیا یوسف، عبدالقادر کھوکھر عرف بھگوان، مرحوم نثار پیر، مرحوم جیون حیات، مرحوم ادریس، مرحوم قاضی رضا محمد، مرحوم قاضی عبدالغفور، ماسٹر نواب علی، ملاجی کاشفیع، یاسین پیر کھڑو شاہ، محبوب قاضی، مرحوم حاجی نور محمد خان جوڑ، سراج قاضی، نثار میر، ستار اینڈ پارٹی، وغیرہ کے نام شامل کیے جاسکتے ہیں۔

دور حاضر میں شفیق برہان، نثار احمد راہیؔ، عنبر فتح پوری، غلام جیلانی نجمی، اسماعیل عادل، منصور نیر، شبیر فراز فتح پوری محفل غزل میں ترنم کا جادو جگانے میں ماہر ہیں۔ان سب کے پہلے مشہور گلوکارہ بسنتی تھی جو اپنے سحر انگیز ترنم سے فتح پور کی فضاؤں کو مسرور کرتی تھی۔

''شیخاواٹی میں پہلی تصنیف کے عنوان سے نذیر نے راجستھان کی پہلی نثری تصنیف کا پتہ لگانے کی کوشش کی اور اس کے لیے انہوں نے ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اور ڈاکٹر فیروز کے مضامین سے کسب فیض کیا۔

عارف فتح پوری کا استقبالیہ نغمہ، اسلامیہ اسکول عیدگاہ، فتح پور کا خصوصی استقبالیہ نغمہ، فتح پور کی ادبی انجمنیں، عنوانات کے ذریعہ نذیر نے اس استقبالیہ گیت کا ذکر کیا ہے جو پیر محمد عارف فتح پوری نے ۱۹۵۲ میں لکھا تھا اور طلبہ نے عیدگاہ اسکول کے ایک جلسے میں اپنی مترنم آواز میں گایا تھا بزم شاہد، بزم احساس اردو ادب، اور انجمن ترقی اردو بزموں کے ذریعہ انہوں نے ان محفلوں کا ذکر کیا جو ادب کے نام پر سجائی گئیں اور فتح پور کے ماحول کو ادبی نیرنگیوں سے معمور کردیا۔

''مشاعرے اور نشستیں'' عنوان میں نذیر نے فتح پور میں ہوئے مشاعروں اور اعزازی محفلوں کا ذکر کیا ہے جو مختلف شعراء کے اعزاز میں منعقد کیے گئے۔اور ان کی تصانیف کی رسم اجراء بھی وجود میں آئی ان مشاعروں اور اعزازی محفلوں میں ۱۹۶۴ اور ۱۹۶۵ کا مشاعرہ، ۱۹۷۹ کا آل انڈیا مشاعرہ، ۱۹۸۳ کا آل انڈیا مشاعرہ، ۱۹۹۲ کا مشاعرہ دیوان سرور کے اجراء پر منعقدہ مشاعرہ، ۱۹۹۸ کا بزم احساس اردو ادب کی جانب سے منعقد مشاعرہ، ۲۷ مئی ۲۰۰۰ کا آل انڈیا مشاعرہ، شین کاف نظام کا اعزاز ڈاکٹر اظہار مسرت کی تصنیف کے اجراء پر منعقد مشاعرہ بزم شاہد اردو ادب فتح پور کے زیر اہتمام ۱۵ مارچ ۱۹۹۱ میں منعقد مشاعرہ مئی ۲۰۰۰ کا انجمن ترقی اردو کی جانب سے جشن اعزاز منصور چوروی، ۲۰ فروری ۱۹۹۹ کو انجمن ترقی اردو کی جانب سے منعقد کل ہند مشاعرہ اور جون ۲۰۰۰ میں نذیرؔ فتح پوری کے اعزاز میں منعقد جلسہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔مشاعروں کی اہمیت اس

لئے مسلم ہے کیوں کہ یہ شعراء اور عوام کے بیچ ایک مستحکم رشتہ استوار کرتے ہیں اور جدید شعراء کو عوام سے مخاطب ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

اس کے بعد اپنی تصنیف میں نذیر نے ان تمام شعراء کا ذکر کیا ہے جنہوں نے فتح پور میں شعر و ادب کی محفلوں کو آراستہ کیا ان میں کچھ اندرون فتح پور اور کچھ بیرون فتح پور سے ہیں انہیں نذیر نے مہمان شعراء کے نام سے مخاطب کیا۔ان شعراء میں عشرت دھولپوری ،شبیر اثر ،عبداللہ آزاد، پارس رومان ،دلدار ہاشمی ،مستان بیکانیری، منصور چوروی ،سالک عزیزی ،مخمور سعیدی ،شین کاف نظام ،شاہد رتلامی ،راشد ٹونکی ،فراز حامدی، فاروق انجینئر ،اظہار مسرت اور ملکہ نسیم وغیرہ ہیں۔نذیر نے ان تمام شعراء کے حالات زندگی اور انتخاب کلام کو شامل تصنیف کیا۔اس کے بعد مرحوم شعراء کے عنوان سے ان شعراء کو شامل کیا گیا ہے جنہوں نے اپنی زندگی میں اردو کی شمع کو روشن رکھا۔ان میں حاجی نجم الدین آفتاب شیخاواٹی ،حاجی محمد نصیر الدین شاہ ،نور احمد صاحب نورؔ فتح پوری ،مولانا محمد رمضان فاروقی ،خواجہ غلام سرور فتح پوری، حافظ عیسیٰ فتح پوری، خواجہ محمد حنیف ،ابراہیم خیالؔ فتح پوری ،غلام سرور وفاؔ فتح پوری ،ممدوح آوارہؔ ،منور علی منورؔ ،محمد جیون حیات ،قمرالدین خان جوڈ قمرؔ ،ماسٹر اصغر علی خان اور حاجی یاسین شامل ہیں۔اس حصہ میں نذیر نے ان تمام مرحوم شعراء کے متعلق ضروری معلومات یکجا کر کے ان کے کلام کو شامل کیا اور ان کی تصانیف کے نام بھی پیش کیئے۔

اس کے بعد موجودہ شعراء کے عنوان سے ان تمام شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جو نذیر کے ہم عصر ہیں اور فتح پور میں شعر و ادب کی محفلیں سجاتے ہیں اپنی شاعری کے ذریعہ باغ اردو کو اشعار کے پھولوں سے مہکاتے رہے ہیں اس باغ کو سجانے والوں میں پیر محمد عارف نجمی ،عارفؔ فتح پوری، عمر دین خاں صباؔ چوروی ،عبدالکریم خان کریمؔ ،غلام جیلانی نجمی فتح پوری، محمد اسماعیل عادلؔ فتح پوری ،نثار احمد راہی فتح پوری نذیرؔ فتح پوری، منصور احمد نیرؔ فتح پوری، محمد الیاس قمرؔ فتح پوری ،شبیر حسن فرازؔ فتح پوری ،صلاح الدین عنبرؔ فتح پوری ،شوکت علی گوہرؔ فتح پوری ،لیاقت علی خان وقارؔ فتح پوری، عبدالرب نشترؔ فتح پوری، پون کمار پروانہ ،غلام دستگیر ضیاءؔ فتح پوری ،شنبھو پرساد پاریکھ ،محمد حسین مدنی ،ناصر فتح پوری ،رفیق راز فتح پوری ،یعقوب ناز فتح پوری ،اسمعیل غازیؔ فتح پوری ،شوکت جذبی فتح پوری ،رفیق منظرؔ فتح پوری اور ادریس راز چوروی شامل ہیں۔

''فتح پور شیخاواٹی کے چند تعلیمی ادارے'' عنوان سے نذیر نے فتح پور کے تعلیمی اداروں کا بیان کیا ہے ان میں اسلامیہ اسکول عیدگاہ کا خاصہ ذکر کیا گیا ہے۔یہ وہی اسکول تھا جہاں نذیر نے اپنے علم کی پیاس بجھائی ،اس اسکول کے آغاز و ارتقاء اور موجودہ صورت حال کو نذیر نے تفصیل سے بیان کیا اور ساتھ ہی ساتھ اسلامیہ اسکول کی تصویر بھی اس تصنیف میں شامل کی ہے۔راقمہ کو بھی یہ اسکول دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اس کے بعد اسلامیہ اسکول عیدگاہ کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اور نذیر نے اسلامیہ اسکول عیدگاہ کے لئے اپنی محبت اور رفاقت کا اظہار اپنی نظم اور غزل کے ذریعہ کیا۔نظم کی چند لائنیں ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

میرے اندر کا وہ معصوم ہمکتا بچہ   تتلیوں نے جسے رنگوں میں ڈبویا تھا کبھی
آج اس صحن میں پھرتا ہے شرارت کرتا   آج اس منظر نایاب پہ قرباں ہے دل

روشنی ننھے دماغوں کو دکھانے والے
علم کے دیپ ہر اک گام جلانے والے
یاد آتے ہیں محبت سے پڑھانے والے

آج گھبرا کے زمانے کی المناکی سے   مادر علم پناہوں میں تری آیا ہوں

بڑھ کے اب اپنے گلے سے تو لگالے مجھ کو　　　　اپنے شفقت بھرے آنچل میں چھپالے مجھ کو

(تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی۔ص۔۱۵۹)

اس کے بعد آزاد سینئر سیکنڈری اسکول اور مدرسہ البنات فاطمہ الزہرہ فتح پور کے بارے میں تفصیلی معلومات مع تصاویر کے پیش کی گئی ہیں۔

بعد ازایں چند اہم شخصیتیں عنوان سے فتح پور کی ان خاص شخصیات کا ذکر ہے جنہوں نے فتح پور کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے اور آج بھی اسے سجانے سنوارنے اور چمکانے میں مصروف ہیں ان حضرات میں مرحوم نیتاجی عبدالغفار خان پڑھیار، عبدالستار خان پڑھیار، مرحوم حاجی وزیر دھوبی مرحوم عبدالغنی وکیل شہر قاضی رضا محمد، مستان بابا، بہادر خان لنگا، مرحوم قاضی رحمت اللہ۔ مرحوم اصغر بھوان، اصغر محمد خان ٹھیکدار، بابو پہلوان، شوکت علی جوڈ، مرحوم اصغر علی، غلام رسول خان جوڈ محمد فاروق قریشی، حکیم عثمان دھوبی مولوی عبدالسمیع صاحب، مرحوم حاجی حسین خان جوڈ ، حاجی نور خان بھوان، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس تصنیف کے ذریعہ نذیر نے اپنے شہر کا تاریخی ادبی سماجی سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے مکمل احاطہ پیش کیا ہے پھر چاہے وہ فتح پور شہر کو بسانے کے متعلق روایات ہوں وہاں کے نوابین کی معلومات ہوں وہاں کے تعلیمی ادارے ہوں یا پھر ان لوگوں کا ذکر ہو جنہوں نے فتح پور کو نئی پہچان نیا چہرہ عطا کیا ان سب مرحلوں پر نذیر نے انصاف کیا ہے اور اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ ظہیر غازی پوری اپنے ایک مضمون تاریخ و تذکرہ فتح پوری شیخاواٹی ایک جائزہ میں اس تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

”میرے خیال میں نذیر فتح پوری کا یہ تذکرہ و تاریخ میر تقی میر کے نکات الشعراء کی طرح شیخاواٹی کا پہلا مبسوط جامع اور منفرد تذکرہ ہے۔ اسے نظر انداز کیے ہوئے ایک چھوٹے سے تاریخی شہر کا بڑا تذکرہ بلکہ کارنامہ کہنے میں کوئی باک نہیں کیوں کہ نذیر فتح پوری نے اسے انتہائی معروضی واقعاتی اور تحقیقی انداز میں قلمبند کیا ہے اور شگفتہ بیان پر خاص نظر رکھی ہے۔“ (۶۲)

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نذیر کی تصنیف تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی پر اپنی گراں قدر رائے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”آپ کی کتاب تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی بہت دلچسپ ہے۔ اور یہ بات بھی قابل قدر ہے کہ آپ نے عام پیش یا افتادہ موضوعات کو چھوڑ کر ایک تاریخی و تحقیقی میدان میں قلم فرسائی کی اور سچ پوچھئے تو یہ کتاب صرف تاریخی ہی نہیں بلکہ اس میں انسانیت اور سماجی تفصیلات بھی شامل ہیں جس نے اس کتاب کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے۔“ (۶۳)

جناب مظہر امام صاحب اس تصنیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے ایک خط جو انہوں نے نذیر کو ۱۱ ؍اگست ۲۰۰۳ کو تحریر کیا تھا میں لکھتے ہیں۔

”آپ نے نسبتاً کم معروف علاقے کا اتنا عمدہ تذکرہ لکھ کر تذکرہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ تحقیقی کتاب ہونے کے باوجود یہ شروع سے آخر تک دلچسپ ہے۔ اتنا مواد جمع کرنے میں آپ کو جس جانفشانی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس کا میں اندازہ کر سکتا ہوں“ (۶۴)

کوٹہ راجستھان سے عقیل شاداب صاحب اس تصنیف پر اپنی رائے دیتے ہوئے نذیر کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ۔

”آپ کا تذکرہ راجستھان میں لکھے گئے سب تذکرہ سے بڑھ کر اور بہتر ہے معنوی اور صوری اعتبار سے بھی کتاب منفرد ہے“ (۶۵)

ساجدہ پروین صاحبہ اپنے مضمون ”تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی اور نذیر فتح پوری“ میں نذیر کی تصنیف پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

”نذیر صاحب کی کتاب علمی وادبی اور سیاسی نقطہ نظر سے ایک دستاویز ہے ایسے علاقے پر لکھنا جس کی تاریخی اہمیت اور

تہذیبی حیثیت کا ادراک تک وہاں کے لوگوں کو نہ ہو بے حد مشکل اور جاں گسل کام تھا جو بالآخر انہوں نے کرلیا۔''(۶۶)

ڈاکٹر معین الدین شاہین اجمیری اپنے مضمون تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی کا تنقیدی جائزہ میں اس تصنیف کے لیے رائے قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اس تالیف کو محض ادبی تذکرہ یا تاریخ پر محمول نہیں کیا جانا چاہیے کیوں کہ اس میں ادب کے علاوہ تہذیب تمدن ثقافت فنون لطیفہ کے علاوہ فتح پور کی سماجی اور سیاسی زندگی کو بھی معرض بحث میں لایا گیا ہے تاہم اسے فتح پور کی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ قرار دینا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔''(۶۷)

اپنے اسی مضمون میں وہ نذیرؔ کے اس کارنامے پر انہیں مبارک باد دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری قابل مبارک باد ہیں کہ ان کا تذکرہ واقعات کی کھتونی ثابت نہ ہوا۔ نیز یہ کہ افکار کی تاریخ مرتب کرنا بھی ان کے پیش نظر رہا۔ ان کا زیر بحث تذکرہ ان تذکروں سے قدرے بہتر ہے جو ماضی قریب میں راجستھان کے مختلف علاقوں کے متعلق شائع ہوئے۔ ان آدھے ادھورے تذکروں کے نام نہاد مولفین نے چند ایسے لوگوں کا بھی تذکرہ کرڈالا جو اردو سے ناواقف ہیں اور دیوناگری رسم الخط میں دوسرے کے اشعار پڑھتے ہیں۔ ان تذکرہ نگاروں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعری کے لیے اردو یا اردو رسم الخط سے واقفیت ضروری نہیں۔ دراصل یہ دو نمبر کے لوگ ہماری تہذیب وتمدن کے سخت دشمن ہیں بحرحال نذیر فتح پوری کی زیر بحث تالیف مثالی تذکرہ یا تاریخ کے زمرے میں آتی ہے۔''(۶۸)

اپنی تصنیف تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی میں نذیرؔ نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ خواجہ نجم الدین کی ۵۲ کتابیں ہیں لیکن وہ سب ابھی تک ہماری نظروں میں نہیں آئی ہیں اس بات کے ردعمل میں معین الدین شاہین اجمیری فرماتے ہیں کہ۔

''میں مؤلف کے اس بیان سے بہ صد معزرت اختلاف کرتے ہوئے عرض کروں کہ ان کی دس پندرہ کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں جو اجمیر کے دو ایک ذاتی کتب خانوں اور درگاہ معلیٰ حضرت غریب نواز کے دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر القدس میں محفوظ ہیں۔ نجم الدین کے ساتھ اکثر کتابوں پر لفظ پروانہ تخلص کی علامت کے ساتھ موجود ہے(۶۹)

راقمہ کی رائے میں تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی نذیر فتح پوری کی ایک ایسی کتاب ہے جس کی وجہ سے راجستھان کے تذکرہ نگاروں کی فہرست میں نذیر کا نام نمایاں ہوا ہے۔ اس کتاب کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ تذکرے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ نوابوں کے شہر فتح پور کی مختصر تاریخ نذیر کی زیر تذکرہ کتاب کے توسط سے منصۂ شہود پر آئی ہے۔ اردو میں یہ کام پہلی بار ہوا ہے اس کتاب کی اشاعت سے نذیر فتح پوری نے اپنی قوم اور اپنی مٹی کا قرض اتارنے کی کوشش کی ہے لیکن ہنوز یہ کام مکمل نہیں سمجھا جا سکتا اس سلسلے میں تلاش وجستجو کی گنجائش ہے۔

شعراء پونہ ایک تحقیق:۔

تحقیق کے میدان میں نذیر کی تصنیف (شعراء پونہ ایک تحقیق) ایک اہم کارنامہ ہے یہ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے نذیر نے تاریخ وتذکرہ فتح پوری شیخاواٹی لکھ کر اپنے وطن عزیز کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ اسی طرح شعرائے پونہ ایک تحقیق لکھ کر انہوں نے اپنے وطن ثانی

پونے سے اپنی بے انتہا محبت کا اظہار کیا۔اور یہاں کے ان تمام شعراء اور ادباء کو ڈھونڈ نکالنے کی جی توڑ کوشش کی جو گوشہ تاریک میں چھپے ہوئے تھے۔کتاب کا آغاز نذؔیر کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

یہ شہر میرے غموں کا امین ہے لوگوں　　　میں اس کو چھوڑ کے تنہا کبھی نہ جاؤں گا

اس شعر میں نذیر نے پونہ سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار بڑے پر اثر انداز میں کیا ہے۔کتاب کا ’’انتساب‘‘ ان حضرات کے نام کیا گیا ہے جنہوں نے اپنی پوری تخلیقی قوت اردو ادب کی آبیاری میں صرف کر دی۔ان اصحاب میں شاؔد پونوی، سلیم پونوی اور احقر جلگانوی کے نام شامل ہیں۔اس کے بعد عرض ناشر کے زیر عنوان جناب منور پیر بھائی کا گراں قدر مضمون شامل ہے۔جس میں انہوں نے اس تصنیف کی اہمیت وافادیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔کتاب کا پیش لفظ نذیر فتح پوری نے خود ہی تحریر کیا ہے۔جس میں انہوں نے ان تمام شخصیات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے کتاب کا مواد جمع کرنے میں ان کی ہر ممکن مدد کی۔ پھر ایک نظم پونہ کے نام درج ہے جس میں پونہ کو عروس دکن کا خطاب عطا کیا ہے۔ بہت سی خوبصورت تصاویر بھی کتاب کے ساتھ منسلک کی گئی ہیں جن سے کتاب کی تاریخی حیثیت میں اضافہ ہوتا ہے۔اس کتاب کی اہمیت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے جناب حسن عباس فطرت اپنے مضمون ’’کتاب اور صاحب کتاب‘‘ میں فرماتے ہیں۔

’’شعراء پونہ ایک تحقیق‘‘ نذیر فتح پوری کی دس سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔پونہ ان کا وطن ثانی ہے اور یہ ان کی شرافت نفسی ہے کہ وہ اپنے تئیں پونے کا قرض دار مانتے ہیں کیوں کہ فتح پور سے آ کر اسی سرزمین پر وہ شعر وادب کی محفل کے رتجگے میں شامل ہوئے۔جذبہ واحساس کے خمیر سے ان کے درون سے شاعری نے سر اٹھایا پھر تو سخن سنجی وسخن آرائی کا سہانا سفر شروع ہو گیا اسباق کی اشاعت سے گیسوئے اردو کی مشاطہ گری میں حصہ لیا۔اور پوری ادبی دنیا میں اسباق کے وسیلے سے پونہ کی شہرت ہوئی۔کوئی مانے یا نہ مانے اسے اختیار ہے،مگر حق یہی ہے کہ نذؔیر فتح پوری کی انتھک اور لگاتار ادبی جدوجہد ہی نے پونے کو شعرائے پونہ کا تذکرہ جمع کرنے کی تحریک دی۔لیکن ظاہر ہے کہ اس میں ہر قدم پر دشواری ہی دشواری تھی۔ پہلے تو پونہ کیا؟ اور پونہ کے شعراء کیا؟ یعنی یہ موضوع ہی محققوں کی نظر میں لائق توجہ بھی نہ تھا۔پھر ماخذ ومدارک کے نہ ہونے پر زیادہ تر راویوں سے کام لینا تھا۔قدیم شاعروں کے احوال وکلام کو جمع کرنا صحرا نوردی وچاہ وتالاب کو کھنگالنے جیسا تھا۔اور تو اور زندہ موجود شعراء کی تلاش بھی آسان نہیں تھی۔نذیر فتح پوری کا کارنامہ یہ ہے کہ جتنے گمنام، بکھرے، چھپے، تنہائی پسند وآدم بیزار شاعر تھے ان میں سے بھی کسی ایک کو چھوڑا نہیں گیا۔(۷۰)

’’پونہ چند حقائق‘‘ کے زیر عنوان نذیر نے پونہ کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ وہاں کے ادبی پس منظر کو بھی بیان کیا ہے اور بہت سی معروف، علمی وادبی شخصیات کا تعلق سرزمین پونہ سے جوڑا ہے۔

اس تذکرہ میں شعراء کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں (۱) مہمان شعراء (۲) پونہ کے مشہور شعراء (۳) موجودہ شعراء (۴) ہندی مراٹھی اور انگریزی کے وہ شعراء جو اردو سے قریب ہیں، شامل ہیں۔

مہمان شعراء میں ماہ لقا چندہ، مولانا حسرؔت موہانی، عبدالحمید عدؔم، جگؔر مراد آبادی، جوؔش ملیح آبادی، ساغؔر نظامی، اختؔر الایمان انجم فوقی بدایونی، علامہ محوؔی صدیقی، منؔیر آلہ آبادی، علی سردار جعفرؔی، مجروؔح سلطان پوری کیفؔی اعظمی، ہریؔش چندر دکھی، عالؔم فتح پوری، مظہر امؔام، گیان چند

جین، قتیل شفائی، ضمیر کاظمی، محمود درانی، ادیب مالیگانوی، عتیق احمد عتیق، محبوب راہی، استاد مائل لکھنوی، شاذ تمکنت، بلقیس ظفر الحسن اور احسن رضوی دانا پوری جیسی مشہور و معروف شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان کے پونہ آنے کے اسباب اور یہاں کی محفلوں اور مشاعروں میں سنائے ہوئے کلام کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں ماہ لقا چندہ کی خوبصورت تصویر بھی آویزہ ہے۔

اس کے بعد پونہ کے مرحوم شعراء کے تحت تقریباً ۹۹ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن میں شاد پونوی، ڈاکٹر عبدالحق، شاگرد غالب حکیم خداداد خان، شوکت حسین عکس برنی، علامہ کالی داس گپتا رضا، احقر جلگانوی اور ڈاکٹر عصمت جاوید جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔

تیسرا باب موجودہ شعراء کے زیر عنوان ترتیب دیا گیا ہے جس میں نذیر نے پونہ کے دور حاضر کے ان تمام شعراء کا جائزہ پیش کیا ہے جو پونہ میں رہ کر میدان شاعری میں معروف ہیں۔ اس باب میں حکیم رازی ادیبی ملک تاسے، دلدار ہاشمی، عزیز قصری، ڈاکٹر امانت، ناظم القادری، نور منیری، حسن عباس فطرت اور رفیق جعفر جیسی ۵۹ شخصیات کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے اور آخری حصہ میں ان سبھی شخصیات کا حوالہ پیش کیا گیا ہے جو ہندی انگریزی اور مراٹھی زبان سے جڑے ہونے کے باوجود اردو سے محبت رکھتے ہیں اور اردو کے قریب ہیں۔ ان مشہور و معروف شخصیات میں شاعروں کے ساتھ خواتین شاعرہ بھی شامل ہیں۔ ۲۲ شعراء کی اس فہرست میں تین خواتین پربھا ماتھر، سنگیتا جوشی، اور اندرا شبنم پونہ والا شامل ہیں۔

نذیر نے شعراء کا ذکر کرتے وقت بہت احتیاط سے کام لیا۔ آپ نے ان کی پیدائش خاندانی احوال و کوائف، پونے سے ان کا تعلق ان کا نمونہ کلام اور یہاں تک کہ ان کی تصویر کو شامل تذکرہ کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی ہے۔ نذیر کی محنت و مشقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر عظیم راہی صاحب اپنے ایک خط جو انہوں نے منور پیر بھائی کے نام لکھا تھا میں فرماتے ہیں۔

> ''جہاں تک کتاب کا تعلق ہے اس بات میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ نذیر فتح پوری نے ہر اعتبار سے مکمل طور پر شعراء پونہ کی تحقیق پیش کی ہے ساتھ ہی ایسے بہت سے معروف و گمنام شعراء کے کوائف اور مختصر سوانحی حالات، مع نمونہ کلام اس میں شامل کر دیے ہیں جن کا ماضی قریب میں کسی نہ کسی وجہ سے شہر پونہ سے تعلق رہا ہے جو پونہ شہر سے نذیر فتح پوری کی گہری وابستگی اور جذباتی لگاؤ کا بھی پتہ دیتا ہے۔ یہ بڑی محنت اور دقت طلب کام تھا جسے نذیر نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔'' (۷۱)

نذیر کے تنقیدی انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے صادقہ نواب سحر اپنے مضمون شعرائے پونہ، ایک تحقیق میں فرماتی ہیں۔

> ''نذیر کی تنقید کہیں رومانی تو کہیں جمالیاتی بھی نظر آنے لگتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذہنی آسودگی کا سامان بن کر یہ ادب کے اہم مقصد یعنی لطف و انبساط پیدا کرنے کو بڑی حد تک پورا کر رہی ہے۔ نذیر حالات سے فراریت کی جگہ ادیبوں کے دل و دماغ میں حالات کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کی گنجلکوں سے پرے اردو کی ترقی پسند، سائنٹفک تنقید سے ہٹ کر وہ تحقیق کو اہمیت دیتے ہیں۔ شاعر اور اس کی شاعری کو سمجھنے سمجھانے کے لیے انہوں نے نفسیاتی نقطہ نظر کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ذاتی حالات، پریشانیاں جذباتی الجھنوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے مناسب الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔'' (۷۲)

نذیر کی اس تصنیف میں بہت سی ایسی تصویریں بھی شامل ہیں جو نہایت اہم ہیں اردو دکن کالج کی تصویر، ۱۹۲۲ میں یہاں سے ولی کا

دیوان شائع کیا گیا تھا۔ایروڈا جیل کی تصویر جہاں حسرت موہانی کو قید کیا گیا تھا۔

یہ تصنیف نذیر کی کڑی محنت کا نتیجہ ہے جس کے متعلق جناب رفیق شاہین صاحب اپنے مضمون نذیر فتح پوری کا، تحقیقی کارنامہ۔شعرائے پونہ ایک تحقیق، میں فرماتے ہیں۔

''ناول اور افسانے تو گھر یا دفتر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر بھی تخلیق کیے جا سکتے ہیں۔لیکن تحقیقی امور کا معاملہ دیگر ہے۔اس کام کو انجام دینے کے لیے اوبڑ کھابڑ راستوں، سنگلاخ زمینوں، تپتے ہوئے صحراؤں، خارزاروں اور دلدلوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔گھر سے دور رہ کر در در خاک چھاننی پڑتی ہے۔یہ انہیں کا حوصلہ ہے کہ حصول مقصد کی خاطر انہوں نے ہر طرح کے مصائب و مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا اور ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔پروفیسر عبدالقوی دسنوی تو اس کام کا انہیں مشورہ دے کر اپنے گھر بیٹھ گئے۔لیکن اس چنگاری سے بھڑک اٹھی آگ میں سرتاپا شعلہ بسر نذیر فتح پوری اپنی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن کئے اور اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے دس سالہ بنواس پر نکل گئے اور در در کی خاک چھانتے پھرے۔اس دوران انہوں نے نہ جانے کتنے دروازوں پر دستک دی اور نہ جانے کن کن لوگوں سے بالمشافانہ ملاقاتیں کیں انہوں نے معالے کو آگے بڑھانے کی دھن میں میلاد خواں گلوکاروں اور قوالوں تک کو نہ بخشا۔وقت اور پیسے کے صرفے سے بانیاز کام کا مواد ملنے کی امید میں انہیں لوگوں سے بار بار ملاقاتیں کرنی پڑیں معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں انہیں مسلسل مراسلہ نگاری بھی کرنی پڑی۔''(۷۳)

نذیر کو اس کار خیر کے لیے بہت سے انعامات واعزازات سے نوازہ گیا۔جن میں ۲۰۰۶ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے تفویض کیا گیا انعام قابل ذکر ہے۔

اس کتاب میں جہاں بے شمار خوبیاں ہیں کچھ ایک خامیاں بھی ہیں جن میں حسن عباس فطرت کے مطابق۔

''کتاب کی یہ خامی ہے کہ اس میں نذیر فتح پوری کا کلام نہیں ہے۔نذیر فتح پوری مستند و معروف شاعر سہی پھر بھی شعراء کی فہرست میں ان کا نام آنا چاہیئے۔کسرنفسی کی وجہ سے یہ بات جائز نہیں ہوسکتی۔مرتب نذیر فتح پوری پر قاعدۃً بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ حتی الامکان پونہ کا کوئی شاعر رہ نہ جائے اور نہ یہ کہ ایک نامور وقد آور شاعر و نثر نگار۔''(۷۴)

کتاب کی ایک اور خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود حسن کا خیال ہے کہ۔

''صفحہ ۱۸۸ کا ایک جملہ'' جاوید صاحب نے اپنی زندگی کے ایک ایک پل کو صرف اردو کے لئے جیا'' جینا فعل لازم ہے فعل لازم میں علامت فاعل ''نے'' کا استعمال صحیح نہیں ہے۔جملہ یوں ہونا چاہیئے۔'' جاوید صاحب ایک ایک پل صرف اردو کے لئے جیئے۔''

کتاب کمپیوٹر کی، طباعت آفسٹ کی، کاغذ سفید و دبیز جلد خوبصورت اور مضبوط لیکن املا کی غلطیاں بے شمار ہیں غالباً پروف دیکھنے کی زحمت نہیں کی گئی۔''(۷۵)

بہرحال ان خامیوں کے باوجود کتاب کی اہمیت میں کسی طرح کی نہیں آتی ہے جیسے چاند میں داغ ہونے کے باوجود اس کے حسن میں کمی نہیں آتی۔اورنذیر کا یہ ادبی کارنامہ پونہ کی اردو تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے اور آنے والی نسل کے لیے بہتر نہیں بہترین خزانہ ہے۔

پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ء تا حال (تحقیق):۔

مذکورہ کتاب پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ء تا حال، نذیر فتح پوری کی تلاش وجستجو اور تحقیق کی طرف خاص رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔نذیر فتح پوری کی اس تصنیف کے متعلق جناب مظہر امام فرماتے ہیں۔

''نذیر فتح پوری کی نئی کتاب پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق (۱۹۲۳ء تا حال) ایک بالکل نئے موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔اور مصنف کی دقت نظر اور صلابت فکر کی آئینہ دار ہے۔'' (۷۶)

حالانکہ پونے میں افسانہ لکھنے والوں کی تعداد کم ہی رہی ہے۔اس کی ایک وجہ شاید یہ رہی کہ یہاں پر اردو افسانے کے فروغ اور ترقی کے لئے کام کرنے والی کوئی بھی تنظیم نہیں ہے۔خود نذیر اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

''پونے میں اردو افسانے نے انفرادی ترقی تو کی ہے لیکن اجتماعی ترقی نہیں کی اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر افسانہ نگاروں کی انجمن نہیں ہے۔جو لوگ افسانہ لکھ رہے ہیں وہ انفرادی طور پر اپنا کام کرتے ہیں۔انہیں شاید اجتماعیت پر یقین نہیں ہے''۔(۷۷)

نذیر تخلیق کے ساتھ ہی تحقیق کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کو نمایاں کر رہے ہیں۔یہ ان کی متجسس طبیعت کا ہی کمال ہے کہ شعرائے پونہ ایک تحقیق۔کے بعد پونہ میں اردو افسانہ ایک تحقیق ہمارے پیش نظر ہے۔

اس تصنیف میں نذیر نے پونہ کے ادبی ماحول، یہاں پر افسانے کا آغاز وارتقاء اور ۱۹۲۳ء سے دور حاضر تک افسانہ نگاروں کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں انھوں نے عہد بہ عہد افسانہ نگاروں اور ان کے خاص افسانوں کو شامل کیا ہے۔

نذیر نے پونے کا پہلا افسانہ نگار صادق درّانی کو قرار دیا ہے۔یہ حیدرآباد دکن کے باشندے تھے اور ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ان کا افسانہ :ماہنامہ گلزار سخن: پونہ ۱۹۲۳ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ان کا یہ افسانہ جنھیں ہے عشق صادق وہ کہاں فریاد کرتے ہیں: کے عنوان سے تھا۔

اس کتاب میں اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے ان افسانوں کا ذکر ہے جو انھوں نے قیام پونہ کے دوران لکھے تھے۔ان میں: ان داتا، اور موبی، خاص ہیں۔''ان داتا'' کرشن چندر نے قحط بنگال کے موضوع پر ۱۹۴۴ء کے درمیان لکھا تھا جب وہ پونہ میں رہائش پذیر تھے اس کی تصدیق پروفیسر عبدالستار دلوی اپنی تصنیف ''پونہ کے مسلمان'' میں ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ۔

''مہندر ناتھ نے لکھا ہے کہ پونہ آنے کے بعد انھوں نے اس بات کا تہیہ کر لیا تھا کہ فلم ان کی ادبی زندگی میں رکاوٹ نہ بن سکے۔اور پونہ میں رہ کر انھوں نے بہترین افسانے لکھے وہ فلم کی طرف تو توجہ نہ دیتے تھے بلکہ وہ ادبی کاموں کو افضل درجہ دیتے تھے۔اسی دوران انھوں نے اپنے شاہکار افسانے، ان داتا، اور موبی لکھے جو ان کو تا ابد زندہ رکھیں گے۔'' (۷۸)

افسانہ ان داتا ''پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق'' میں شامل کیا گیا۔

ماہنامہ شاہین کے پہلے شمارے میں جو پہلی بار مئی ۱۹۵۲ء میں ۲۰۶۸ جان محمد اسٹریٹ پونہ نمبر سے شائع ہوا تھا میں بھی چار افسانے شائع ہوئے تھے، اس کے نگراں ڈاکٹر امانت اور مدیر اثر مستقطی تھے، پہلا افسانہ، زمرد، کے عنوان سے تھا جس کے مصنف جمیل ملک تھے۔ اس افسانے میں زمرد ایک ایرانی نسل کی بلی ہے جسے افسانے کا موضوع بنا کر ایک دلچسپ افسانہ تخلیق کیا گیا ہے۔

دوسرا افسانہ، بانجھ، کے نام سے شامل ہوا جس کے مصنف منیر انجم تھے۔ اس افسانے میں ایک ایسی عورت کی زندگی بیان کی گئی ہے جس کی ماں بننے کی خواہش لاکھ کوششوں کے باوجود پوری نہیں ہو پاتی۔ منیر انجم کے افسانوں کا مجموعہ رنگین دوپٹے کے نام سے ادارہ شاہین سے شائع ہوا تھا۔

اس شمارے کا تیسرا افسانہ، زندہ خواب ہے، ہے جو مس لطیفہ مومن کا لکھا ہوا ہے۔ یہ افسانہ بیانیہ ہے اور اس کے اندر کہانی کا عنصر کم ہی نظر آتا ہے۔

شمارے کا چوتھا افسانہ ''بوڑھی مالن'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس افسانے کے مصنف پریم شرر ہیں، اس افسانے میں ایک ایسی مالن کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس نے کبھی زندگی کی تکلیفوں سے ہار نہیں مانی اور زندگی کی تکالیف کا سامنا اس نے بلند حوصلے سے کیا۔ اس افسانے کو بھی نذیؔر نے اپنی اس تصنیف میں شامل کیا ہے۔

۱۹۷۱ء کے زمانے میں ماہنامہ نگار کے بعد ماہنامہ شاعر ایک ایسا ادبی رسالہ تھا جس میں کسی کی تخلیق شائع ہونے کے ساتھ ہی اس کے مصنف کو مستند مان لیا جاتا تھا، ایسے میں نذیؔر جو اس وقت ایک شاعر کے طور پر اپنی پہچان بنا رہے تھے، ان کا ایک افسانہ ''بڑا آدمی'' کے عنوان سے اسی ماہنامے میں شائع ہوا یہ شادمانی نذیؔر کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔ خود فرتے ہیں۔

> ''میں نے جب اپنا ایک افسانہ ''بڑا آدمی'' اشاعت کے لیے ارسال کیا تو مجھے افسانے کی کوئی رسید نہیں ملی، لیکن دو تین شماروں کے بعد میرا افسانہ چھپ گیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ بات میرے لیے کسی ادبی اعزاز سے کم نہ تھی کہ اس وقت میرا افسانہ اعزاز صدیقی نے شاعر میں شائع کیا جب کہ میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔'' (۷۹)

ادارۂ اسباق نے بھی افسانہ اور افسانہ نگاروں کی خوب خدمت کی ہے اس کے زیرِ اہتمام بہت سے افسانہ نگاروں کے افسانوی مجموعے شائع ہوئے، جن میں قاضی مشتاق احمد، ڈاکٹر بانو سرتاج اور اندرا شبنم اندو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی جیسے بلند رتبہ شاعر پونہ میں مقیم رہے، اسی زمانے میں سعادت حسن منٹو پونہ میں آتے جاتے رہے، یہیں انہوں نے اپنا افسانہ ''ممی'' ۱۹۵۱ء میں لکھنا شروع کیا تھا جو پاکستان میں جا کر مکمل ہوا، اس بات کی تصدیق ڈاکٹر نگار اعظم نے اس خط میں کی ہے جو انہوں نے نذیؔر کو مارچ ۲۰۰۲ء میں تحریر فرمایا تھا۔

> ''دراصل منٹو کے پونے میں رہنے کی تاریخ اور وقت کسی بھی تحریر سے واضح نہیں ہوتا کہ انہوں نے وہاں کتنا عرصہ گزارا۔ ہاں ان کی کہانی ''ممی'' پونے کے قیام کے دوران کی کہانی ہے، لیکن یہ منٹو کے آخری دور میں ان کے قلم سے نکلی ہے۔ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو انہوں نے یہ کہانی لکھنا شروع کی تھی لیکن وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی کے گولی لگنے کے سبب اس کی تکمیل میں تاخیر ہوگئی تھی۔'' (۸۰)

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی دو سال پونہ میں قیام کیا تھا ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء کے درمیان، وہ پونہ کی بھگوان داس چال میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم رہے۔ ۱۹۴۴ء میں ان کے والد کا تبادلہ انبالہ ہوگیا۔ چند سال یہاں گزارنے کے بعد تقسیم ہند کے ساتھ ہی ان کا خاندان پاکستان چلا گیا۔ اس تصنیف میں ان کا ایک بہت ہی خوبصورت افسانہ ''جنم روپ'' شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ جو ایک مشہور شاعر، ڈرامہ نگار، ادیب، ناقد اور محقق تھے ان کا تعلق بھی پونہ سے تھا۔ ان کے آباء واجداد پونہ کے ہی تھے۔ انہوں نے افسانے کے میدان میں بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں اور پونہ میں افسانہ کے کارواں کو آگے بڑھانے میں مدد کی ہے، ان کے افسانوں میں ''کلاس فیلو'' کاغذ کے پرزے''، میں آگئی ہوں'' بے غیرت کہیں کا'' منجمد سائے'' بکرے کا بچہ اور لاوا قابل ذکر ہیں۔

مس خورشید نکہت نے بھی اپنے افسانوں کے ذریعہ پونہ کے ادبی ماحول کو پروان چڑھایا، ان کا پہلا افسانہ ''خلش'' تھا جو پیام مشرق میں شائع ہوا تھا ان کے افسانے مختلف رسائل وجرائد میں بیک وقت شائع ہوتے رہے، انہوں نے انیس افسانے اور چھ ناول تحریر کئے ہیں اس کے علاوہ چار ناولوں کا ترجمہ کیا ہے، ان کا آخری افسانہ ۱۹۹۶ء میں اسباق میں ''تمہارے بغیر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، ان کے ایک افسانے ''ہاں اسی موڑ پر'' کو شامل تصنیف کیا گیا ہے۔

میر فقیر اللہ خاں، پرویز عرف ایم، ایف پرویز جو ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے تھے، گھر کا ماحول ادبی ہونے کی وجہ سے کم عمری میں ہی ادب سے واقفیت ہوگئی اور خوش دلی سے ادب کی آبیاری میں مشغول ہوگئے، اپنے ادبی سفر میں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۳ء کے درمیان انہوں نے کثرت سے افسانے لکھے جن کی تعداد تقریباً اکیس ہے، ان کا ایک افسانہ ''ایک لڑکی'' مذکورہ تصنیف میں شامل ہے جو ماہنامہ بیسویں صدی میں اکتوبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔

نذیرؔ نے بھی افسانے لکھے ہیں اور ان کے افسانے رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ایسے میں ان کے افسانے لکھنے کی ابتداء کے بارے میں معلومات فراہم کرنا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ نذیرؔ کا سب سے پہلا افسانہ ''محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا فرض کا موتی'' ہے جو ۱۹۷۱ء میں خاتون مشرق میں شائع ہوا۔ اسی افسانے کے ساتھ انہوں نے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا۔ اسی سال ندائے فلسطین میں بعنوان ''فغان درویش'' ان کے ایک اور افسانے کی اشاعت وجود میں آئی جس میں ایک ایسے فقیر کی داستاں بیان کی گئی ہے جس کے پاس بھیک مانگنے کے لیے جھولی تک نہیں ہے۔ بعدازیں مارچ ۱۹۷۲ء میں خاتون مشرق کے شمارے میں ایک افسانہ ''گلشن مر کر بھی زندہ ہوگئی'' شائع ہوا جس میں ایک بدقسمت لڑکی کی داستاں ہے جو فرقہ وارانہ فساد کے باعث شادی کے کچھ وقت کے بعد ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ (نذیرؔ کی افسانہ نگاری سے متعلق مزید معلومات ''نذیرؔ بحیثیت افسانہ نگار میں پیش کی جاچکی ہے)

رشید اعجاز بھی پونہ کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی کئی افسانے لکھے ہیں ۱۹۸۹ء میں اسباق نے ان پر خصوصی شمارہ شائع کیا تھا۔ ان کا انتقال پونہ ہی میں ۵ رمئی ۱۹۹۵ء کو ہوا تھا ان کے افسانے ''دوڑاک'' کو اس تصنیف میں شامل کیا گیا ہے۔

شیخ مدنی عرف مشتاق مدنی ۱۹۵۹ء میں پونہ پیدا ہوئے، ان کا پہلا افسانہ خاتون مشرق میں ''خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا'' کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا، اس کے بعد مختلف رسائل وجرائد میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ ان کا افسانہ ''سنیاس'' قابل ذکر ہے جس میں ذہنی سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔

قاضی مشتاق احمد نے بھی پونہ میں رہائش کی تھی، ان کے افسانے شمع اور بیسویں صدی میں شائع ہوتے رہے، ان کے افسانوں کا پہلا

مجموعہ ''صحبت کی خوشبو'' یہ مجموعہ ہندی رسم الخط میں شائع ہوا، اس کے علاوہ ''ایک ہی راستہ'' ہندی رسم الخط اور افسانچوں کا مجموعہ ''قطرہ قطرہ'' اسباق پبلی کیشنز سے شائع ہوئے۔ ان کا ایک افسانہ ''میں مسز درگا بھاردواج کا شوہر ہوں'' کو اس تصنیف میں شامل کیا گیا ہے۔

خالد انصاری کا تعلق یوپی سے ہے، ان کے والدین دار آدمی تھے۔ اردو زبان پر خالد کو مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''چنگاری'' کے نام سے ۱۹۸۵ء میں خاتون مشرق میں شائع ہوا تھا، ان کے افسانے ''سفید دوپٹے'' کے لئے انہیں یاد اقبال کمیٹی لکھنؤ کی جانب سے انعام بھی دیا گیا۔

زین العابدین خاں موضع اکھنی، بھبھواں ضلع بہار میں ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے پیشے سے فوجی ہیں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا دل افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوا، اور ۲۰۰۵ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''تیس سال لمبی سڑک'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں ۲۳ر افسانے شامل ہیں، اس مجموعے کے کئی افسانے شمع اور بیسویں صدی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے ''تیس سال لمبی سڑک'' کو اس تصنیف میں شامل کیا گیا ہے۔

اسباق کے ابتدائی زمانے میں اسباق کا دفتر دواخانہ حکیم رازی میں تھا، یہاں نذیؔر کی ملاقات مرحوم ظفیر الحسن صاحب سے ہوئی تھی اور ان کے اصرار پر ظفیر الحسن نے کئی کتابوں پر تبصرے بھی لکھے تھے جو اسباق میں شائع ہوئے تھے اسی دوران نذیؔر کی ملاقات ظفیر الحسن کی اہلیہ بلقیس صاحبہ سے ہوئی، یہ بھی تخلیقی ادب سے واقفیت رکھتی ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''ویرانے آباد گھروں کے'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں گیارہ افسانے اور ایک ڈرامہ شامل ہے، اس مجموعے کے تین افسانے انہوں نے قیام پونہ کے دوران لکھے تھے جو ان کی ابتدائی تخلیق ہیں۔ مجموعے کا سب سے اول افسانہ ''میرا نام بنت زینب ہے'' اس تصنیف میں شامل کیا گیا ہے۔

رفیق جعفر حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ وہیں پر تعلیم بھی حاصل کی شعر و ادب اور صحافت کے چراغوں کو روشن کرنے کے بعد افسانے کی شمع بھی جلائی۔ ۱۹۸۰ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ البم شائع ہوا اس وقت وہ ممبئی میں قیام پذیر تھے۔ اب پونہ میں ان کا قیام ہے یہاں ان کے بہت سے افسانے اسباق، بے باک، انشاء، اعتماد، قرطاس، وغیرہ میں شائع ہوئے ان کے ایک افسانے ''فلاح الفلاح'' کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

معراج انور نے شاعری کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کو بھی اپنایا متعدد رسائل و جرائد میں ان کے افسانے شائع ہوئے فیصلہ جب بہار آئی، کلائمکس، نگہبان، تحفے، اور ایک خط ایک کہانی وغیرہ ان کے خاص افسانے ہیں، ان کا ایک اور خاص افسانہ ''نرگس'' اس وقت وجود میں آیا جب وہ مستقل طور پر پونہ میں آباد ہو گئے۔ ۱۹۷۲ء کا زمانہ تھا یہ افسانہ ابھی غیر مطبوعہ ہے، ان کے ایک خوبصورت افسانہ ''تصویر بول اٹھی'' کو اس تصنیف میں شامل کیا گیا ہے۔

اندرا شبنم اندو جن کی مادری زبان سندھی ہے، یہ سندھی کی ہی ادیبہ ہیں اور اسی زبان میں شاعری اور افسانے لکھتی ہیں، ان کی تصانیف کو پہلے ہندی میں منتقل کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد اردو کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے، اندرا شبنم کے افسانوں کا مجموعہ ''عبادت'' کے نام سے اردو ترجمہ ہو کر ۲۰۰۶ء میں اسباق پبلی کیشنز سے شائع ہوا، ان کی تصانیف کو اردو میں متعارف کرانے کا سہرا نذیؔر کے سر جاتا ہے۔ خود اندرا شبنم اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ۔

''نذیؔر فتح پوری کا شکریہ اس لیے لازم ہے کہ سب سے پہلے آپ ہی نے مجھے اردو سماج میں متعارف کرایا۔
اسباق پبلی کیشنز کے تحت میری کتابیں شائع کر کے اہل ذوق کے مطالعہ کی میز تک پہنچائیں اردو میں سب سے پہلا مضمون میری شاعری کے مجموعے ''سرگوشیاں'' کے لئے نذیؔر صاحب ہی نے لکھا تھا اور دیگر اہل قلم

سے میری کتابوں کے لیے پیش لفظ اور تبصرے لکھوائے۔'' (۸۱)

ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ بھی ۲۰۰۸ء میں اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ''ضمیر اپنا اپنا'' کے عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے، ان کے افسانے ''عبادت'' کو شامل تصنیف کیا گیا ہے۔

ان تمام افسانہ نگاروں نے پونہ میں اردو افسانے کی خدمت میں اپنا تعاون دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ نسرین رمضان سید، شیخ طاہرہ عبد الشکور، اور تا کیدار شمشاد جلیل شاد ایسے نام ہیں جنھوں نے افسانہ کے سفر کو رفتار عطا کی ہے۔ ان کے افسانے ''عہد وفا'' دشت کے رنگ'' اور دوسرا زلزلہ کو بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

نذیرؔ نے اس تصنیف میں وسیع النظری سے کام لیا ہے اور ۱۹۲۳ء کے بعد میں پونہ میں جتنے بھی افسانے لکھے گئے ہیں ان کو تلاش کر کے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ جتنے بھی افسانے اس زمانے سے لے کر آج تک شائع ہوئے ہیں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں بڑی جاں فشانی سے کام لیا ہے۔ یہ تصنیف نذیرؔ کی تحقیقی کاوشوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان کی اس تحقیقی کاوش کو مہاراشٹر ین اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی نے خوب سراہا ہے، اور ان کو ۲۰۱۰ء کے تحقیق وتنقید کے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

پونہ میں اردو افسانہ ایک تحقیق کی خوبیوں اور خامیوں کی گرہ کشائی کرتے ہوئے ڈاکٹر عظیم راہیؔ فرماتے ہیں۔

''ان تین نئی ابھرتی ہوئی خواتین افسانہ نگاروں کا بھی اگر مختصر ہی سہی تعارف پیش کیا جاتا تو بہتر ہوتا، اسی طرح عصمت جاوید کا تعارف تو شامل ہے لیکن باوجود بسیار کوشش ان کا افسانہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے شریک کتاب نہیں کیا جاسکا جس کا محقق کو بھی احساس ہے اور قاری کو بھی اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح چند افسانہ نگار اس تحقیق میں شامل ہونے سے رہ گئے جیسے رفیعہ شبنم منچری اور اسلم مرزا وغیرہ۔ اسلم مرزا کا آبائی وطن احمد نگر اور وطنِ ثانی اورنگ آباد ضرور ہے لیکن ان کی پیدائش پونہ کی ہے جہاں اس زمانے میں ان کے والد ملٹری کی ملازمت کے سلسلہ میں قیام پذیر تھے۔ ان کے تخلیقی سفر کی ابتداء شاعری کے ساتھ افسانہ سے ہوئی ہے ۱۹۷۲ء سے قبل اسلم مرزا بڑی باقاعدگی سے افسانے لکھتے رہے اور موٴقر رسائل میں چھپتے بھی رہے۔ اس لحاظ سے ان کا افسانہ بھی پونہ کے افسانہ نگاروں کے باب میں شامل کیا جاسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ بات محقق کی نظر میں نہ آئی ہو یا شاید ان کے علم میں نہ ہو۔ کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی خامی محسوس ہوتی ہے۔ بہر کیف ان معمولی کمیوں کے باوجود پونہ میں اردو افسانہ ایک تحقیق ایک جاندار کتاب اور شاندار تحقیق کی مثال ہے اور اپنے علاقے کا ایک دیانتدارانہ جائزہ ہے جس کی ستائش نہ کرنا ناانصافی کے مترادف ہوگا۔'' (۸۲)

اپنی کتابوں میں نذیرؔ پونہ کے تعلق سے ہمیشہ مخلص نظر آتے ہیں۔ شعرائے پونہ ایک تحقیق اور پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق نذیرؔ کی تلاش وجستجو کے ایسے کارنامے ہیں جن کی اشاعت کی وجہ سے پونہ کے ادبی طور پر ماضی اور حال کے دریچوں میں چراغ روشن ہوگئے ہیں جن کی روشنی ادب میں دور دور تک محسوس کی جائے گی۔

مہاراشٹر ساہتیہ اردو اکادمی کے علاوہ نذیرؔ کی اس کتاب پر اتر پردیش اردو اکادمی نے بھی ایوارڈ سے نواز کر نذیرؔ فتح پوری کے محققانہ

کارناموں کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ پذیرائی بھی کی۔

امیر تیمور(سوانحی ناول بچوں کے لیے):-

اُردو ادب کے توسط سے بچوں کو بہترین تربیت فراہم کرانے کے لیے بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ جن میں ان کے لیے آسان نظمیں، چھوٹی چھوٹی نصیحت آموز کہانیاں، مضمون، اوراعلیٰ شخصیات کی سوانح وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے ذریعہ بچوں میں بہترین اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں ایک کوشش نذیؔر نے ''امیر تیمور' لکھ کر کی ہے، اس تصنیف میں امیر تیمور کی شخصیت اور سوانح کو مختصر مگر نصیحت آموز انداز میں بیان کیا ہے۔ تیمور کی شخصیت اپنے آپ میں شجاعت اور بہادری کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ اس تصنیف میں نذیر نے تیمور کو انصاف پسند، استاد اور بڑوں کی عزت کرنے والا، حافظ قرآن، اپنے ماں باپ کی قدر کرنے والا، بہادر اور نڈر، ہر مشکل کو ہنستے ہوئے جھیل جانے والا بتایا ہے، اس کی ساری زندگی جنگ لڑتے لڑتے گزری کیونکہ اس نے منصوبہ ہی ایسا بنایا تھا ''پوری دنیا کو فتح کرنے کا'' اور اس منصوبے کے تحت اس کی ساری زندگی پہاڑوں، جنگلوں، وادیوں، صحراؤں، ٹیلوں اور دلدلوں کی دشوار گزار راہوں میں گزری اس کے متعلق نذیؔر فرماتے ہیں کہ۔

> ''تیمور کی فتح کی بھوک بہت گہری تھی۔ اس کی ساری زندگی جنگلوں، پہاڑوں، ٹیلوں، وادیوں صحراؤں اور دلدلوں کے درمیان گزری۔ جنگ کے میدان میں وہ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلاتا تھا اس کے انصاف کے دفتر میں اپنے دشمنوں کے لیے معافی کا کوئی لفظ نہیں تھا وہ اپنے مخالفین کو کڑی سے کڑی سزا دیتا تھا، وہ متعصب بھی نہیں تھا۔'' (۸۳)

اس کے آگے نذیؔر اس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ''وہ عالموں اور شاعروں کی قدر کرتا تھا، لیکن خود کبھی خیالات کی دنیا میں نہیں جیتا تھا، عملی زندگی پر اس کا ایمان تھا، وہ سچائیوں کا شیدا تھا، بہادری کا پیکر تھا، حوصلہ اور ہمت کا پہاڑ تھا، فوج میں صرف جھنڈا ہاتھ میں اُٹھا کر قیادت نہیں کرتا تھا، بلکہ خود تلوار لے کر دشمن کی فوج میں گھس جاتا اور دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا کر دشمن کے فوجیوں پر حملہ کرتا، جو بھی اس کے وار کی زد میں آتا کبھی نہیں بچ پاتا، دشمن اس کے نام سے خوف کھاتے تھے اس نے گرمی سردی اور بارش کسی بھی موسم کو اپنے لیے آرام کا موسم قرار نہیں دیا، بس اپنی مہم جوئی کے لیے آگے ہی آگے کوچ کرتا رہتا۔'' (۸۴)

تیمور کی شخصیت کو نذیؔر نے بچوں کے سامنے پیش کرنے کی مہم اس لئے چھیڑی کیوں کہ وہ بچوں کو یہ نصیحت کرنا چاہتے تھے کہ۔

> ''بچوں کو ذرا ذرا سی بات پر غصہ نہیں کرنا چاہئے۔ بدلہ کی آگ سے اپنے دل کو پاک رکھنا چاہیے۔ دوسروں کی مصیبت میں کام آنا چاہیے۔'' (۸۵)

نذیؔر نے تیمور کی خودنوشت سوانح سے یہ کہانی اخذ کی ہے جسے خود تیمور نے اپنے بائیں ہاتھ سے لکھا تھا اس کا ترجمہ سب سے پہلے فرانسیسی مصنف مارسل ہریون نے کیا تھا اس کے بعد انگریزی میں ڈیوی نے ترجمہ کیا اور خلیل الرحمٰن اور ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی نے اسے اردو کا پیکر عطا کیا۔ اس تصنیف میں نذیؔر نے تیمور کی سوانح حیات کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اور بچوں کو یہ بات ذہن نشین

کرانے کی کوشش کی ہے کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنا وقت ضائع کیے بغیر محنت کرتے رہنا چاہیے۔کبھی بھی اپنے آپ پر غرور نہیں کرنا چاہئے ،اور اپنے غصے پر قابو رکھنا چاہیے ، ہر کام کو سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے ہمیشہ بہادری سے جینا چاہئے اور اپنا کام خود کرنے کی اچھی عادت اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔

نذیر نے یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں رحمانی سلیم احمد (رحمانی پبلیکیشنز) کی دعوت پر بچوں کے لیے لکھی ، کیوں کہ یہ کتاب بچوں کو نصیحت کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اس لیے نذیر نے بڑے ہی سیدھے سادے مگر پرکشش انداز میں تیمور کی سوانح کو صفحہ قرطاس پر تحریر کر دیا ہے۔عبارت آسان اور رواں ہے اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ پوری سوانح کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے اور نصیحت کرنے کا موثر ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔

امیر تیمور ہندوستان میں:۔

نذیر فتح پوری کی یہ تصنیف ''امیر تیمور'' ناول کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے ،جس کا ذکر نذیر اپنے ناول امیر تیمور میں پہلے ہی کر چکے ہیں بقول خود۔

''تیمور ہندوستان بھی آیا ،اس کی زندگی کا یہ سفر بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔اگر حالات نے ساتھ دیا تو ایک ناول اس موضوع پر ''امیر تیمور ہندوستان میں'' عنوان سے پیش کیا جائے گا۔تب اس کے دلچسپ واقعات آپ کے مطالعے میں آئیں گے۔''(۸۶)

نذیر کا یہ ناول (امیر تیمور ہندوستان میں)۴۵ باب پر مشتمل ہے جو ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا ،اپنے مشن کی اس دوسری کڑی میں نذیر نے تیمور کی ہندوستان میں فتح اور اس کے راستے میں آنے والی ان تمام رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے جو اسے درپیش آئیں۔اس کا کوئی بھی قصہ جھوٹ نہیں ہے اور بچوں کی معلومات میں اضافہ والا ہے اس کے متعلق نذیر کا کہنا ہے۔

''۵۸۰ صفحات کی کتاب کو سمیٹ کر چند صفحات میں پیش کرنا ایک مشکل کام تھا لیکن خدا نے اسے میرے لئے آسان کر دیا اور تیمور کی زندگی کے منتخب واقعات اور یادگار جنگی معرکوں کو موضوع بنا کر دو ناولوں میں اس کی زندگی کو سمیٹنے کی کوشش کی۔''(۸۷)

اس تصنیف میں نذیر نے تیمور کی ہندوستان پر فتح کو مختصراً انداز میں بیان کیا ہے اس کا کوئی بھی واقعہ جھوٹ نہیں ہے اور بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے والا ہے اس کے متعلق نذیر کا کہنا ہے۔

''امیر تیمور ہندوستان میں'' پڑھتے وقت بچوں کو یوں محسوس ہوگا جیسے وہ عجیب و غریب کہانی کی کوئی ایسی کتاب پڑھ رہے ہیں جو دانستہ بچوں کی دلچسپی اور معلومات کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس ناول میں کوئی بھی واقعہ خیالی یا من گھڑت نہیں ہے۔جو بھی ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے تیمور کی زندگی کا عکس ہے۔ ماضی کا روشن باب ہے۔''(۸۸)

جہاں نذیر تیمور کے تمام اوصاف اور خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''جہاں ایک طرف حافظ قرآن تھا ،مفتی تھا ، باجماعت نمازوں کا پابند تھا ،غریبوں کا مددگار تھا ، یتیموں اور

بے کسوں پر رحم کرنے والا تھا۔ باہنر لوگوں کی اس کے دل میں بڑی قدر تھی، وہ عالموں، حافظوں، شاعروں اور تاجروں کی دل سے قدر افزائی کرتا تھا، انہیں اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتا تھا۔ ان سے علمی اور مذہبی گفتگو کر کے خوش ہوتا تھا۔ اس نے شیخ سعدی کے بوسیدہ مزار کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ اور اس پر یادگار کتبہ نصب کیا، فتح حاصل کرنے کے باوجود اس نے ان شہروں کے باشندوں کا قتلِ عام نہیں کیا جن شہروں میں نامور ادیب اور شاعر گزرے ہیں۔'' (۸۹)

وہیں وہ تصویر کے دوسرے رُخ کو بھی نمایاں کرنے میں چشم پوشی نہیں کرتے ہیں، لکھتے ہیں۔

''دوسری طرف اس کی زندگی کی داستان تلوار کی نوک سے تاریخ کے صفحات میں درج ہے۔ جو بے گناہ شہریوں کے خون سے لکھی گئی ہے، اس نے اپنے جنگی اصول خود بنائے تھے اس نے کبھی اپنے دشمنوں کو معاف نہیں کیا۔ اس کی نظر میں چھوٹی سے چھوٹی غلطی کی سزا بھی موت سے کم نہ تھی۔ اس نے بے شمار تاریخی شہروں پر فتح حاصل کرنے کے بعد انہیں کھنڈر بنا دیا اور عوام کا قتل عام کر کے شہر کے گلی کوچوں کو لاشوں سے بھر دیا۔ لاکھوں انسانوں کی گردنیں کاٹ کر اس نے مینار بنائے اور بڑے بڑے قلعوں کو بارود سے اُڑا کر زمین پر بچھا دیا'' (۹۰)

نذیر نے تیمور کی زندگی کو بچوں کے سامنے ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کے پیچھے ان کا سب سے اہم مقصد تیمور کی بہادرانہ شخصیت سے بچوں کو آگاہ کرنا تھا، اس کی صلاحیتوں کو روشن کرنا تھا، جس سے بچے سبق حاصل کر سکیں۔ ایک جگہ تیمور کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''وہ کاہل اور سست گام مسافر نہیں تھا وہ جس زمین پر قدم رکھتا اس کی بساط کو جلد سے جلد لپیٹ کر رکھ دینا چاہتا تھا اس نے اپنے پیچھے قدموں کے جو نشان چھوڑے ہیں اس کے بعد اس راستے پر کوئی دوسرا مسافر نظر نہیں آیا۔ وہ صرف راستہ ناپنے کے لیے نہیں چلتا تھا بلکہ کامیابی کا علم بلند کرنا اس کی عادت کا حصہ بن چکا تھا۔'' (۹۱)

تیمور کی یہ کہانی نذیر نے کسی اور تاریخی کتاب سے نہیں بلکہ خود تیمور کی خودنوشت سے تحریر کی ہے۔ اس کا ذریعہ تیمور کی سوانح حیات ہی ہے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے نذیر لکھتے ہیں۔

''یہ سوانحی ناول ہم نے صرف تیمور کی خودنوشت کے سہارے لکھا ہے، دوسرے کسی مورخ کی کتاب ہمارے سامنے نہیں تھی ممکن ہے دوسرے لوگوں نے کسی اور طریقے سے اس کی روداد لکھی ہو۔ یہ سچ ہے کہ ماضی الگ الگ طریقوں اور وسیلوں سے ہمارے مطالعہ میں آیا ہے، تیمور کو کسی دوسرے طریقے اور وسیلے سے بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔'' (۹۲)

رحمانی پبلی کیشنز کی دعوت پر نذیر نے تیمور کی سوانح حیات کو بچوں کے مطالعہ کی میز تک پہنچا دیا ہے اور اس سلسلے کے دو ناول ''امیر تیمور'' اور'' امیر تیمور ہندوستان میں'' تحریر کر دیئے۔ اس سلسلے کو آگے جاری رکھنے کے متعلق نذیر فرماتے ہیں۔

''ابھی تیمور کی کہانی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ممکن ہے کس دن اس سلسلے کا تیسرا ناول بھی بچوں کے مطالعہ کی میز پر نظر آ جائے۔'' (۹۳)

نذؔیر کی اس تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے نثار احمد صدیقی فرماتے ہیں۔

''نذؔیر فتح پوری کا یہ ناول بھی پہلے ناول ہی کے جیسا معلوماتی، حیرت انگیز اور دلچسپ واقعات سے پُر ہے۔امیر تیمور تاریخ کا ایک جیتا جاگتا گردار ہے جسے نذؔیر فتح پوری نے اس کی زندگی کے سچے واقعات پر مبنی ایک خوبصورت ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔یہ ناول دلچسپ اور افسانوی انداز سے تحریر کیا گیا ہے، بچے اس ناول کو شروع کریں گے تو یقیناً بغیر ختم کیئے دم نہیں لیں گے۔''(۹۴)

یہ کتاب نذؔیر کا ایک مثالی کارنامہ ہے جسے ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور بچوں کی معلومات میں اضافے کا سبب بھی ہوئی ہے، مذکورہ دونوں ناولوں کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ نذؔیر تاریخی سوانح نگاری میں بھی کم نہیں ہیں، جہاں ایک طرف وہ تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی ادبی، تبصراتی ادب لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں وہاں تاریخی سوانحی ناول بھی وہ کامیابی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں۔

اُردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر:۔

نذؔیر فتح پوری کی زندگی تخلیق ادب میں گزر رہی ہے۔اس میدان میں ان کا ثانی نظر نہیں آتا، اردو کا وہ کونسا باب ہے جس کی پیشانی پر نذؔیر نے اپنا نام نہ لکھا ہو۔نذؔیر اگرچہ مہاراشٹر کے شہر پونے میں مقیم ہیں لیکن راجستھان ہر لحاظ سے ان کی سانسوں میں بسا ہوا ہے۔وہ کسی نہ کسی بہانے راجستھان سے اپنی وابستگی کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں۔ان کی زیر تبصرہ کتاب ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، اپنی اس تحقیقی کتاب کے ذریعہ نذؔیر نے راجستھانی بولیوں پر اردو کے اثرات تلاش کیے اور دلائل وشواہد کے ساتھ اپنی بات ثابت کی ہے۔۱۹۲ صفحات پر مشتمل اس تصنیف میں ۳۷ مضامین مختلف عنوانات کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔''پیش لفظ'' ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط نے تحریر کیا ہے ایک توشیحی نظم ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' کے عنوان سے نذؔیر نے خود لکھی ہے۔اس توشیحی نظم میں نذؔیر نے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد بیان کر دیا ہے اور ان سب مشکلات کی نشاندہی بھی کر دی ہے جو ان کے اس سفر میں پیش آئیں گی لیکن پھر بھی ان کا عزم وحوصلہ جوان ہے اور وہ اس خارزار سے گوہرِ آب دار ڈھونڈ لانے کے لئے بیقرار ہیں۔

ا ادب کے ریگ زاروں کا سفر در پیش آیا ہے
تلاش وجستجو کا کس گھڑی سندیش آیا ہے

ر روابط ڈھونڈنے اردو کے ہیں اب ریگ زاروں میں
اشاروں میں، کنایوں میں، مثالوں، استعاروں میں

د دیانت داریاں ملحوظ رکھ کر کام کرنا ہے
صداقت کا تمامی منظروں میں رنگ بھرنا ہے

و وہاں کا کھوج کرنا ہے جہاں جوہر ہے پوشیدہ

وہاں کی جستجو ہو گی جہاں گو ہر ہے پوشیدہ

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص۱۳/ایڈیشن فروری ۲۰۱۱ء)

بعدازیں گفت باہمی کے تحت نذیرؔ نے اپنے وطن سے بے پناہ محبت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے مواد کے لیے جن تصانیف اور حضرات سے فیض حاصل کیا ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

''زبانوں کا باہمی ربط و تعاون'' اس موضوع سے مضامین کی شروعات ہوتی ہے۔اس مضمون کے تحت نذیرؔ نے زبانوں کے باہمی ربط اور اس ربط کے نتیجہ میں اس زبان میں شامل ہوئے دوسری زبانوں کے الفاظ کو موضوع بحث بنایا ہے۔اس کے لیے انہوں نے مولانا حسین آزاد کے نظریہ ''اردو برج بھاشا سے نکلی ہے'' اور حافظ محمود شیروانی کے نظریہ ''اردو پنجاب میں پیدا ہوئی ہے'' سے بھی استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور ان دونوں حضرات کی تصانیف سے حوالہ جات بھی قلم بند کیے۔اور ساتھ ہی ساتھ زبانوں کے خاندان کی پہچان کے لیے شجرے بھی مرتب کئے ہیں شجرے ملاحظہ ہوں۔

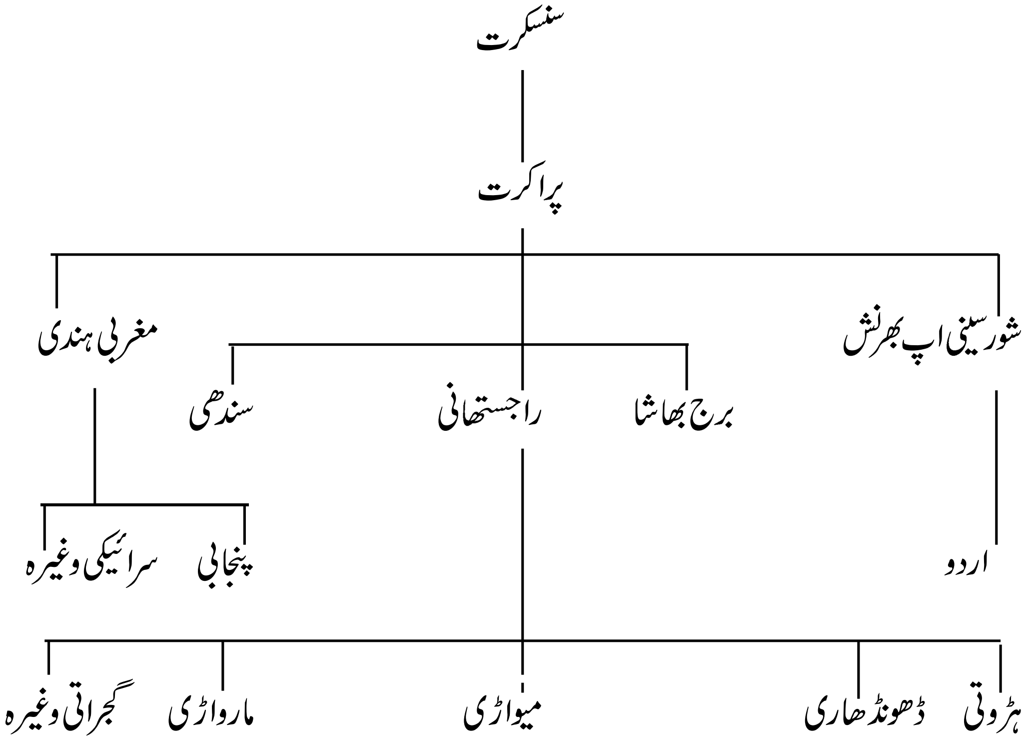

(۹۵)

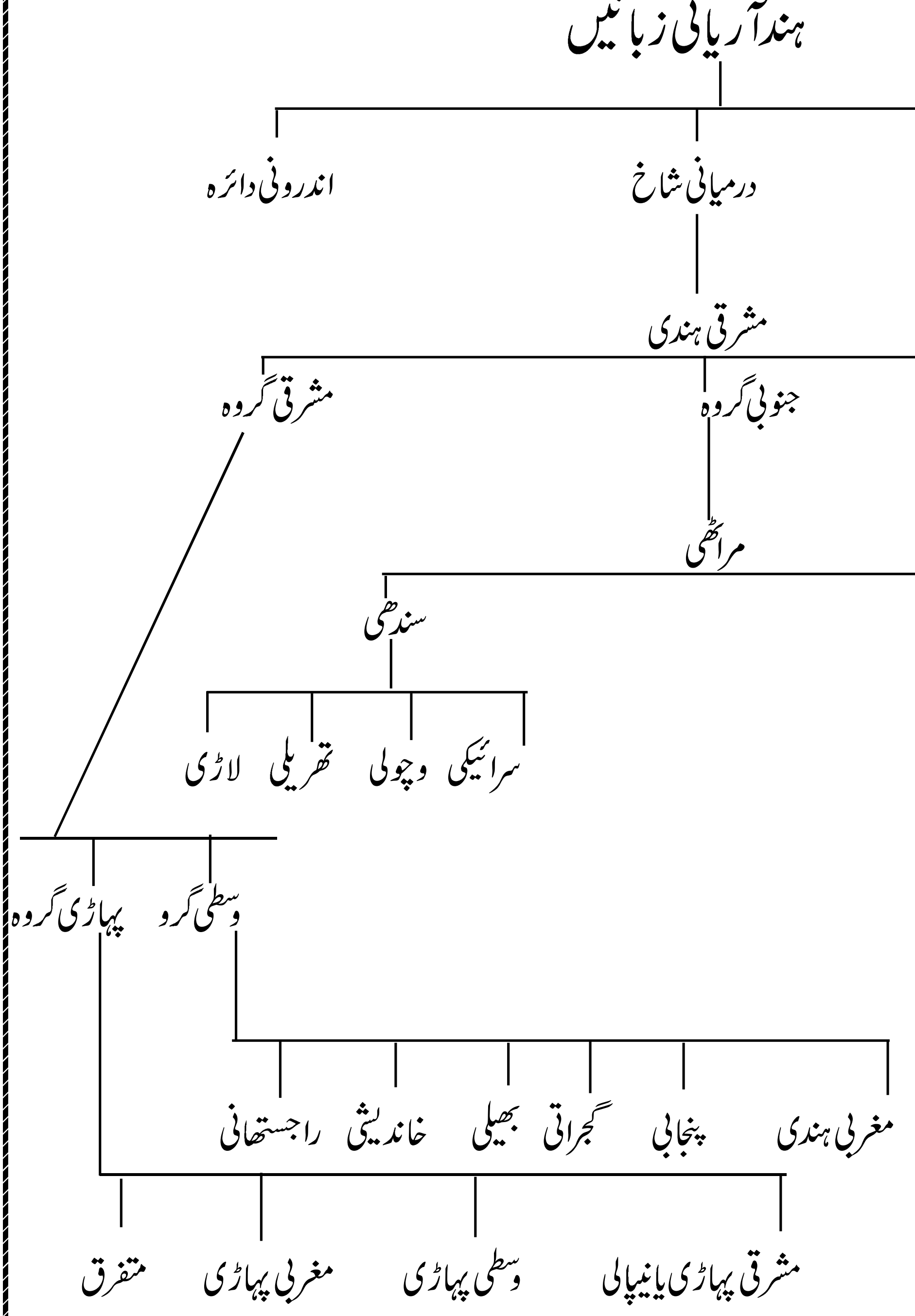

(۹٦)

''زبانوں کا تعصب'' میں لسانی تعصب کی مثالیں پیش کرتے ہوئے اس تعصب کو ختم کرنے کی التجا ہے۔عالمی زبانوں کی بنتی بگڑتی صورتِ حال'' اس مضمون میں نذیؔر نے اپنی سخت محنت و کاوش کا ثبوت دیا ہے۔حوالہ جات کے طور پر ڈاکٹر سلیم اختر اور خالد مسعود کے مضامین کے ساتھ روزنامہ جنگ سے کچھ رپورٹ اخذ کی گئی ہیں۔راجستھانی زبان کی ابتداء'' کے تحت نذیؔر نے راجستھانی زبان کی ابتداء پر ایک مختصر مضمون تحریر کیا۔اس کے متعلق اپنی رائے بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

''راجستھانی کوئی ایک زبان نہیں ہے، یہ مختلف علاقوں کی بولیوں سے مل کر راجستھانی کہلاتی ہے۔'' (۹۷)

پھر اپنی اس بات کی تصدیق میں نذیؔر نے ڈاکٹر فیروز احمد کی تصنیف ''راجستھانی اور اردو'' سے یہ رائے قلمبند کی ہے۔

''راجستھانی مختلف بولیوں کی ایسی شکل ہے جو اپنے لب ولہجہ کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ان کی اصل ایک ہے اور یہ راجستھان کے وسیع وعریض علاقوں میں ہندی کے بڑھتے اثرات کے باوجود بول چال میں مستعمل ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ ہندی اور اردو کے جنم سے بہت پہلے راجستھانی موجود تھی اور نہ صرف راجپوتانہ بلکہ اس کے جغرافیائی حدود سے متصل دوسرے صوبوں تک اس کے اثرات موجود تھے(راجستھانی اور اردو صفحہ نمبر ۳۱)'' (۹۸)

''راجستھانی میں اردو کی ابتداء'' میں نذیر نے راجستھانی کی ابتداء سے متعلق حقائق کو پیش کرنے کے لئے حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی، اور ڈاکٹر فیروز کے مضامین سے استفادہ کیا ہے۔نذیر نے اس کی تصدیق کے لئے حافظ محمود شیروانی کے مضمون کا ایک حصہ شامل کیا ہے جو حسبِ ذیل ہے۔

''اہل دائرہ کو مذہب کے ساتھ ہمیشہ توغل رہا ہے، ایک الگ تھلگ مقام پر آباد رہنے اور بعض اخلاقی معتقدات پر یقین لانے کی وجہ سے ان میں مذہبی جوش ہر عہد میں بیدار اور قائم نظر آتا ہے۔ وہ اپنی روایت زندہ رکھتے ہیں۔ جب تک فارسی میں نبھا سکے فارسی سے کام لیتے رہے۔ جب اردو کا ستارہ چمکا اور محمد شاہ کے عہد سے شمالی ہند میں ادبی تحریک شروع ہوئی۔ انہوں نے اردو اختیار کر لی اور اپنے مطالعہ کے لیے علیحدہ لٹریچر جو زیادہ تر نیم مذہبی قسم کا ہے تیار کرتے رہے۔ نہ صرف لٹریچر تیار کیا بلکہ اس کے تحفظ میں بھی ساتھ رہے۔(مقالات شیروانی صفحہ نمبر۔۴۷۔۴۶) ''(۹۹)

اپنے اس مضمون میں آگے چل کر محمود شیرانی تاریخ غریبی کے سنِ تخلیق کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور انہوں نے اس تصنیف کا آغاز ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) اور اختتام ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء) بتایا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے اس کی شروعات ۱۷۴۷ اور تکمیل ۱۷۵۲ء بتائی ہے۔اس کے متعلق نذیر نے یہ تین شعر جو تاریخ غریبی کا حصہ ہیں اخذ کئے ہیں۔

سنو عاجزی کرے بچارا اس کتاب کا جوڑن ہارا
پیچھے سب کوی نفع نصیبی نادر کہا تاریخ غریبی
گیارہ سو چوسنٹھ ماہی کئے شروع فضل الٰہی''

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص ۴۰)

''راجستھانی زبان اور بولیاں کچھ باتیں'' اس مضمون میں نذیر راجستھانی زبان کی قدامت اور اس کی مختلف شکلوں کا ذکر عبدالحفیظ با حلیم، ڈاکٹر عزیز انصاری حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی گراں قدر رائے سے اپنی بات کو اختتام پذیر کیا ہے۔ مضمون کے آخر میں کچھ راجستھانی الفاظ اور اردو میں اس کے معنی دے گئے ہیں۔ راجستھانی زبان کی وسعت اور قدامت کے متعلق نذیر نے عبدالحفیظ با حلیم کے حوالے سے ایک رائے قلمبند کی ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

''راجستھانی زبان ایک علاقے سے متعلق ہونے کے باوجود اس کے الفاظ دیگر زبانوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ دکن میں نصرتی کی کتب جن میں کئی الفاظ راجستھانی کے آگئے ہیں جو آج بھی اس زبان میں مستعمل

ہیں اسی طرح سید انشاء کی رانی کیتکی ،مثنوی نوسر ہار اور شاہ اشرف بیابانی کے کلام سے چند الفاظ مشت نمونہ ازخروارے کے طور پر تحریر کرنے سے پہلے یہ امر بھی باعث توجہ ہے کہ اردو کی کئی لغات میں لفظ کے آگے ق درج ہے جس کے معنی قدیم کے ہوتے ہیں ان میں بیشتر الفاظ راجستھانی کے ہیں جو اس زبان میں آج بھی ان ہی معنی میں مستعمل ہیں۔(راجستھانی زبان شمارہ ۱۹۹۴ء صفحہ نمبر ۴۳)'' (۱۰۰)

''راجستھانی بولیوں پر اردو کا اثر۔کچھ حوالے''اس مضمون کے تحت نذیر نے راجستھانی زبان میں اردو الفاظ کی شمولیت کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے اس کے تحت سب سے خاص حوالہ انہوں نے جناب حفیظ اللہ بیکس وکیل جودھپور کے مضمون کا دیا ہے جو انہوں نے انجمن ترقی اردو ہند جودھپور کے زیر اہتمام منعقدہ ایک سیمنار ۱۳،۱۴،اور ۱۵ نومبر ۱۹۶۴ء میں پڑھا تھا۔اس سیمنار کا موضوع راجستھان میں اردو ادب کے سو سال تھا۔اس موضوع کے تحت یہ جناب اپنے مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ راجستھان میں اردو کی ابتداء ۸۰۰ سال پہلے تبھی ہو چکی تھی جب خسرو اور کبیر شاعری میں مشغول تھے۔اور پرتھوی راج چوہان کے درباری شاعر چندؔر نے پرتھوی راج راسو تحریر کی تو اس میں بھی عربی اور فارسی الفاظ مثلاً عرق،عنبر وغیرہ کا استعمال کیا۔

یہ حضرت اپنے اسی مضمون میں راجستھان کی مختلف بولیوں میں بھی اردو الفاظ کی شناخت کرتے ہیں جس کے متعلق نذیر نے ان کے مضمون کا یہ حصہ اپنے اس مضمون میں شامل کیا ہے۔

> ''چتوڑ گڈھ کے مہارانا کنبھا نے چار ناٹک لکھوائے تھے۔ان میں سے ایک ناٹک کی زبان میواڑی تھی۔ میواڑی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ موجود ہیں۔ڈھونڈ ھاری زبان مارواڑی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ہاڑوتی زبان بھی اسی سے مشابہ ہے۔جس میں لفظ برسانا،کھوج،آفت،چاکر،معزولی،فائدہ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔اس زبان میں اردو کی جھلک پوری طرح موجود ہے۔(صفحہ نمبر ۱۰۴)'' (۱۰۱)

''نذیر نے راجستھان میں اردو کے غلبے کو ثابت کرنے کے لیے ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے ایک پیراگراف بھی قلمبند کیا ہے جو اس طرح ہیں۔

> ''قصباتی اور شہری آبادیوں میں ہندوستانی یا اردو بولنے کا زبردست میلان پایا جاتا ہے اور مارواڑی رفتہ رفتہ فنا ہو رہی ہے۔تعلیم یافتہ مارواڑی اور خصوصاً مارواڑی عہدیدار باہمی گفتگو میں مارواڑی کے بجائے اردو استعمال کرتے ہیں خالص ہندوستانی یا اردو تو یقیناً کمیاب ہے مگر ملی جلی ہندوستانی اور اردو عام طور پر بولی جاتی ہے۔'' (۱۰۲)

نذؔیر نے مختلف تصانیف میں اردو الفاظ کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے۔جس میں ہمیر راسو،نمل چھند،کھمان راسو،رنگ راسو،دیو راسو وغیرہ تصانیف کے نام گنوائے ہیں اور ان میں سلطان،خان،خواص،،سفر،ترک،رحمٰن،نماز گزار،شکار،رسالہ،ایک،شتر،رقم،عنبر،محل،آسمان،خنجر، پیش کش،تیغ،جنگ،گرد،گزر،جمال وغیرہ الفاظ کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے راجستھان کے مختلف حصوں میں رائج زبانوں مثلاً مارواڑی،ڈھونڈھاری،میواتی باگڑی،ڈنگل،پنگل،ہاڑوتی،رانگڑی جیسی زبانوں پر بھی اردو کے اثرات کی بات کہی ہے۔

''موجودہ صورت حال'' کے زیر عنوان نذیر نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ۔

”راجستھانی زبان اور بولیاں اب صرف راجستھان تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔اور اردو کا وجود عالمی منظر نامے کا حصہ بن چکا ہے۔آج ساری دنیا میں اردو کے مراکز موجود ہیں۔اس کے بولنے لکھنے اور پڑھنے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور اردو جذبات وخیالات واحساسات وکیفیات کے اظہار کا موثر ذریعہ ہے۔اردو شاعری اور بالخصوص اردو غزل نے اذہان وقلوب کو مسخر کر رکھا ہے۔مہاراشٹر میں اردو کا اثر مراٹھی زبان پر دیکھنے کو ملتا ہے۔عدالت میں آج بھی اردو کے بے شمار الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اردو غزل نے مراٹھی اور گجراتی زبانوں کے گلے میں اپنا ہار ڈال رکھا ہے گزشتہ چند دہائیوں سے راجستھان میں راجستھانی غزل نے اپنے تخلیقی جلوے بکھیرنے شروع کر دیے ہیں۔“(۱۰۳)

نذیر کے اس قول کی روشنی میں شین کاف نظام کے مضمون کا یہ پیرا بھی بہت اہمیت کا حامل ہے جو اس مضمون میں شامل ہے اقتباس ملاحظہ ہو

”پچھلے پچیس سال میں جہاں راجستھانی زبان نے کئی اصناف سے قریب قریب ہاتھ اٹھالیا وہاں پچھلے دس سال میں ایک نئی صنف سخن غزل کو متعارف کرایا اور پروان چڑھایا اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ غزل راجستھانی میں اردو کے ذریعہ سے پہنچی غزل کی شروعات جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے استاد سے ہوئی۔لیکن استاد نے اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔پچھلے دس سال میں جن حضرات نے غزل کے میدان میں جم کر کام کیا ان میں ستیش جوشی ”پریم جی پریم، گووند کلا“ کرشن گوپال شرما کے ناموں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا (راجستھانی زبان کا معاصر ادب مطبوعہ اردو چینل ممبئی صفحہ نمبر۔۸۹)“(۱۰۴)

اس کے ساتھ ہی نذیر نے شین کاف نظام کے اس مضمون کے اس حصہ کو بھی بطور حوالہ پیش کیا ہے جس میں انہوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ راجستھانی شعراء اب اپنی شاعری میں اردو،عربی اور فارسی کے شریں الفاظ کی جگہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔

”ہندوؤں کے نام میں شامل فارسی اردو سابقے لاحقے“ اس مضمون کی شروعات نذیر کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

”ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی جے پور نے اس موضوع پر ایک لغت مرتب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کام کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا اہم ذیل میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کے شکریہ کے ساتھ ان ہندوؤں کے ناموں کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔جن میں فارسی اور اردو الفاظ شامل ہیں۔“(۱۰۵)

اس کے بعد اس فہرست کو شامل کیا گیا ہے جس میں ہندوؤں کے ناموں کے ساتھ فارسی لاحقے اور سابقے موجود ہیں۔اس کے ساتھ ہی راجپوت حکمرانوں کے محلات کے مختلف حصوں کے نام،لباس، پوشاک،زیورات،پھل پھول اور یہاں تک کہ دواؤں کے نام بھی شامل کیے گئے ہیں جو اردو کے الفاظ ہیں۔

”پرتھوی راج راسو میں عربی اور فارسی کے الفاظ“ اس دلیل کو ثابت کرنے کے لیے نذیر نے صابر حسن رئیس کے ایک مضمون سے فائدہ اٹھایا۔ثبوت کے طور پر یہ حوالہ ملاحظہ فرمائیں جو نذیر نے صابر حسن رئیس کے مقالے سے اخذ کیا ہے۔

”راسو کی زبان راجستھانی ضرور ہے لیکن بابو شیام سندر داس کے مطابق راسو میں بتیس فیصد خالص سنسکرت، تیس شو شینی اور باقی دیگر زبانوں کے الفاظ ہیں۔دیگر زبانوں میں عربی فارسی اور ترکی کے الفاظ کی تعداد تقریباً

دس فی صد بتائی گئی ہے لاکھوں چھندوں کے اس ضخیم شاہنامے میں دس فی صد الفاظ تعداد میں کتنے ہوں گے۔(صفحہ نمبر ۴۲۹)''(۱۰۶)

''جان کوی نعمت خان کی کتابوں میں فارسی اور اردو'' جان کوی نعمت خان جو ۷۵ تصانیف کا مالک بتایا جاتا ہے ان کی تصانیف میں اردو الفاظ کے استعمال شدہ زبان کے متعلق نذیر لکھتے ہیں۔

''جان کی مادری زبان کا علم نہیں ہوسکا لیکن تخلیقی طور پر اس نے جو زبان استعمال کی ہے اسے پرانی راجستھانی بتایا گیا ہے۔اور بعض نے اسے راجستھانی گوجری اور بعض نے اسے مارو گجر بتایا ہے۔اور بعض نے اسے ڈنگل لکھا ہے۔قائم خان راسا میں مختلف زبانوں کا تخلیقی امتزاج موجود ہے جس میں برج بھاشا کا استعمال بدرجہ اتم ہوا ہے۔اردو اور فارسی کے علاوہ کہیں کہیں پنجابی کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں''۔(۱۰۷)

''میرا (میراں) کے گیتوں اور بھجنوں میں اردو الفاظ'' کے ذریعہ نذیر نے شاعرہ میرا کے کلام میں اردو کی موجودگی کو پروفیسر سید محمد عقیل کے مضمون ''میرا بائی کی شعری زبان میں لسانی سمیلن (مطبوعہ میرا شخصیت اور فن از ڈاکٹر ثروت خان) اور ریٹا شہانی کی تصنیف'' میرا بائی سے وارتالاپ'' سے حوالہ جات کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اور میرا کے کلام میں اردو فارسی الفاظ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔

''کبیر اور راجستھان کے تحت نذیر نے کبیر اور ان کے شاگردوں کے کلام میں اردو فارسی الفاظ کے موجود ہونے کی دلیل پیش کی ہے جس کے لیے انہوں نے ڈاکٹر فیروز اور ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔کبیر کے دوہوں میں اردو الفاظ کی آمیزش کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

''ہماری گفتگو کا موضوع کبیر کے دوہوں میں اردو کی چاشنی اور اردو کے الفاظ کا تصرفی استعمال کی تلاش ہے۔ایک دوہا ملاحظہ کریں۔

ست گرو کے صدقے کروں، دل اپنی کا ساچھ   کل یگ ہم سوں لڑ پڑیا محکم میرا باچھ

اس دوہے میں صدقے اور محکم اردو کے دو لفظ اپنی پوری صحت اور معنویت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں ایک دوہے میں ہری دیدار کا استعمال ہوا ہے ایک جگہ گا پھل (غافل) استعمال ہوا ہے ایک دوہے میں رباب آیا ہے۔ایک دوہا اور دیکھیئے۔

جوری کیا جلم ہے، مانگے ناؤ، کھدائی   کھالک درکھونی کھڑا مار مورہے منھ کھائی

اس دوہے میں جلم (ظلم) کھدائی (خدائی) کھالک (خالق) کھونی (خونی) اور ایک دوسرے دوہے میں اندیسا (اندیشہ) ایک جگہ نجر (نظر) اور خلق کا استعمال صاف ظاہر کرتا ہے کہ کبیر عربی اور فارسی سے بھی واقف تھے۔اور اس واقفیت کا انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے عربی فارسی کے لفظ اپنے دوہوں میں استعمال کیے۔''(۱۰۸)

''راجستھانی کے ''امراؤ'' اور ''ڈھولا مارو'' میں اردو کی جھلک میں نذیر نے ان دونوں راجستھانی لوک گیتوں میں بھی اردو کے الفاظ کو ڈھونڈ نکالے ہیں۔

''سیکر راجستھان کے راجیہ کے دوہوں پر اردو کا اثر'' اس مضمون میں نذیر نے راجیا کے حوالے سے اس سچائی سے نقاب اٹھایا ہے کہ اصل

میں راجیا نام کا کوئی شاعر سیکر میں پیدا ہی نہیں ہوا البتہ سیکر کے درباری شاعر ''کرپارام'' نے اپنی تمام شاعری اپنے غلام راجیا کے نام سے تحریر کی ہے۔ اس کے پیچھے بھی بہت دلچسپ داستان ہے۔ کرپارام کے دوہوں میں بھی اردو کا اثر جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس کے متعلق نذیر کا خیال ہے کہ۔

''یہ ۱۷۵۳ء کا زمانہ تھا۔ دہلی میں مغلوں کی حکومت تھی۔ فارسی کا چلن عام ہونے لگا تھا۔ اردو نے بھی اپنے واضح نقوش مرتب کرنے شروع کر دیئے تھے۔ جس کا اثر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ سیکر دربار کا کوی راج کرپارام بھی اردو کے اس فطری اثر سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ جس کا عکس ان کے دوہوں میں صاف نظر آتا ہے۔'' (۱۰۹)

''راجستھانی لوک گیتوں پر اردو کا اثر'' ''راجستھانی محاوروں پر اردو کا اثر'' ''راجستھانی کہاوتوں پر اردو کا اثر'' اور ''راجستھانی جکڑیوں پر اردو کا اثر'' مضامین میں نذیر نے لوک گیتوں، کہاوتوں، محاوروں اور جکڑیوں میں اردو کے الفاظ ڈھونڈ نکالے۔

''راجستھان میں قائم خانی سماج کے لوک گیتوں میں اردو کی جھلک'' اور ہریالی تیج تہوار'' عنوانات کے تحت نذیر نے قائم خانی خاندان کے لووک گیتوں میں جو کہ شادی وغیرہ کی تقریب میں مختلف اوقات پر گائے جاتے ہیں اور تیج تہوار میں سہاگنوں اور کنواری دوشیزاؤں کے ذریعہ ساون کے مہینے میں گائے جانے والے گیتوں میں اردو الفاظ کی شمولیت کا سراغ لگایا ہے۔

''راجستھان میں نعت گوئی'' میں انہوں نے ایک ہندو شاعر اوم پرکاش کھینچی ''دل سیکری'' کی راجستھانی نعت پیش کی ہے جس میں انہوں نے راجستھانی مصرعے کے ساتھ اردو مصرعے کو بڑی خوبصورتی اور فنکارانہ انداز میں پیوست کر دیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

''آپرو پرتاپ اوبچو، کرسکے ہے کن بکھان ''سارا عالم ہے منور آپ کے کردار سے''

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص۔۱۱۶)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس نعت کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے بچپن کی خوبصورت یادوں میں شامل ہے جبکہ وہ قاضی رضا محمد مرحوم (فتح پور شیخاواٹی راجستھان) کے ساتھ محفل میلاد شریف میں شرکت کرتے تھے اور ان کے ساتھ یہ نعت پڑھا کرتے تھے۔ نعت کا بند ملاحظہ ہو۔

سلام

تھا پر لاکھ ہجار سلام تھاں پر پڑھاں پکار سلام
تھارو دل سے بنو گلام تھارو پلّو لینو تھام
تھارو نبی محمد ﷺ نام
مھارو کرو کبول سلام
تھاں سوکھا لک (خالق) راکھے پیار مھا بھی تھا پر چھو بلہار
تھارو آلی چھے دربار مھاں پر نجر کرو اک بار
تھارو نبی محمد ﷺ نام
مھارو کرو کبول سلام

(اردو کا اثر راجستھان بولیوں پر۔ص ۱۱۸؛

اس کے ساتھ ہی ایک نعت جو نذیر نے خود راجستھانی میں تحریر کی ہے بھی شامل ہے اور اس کے علاوہ اکرام راجستھانی کی بھی نعت شامل

مضمون کی ہے۔ راجستھانی نعت پر اردو کے اثر کے متعلق آخر میں نذیرؔ فرماتے ہیں۔

''راجستھانی کے شاعروں نے کثرت سے نعتِ رسول کے ساتھ ساتھ۔ منقبت اور سلام بھی کہے ہیں۔ یہ تمام اصناف ظاہر ہے کہ اردو ہی سے راجستھانی میں آئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر اردو کا گہرا اثر ہے'' (۱۱۰)

نذیرؔ کی راجستھانی نعت کا ایک بند بھی ملاحظہ کریں۔

راجستھانی نعت

لاگے کھوب سہاؤنا

نبی جی مھارو پاؤنا

آیو مھارے آنگنا

نب جی مھارو پاؤنا

رم جھم رم جھم میہا برسے چمکے بجوری کھوب

ایکلی ایکلی بیٹھیاں بیٹھیاں یاد آئے محبوب

موسم ہے سہاؤنا

نبی جی مھارو پاؤنا

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر ص۔۱۲۱)

''راجستھانی غزل اور نظم پر اردو کا اثر'' کے تحت نذیرؔ نے اپنے مضمون میں ان راجستھانی شعراء کا کلام یکجا کیا ہے جو ردیف وقافیہ کی پابندی کے ساتھ اردو کے الفاظ بھی اپنی غزلوں میں جا بجا استعمال کرتے ہیں۔ ان شعراء میں راجندر شونکری، اوم پرکاش دلؔ سیکری، اوم ناگر اشک، ڈاکٹر ونود سومانی ہنس، تاؤ شیخاواٹی، اور لکشی نرائن کے کلام سے کچھ غزلیں اور نظمیں مضمون میں شامل کی گئیں ہیں۔

''فتح پور شیخاواٹی کی راجستھانی شاعری میں اردو'' اس مضمون میں فتح پور کے ان شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے اپنی شاعری میں اردو فارسی الفاظ کا استعمال کیا۔ ان شعراء میں صوفی سنت بھی شامل ہیں۔ سندرداس، تاج کویتری، خواجہ نجم الدین، قمرالدین خان جوڈ قمر، خواجہ غلام سرور، مدن کھنڈیلوال، دولت رام چھاچیڑ، پنڈت دوارکا پرساد بوچی وال، لکشمن نیوٹیا، وغیرہ کے کلام میں اردو الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔

''اردو غزل میں راجستھان'' اور ''اردو نظم میں راجستھان'' کے حوالے سے نذیرؔ نے اردو شعراء کی غزلوں اور نظموں میں یہاں کے موسموں اور اس سے متعلق مختلف خیالات واحساسات کا ذکر کیا ہے جو ان کی شاعری میں نئے معنی اور استعارے بن کر ابھرے ہیں۔ جس کے متعلق نذیر کا خیال ہے کہ۔

''اردو شاعری میں راجستھان کا ذکر مختلف حوالوں سے آیا ہے، بالخصوص اردو غزل میں ریگستان، پیاس، صحرا کنواں، بگولے، سراب، گرمی، دھوپ وغیرہ کے استعاروں سے جو نئے ابعاد وجود میں آئے ہیں ان سے اردو شاعری کا دامن مالا مال ہوا ہے۔'' (۱۱۱)

ان کے اس قول کی روشنی میں انہیں کی ایک نظم ذیل میں پیش کی جا رہی ہے جس کا عنوان ہی ''گرمی'' ہے۔

گرمی

''پیاس ہی پیاس ہے
ہر طرف پیاس ہے
دھوپ کا راج ہے
سر پہ آکاش کے ان دنوں
آگ کا تاج ہے
تال، تالاب پوکھر سبھی
شدتِ پیاس کا آئینہ بن گئے
آدمی، جانور
پھول، پتے، شجر
المدد المدد کی صدا میں ہیں ڈوبے ہوئے
اے خدا آگ کو باغ کردے ذرا
اوک پانی سے بھردے ذرا''

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص ۱۴۸)

جہاں ''اردو شاعروں کی راجستھانی شاعری'' میں نذیؔر نے راجستھانی شاعری کے نقوش ڈھونڈے ہیں وہیں ''راجستھانی شاعروں کی اردو شاعری'' میں اردو الفاظ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔

''اردو کے راجستھانی میں تراجم'' کے ذریعہ نذیؔر نے اردو سے راجستھانی میں ترجمہ ہونے والی ان تخلیقات کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے راجستھانی ادب کے ذخیرہ میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس مضمون میں ''اکرام راجستھانی'' اور اسد علی اسد کی ترجمہ نگاری کو موضوع بنایا ہے ذیل میں اکرام راجستھانی کا ترجمہ کردہ ایک دوہا ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا راجستھانی میں ترجمہ کیا ہے۔

''سب پہلی سمرن کروں، میں اللہ کو نام گھنو گھنو کرپالو ہے اور دیا کو دھام

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص ۱۵۹)

اس کے علاوہ اسد علی اسد نے بھی اپنی ترجمہ نگاری کے ذریعہ اردو کی بہت سی تخلیقات کو راجستھانی زبان میں ڈھال دیا۔ انہوں نے نذیؔر کا افسانہ بھی راجستھانی زبان میں ترجمہ کیا جو اُوجاس خانی'' کے عنوان سے راجستھانی زبان میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالے انوسرجن' کے جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء کے شمارے کے صفحہ نمبر ۲۳ پر شائع ہوا۔

''غالب راجستھانی میں'' کے عنوان سے نذیؔر نے غالبؔ کے دیوان کے اس راجستھانی ترجمہ کا ذکر کیا ہے جو حکیم یوسف جو جھونوی نے ۱۹۸۳ء میں کیا تھا۔ اور جسے محمد اسمٰعیل قریشی نے قریشی دواخانہ ساہتیہ منزل جھونجھنوں راجستھان سے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر

او۔پی۔دوست نے بھی ہاڑوتی زبان میں غالب کی غزلوں کا ترجمہ کیا۔لیکن دونوں نے انداز جداگانہ ہیں۔دونوں کے ترجمہ کردہ،اشعار ملاحظہ ہو۔

محمد یوسف... بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

[illegible]

[illegible]

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص۱۶۲)

ڈاکٹر او۔پی۔دوست:۔

دردمنت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

[illegible]

[illegible]

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص۱۶۴)

''راجستھان کے شہروں کا ذکر اردو شاعری میں'' نذیؔر نے مختلف شعراء کے کلام سے ان اشعار اور نظموں کا انتخاب کیا ہے۔جن میں انہوں نے راجستھان کے تہذیبی اور ثقافتی شہروں مثلاً۔جے پور، جودھپور، ادے پور، اجمیر،ٹونک، الور، بیکانیر، فتح پور اور کوٹہ کا ذکر کیا ہے یہ تمام اشعار اور نظمیں شعراء نے اپنے وطن سے محبت وعقیدت کے اظہار کے لیے قلمبند کی ہیں۔ذیل میں عقیل شاداب مرحوم کا یہ شعر ملاحظہ ہو جو کوٹہ کی شان وشوکت میں اضافہ کرتا ہے۔

ایسا کوٹہ، ایسی چمبل، ایسا گھر کہاں ملے گا یہ گنگا جل، ایسا گھر

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص۱۶۹)

''راجستھان کے معروف شاعر کنہیا لال سیٹھیا کی اردو شاعری'' کے متعلق نذیؔر کا خیال ہے کہ۔

''ان کی راجستھانی شاعری میں جگہ جگہ اردو الفاظ کا استعمال ملتا ہے اس سے ان کے گیتوں میں روانی اور شیرینی در آئی ہے، وہ علمِ عروض سے واقف نہ تھے پھر بھی انہوں نے اردو شعر لکھنے کی جسارت دکھائی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو سے متاثر تھے۔اور بے حد متاثر تھے۔'' (۱۱۲)

''اردو شاعری میں کنویں اور حویلیاں'' راجستھان کے پس منظر میں کنویں اور حویلیوں کی اہمیت وافادیت کے متعلق نذیؔر لکھتے ہیں کہ

''اردو کے شاعروں نے جہاں اردو غزل میں قدیم استعارات اور تماثیل کی دنیا آباد کر رکھی ہے وہاں جدید پیکر تراشنے کے لئے جدید اشعار اور تماثیل واضح کیے ہیں ان میں کنویں اور حویلیوں کی بڑی اہمیت ہے'' (۱۱۳)

ذیل میں نذیؔر کے ہی دو اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کے اس قول کے غماز ہیں۔

یاد آیا وہ کنوا پیاس بجھائی جس نے سائے میں بیٹھے تھے جس کی وہ شجر یاد آیا

مقفل حویلی کا در منتظر تھا وطن آ کے دیکھا تو گھر منتظر تھا

(اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ص۱۷۷)

''راجستھانی کا اثر فرانسیسی پر'' کو ثابت کرنے کے لیے نذیؔر نے راجستھان کے ہندی اخبار دینک بھاسکر کی اس رپورٹ کا ذکر کیا جو

۱۶؍نومبر ۲۰۱۰ء کو اخبار میں شائع ہوئی اور جس میں اس بات کو واضح کیا گیا کہ راجستھانی زبان کے کچھ الفاظ فرانسیسی زبان میں ہو بہو شامل ہیں۔ اس بات کی تصدیق میں وہ کرنل پورن سنگھ راٹھور جو ماہرِ لسانیات ہیں کہ حوالے سے لکھتے ہیں۔

"آپ نے فرنچ اور راجستھان کے لسانی روابط پر فرانس کے ایک شہر موبلیار میں خطبہ بھی دیا ہے۔ آپ کی تحقیق کے مُطابق راجستھانی لفظ سال (شال) سوکھو (سوکھا) ریت (رسم) کرونڈ، کورنڈ، باجو (باجا) ایسے الفاظ ہیں جو راجستھانی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔" (۱۱۴)

پھر آگے چل کر فرانسیس زبان کے ماہر پول گھ کی رائے بھی قلمبند کرتے ہیں جس میں وہ فرماتے ہیں۔

"فرانسیسی کے ماہر پول گھ کا خیال ہے کہ راجستھانی اور فرنچ انڈو یورپی زبان کے خاندان سے ہیں۔ راجستھانی سینٹرل انڈو آرین لوگوں کی زبان سے تعلق رکھتی ہے۔ فرانسیسی خانہ بدوشوں کی زبان میں سنسکرت کے ساتھ ہی دوسری ہندوستانی زبانوں کے لفظ بھی شامل ہیں ممکن ہے اس میں اردو الفاظ بھی مل جائے۔" (۱۱۵)

یہ تصنیف اسباق پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام فروری ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی خوبصورت سرورق کے ساتھ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف اپنے آپ میں ایک لسانی ذخیرہ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے لسانیات کے طالب علم فیض یاب ہوں گے۔ اس تصنیف کے وجود میں آنے کا کیا مقصد رہا ہوگا؟ جب راقمہ نے اس کے متعلق نذیؔر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ انہوں نے "قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی" کے حکم پر انجام دیا۔ اس کے متعلق ایک دوسری وجہ کی قیاس آرائی کرتے ہوئے سیّد یحییٰ نشیط فرماتے ہیں۔

"اردو اور راجستھانی دو الگ الگ ذیلی شاخوں سے تعلق رکھنے کے باوصف ہند آریائی خاندان ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ قواعد زبان کے اعتبار سے دونوں میں مماثلت و مطابقت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے افعال و اسماء اگرچہ الگ الگ ہیں، ضمائر و متعلقہ فعل میں بھی بڑی حد تک فرق پایا جاتا ہے لیکن اس کے علی الرغم دونوں نے ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ ان اثرات کے مرتسم نقوش کو نذیؔر فتح پوری نے "راجستھانی بولیوں پر اردو کا اثر" میں تلاش کرنے کی مخلصانہ سعی کی ہے۔ نذیؔر صاحب کی مادری زبان راجستھانی ہے اور وہ راجستھان ہی کے باشندے ہیں۔ اردو سے انہیں محبت ہے۔ شاید اسی محبت نے انہیں ان دونوں زبانوں کے باہمی روابط کے دریچوں میں جھانکنے کی تحریک دی۔ اور انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اسے تنقید و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ کتاب ترتیب دی ہے۔" (۱۱۶)

بہر حال وجہ چاہے جو بھی رہی ہو لیکن اس تصنیف نے بہت سے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھایا ہے اور تحقیق کے نئے دروازے کھولے ہیں۔ اور اسی لیے بہار اردو اکیڈمی نے اسے انعام سے نوازا۔ لیکن راجستھان اور راجستھانیوں کی طرف سے اس تصنیف کے ساتھ کوئی انصاف نہیں کیا گیا نثار احمد صدیقی کے سوال "اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر" آپ کی تحقیقی کتاب ہے جس پر بہار اردو اکادمی نے پہلا انعام دیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت سے متعلق اردو ادب کے طالب علموں کو مختصر جملوں میں بتائیں پر نذیؔر نے اسی طرح کے خیالات کا ذکر کیا ذیل میں اس سوال کا جواب ملاحظہ کریں۔

''جواب۔ میں نے اوپر حق تلفی کی بات کہی ہے۔،اس کتاب کے ساتھ راجستھان والوں نے یہی سلوک کیا۔ راجستھان اردو اکادمی نے اسے انعام کے قابل نہیں سمجھا راجستھان کے دانشورانِ ادب نے بھی اس کتاب کی رسید تک نہیں دی۔ جن لوگوں نے رسید دی وہ تحریر حوصلوں کو پست کردینے والی تھی، یہ بات کسی کے حلق سے نہیں اتری کہ راجستھان سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھ کر نذیرؔ نے یہ سب کچھ کیسے کرلیا۔ جو حضرات تعلیمی اداروں کی کرسیوں پر براجمان ہیں وہ چاہتے تو یونیورسٹی کے نصاب میں اسے داخل کراسکتے تھے۔ لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا۔ بہار اردو اکادمی کا شکرگزار ہوں کہ اس کتاب کی اہمیت کو محسوس کیا اور اسے انعام سے نواز کر اس کی قیمت دوبالا کردی طالب علم اپنے موضوع اور متن کے لحاظ سے اس کتاب کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ یہ ہر حال میں استفادے کی کتاب ہے مجھے یہ کام کرتے روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے۔'' (۱۱۷)

اس تصنیف کی اہمیت وافادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر غازی علم الدین (پاکستان) اپنے مضمون ''اُردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' (نذیرؔ فتح پوری کے لسانیاتی تقابل کا تنقیدی مطالعہ) میں لکھتے ہیں۔

''اُردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' ایک خالص تحقیقی کتاب ہے جو لسانیات کے طلبہ اور اساتذہ ہر دو کے لئے ایک قابل قدر تحفہ ہے۔ ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں لسانیات پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اردو اور راجستھانی بولیوں کے باہمی تعلق کی نسبت یہ خوبصورت ذولسانیاتی کاوش ہے۔'' (۱۱۸)

اپنے اسی مضمون میں وہ آگے لکھتے ہیں۔

''یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے لسانیاتی ادب میں ایک مفید لائق تحسین اور وقیع اضافہ ہے جو فاضل محقق کی محنتِ شاقہ، تحقیقی مہارت اور ادبی اسلوب نگارش کی نادر مثال ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے لسانیاتی تقابل کے ایک تشنہ پہلو کی تکمیل ہوتی ہے۔ فاضل محقق نے بکھرے ہوئے دستاویزی مواد کو محنت شاقہ سے جمع کیا اور ترتیب وتہذیب کر کے اسے مربوط اور منظّم انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سے فاضل محقق کی شخصیت کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے کہ آپ ایک صاحبِ طرز ادیب، قادرالکلام شاعر اور دردِ دل رکھنے والے مدبر ہیں جن کے قلم میں ادب لطیف کی چاشنی، تفکر وتفحص کی وسعت اور تحریر کی اثر انگیزی ہے۔ یہ تحقیقی کاوش شروع سے آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے اور پڑھنے کی طرف راغب کرتی ہے۔'' (۱۱۹)

ضیاء الحسن قادری نے اس تصنیف پر تبصرہ لکھا جس کا عنوان ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' اردو راجستھانی دوستی پر ایک مکمل کتاب'' ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ۔

''نذیرؔ فتح پوری نے اپنی اس تحقیقی کتاب میں اردو اور راجستھانی زبان کے باہمی اختلاف اور دوستی پر ایک محققانہ نظر ڈالی ہے۔ البتہ تنقید کا پہلو کہیں بھی نظر نہیں آتا'' (۱۲۰)

حالانکہ یہ کتاب اپنے موضوع ومواد کے لحاظ سے مکمل نظر آتی ہے لیکن ڈاکٹر ثروت خان صاحبہ کو اس تصنیف میں ایک کمی کھلی ہے جس کے

متعلق وہ اپنے مضمون ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' میری نظر میں'' یہ فرماتی ہیں۔

''بلاشبہ نذیر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔لیکن نہ جانے کیوں نذیر صاحب نے اردو افسانہ ناول اور طنز و مزاح کے گوشے کو تشنہ چھوڑ دیا۔'' (۱۲۱)

اس کتاب کی زبان و بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر ایک مطالعہ'' میں جناب اسلم مرزا کا خیال ہے کہ۔

''ان کی نثر بہت شگفتہ سلیس اور رواں دواں ہے۔ بے شمار ابواب ہیں لیکن ہر باب اپنے اختصار کے باوجود بہت کسا ہوا، پر از معلومات اور قاری کی سوچ کو مہمیز کرتے ہوئے زبان کے بارے میں آگاہی دیتا ہے۔'' (۱۲۲)

اپنے اسی مضمون میں اسلم مرزا آگے فرماتے ہیں۔

''نذیر صاحب نہایت منکسر المزاج شخص ہیں اور اس بات کے مدعی نہیں کہ ان کا یہ کام حرفِ آخر ہے وہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کے ذریعہ اخذیق اور اضافے کی راہ ضرور نکلے گی اور نکلنا بھی چاہیے کہ کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی اور نہ کوئی محقق اس کا دعویٰ کرسکتا ہے۔نذیر صاحب ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اردو ادب میں ایک نہایت اہم اور گرانقدر کتاب کا اضافہ کیا۔ جو حوالے کی کتاب بن جائے گی۔'' (۱۲۳)

جناب مختار ٹونکی اپنے ایک خط میں اس تصنیف کے لیے نذیر کو مبارک باد دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''فی الحقیقت آپ نے پروفیسر فضل امام اور ڈاکٹر فیروز احمد سے کچھ آگے بڑھ کر کام کیا ہے اور کئی تشنۂ تحریر پہلوؤں کا تعین کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں مجموعی طور پر آپ کا یہ کارنامہ راجستھان کے شعراء اور ادباء کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (۱۲۴)

جہاں مختار ٹونکی صاحب نے نذیر کے اس کارنامے کی قصیدہ خوانی ان الفاظ میں کی ہے وہیں خلیل تنویر صاحب اس تصنیف کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے ایک خط جو انہوں نے نذیر کو ۲۸/ اپریل ۲۰۱۱ء کو تحریر کیا تھا میں لکھتے ہیں کہ۔

''آپ نے راجستھان میں اردو کی ابتداء لکھنے سے پہلے راجستھان کی سیاسی صورتِ حال پر روشنی ڈالی ہوتی تو بہتر تھا۔ راجستھان میں خواجہ معین الدین کے آنے سے پہلے ناگور اسلام کا پہلا مرکز تھا۔ مختار ٹونکی نے اس جانب اشارہ ضرور کیا ہے۔ جس طرح فتح پور قائم خانی حکمرانوں کی راجدھانی تھا اسی طرح ناگور گجرات کے مسلم سلطانوں کے ماتحت تھا، اس دوران زبانوں پر کیا اثرات ہوئے اس کا ذکر بھی آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے خواجہ اجمیری خلیفہ حمید الدین کے ملفوظات سرور الصدور کا ذکر کیا ہے یہ ملفوظات حمید الدین کے پوتے فرید الدین نے جمع کیے تھے لگتا ہے اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے اس میں اردو کی ابتدائی نشونما کا سراغ ملتا ہے۔ صفحہ ۴۴ پر آپ نے عزیز انصاری کے حوالے سے جودھا بائی کو اکبر کے حرم میں بتلایا ہے دراصل جودھا بائی جودھپور کی رہنے والی تھی جو شاہجہاں کے حرم میں تھی

جودھپور کی کھیات میں لکھا ہے جودھپور کے جس راجا کی لڑکی سے سلیم پیدا ہوا اس کا نام تہر کا بائی تھا جس کو اکبر کے حرم میں مریم زمانی کا نام دیا گیا۔'' (۱۲۵)

اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' نذیر فتح پوری کی ادبی زندگی کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو لسانیات کے ماہرین سے بھی داد وصول کرے گا اور طلبہ وطالبات کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

جگن ناتھ آزاد۔ایک مستقل ادارہ:۔

مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد، اقبالیات کے ماہرین میں پہلے نمبر پر شمار ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد برسوں آزاد ہندستان میں علامہ اقبالؔ کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔لیکن پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے پہلی بار علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور ان کے فکر وفن پر لکچر دے کر از سر نو اقبالؔ کی بازیافت کی جسارت کی اس طرح ہندوستان کے اردو حلقوں ہی میں نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی گلیاروں میں بھی علامہ اقبال کا ذکر ہونے لگا۔

جگن ناتھ آزاد پر سب سے پہلے کتاب لکھنے کا سہرا نذیرؔ فتح پوری کے سر بندھا۔ جب ۱۹۹۸ء میں ان کی کتاب ''جگن ناتھ آزاد۔ایک مستقل ادارہ'' محروم میموریل لٹریری سوسائٹی نئی دلی کی جانب سے شائع ہوئی۔

نذیرؔ نے جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور فکر وفن کو مختلف زاویوں سے مطالعہ کر کے اپنی بات قارئین کے روبرو پیش کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ایک اہم اور بڑی ادبی حیثیت کے حامل ادیب وشاعر تھے، نذیرؔ نے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ مختلف عنوانات کے تحت مضامین لکھ کر آزاد صاحب کی خوبصورت شخصیت کو مزید خوبصورت بنا کر پیش کیا ہے۔

نذیرؔ فتح پوری کی اس کتاب کا پیش لفظ بشیر احمد انصاری نے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''نذیرؔ صاحب کی یہ کتاب ایک جرأت مندانہ اقدام ہے انہوں نے خلوص اور عقیدت کے جذبے کے تحت مواد جمع کیا اور ایک نئے زاویئے سے انہیں پیش کیا ہے، بلاشبہ جگن ناتھ آزاد کے فکر وفن پر بحث کرتے وقت زیر نظر کتاب کے حوالے کار آمد ہونگے۔اہلِ پونہ کے لیے یہ باعث مسرت ہے اور وہ نذیرؔ صاحب کے اس کارنامے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔'' (۱۲۶)

یہ سچ ہے کہ نذیر فتح پوری نے ادبی شخصیات پر خوب لکھا ہے، اور خوب سے خوب تر بھی لکھا ہے، فراخ دلی سے لکھا ہے۔ جس پر لکھا ہے اس کے ادبی کارناموں کو خوب سراہا ہے۔ جگن ناتھ آزاد اگرچہ غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ نذیرؔ کے قلم نے انہیں زندگی عطا کی مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نذیرؔ نے اپنے طریقے اور زاویہ سے جگن ناتھ آزاد کے فکر وفن پر روشنی ڈالی ہے یہ نذیر کی تلاش وجستجو کی عادت اور گہرے مشاہدے کا ہی کمال ہے جو انہوں نے آزاد کی تخلیقات اور ان کی تحقیق میں ایسے رویوں کی شناخت کی ہے جس سے آزاد کی شعری آفاقیت اور تحقیقی صداقت کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر عظیم راہیؔ فرماتے ہیں۔

> ''نذیرؔ فتح پوری نے تقریباً ایک سال لگاتار محنت اور تحقیق کے بعد جگن ناتھ آزاد کی حیات اور ادبی کارناموں پر اپنی تصنیف مکمل کی۔'' (۱۲۷)

جو لوگ نذیرؔ کے قریبی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ نذیرؔ محنت سے جی نہیں چراتے، جو کام کرتے ہیں پوری سپردگی اور

اپنے پن کے ساتھ کرتے ہیں جگن ناتھ آزاد۔ ایک مستقل ادارہ۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

نذیؔر فتح پوری چونکہ خود سفر ناموں کے مسافر ہیں اس لیے انہوں نے اس کتاب میں آزاد کے ادبی اسفار کا بھی ذکر کیا ہے۔ لاہور، مدراس، آسام، دوبئی، وغیرہ کے اسفار پر نذیؔر نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔ دوبئی میں منعقدہ جشن آزاد کا نہایت تفصیل سے اظہار کیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد۔ کسی مشاعرے کی صدارت کے لیے جب پونہ آئے تو نذیؔر اس کمیٹی کا حصہ تھے جس کمیٹی کو ان کے استقبال کی ذمہ داری سونپی گئی جگن ناتھ آزاد نے اپنے تین روزہ قیام کے دوران جب پونہ کے تعلیمی اداروں کا معائنہ کیا تو نذیر ان کے ساتھ تھے۔ اس لیے انہوں نے جگن ناتھ آزاد کو قریب سے دیکھا، ان سے تبادلہ خیال کرتے رہے اور ان کی شخصیت کی پرتیں نذیر پر کھلتی گئیں۔ اور نتیجہ میں جگن ناتھ آزادا۔ ایک مستقل ادارہ'' جیسی تصنیف منظر عام پر آئی۔

جہان گیتا رضؔا:۔

''جہانِ گیتا رضا'' یہ تصنیف کالی داس گیتا رضا کے فن اور شخصیت پر تحریر کی گئی ہے جس کا سنِ تصنیف ۱۹۹۹ء ہے۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل اس تصنیف میں نذیؔر نے رضؔا صاحب کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اور ان کی شخصیت میں پوشیدہ بہت سے رازوں کا انکشاف کیا ہے۔ اس تصنیف کا آغاز ''گفت باہمی'' ۔ ''تعارف'' ۔ اور ''کالی داس گیتا رضؔا سے پہلی ملاقات'' سے ہوتا ہے پھر ۱۴ مضامین مختلف عنوانات مثلاً ''گیتا رضؔا کی شاعری کے متعلق، شعور، غم حسین اور کالی داس گیتا رضؔا، شعلۂ خاموش ہندوستانی مبصرین کی نظر میں'' شعلۂ خاموش پاکستانی اہل قلم کی نظر میں'' رضؔا صاحب کے نثری فن پارے'' حسینا، دُرگا دیوی، عبدل بابا، گیتا رضا اور تاریخ گوئی، کالی داس گیتا رضؔا ایک کرم فرما'' کچھ تلامذۂ رضا صاحب سے متعلق'' رضؔا صاحب کی اصلاحیں، ماں اور رضا صاحب، کے زیر عنوان شامل کئے گئے ہیں۔ اس تصنیف میں نذیؔر نے رضؔا صاحب کے شعری مجموعے ''شعورِ غم'' کی نظموں پر بھی بحث کی ہے اور ان کی اسلام سے محبت اور اس سے عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے۔ ''شعور غم'' کو اعجاز سیمابی نے مرتب کیا ہے۔ اصل میں یہ مجموعہ پہلے رضا صاحب نے ''اجالے'' عنوان سے شائع کیا تھا جس میں ترمیم و اضافہ کر کے اعجاز سیمابی نے اسے دوبارہ ''شعور غم'' کے عنوان سے شائع کیا۔

نذیؔر نے اس مجموعہ کو اپنے مضمون کا حصہ بنایا اور اس کے پیچھے ان کا مقصد تھا رضؔا صاحب کی شخصیت کے ان خوبصورت اور خوب سیرت پہلوؤں کو نمایاں کرنا جو ان کی انسان دوستی اور ہمدردانہ رویوں کے غماز ہیں۔

رضؔا صاحب ماہر غالبیات ہیں۔ ان کے فکر و فن پر بہت سی کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں نذیؔر کی یہ تصنیف بھی اسی صف میں شامل ہے مگر اس کی خاص بات جو اسے دوسری تصانیف سے الگ کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ تصنیف میں نذیؔر نے رضؔا صاحب اور خود اپنے درمیان کی بہت سی ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے جو آپ دونوں کے ذاتی تعلق پر منحصر ہے۔ اس تصنیف کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی بہت سے لوگوں نے اس پر تبصرے تحریر کیے تو بہت لوگوں نے نذیر کو خطوط سے نوازہ۔ ان خطوط میں سے ایک خط مجروح سلطانپوری کا بھی ہے جس میں وہ کتاب کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں۔

> '' ہر چند آپ کا طرزِ تحریر اپنی سادگی کے باوجود اتنی پرکاری رکھتا ہے کہ میں نے یوں چاہا کہ ایک آدھ نسخہ دیکھوں تو سہی کہ کیا ہے تو چودہ پندرہ صفحے پڑھتا ہی چلا گیا اور آپ کے تعارف رضؔا اور دیگر تفصیلات تک

آپ کی تحریر نے دامن نہیں چھوڑا۔'' (۱۲۸)

اس تصنیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر معین الدین شاہین اجمیری اپنے طویل مضمون ''نمونۂ سعادت مندی'' جہان گپتا رضا'' میں فرماتے ہیں۔

''کالی داس گپتا رضا صاحب کے فکر وفن پر لکھی گئی تمام کتابوں اور رسائل وجرائد کے خصوصی شماروں اور مضامین کے مجموعوں کی طرح ''جہان گپتا رضا'' بھی امتیازی اہمیت وحیثیت کا حامل ہے بلکہ اس میں بعض ایسی معلومات یکجا کی گئی ہیں جو دوسرے ذرائع سے معلوم نہیں ہوتیں رضا صاحب اور نذیر صاحب میں دیرینہ تعلقات تھے۔رضا کو نذیر صاحب نے قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔اور ان کے متعلق انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اس کا ذکر اس قدر موثر انداز میں کر دیا کہ ہر ایک قاری مسرور ومحسور ہو جاتا ہے۔'' (۱۲۹)

نذؔیر فتح پوری رضؔا صاحب کے تلامذہ میں سے ہیں برسوں وہ رضؔا صاحب کی صحبت سے فیضیات ہوتے رہے۔وہ ان کی ادبی اور سماجی زندگی کے راز دار بھی ہیں۔نذؔیر نے پونے اور ممبئی میں رضؔا صاحب کو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے اور لکھتے پڑھتے دیکھا ہے، اس لیے آپ نے رضؔا صاحب کے تعلق سے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں ایک بڑی سچائی ہے۔زیر تبصرہ کتاب اس سچائی کا آئینہ ہے۔

مرزا غالؔب، کالی داس گپتا رضا اور سنجے گوڈ بولے

ادبی شخصیات پر بطور خراج تحسین لکھنا ادبی نیکی کے مترادف ہے اور اس ادبی نیکی سے مستفیض ہونے والوں میں نذؔیر کا نام بھی شامل ہے۔اس کتابچہ میں نذؔیر نے غالؔب کے لیے علامہ کالی داس گپتا رضا اور سنجے گوڈ بولے کی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ کتاب ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ستمبر ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔علامہ کالی داس گپتا رضؔا ماہر غالبیات ہیں اور سنجے گوڈ بولے ان کے شاگرد ہیں۔سنجے گوڈ بولے نے دیوان غالب کو مراٹھی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کروایا۔جس کے سبب سنجے غالؔب کے پرستاروں کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔اس کتابچہ میں اس مجلس کی روداد بھی بیان کی گئی ہے جو اگست ۲۰۰۰ء کو اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام علامہ کالی داس گپتا رضا کے دولت خانے پر ''بنام غالؔب'' منعقد ہوئی۔اس مجلس میں سنجے گوڈ بولے کی اس ترجمہ شدہ تصنیف کا رسمِ اجراء وجود میں آیا جو علامہ کالی داس گپتا رضا کی تصنیف ہے۔اس کتاب میں غالؔب کے ۱۲۵۱ اشعار کی شرح پیش کی گئی ہے جس میں ۱۹۱ اشعار ایسے بھی شامل کیے گئے ہیں جو دیوانِ غالؔب میں شامل نہیں تھے۔اس کتاب کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی مجلس میں موجود تمام شعراء ادباء نے اس کام کو خوب پسند کیا۔

ساؔحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ:۔

ساؔحر شیوی کے فن اور شخصیت پر مرتب اس تصنیف میں نذؔیر نے مضامین تحریر کیے ہیں۔اس کتاب کی ابتداء نامور ادیب وشاعر رفیق جعفر کے مضمون سے ہوتی ہے۔جس کے تحت رفیق جعفر صاحب نے نذؔیر سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔اس مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''جناب نذؔیر شاعر ہونے کے علاوہ بہترین نثار اور محقق بھی ہیں۔اور ''اسباق'' جیسے ادبی معیاری رسالے کے مدیر بھی ہیں۔میں ان کے اس فیصلے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے ساؔحر شیوی جیسے ہمہ رنگی نثار اور قوس قزاحی

خوش رنگوں کے شاعر پر لکھنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کیا اور ادب کی مختلف اصناف پر لکھی ساحؔر شیوی کی تخلیقات پر ژرف بینی سے روشنی ڈالی اس سے یہ ہوا کہ ساحؔر کے تعلق سے کئی باتیں کھل کر سامنے آئیں، کچھ وضاحتیں ہوئیں کچھ انکشافات ہوئے اور کچھ ایسی باتیں سمجھ میں آئیں جو کہ قاری کی نظروں سے اب تک پوشیدہ تھیں یہ ایک قلم کار کی دوسرے قلم کار کی ایک طرح سے وکالت ہے اور میری ناچیز رائے میں عصری ادب کی عدالت میں قائم ہوئے اس مقدمے میں جناب نذیؔر کی جیت ہوئی اور ساحؔر شیوی کا شفاف کردار اور اپنائیت شناس معیار سامنے آیا اور ان پر لگائے گئے بسیار نویسی اور ژولیدہ تخلیقی روش جیسے بے جا الزامات سے وہ باعزت بری ہوئے۔'' (۱۳۰)

پھر گفت باہمی'' کے عنوان سے نذیؔر خود ہی اپنے قارئین سے مخاطب ہوتے ہیں اور اس کتاب کی تشکیل کی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''ساحؔر شیوی کے فکر و فن پر متعدد کتابیں مرتب کی جا چکی ہیں لیکن زیر مطالعہ کتاب پورے طور پر میری تحریر کردہ ہے۔ میں نہ ناقد ہوں نہ مبصر، ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے اپنے علم اور اپنی تفہیم کے مطابق ساحؔر شیوی کے تخلیقی منظر نامے کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، اس کوشش میں یہ کوشش بھی شامل رہی ہے کہ موصوف کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہ ہو، میری تحریر نہ حرف اول ہے نہ حرفِ آخر پہلے بھی ساحؔر کے فکر و فن پر بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں، آئندہ بھی لکھے جاتے رہیں گے۔ جب تک ساحؔر کی تخلیقیت کا جھرنا بہتا رہے گا اس سے سیریاب ہونے کا موقع بھی اکثر اہل قلم کو ملتا رہے گا۔ میری تحریر ایک ایسی کڑی ہے جو ماضی اور مستقبل کے سلسلوں کو جوڑنے کا کام کرے گی۔'' (۱۳۱)

(نذیؔر کی یہ تحریر ۲۸ / مارچ ۲۰۰۷ء کو وجود میں آئی۔ ''میں شخصیتوں پر کیوں لکھتا ہوں'' اور اس کے بعد توشیحی نظم ''میرے خواجہ تاش ساحؔر شیوی'' شامل کی گئی ہے اس توشیحی نظم کے ذریعہ نذیؔر نے ساحؔر کے اوصاف گنوائے اور ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔

۱۹۰ / صفحات پر مشتمل یہ تصنیف جس کا انتساب مشہور شاعر، ادیب اور مدیر سیّد معراج جامی (کراچی پاکستان) کے نام کیا ہے، اکثر مضامین کسی نہ کسی رسالے کی زینت بن چکے ہیں اور قارئین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں، اور باقی کے مضامین کو یکجا کر کے ۲۰۰۷ء میں اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام کتاب منظر عام پر آئی ہے۔

نذیؔر ساحؔر کے فن سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ متاثر بھی ہیں اور اس لیے انہوں نے ساحؔر کے فن پر غور و فکر کے بعد اپنے تاثرات مختلف مضامین مثلاً ساحر شیوی کے حمد و مناجات کا حوالہ، ساحر شیوی کی نعتیہ شاعری ''ساحؔر شیوی، شہرِ غزل کا مسافر'' ساحؔر شیوی کی دوہا نگاری''۔ ''ساحؔر شیوی، وادیٔ کوکن کا مسافر''، ''ساحؔر شیوی کی ہائیکو نگاری'' ساحؔر شیوی رباعی کے آئینے میں'' ساحر شیوی کی شخصی رباعیات، ''ساحؔر شیوی کی آزاد غزلیں''۔ ''ساحؔر شیوی کی دیگر رباعیات''، ساحؔر شیوی۔ اُردو سین ریوز کا خالق''، ساحؔر شیوی کی تکونیاں''، ساحؔر شیوی کی کہہ مکرنیاں''، ساحؔر شیوی کی قطعہ نگاری''، ساحؔر شیوی کی نظمیں''، ساحؔر شیوی کے چند گیت''، ''ساحؔر شیوی کی تلخیاں'' ساحؔر شیوی کی ثلاثیاں، ساحر شیوی اردو کی محبت میں گرفتار، ساحؔر شیوی کوکن کی محبت میں گرفتار''، ساحؔر شیوی کی افسانہ نگاری''، ساحؔر شیوی کا ایک تنقیدی کارنامہ''، متعلقات کالی داس گپتا رضاؔ ''ساحؔر شیوی اور ان کے ادبی کارنامے''، ساحؔر شیوی کی مرتبہ کتاب''، کالی داس گپتا رضاؔ۔ شخص اور شاعر''، ساحؔر شیوی اور رضا صاحب'' ''ساحؔر شیوی کی نئی کتاب، متعلقات انور شیخ''، ساحؔر شیوی حیات اور شاعری از ہاشم عبدالرزاق اور ''ساحؔر شیوی بہادر شاہ ظفر کے دربار میں کے

عنوان سے تحریر فرما کر ساؔحر کے فکروفن کو سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ان تمام عنوانات میں نذؔیر نے ساؔحر کے شعری مجموعات ابھی منزل نہیں آئی’’صحرا کی دھوپ(۱۹۷۸ء) ’دد ہے کوکن کے (دوہوں کا مجموعہ)’’وسیلۂ نجات (نعتیہ شاعری کا مجموعہ) ’وادئ کوکن (ماہیوں کا مجموعہ(۱۹۹۹ء) ’’دیواروں کے کان(ساؔحر کی سین ریوزنظموں کا مجموعہ) شعری مجموعہ کوکن میرا مہان‘‘ وغیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔نذؔیر کے اس کارنامے کوخراج تحسین پیش کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر ستیہ پال آنند(امریکہ) اپنے ایک مضمون ’’ساؔحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ‘‘میں فرماتے ہیں۔

’’ساؔحر شیوی جیسے ہمہ جہت شاعر کو پرکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان جیسا ہی کوئی نقد ونظر کا ماہر، جوان سب اصناف سخن پر عبور نہ بھی رکھتا ہوتو بھی اس قابل ہو کہ اپنی تنقیدی اور تجزیاتی تحریر میں ان سے انصاف کر سکے۔ کسی ایک کتاب پر تبصرہ لکھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے،لیکن ساؔحر شیوی جیسے شاعر کی ہمہ جہتی جو چہار اطراف میں پھیلی ہوئی ہے،کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی چھان بین کرنا ایک مشکل کام ہے میرے خیال میں اس کام کے لیے نذؔیر فتح پوری صاحب سے بڑھ کر اور کوئی موزوں شخص نہیں ہوسکتا تھا اس بات کا ثبوت ان کی کتاب ’’ساؔحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ ہے۔‘‘(۱۳۲)

اگر چہ نذؔیر خود کو ایک ناقد کے طور پر پیش نہیں کرتے لیکن اکثر ناقدین نے ان کی تحریروں کو صحت مند تنقید کے زمرے میں رکھا ہے۔ستیہ پال آنند جیسے شاعر اور ناقد نے بھی نذیر کو نقد ونظر کا ماہر تسلیم کیا ہے۔

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ:۔

یہ تصنیف نذؔیر نے ایک ایسے شخص کی محبت میں سرشار ہو کر تحریر کی ہے جو ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے نام سے اردو دنیا میں اپنی ایک منفرد پہچان بنا چکے ہیں۔نذؔیر ان کی اردو زبان سے محبت ورفاقت کے متعلق فرماتے ہیں۔

’’اردو کے لیے ودیا ساگر آنند کا عشق محض لفظی نہیں ہے۔وہ عملی طور پر بھی اس میدان میں دور دور تک اکیلے ہی نظر آتے ہیں۔میرے بڑے بھائی ساؔحر شیوی جب بھی برطانیہ سے مجھے فون کرتے ہیں دوسری باتوں کے علاوہ ودیا ساگر آنند کی اردو نوازی کا ذکر ہی غالب رہتا ہے۔ڈاکٹر ساؔحر شیوی کے مطابق ان کے ادبی رسالوں ’’پرواز‘‘ سفیر اردو،اور ترسیل کی سرپرستی ودیا ساگر آنند ہی فرماتے ہیں ہندوستان میں کئی دوسرے رسالے ہیں جن کو وہ تعاون کرتے رہتے ہیں آج جب اردو رسائل کے مدیران ایک ایک سالانہ خریدار کی تلاش میں سرگرداں ہیں ایسے میں کوئی اپنی جیب خاص سے اردو کے اتنے سارے رسائل کی معاونت کرتا ہے کیا وہ اردو کا عاشق نہیں ہے۔‘‘(۱۳۳)

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند مختلف الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔شاعری اور نثر دونوں ہی میدانوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں ان کے فکروفن پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔نذؔیر نے بھی اس تصنیف کو ایک مقصد کے تحت قلمبند کیا ہے جس کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

’’ میں چاہتا تو بڑی آسانی سے دیگر اہلِ قلم سے مضامین لکھوا کر ایک کتاب شائع کرا دیتا۔ تب مجھے ودیا ساگر آنند کے ساتھ فکری طور پر اپنا وقت گزارنے کا موقع نہ ملتا جتنا موقع زیر مطالعہ کتاب قلم بند کرتے وقت میسر آیا ہے۔ میں گذشتہ کئی ماہ سے ودیا ساگر آنند کی فکروں کے ساتھ ہوں۔ میں انہیں پڑھتا ہوں سمجھتا ہوں اور اپنی رائے سپردِ قلم کرتا ہوں۔ جیسے میری عادت ہے۔ میں کسی پر لکھتے وقت کچھ چھپاتا نہیں۔ میرے پاس ایسی کوئی گٹھری نہیں ہے جس میں اچھا مال الگ سے باندھ کر رکھا جائے، آپ جب کسی فنکار کے ساتھ مخلص نہیں ہوتے نہ اسے سمجھ سکتے ہیں نہ دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں میں نے اپنے اس مطالعہ کے ذریعہ کسی اور کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ خود تفہیمی کے دور سے گزرا ہوں، جو کچھ سمجھ پایا ہوں وہ پورے کا پورا لکھ دیا۔‘‘ (۱۳۴)

نذیر نے ۲۰۸ صفحات پر مشتمل اس تصنیف کے مواد کو پانچ ابواب میں تقسیم کر کے پیش کیا ہے۔ جس میں پہلا بات ’’شخصیت، دوسرا باب ’’شاعری‘‘ تیسرا باب ’’آنند کے ممدوحین‘‘ چوتھا باب ’’آنند کے فکر وفن پر مرتب کتب‘‘ اور پانچواں باب ’’آنند کی نثر کے چند نمونے‘‘ کے زیر عنوان تحریر کیا ہے۔ اور آنند کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور اپنی بات کو مختلف حضرات کی رائے سے ثابت کیا ہے یہ تصنیف اپنے موضوع ومواد کے لحاظ سے ایک قیمتی ادبی سرمایہ ہے اس تصنیف کو ہندی قلمکاروں تک پہنچانے میں بھی نذیر نے اہم رول ادا کیا انہوں نے اسے ہندی رسم الخط میں ۲۰۰۹ء میں ماڈرن پبلی شنگ ہاؤس کے زیر اہتمام شائع کروایا تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک اس کی رسائی ممکن ہو سکے۔

اس تصنیف کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے درخشاں زرین اپنے ایک خط میں فرماتی ہیں۔

’’آپ کی تحقیقی جستجو قابل ستائش ہے جو قاری کو ادب کے ایک وسیع منظرنامے سے متعارف کراتی ہے انداز بیان میں فطری پن اور زبان میں گھلاوٹ ہے ہر جگہ یوں محسوس ہوا جیسے آنند کے اخلاق وعادات افکار وشخصیت اور اردو سے ان کی بے پناہ محبت کی کہانی ہم پڑھ نہیں رہے بلکہ ان سے روبہ رو متعارف ہو رہے ہیں اور یہ کمال ہے آپ کی اس تحریر کا جس میں تحقیق وتنقید کے ساتھ تخلیق بھی آپس میں گلے ملتی نظر آتی ہے۔‘‘ (۱۳۵)

جو تشنگی نذیر کو ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی تخلیقات میں نظر آتی ہے عین وہی تشنگی وقار قادری کو نذیر کی تخلیقات میں نظر آتی ہے اور وہ اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

’’آج نذیر ودیا ساگر آنند کی طرح ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں جن پر بار بار قلم اٹھایا جائے تب بھی نوک قلم کی تشنگی باقی رہے گی۔‘‘ (۱۳۶)

اس سے بڑھ کر ایک مصنف کے لیے کیا اعزاز کی بات ہوگی کہ جس شخص کی مداح سرائی میں وہ مشغول ہے ایک دوسرا مصنف اسے اسی کے مدمقابل بٹھا دیتا ہے۔ یہ کتاب بھی نذیر کی تنقیدی نثر کا ایک اہم حوالہ ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی:۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تصنیف ''ژرف گوئی'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی جو اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے اس تصنیف میں مناظر عاشق ہرگانوی نے اردو ادب کی نامور ہستیوں کو ایک سوال نامہ کے ذریعہ دو سوال (۱) ۲۰۰۸ء آپ کے لئے ادبی طور پر کیسا گزرا؟'' اور دوسرا سوال ہے۔''سال کا آخری دن آپ کیسے گزارنا چاہتے ہیں۔؟'' کے جواب طلب کیے اور پھر انہیں کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ان کی اس تصنیف سے بے حد متاثر ہو کر نذیؔر نے اپنی تصنیف مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی کا مواد تیار کیا۔

یہ تصنیف آٹھ حصوں پر مشتمل ہے، جن میں گفت باہمی، مجھے پیارا ہے وہ جس کو کتابوں سے محبت ہے، اسباق کا منظوم اداریہ ڈاکٹر ہرگانوی کے نام، تضمین بر آزاد غزل مناظر عاشق ہرگانوی، منظوم مناظر نامہ، پر منظوم تبصرہ، اسباق خطوط اور ہرگانوی، مناظر بنام نذیر، چند خطوط اور ژرف گوئی تجزیاتی مطالعہ شامل ہیں۔

گفت باہمی میں نذیؔر نے اس کتاب کے وجود میں آنے کے مقصد کی وضاحت کی ہے تو ''مجھے پیارا ہے وہ جس کو کتابوں سے محبت ہے'' میں کتابوں کی اہمیت وافادیت کو بیان کرتے ہوئے اس نظم کو مناظر صاحب کی نذر کیا ہے۔پھر اس کے بعد اس منظوم اداریے کو شامل کیا گیا ہے جو مناظر کے لیے تحریر کیا گیا تھا۔اور ستمبر ۲۰۰۳ء کے اسباق کے مناظر عاشق ہرگانوی پر شائع ہوئے خصوصی شمارے میں شامل کیا گیا تھا۔''تضمین بر آزاد غزل مناظر عاشق ہرگانوی'' میں'' نذیر نے اس تضمین کو شامل کیا ہے جس میں انہوں نے مناظر صاحب کی آزاد غزل پر تضمین لکھی تھی تضمین کا انداز ملاحظہ ہو۔

''مجھ پر اک دن ایسی ساعت آئی تھی
جان،، بہت گھبرائی تھی
زخمی تھی گیتوں کی سرگم، سوز بھری شہنائی تھی
جانے کیسا ساز چھڑا تھا، رُت تھی اور پروائی تھی
میں تھا اور تنہائی تھی۔''

(مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی۔ص ۱۱)

اس تضمین کے ساتھ ہی نذیؔر اس بات کا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ

''اردو میں سب سے پہلی آزاد غزل پر تضمین راقم الحروف نے ہی لکھی تھی۔'' (۱۳۷)

اس کے بعد نذیؔر نے اس منظوم تبصرے کو شامل کیا ہے جو انہوں نے ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی منظوم تصنیف ''مناظر نامہ'' پر تحریر کیا تھا۔ اور مناظر عاشق ہرگانوی نمبر میں شائع کیا تھا۔تبصرے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

''خدمتوں کا اعتراف ایسے بھی ہو
چاہتوں کا اعتراف ایسے بھی ہو
یہ مفصل داستاں عاشؔق کی ہے
ایک لفظی کہکشا عاشؔق کی ہے
کام عاشق کے قلم نے جو کیا

ہر ورق پہ ہے اسی کا جائزہ
کارنامے ہیں مناظر کے بجا
ہیں انہیں پر یہ منظّم تبصرہ

(مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی، ص ۱۲)

''اسباق خطوط اور ہرگانوی'' میں نذیؔر نے ان حقائق کو شامل کیا ہے جو مناظر کے فکر وفن پر ہیں یا پھر مناظر صاحب نے دوسری ادبی شخصیات کے متعلق بیان کیا ہے۔ یہاں نذیؔر مناظر کی متجسس اور ہر دم سرگرمِ عمل رہنے کی عادت کے متعلق لکھتے ہیں۔

''مناظر صاحب کو ادب میں نئے نئے زاویے تلاش کرنے کی دھن سوار رہتی ہے۔ ایک کام کرنے کے بعد وہ تھک کر نہیں بیٹھتے بلکہ فوراً دوسرا ڈول ڈال دیتے ہیں جب یہ ڈول کنویں کے لبوں تک آتا ہے آپ تیسرے ڈول کی تیاری میں لگ جاتے ہیں کسی تنقید کی پرواہ کیے بغیر اپنے منصوبوں پر عمل پیرا رہتے ہیں۔'' (۱۳۸)

''مناظر بنام نذیر چند خطوط'' میں چار خط شامل کیے گئے ہیں جو مناظر صاحب نے نذیؔر کو تحریر فرمائے ہیں۔ اس کے بعد ژرف گوئی، تجزیاتی مطالعہ کے زیرِ عنوان اس تصنیف میں شامل مختلف حضرات کے جوابات کو شامل کیا ہے اور ان کے جواب کے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی گفتگو کی گئی ہے نذیؔر نے اس سبھی حضرات کے جوابات میں کہیں سیاسی وسماجی حالات کی عکاسی پائی ہے تو کہیں اپنے ذاتی کرب میں مبتلا پایا ہے۔ نذیؔر نے حسبِ ضرورت کچھ شخصیات کے جوابات کو شامل بھی کیا ہے۔ اس تصنیف میں نذیؔر کے خود کے بھی جوابات شامل ہیں جس کے تعلق سے بھی اس کتاب کے صفحہ نمبر ۴۲ پر لکھتے ہیں۔

''اس کے بعد راقم الحروف کا نمبر ہے یعنی نذیر فتح پوری کا جواب نامہ سال آتے ہیں گزر جاتے ہیں اور اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اچھی اور بری یادوں کی پرچھائیاں۔ انسان سال بھر ان پرچھائیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ لیکن پرچھائیاں کسی کے ہاتھ نہیں آتیں ممکن ہے یہ سطر زندگی کی سچائی کا اظہار ہو۔ زندگی کسی ایک سچائی کے اظہار کا نام نہیں۔ زندگی کی تختی بے شمار سچائیوں نے مل کر لکھی ہے۔ ہر انسان کی تختی الگ ہے۔ فن اور فلسفے کی اس تختی میں کم ہی گنجائش ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ اہلِ دانش گنجائش نکال ہی لیتے ہیں۔ چاہے عبارت حاشئے پر ہی کیوں نہ لکھنی پڑے۔ ۲۰۰۸ میں راقم کی ۵ کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ اسباق کے پانچ شمارے شائع ہوئے اسی سال اپنا دیوان تخلیق کیا جس کی اشاعت ہنوز باقی ہے۔ راقم کا جب اپنے آپ کے ذکر سے دم گھٹنے لگا تو اس کی توجہ سماج اور معاشرے کی جانب مبذول ہوئی۔ ملک اور قوم کے لئے دل میں درد نہ ہو تو راقم ایسے لکھاریوں کو خود غرض ٹولے کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔ راقم نے اپنے پہلے جواب کے آخری حصہ میں بتایا کہ آٹھ سال میں صرف مہاراشٹر میں ایک ہزار ۴۶ فرقہ وارانہ فساد ہوئے سینکڑوں مسلمان ہلاک ہوئے کروڑوں کی املاک تباہ ہوئی۔ راقم الحروف نے آخری دن ساری دنیا میں امن اور سکون کے لئے دعا کرنے میں گزارنے کی خواہش کی تھی۔ اپنے لئے اپنے بیٹوں کے لئے اپنے پوتوں کے لیے سکھ اور شانتی کی دعا مانگنے کا خیال راقم کو قطعی نہیں آیا۔ اس لیے کہ راقم اپنے خاندان کو دنیا سے الگ نہیں سمجھتا۔ دنیا میں سکون

ہوگا تو ہر گھر میں سکون ہوگا۔‘‘(۱۳۹)

مناظر صاحب کے دو آسان سوالوں کے جواب میں اکثر حضرات نے اپنے جوابات کے ذریعہ لوگوں کو غور وفکر کے لیے مجبور کردیا جس کی تازہ مثال نذؔیر صاحب کے جواب ہیں جو اوپر قلم بند کیے گئے ہیں۔ ژرف گوئی کی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے نذیر فرماتے ہیں۔

’’ژرف گوئی‘‘ اردو میں اپنی نوعیت کی الگ کتاب ہے جس میں ذہن کی مہمیزی ہے اور حالات حاضرہ کی عکاسی ہے، آشنائی اور فنکاری تو ہے ہی ایسی کتاب ڈاکٹر ہرگانوی ہی تیار کر سکتے تھے کہ بہت سے معاملے میں پہل کرنے اور اولیت کا سہرا باندھنے کی ان کی پرانی عادت ہے۔ ان کی تخلیقی شخصیت ہر لحاظ سے منفرد ہے‘‘(۱۴۰)

اس کتاب کا انتساب نذؔیر نے کچھ اس انداز میں تحریر کیا ہے

’’کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی

کے نام

’’مجھے اچھا لگا ہے آپ کا انساں ہو جانا‘‘

نذیر فتح پوری‘‘

(مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی صفحہ-۳)

۶۷ر صفحات مشتمل یہ تصنیف جو کہ ۲۰۱۰ء میں ایجوکیشن پبلی شنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تصنیف کے لکھنے کا مقصد بتاتے ہوئے نذؔیر لکھتے ہیں۔

’’۲۰۰۹ء میں طبع شدہ ان کی کتاب ’’ژرف گوئی‘‘ کو پڑھتے وقت اس کتاب کو تیار کرنے کا خیال ذہن میں آیا اور فوراً سے پیشتر قلم کاغذ لے کر بیٹھ گیا۔‘‘(۱۴۱)

پھر آگے نذؔیر لکھتے ہیں۔

’’میں نے آٹھ دنوں میں یہ صفحات لکھے ہیں۔ کتاب کے مطالعے کے دوران جو ذہن میں آتا گیا سپرد قلم کرتا گیا۔ ممکن ہے کچھ دوستوں کو کچھ باتیں ناگوار خاطر بھی گزریں لیکن ہر بڑے فنکار کو اپنے خلاف صداقتوں کے اظہار کو برداشت کرنے کی قوت دکھانی چاہیے۔ یہ ظرف کی بات نہیں کہ ہم دوسروں کے خلاف صف آراء رہیں اور کوئی اپنے خلاف تھوڑا سا بھی کچھ لکھ دے تو ہم آپے سے باہر ہوں جائیں۔‘‘(۱۴۲)

نذؔیر کی یہ رائے درست ہے۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت سے متعلق بات میں تضاد پایا جاتا ہے کیوں کہ اسی تصنیف کے صفحہ نمبر سات پر گفت باہمی کے زیر عنوان نذؔیر جب اپنی بات کہنا شروع کرتے ہیں تو وہ لکھتے ہیں۔

’’اس کتاب کا پہلا صفحہ ۲۱ر جولائی ۲۰۰۹ء کی صبح فجر کی نماز کے بعد لکھا اور ۲۳ر جولائی کو یہ مسودہ مکمل ہو گیا‘‘(۱۴۳)

اس تحریر کے لحاظ سے یہ کتاب تین دن میں تیار ہو رہی ہے جبکہ پچھلی تحریر میں نذیر نے اس کتاب کے مکمل ہونے میں آٹھ دن کا وقت بتایا ہے ہوسکتا ہے شاید کمپیوٹر کی غلطی کی وجہ سے یہ حالات پیدا ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں جب راقمہ نے نذیر صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ کتاب تین دن میں نہیں بلکہ آٹھ دن میں مکمل ہوئی، پہلا سہو کمپوزنگ کی غلطی قرار دیا جائے گا۔ بہر حال اس تصنیف کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ

پذیرائی ہوئی جس کا ثبوت وہ تبصرے ہیں جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ رہنمائے تعلیم جدید دہلی کے فروری تا مارچ ۲۰۱۲ء کے شمارے میں جناب یٰسین احمد کا تبصرہ اس بات کا ثبوت ہے۔

''نذیرؔ فتح پوری نے اس تجزیاتی مضمون کے علاوہ کتاب میں کچھ اور متفرق تحریریں بھی شامل کئے ہیں، جو مختصر ہیں لیکن ان کی معنویت مسلمہ ہے اور انفرادیت قابل تحسین ان تحریروں کے مطالعے سے نذیرؔ فتح پوری اور مناظر عاشق ہرگانوی کے درمیان جو گہرے مراسم ہیں اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ان دونوں کی برادرانہ محبت اجاگر ہوتی ہے۔'' (۱۴۴)

معین الدین عثمانی اس تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''نذیرؔ فتح پوری کی یہ کتاب اس لیے بھی یاد رکھی جائے گی کہ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جو اپنے اندر اس قدر روانی لئے ہوئے ہے کہ قاری اگر ایک بار شروع کردے تو ختم کئے بغیر دم نہیں لیتا۔'' (۱۴۵)

معین الدین عثمانی کی یہ تحریر اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ یہ تصنیف اپنے موضوع و مواد کی بنا پر قارئین کو مسرت کا سامان فراہم کرے گی۔

جناب سلام بن رزاق اپنے ایک خط میں اس تصنیف کے متعلق نذیرؔ کو لکھتے ہیں۔

''آپ کی کتاب کے مطالعے نے مناظر صاحب کی اصل کتاب ژرف گوئی کو پڑھنے کا اشتیاق بڑھا دیا ایسی کتاب ہر دو چار سال میں ترتیب دی جانی چاہیے تاکہ ہمیں اپنے معاصر قلمکاروں کی ذاتی دلچسپیوں اور ان کے شب و روز سے آگاہی ہو سکے۔'' (۱۴۶)

راقمہ کے خیال میں زیر تبصرہ کتاب نذیرؔ کی تنقیدی بصیرتوں کا جداگانہ اظہار ہے اس کتاب کے مطالعہ سے یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ نذیر کی فکر، قلم اور اسلوب ان کے تابع ہیں۔ وہ جب چاہیں جیسا چاہیں اپنے قلم سے کام لے سکتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت:۔

دانشور، نقاد اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ۷۰ سے زائد کتابوں کے مالک اور پدم بھوشن جیسے ہزار ہا انعامات و اعزازات سے نوازے گئے نارنگ صاحب دہلی اردو اکادمی اور قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے اعلیٰ عہدوں پر بھی اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ وہ اپنے دل میں اردو کے لیے بے پناہ محبت لیے اس کی آبیاری میں ہمیشہ سرگرداں رہے وہ اردو کے لیے اپنے فرامین خیالات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''تاریخ میں عروج وزوال اور نشیب وفراز آتے ہی رہتے ہیں سیاست فوری طور پر بدل سکتی ہے تاریخ بھی بدلتی ہے، جغرافیہ بھی راتوں رات بدل جاتا ہے لیکن نہیں بدلتا تو زبانوں کا تہذیبی اور لسانی مزاج یا ان کا جینیس جو صدیوں کے تال میل اور عمرانیاتی عمل سے وجود میں آتا ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں میرا ادبی سفر سفرِ عشق ہے۔ اردو سے میرا رشتہ سود وزیاں کا نہیں۔ معشوق اگر مجموعہ خوبی ہے تو اس کا ہر کرشمہ دامن

دل کو کھینچے گا ہی۔''(۱۴۷)

یہ تحریر ان کی تصنیف ''دیکھنا تحریر کی لذت'' سے ماخوذ ہے۔اور ان کی اردو سے اسی محبت وعقیدت نے محبوب راہی اور نذیر فتح پوری کو ان کے فکر وفن پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ یہ تصنیف ان کی انہیں کاوشات کا نتیجہ ہے۔اس کتاب کی اشاعت کا سبب بیان کرتے ہوئے 'گفت باہمی' میں نذیرؔ لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر محبوب راہیؔ سے گزارش کی کہ اب تک انہوں نے نارنگ صاحب پر کچھ نہیں لکھا،لہٰذا کوئی مضمون سپرد قلم کریں۔راہیؔ صاحب نے ایک نہیں بہ یک وقت دو مضامین نارنگ کے فکر وفن پر لکھ دیے۔ باہمی طور پر طے پایا کہ کچھ صفحات میں بھی لکھوں چونکہ راہیؔ صاحب نے میری خواہش کا احترام کیا تھا لہٰذا میں بھی ان کا حکم نہ ٹال سکا اور اسی طرح دس بارہ برسوں سے نارنگ صاحب کی شخصیت پر اپنا سا کچھ لکھنے کی جسارت میرے دل میں پل رہی تھی۔اس خواب کو تعبیر سے ہمکنار ہونے کا راستہ مل گیا۔''(۱۴۸)

ایم۔آر پبلی کیشن نئی دہلی کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوئی اس تصنیف میں محبوب راہیؔ صاحب کے چار مضامین شامل ہیں جن میں ''جواز اس کتاب کی اشاعت کا، گوپی چند نارنگ پر ایک تحریر کوزے میں سمندر، گوپی چند نارنگ اپنے استاد خواجہ احمد فاروقی کی نظر میں اور گوپی چند نارنگ سے ایک ملاقات، شامل ہیں۔کتاب کا دوسرا حصہ نذیرؔ کے حصے میں آیا اور انہوں نے اپنے خیالات چودہ (۱۴) حصوں میں تقسیم کر کے بیان کیے ہیں۔''گفت باہمی' میں اپنی بات کو شروع کرتے ہوئے 'گوپی چند نارنگ سے پہلی ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''نارنگ صاحب سے پہلی بار پونہ فیسٹول کے مشاعرے میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔''(۱۴۹)

پونہ فیسٹول کے دوسرے دن نذیر اور سنجے گوڈبولے نارنگ صاحب سے پونہ کے ٹرب کلب میں ملاقات کے لیے گئے جہاں ان کا قیام تھا یہ ملاقات نذیرؔ کے لئے کسی انعام سے کم نہ تھی۔نذیرؔ کو نارنگ صاحب سے دوسری ملاقات کی خواہش تھی اور یہ خواہش اس وقت پوری ہوئی جب نارنگ صاحب پانچ ستمبر ۲۰۱۲ء کو ساہتیہ اکادمی دہلی میں نذیرؔ کی مرتبہ تصنیف ''میخانہ اردو کا پیر مغاں نارنگ ساقی'' کی رسمِ اجراء کے لیے تشریف لائے،اس تصنیف کی رسمِ اجراء نارنگ صاحب کے ہاتھوں ہوئی،اس کے متعلق نذیرؔ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''پانچ ستمبر ۲۰۱۲ء کی شام جب ساہتیہ اکادمی دلی کے ہال میں میری مرتبہ کتاب ''میخانہ اردو کا پیر مغاں نارنگ ساقی'' کی رسم رونمائی گوپی چند نارنگ کے ادب پرور ہاتھوں سے انجام پائی تو پہلی بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جس ادب کے ہمالیائی استعارے کو میں نے اپنے تصور کی بلندی پر براجمان کر رکھا ہے وہ تو دل میں بٹھانے کے لیے ہے۔جو اپنائیت جو خلوص میں نے اس دوران ان کی شخصیت سے مترشح دیکھا وہ میرے ذہن میں نئی راہ کھولنے کے لیے کافی تھا۔''(۱۵۰)

یہ تحریر اس راز سے پردہ اٹھاتی ہے کہ نذیرؔ کے دل میں نارنگ صاحب کے لیے جتنی محبت ہے اس سے کہیں زیادہ احترام بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نارنگ صاحب کو اپنے دل میں بٹھانا چاہتے ہیں،یہ محبت واحترام یوں ہی نذیرؔ کے دل میں جگہ نہیں بنا پائے تھے بلکہ نارنگ صاحب کی شخصیت نے انہیں اس کے لئے آمادہ کیا۔''چند خطوط گوپی چند نارنگ کے نام'' کے زیر عنوان نذیرؔ نے مختلف حضرات کے ان خطوط کے حوالے

سے بات کی جو نارنگ صاحب کو تحریر کیے گئے تھے۔ان حضرات میں ماہنامہ شاعر کے مدیر اعجاز صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، بشیر بدر اور جمیل جالبی کے خطوط سے متن شامل کیا گیا ہے۔

''اقوال نارنگ اور ''جامعہ ملیہ اسلامیہ کچھ حقائق'' کے زیر عنوان بھی نذیؔر نے مضمون قلم بند کیے ہیں۔نارنگ صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صدر شعبہ کے عہدے پر اپنی خدمات انجام دیں اور اس شعبہ کوز میں سے آسماں کر دیا۔ان حقائق کی نشاندہی ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے ایک مضمون میں کی تھی جو ماہنامہ انشاء کے گوپی چند نارنگ نمبر میں شائع ہوا تھا۔اسی مضمون کو بنیاد بنا کر نذیؔر نے اپنا یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔اس مضمون کو تحریر کرنے میں نذیؔر نے کیوں دلچسپی لی؟ اس سوال کا جواب ہمیں ان کے ان الفاظ سے ملتا ہے۔''

یہ تحریر جامعہ سے متعلق بہت سے حقائق کی نقاب کشائی کرتی ہے اور گوپی چند نارنگ کے سیکولر کردار کو مستحکم بناتی ہے اور جامعہ سے ان کی بے لوث محبت کی مظہر ہے۔''(۱۵۱)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے لیے نارنگ صاحب نے جو خدمات انجام دیں ان کا اعتراف کرتے ہوئے نذیؔر لکھتے ہیں۔

''جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شعبہ اُردو اس وقت بہت معمولی کمروں میں سانسیں لے رہا تھا۔نارنگ صاحب اس کے لئے پریشاں تھے وہ شعبہ اُردو کی عمارت کو پُرشکوہ دیکھنا چاہتے تھے۔اس کے لئے انہوں نے کشمیر سے فنڈ حاصل کیا اور اپنے ایک ہندو بھائی سے اس کی عمارت سستے داموں جامعہ کو دلوائی اس ہندو بھائی نے بھی آسانی کے ساتھ اپنی عمارت اردو تعلیم کے فروغ کے لیے دے دی یہ معمولی بات نہ تھی۔اس میں نارنگ صاحب کی شخصیت کا بڑا ہاتھ تھا۔ورنہ بعض مسلمان تو مسجد کی توسیع کے لیے جب کرائے کا گھر چھوڑتے ہیں تو مسجد کے ٹرسٹ سے بڑی رقم وصول کرتے ہیں ہم ایسی باتیں بھول جاتے ہیں۔یہ احسان شناسی کے مترادف ہے۔جو عمارت کسی زمانے میں ''بھگت نواس'' تھی وہ آج اردو کے فروغ کا اہم مرکز بنی ہوئی ہے۔نارنگ صاحب اب اس شعبے میں نہیں ہیں لیکن ان کی قربانی کا عکس آج بھی موجود ہے۔''(۱۵۲)

''باتیں نارنگ کی'' کے تحت نذیؔر نارنگ صاحب سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

''میرے اور نارنگ صاحب کے درمیان جو تعلق ہے وہ ادبی طور پر تکلف سے بھرا ہوا ہے۔بلکہ مالا مال ہے میں نے ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ان کو اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت سمجھا ہے۔''(۱۵۳)

''زبان نہیں تو آپ کا چہرہ نہیں'' یہ قول ہے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا جسے نذیؔر نے اس مضمون کا عنوان بنالیا ہے، جس میں انہوں نارنگ صاحب کی اردو سے محبت کے حوالے سے گفتگو کی ہے گوپی چند نارنگ کی اردو زبان سے محبت کو بیان کرتے ہوئے نذیؔر لکھتے ہیں۔

''گوپی چند نارنگ اردو کو بہت کشادہ اور سرل زبان قرار دیتے ہیں، اردو اپنی ہم عصر زبانوں کے درمیان اپنے تخلیقی حسن کے سبب پل بناتی ہے، وہ ہر زبان کو اپنی جگہ اہم مانتے ہیں لیکن اردو کو لسانی تاج محل کا درجہ دیتے ہیں۔''(۱۵۴)

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے نذیر لکھتے ہیں۔

''اردو کے لیے نارنگ صاحب کے دل میں محض لفظی محبت نہیں ہے بلکہ وہ پورے عمل و کردار کے ساتھ اردو

کے سپاہی ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اردو کا شعریاتی اور جمالیاتی نظام اس کی غیر معمولی طاقت ہے۔''(۱۵۵)

''کچھ گھر آنگن کی باتیں'' کے زیرِعنوان نذیرؔ نے نارنگ صاحب کی اہلیہ محترمہ منورما کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔جس میں ان کے ذاتی کوائف کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔اور نذیرؔ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نارنگ صاحب کی اہلیہ نے اپنے خانہ داری فرائض کو بخوبی انجام دیا،جس کے سبب نارنگ صاحب اپنے سفر پر بنا کسی رکاوٹ کے آگے بڑھتے رہے ان کی اہلیہ قدم قدم پر ان کا ساتھ نبھاتی ہیں اور نارنگ صاحب نے بھی کبھی اپنے اہل خانہ کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔''نارنگ کی کتاب فہمی اور کتاب دوستی میں نذیرؔ نے عبدالصمد صاحب کے ایک مضمون کی تحریر کے ذریعہ نارنگ صاحب کے گھر میں پھیلی کتابوں یا یوں کہہ لیں کہ کتابوں کے انبار کو کس سلیقے سے ترتیب دے کر سجایا گیا ہے کہ حوالے سے بات کی ہے۔جناب چندر بھان خیال نے ایک نظم کے ذریعہ نارنگ صاحب کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی اس نظم کے موضوع ومواد سے گفتگو کرتے ہوئے نذیرؔ اپنا مضمون ''نارنگ کے حوالے سے ایک نظم'' قلم بند کرتے ہیں۔تین بندوں پر مشتمل یہ نظم جس کے ہر بند میں چار چار اشعار شامل ہیں اس نظم کی تعریف کرتے ہوئے نذیرؔ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ۔

''میں پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ چندر بھان خیال نے اپنی اس نظم کے توسط سے ''اوصافِ نارنگ'' کو جس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ کوزے میں سمندر بھر دینے کے مترادف ہے۔''(۱۵۶)

''گوپی چند نارنگ کی کتاب،اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب''توشیحی نظم،مشتاق صدف کی مرتب کردہ کتاب''دیکھنا تقریر کی لذّت،منظوم تبصرہ،''ترا جواب نہیں''اور''خراج تحسین''،(صدر پاکستان کی جانب سے گوپی چند نارنگ کو ستارہ،امتیاز ملنے پر۔یہ وہ منظومات ہیں جن میں نذیرؔ کی جانب سے گوپی چند نارنگ کے کارناموں کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

''جو کارنامہ کیا بے نظیر تو نے کیا
دلائل وشواہد سے گفتگو تیری
کہ بے مثال ہے وجدان وآگہی تیرے
سحر طرازئ گفتار کی مثال کہاں
تو بولتا ہے تو ہونٹوں سے پھول جھڑتے ہیں
جو کام تو نے کیا ہے وہ بے مثال کیا
جہاں سے گزرا اسی راہ کو نہال کیا
معاصر اہلِ ادب میں ترا جواب نہیں''

(گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت،ص ۱۱۰)

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تصنیف میں محبوب راہیؔ اور نذیرؔ فتح پوری نے مل کر نارنگ صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور نارنگ صاحب کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔مشکل مسائل کو بھی بیان کرنے کے لیے سادہ اور دلکش زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ہندی الفاظ کی آمیزش نے بھی بیان کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیا ہے۔اب قارئین اسے کس حد تک پسند کریں گے یہ تو وقت ہی بتائیگا لیکن مجھے یقین ہے یہ دونوں مصنفوں کی کاوش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

میری شاعری میں جانور:۔

کچھ لوگ زندگی میں بھی اورادب کے میدان میں بھی کچھ الگ اورسب سے جدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے۔

سب چلیں جس پہ وہی راہ گزر کیا معنی

ایسی ہی انفرادی سوچ کے حامل جناب مختار بدری نے ایک کتاب ''اردو شاعری میں جانور'' شائع کی ہے۔اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ اردو میں پہلی کاوش ہے، ایک دم منفرد موضوع، مختار بدری نے اس کتاب کے لیے مختلف شعراء کے کلام میں جانوروں سے متعلق اشعار ڈھونڈ نکالے۔جانوروں سے متعلق اشعار کا مطلب ہے وہ اشعار جن میں جانوروں کا ذکر ہوا ہے اور جانوروں کی صفحات کو بیان کیا گیا ہے۔اس کتاب میں تمام شعراء کے مقابلے میں نذیؔر فتح پوری کے اشعار کثرت سے شامل ہیں۔اس بات سے متاثر ہو کر نذیر فتح پوری نے اپنے تمام شعری مجموعہ کھنگال ڈالے اور ایسے اشعار ڈھونڈ نکالے جن میں جانوروں کا ذکر موجود ہے اور پھر ''میری شاعری میں جانور'' عنوان سے ایک کتاب سپردِ قلم کر دی۔جس کا انتساب ملاحظہ کریں۔

''اردو شاعری میں جانور

کے مصنف،، محقق اور مرتب

مختار بدری

کے نام

جن کی کتاب میں اپنے اشعار کی کثرت دیکھ کر میں نے یہ کتاب لکھی'' (میری شاعری میں جانور۔ص ۵)

کتاب کے سرورق پر پہلا شعر حمد کا ہے۔

یہ پرندے جو چہچہاتے ہیں لب پہ ذکر خدا ہے سن آواز

خدا کی حمد و ثنا کے بعد اسی شعر کے نیچے یہ شعر بھی درج ہے

آدمی سے جانور اچھا نذیؔر بے وفائی میں ذرا کم تو ہے

یہ شعر نذیر کے مشاہدے کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک موتی ہے جس کی آب و تاب زندگی کی تاریک راتوں اور مہیب راہوں میں راہ دکھانے کا کام کرتی ہے۔زیر تبصرہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے، گفت باہمی کے تحت نذیر انکشاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ کتاب واقعی عجیب و غریب ہے شاید اردو میں اس لحاظ سے یہ پہلی کاوش ہے

کہ شاعر نے ناقد بن کر اپنی شاعری کا خود ہی محاسبہ اور محاکمہ کیا ہے۔'' (۱۵۷)

مختار بدری کی کتاب کے حوالے سے نذیؔر نے اس کتاب میں شامل اپنے اشعار کے معنی و مفہوم سے بحث کی ہے اور ان اشعار کا مختلف زاویوں سے جائزہ بھی لیا ہے۔اور محاسن کے ساتھ ساتھ عیوب کی بھی نشاندہی کی ہے۔اس کے علاوہ اپنے شعری مجموعوں لمحوں کا سفر، سفر تا سفر، تیسرا سفر، سفر مدام سفر، تتلیوں بھرا آسمان، یہ زمین میری ہے اور ثنائے جلیل سے بھی وہ اشعار ڈھونڈ نکالے ہیں جن میں کسی نہ کسی جانور کا ذکر اس کی

صفات کے ساتھ ہوا ہے۔ان جانوروں میں طاؤس، آہو، اژدہا، رخش، دیمک، مگس، پروانہ، کوئل، بلبل، جگنو، چڑیا، اور نذیرؔ کی سب سے پسندیدہ شئے تتلی شامل ہیں۔تتلی نذیرؔ کی شاعری کا ایک رنگیں، نازک اور ملائم استعارہ ہے تتلی ان کو ازحد محبوب ہے، تتلی پر ان کا سب سے پہلا شعر ملاحظہ کریں۔

کتنا پیچھے دوڑا ہوں　　　تب پائی فن کی تتلی

(میری شاعری میں جانور۔ص ۳۴)

یہ شعران کے پہلے شعری مجموعے ''لمحوں کا سفر'' میں شامل ہے۔جس طرح تتلی نے ان کے تخلیقی زاویوں کو رنگینی عطا کی ہے اسی طرح جگنوؤں نے بھی ان کی فکر کے بام و در کو روشنی اور تابنا کی عطا کی ہے۔ یہ شعر بھی پہلے شعری مجموعے لمحوں کا سفر میں شامل ہے۔

دن میں سورج پھر اسی چادر کو پھیلا جائے گا　　　شب میں جگنو آئیں گے ظلمت مٹانے کے لئے

(میری شاعری میں جانور۔ص ۳۴)

نذیرؔ کے مشاہدے کی آنکھ بہت تیز ہے۔ وہ زندگی کے ایسے منظر دیکھ کر متاثر ہو جاتے ہیں جنہیں عام طور پر لوگ دیکھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں راجستھان کے انتہائی گرم علاقوں میں ایسے منظر کثرت سے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

چونچ میں کوّا لیے بیٹھا ہے کنکر دیکھنا　　　سامنے ٹوٹے ہوئے مٹکے کے ٹکڑے ہیں نذیرؔ

(میری شاعری میں جانور ص۔۵۰)

اس موضوع پر کلاسک ادب کی ایک کہانی بھی یاد آ رہی ہے۔شاید اسکول کے نصاب میں کسی درجے کی کتاب میں یہ کہانی موجود ہے اس طرح نذیرؔ نے ایک کہانی کے متن کو اپنی غزل کے ایک شعر میں منظوم کر کے پیش کر دیا۔ یہ نذیرؔ کی اختصار پسندی کی ایک بہترین مثال ہے۔ کیوں کہ نذیرؔ اپنی تخلیق کے خود ہی ناقد بنے ہیں اس لیے محاسن کے ساتھ ساتھ اپنے معائب کی بھی انہوں نے نشاں دہی کی ہے۔ نذیرؔ نے اس کتاب کو تحریر کرتے وقت ایسا پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے گویا کوئی اور کردار ان سے مخاطب ہے اور ان کے اشعار سے متعلق محوِ گفتگو ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات انہوں نے اپنے اشعار کی بہت خوبصورت وضاحت بھی کی ہے ایک شعر نمونے کے طور پر ملاحظہ کریں۔

''تتلی، بھنورا، بلبل، کوئل، مور　　　دل گلشن میں رونق چاروں اور

یہاں پانچ پرندوں کو ترتیب سے شعر بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دل کے گلشن میں ان پانچوں پرندوں کی وجہ سے رونق ہے، کیوں کہ تتلی خوابوں میں رنگ بھرتی ہے بھنورا مصیبت میں گنگنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ بلبل ہر حال میں چہچہانے کی ہمت دیتی ہے، کوئل کا بھی یہی پیغام ہے کہ انسان کی شکل وصورت، رنگ ونسل، چاہے جو ہو، لیکن اسے چاہئے کہ زبان میں شیرینی گھول کر تخاطب کرے یعنی شریں بیانی سے دلوں کو فتح کرنا آسان ہے اور مور کی طرح من چاہے جنگلوں میں رقص کرتے رہو چاہے تمہارے پیر کمزور ہوں یا پنکھوں میں سکت نہ ہو۔ پھر بھی جھومو، گاؤ، زندگی کا جشن مناؤ، خود بھی مست ملنگ رہو اور دوسروں کو بھی مستی بھرے ماحول سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتے رہو۔'' (۱۵۸)

نذیرؔ کے لفظوں میں ان کے اس شعر کی تشریح بہت ہی خوبصورت ہے اور خاص دلچسپ بھی اور حقیقت سے قریب بھی۔ جس میں ہمت اور حوصلے کے سارے رنگ موجود ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب، اس طرح کی وضاحت اور دلچسپ تشریحات کا ایک خزانہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، نذیرؔ کا اسلوب واقعی ذائقہ دار ہے جو بھی اس کتاب کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا، زبان کے ایک نئے زاویہ اور ذائقہ سے لطف اندوز ہوگا۔ یہ کتاب مختصر ہے، اس اختصار سے ایک قسم کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے، کتاب کے کل صفحات ۸۰/ ہیں لیکن آخری چھ صفحات میں نذیرؔ کا ادبی منظرنامہ شامل کیا گیا ہے، اس لحاظ سے کتاب کا متن ۷۴/ صفحات ہی میں سمایا اور سمویا ہوا ہے۔ یہاں بھی نذیرؔ کی اختصار پسندی اپنا ہنر دکھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

موضوع اور متن کے لحاظ سے زیر مطالعہ کتاب واقعی نذیرؔ کے قلم کا ایک انوکھا شہکار کہا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ نذیرؔ نے تنقید کا ایک قطعی نیا اور انوکھا راستہ تلاش کیا ہے۔ وہ اس ڈگر پر چلے ہیں جہاں شاید پہلے کوئی گیا ہو۔ کتاب کا سرورق بھی نذیرؔ کے اسلوب کی طرح سادہ مگر گہرا اور جاذب نظر ہے۔ نذیرؔ نے اس کتاب میں خالق اور ناقد دونوں کردار ادا کئے ہیں اور دونوں کرداروں کو متوازن رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب میں اردو کے ساتھ ہی جگہ جگہ ہندی الفاظ کی آمیزش نے زبان کو سادہ اور اسلوب کو دلکش بنادیا ہے تھوڑی بہت اردو سمجھنے والے قارئین بھی اس کتاب کے مطالعے سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے نئے اذہان اس کتاب کے مطالعہ سے خاطر خواہ لطف اندوز بھی ہوںگے اور مستفیض بھی۔ کتاب ۲۰۱۴ء میں اسباق پبلی کیشنز پونے کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔!!!

مناظر صاحب! کتابیں ملیں:۔

مناظر صاحب! کتابیں ملیں...... یہ تصنیف نذیرؔ کے خطوط کا مجموعہ ہے، یہ خط نذیرؔ نے مناظر صاحب کو ان کی کتابوں کی رسید کے طور پر تحریر کیے ہیں۔ ان خطوط میں نذیرؔ نے مناظر صاحب کی مرتب کردہ تصانیف کے ساتھ ساتھ ان کے فکروفن پر شائع کتابوں پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہونے والی اس تصنیف میں ۲۳ خط شامل ہیں۔ یہ خط ۴/ مئی ۲۰۱۴ تا ۱۰/ جون ۲۰۱۴ کے درمیان لکھے گئے ہیں، نذیرؔ تصانیف کا مطالعہ کرتے گئے اور ان تصانیف پر اپنی رائے خطوط کے پیرائے میں قلم بند کرتے گئے۔ ۳۷/ دن کے درمیانی وقفہ میں انہوں نے ''تکونیاں'' مناظر عاشق ہرگانوی بحیثیت شاعر' مناظر عاشق ہرگانوی، بچوں کے دیپ'' بیکل اتساہی منفرد گیت کار، ماں، مدیر شعراء کی غزلیں، رم جھم رم جھم، ترسیل، مناشر عاشق ہرگانوی شش جہاتی فنکار، مناظر نامہ، اردو میں بچوں کے ادب کی اینتھولوجی، دوہا رنگ، ایک نظم اپنے لئے، اکیسویں صدی کی غزلیں، تنقید کا نیا منظرنامہ اور گوپی چند نارنگ، تنقید و تفہیم، سید ظفر ہاشمی ایک نابغۂ لسانی لغت غازی الدین حیدر کے حوالے سے، مناظر عاشق ہرگانوی کی شاعرانہ جہتیں، عضویاتی غزلیں، ابن صفی کے یہاں طنز و مزاح کی تلاش، ابن صفی کے ناولوں میں اردو، ابن صفی کے اداریے، ایوان، غزل نما، مطالعۂ ابوالکلام آزاد اور وہاب قیصر، مغربی بنگال کے ہم عصر ادیب و شاعر جیسی تقریباً ۲۸/ تصانیف پر تبصرہ پیش کیا ہے، ان تصانیف میں سے اکثر تصانیف مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر کردہ اور مرتب کردہ ہیں اور باقی کتابیں ان کے فکروفن پر دوسرے حضرات کے زور قلم کا نتیجہ ہیں، اسے نذیرؔ کی زود گوئی کہیے یا ان کی کتابوں سے محبت جو انہوں نے ۳۷/ دنوں میں ۲۸/ کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان پر اپنے تاثرات قلم بند کیے جبکہ یہ سبھی تصانیف مختلف نوعیت کی تھیں کچھ تنقید و تحقیق سے متعلق ہیں تو کچھ لسان سے، کچھ مختلف شعری اصناف سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ ادب اطفال سے۔ نذیرؔ کی اس تصنیف کی خاصیت یہ ہے کہ اس ایک ہی کتاب میں شاعری و نثر کی مختلف اصناف پر مشتمل تصانیف پر تبصرہ تحریر کیا گیا ہے جس سے انہیں سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی، اور نذیرؔ نے مناظر صاحب کے ساتھ ساتھ ان سبھی حضرات کی بھی حوصلہ افزائی کی

ہے جنہوں نے مناظر صاحب کے فکر وفن پر قلم اٹھانے کی جرأت کی۔خطوط کی شکل میں تحریر کیے گئے یہ تبصرے اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ اس میں نذیؔر نے عصری حالات کی عکاسی بھی جا بجا کی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ویسے بھی چار روز سے یہاں شدید کشیدگی کا ماحول تھا، کسی نے فیس بک پر شیوا جی مہاراج اور بال ٹھاکرے کی تصاویر کے ساتھ گستاخی کر کے اپنا نام نہال لکھ دیا تھا۔ نتیجے میں ہنگامے شروع ہو گئے لیکن پولس کی مداخلت نے ایک بڑے منصوبے کو ناکام کر دیا۔تین روز تک سورج بھی آگ کا گولہ بنا ہوا تھا۔لیکن تین دنوں کے بعد آج ماحول سرد رہا۔بازار بھی کھل گئے اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے ۔اور اب بارش نے لطف اُٹھانے کا سامان مہیا کر دیا۔کم کم ہی صحیح لیکن بارش ہو رہی ہے۔''(۱۵۹)

اس اقتباس کے مطالعے سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ نذیؔر کے یہ خطوط اپنے عہد وماحول کے بھی عکاس ہو گئے ہیں، نذیؔر نے مناظر صاحب کی تصانیف پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے اور ان کی تنقیدی تصانیف پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔مناظر کی تصنیف ''تنقید و تفہیم'' میں ۱۹؍مضامین شامل ہیں جس پر نذیؔر نے طویل تبصرہ تحریر کیا ہے اور ان ۱۹؍مضامین کے حوالے سے گفتگو کر کے مناظر صاحب کی تنقیدی بصیرت کو بھی اجاگر کیا ہے، نذیؔر مناظؔر کی مقفّٰی طرز تحریر کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''آپ جونثر میں مقفّٰی گفتگو کرتے ہیں اس سے مولانا آزاد کی نثر یاد آتی ہے جسے پڑھ کر حسرت موہانی شعر کہنا بھول گئے تھے۔''(۱۶۰)

اسی کے ساتھ آپ نے مناظر کی قلمی تصویر بھی کھینچی ہے۔

''مناظر عاشق ہرگانوی، بچوں کے ادیب، یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی تھی، مجھے بخوبی یاد ہے اس وقت کتاب کے ٹائٹل پر چھپی آپ کی تصویر دیکھ کر مجھے آپ بہاری کم اور بنگالی بابو زیادہ نظر آئے ،کسی بنگالی فلم کے ہیرو سے مماثل چہرہ، سیاہ فریم کی عینک اور ہونٹوں پر خاموش مسکراہٹ۔''(۱۶۱)

نذیؔر نے جن کتابوں پر تبصرہ پیش کیا ہے ان میں سے اکثر کتابوں میں خود ان کا بھی ذکر موجود ہے جسے دیکھ کر وہ کافی خوشی بھی ہوتے ہیں اور مناظر صاحب کے شکر گزار بھی ہوتے ہیں۔ان خطوط کے مطالعہ سے سیاسی سماجی معاشری ماحول کی عکاسی تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ نذیؔر کے ذاتی حالات کی بھی گرہ کھلتی ہیں ایک اقتباس ملاحظہ کریں جو نذیؔر کے ذاتی تاثرات کا غماز ہے۔

''آنجہانی اوم پرکاش اگروال زار علامی نے شاید اپنے حلقے کے شاعروں کو چھوڑ کر کسی کو پسند نہیں کیا۔وہ فاعلن مفاعلن کے دھنی تھے۔کچھ عرصے تک مجھ سے خوشگوار مراسلت رہی پھر کالی داس گپتا رضؔا کے ایک مضمون خزم کو لے کر کچی پکی مراسلت میں درار پڑ گئی اور انہوں نے معرکہ ''زاؔر و رضؔا'' نام سے کتاب مرتب کر کے جوش ملسیانی، کالی داس گپتا رضؔا کے ساتھ مجھے بھی گھیرے میں لے لیا۔''(۱۶۲)

یہ اقتباس ان کے ماضی سے پردہ اٹھاتا ہے اور ان کے ذاتی حالات سے ہمیں واقف کرتا ہے۔ایک خط میں نذیر اپنی آئندہ زمانے میں شائع ہونے والی تصنیف کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ایک ناول کے چند صفحات لکھ چکا ہوں۔ناول کا عنوان ''نہیں نہیں یہ موضوع بھی نہیں'' طے کیا ہے۔ایک

عنوان اور لکھ رکھا ہے ''یہ ناول بھی ہوسکتا ہے'' ناول کیا ہے دل کی آگ کاغذ پر بکھیر دی ہے۔لفظ انگارے ہیں۔ پلاٹ میں دوزخ کی کھڑکیاں کھلی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے۔سارا ماحول جہنم کے پیٹ میں پرورش پا رہا ہو۔'' (۱۶۳)

ان خطوط کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ نذیرؔ نے ان پر اس وقت کی مہر بھی لگادی جس وقت انہوں نے خط کا آغاز یا اختتام کیا۔

ناشر ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس دہلی کا تبصرہ پوری کتاب کی اہمیت وافادیت کا آئینہ دار ہے ملاحظہ کریں۔

''ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ہمہ جہت شخصیت اور متنوع تحریر پر ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری کی یہ کتاب تبصراتی لہجے میں ہے، جس کے اسلوب میں سادگی ہے۔گفتگو کے انداز میں الگ الگ نوعیت کی کتابوں کا جائزہ اردو میں پہلی بار سامنے آیا ہے، کہ موضوع کو بات چیت بنانے کا ہنر ہر صفحہ سے عیاں ہے۔خطوط نما ہمعصر ادبی منظر نامہ کی اس روشن کتاب میں الفاظ کی فراوانی ہے واقعات وکردار کی نئی تہذیب ہے، ماحول سے مفاہمت ہے، طنز کے خوشنما پھول ہیں، امڈتا ہوا محبت کا جذبہ ہے، سیاسی وملکی مسائل کی اشاریت ہے اور روانی، شگفتگی اور بے ساختگی کی چاشنی ہے، نئی جہتوں کی تلاش کا بھرم بھی ہے، ادبی دیانت داری کی حق ادائیگی بھی ہے اور اپنائیت شخصیت شناسی اور ادب کے مطالعے کی تازہ کاری وسرشاری بھی ہے زبان وادب کی زمین کو کنارے تک پہنچانے والی ایسی کتاب کبھی کبھی وجود میں آتی ہے۔'' (۱۶۴)

اس کتاب کو لکھنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے خود نذیرؔ فرماتے ہیں۔

''مناظر صاحب جیسی ادبی شخصیت سے ملاقات کے کئی مواقع میں نے نکالے لیکن ان سے ملنا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ لینے کے لیے ہوائی جہاز سے وہ پونہ آئے۔ ائر پورٹ پر میں اور میرے احباب ہی ان سے ملنے گئے کہ انہوں نے دوسروں کو اس کی اطلاع نہیں دی تھی۔ ڈھائی دن وہ پونہ کے ۷ ستارہ ہوٹل میں ٹھہرے لیکن ان کا زیادہ وقت میرے اور احباب کے ساتھ اور میرے غریب خانہ پر گزرا۔ان کی اپنائیت اور محبت میں جو پرجوش گرمی تھی اس کی حدت اور شدت کو میں آج بھی محسوس کر رہا ہوں یہی وجہ ہے کہ ان کی قربت کی دوری کو ان کی کتابوں کے مطالعے سے دور کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ کتابیں پڑھتے وقت خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے تاثرات لکھتا جاؤں اور مناظر صاحب سے مخاطب بھی رہوں۔'' (۱۶۵)

اقتباس کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مناظر صاحب کی شخصیت اور ان سے محبت نے نذیرؔ کو اتنا متاثر کیا کہ ان کی شخصیت کو کتابی شکل دے کر ادب کی دنیا میں زندہ جاوید بنا دیا۔

اس کتاب پر سہ ماہی اسباق میں ''ایک کتاب ایک گوشہ'' عنوان سے چار مضامین شائع ہوئے ہیں، جو اسلم مرزا، رفیق جعفر، محبوب راہی اور ہاجرہ بانو نے قلم بند کیے ہیں۔ان چار صاحب نظر قلمکاروں نے نذیرؔ کی اس تصنیف میں ان کی رواں دواں نثر کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔

نذیر کی نثر نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر عظیم راہی فرماتے ہیں۔

’’نذیرؔ فتح پوری شاعری کی طرح نثر میں بھی بڑی خوبصورت زبان لکھتے ہیں۔ بلکہ تخلیقی زبان کی جلوہ سامانیاں، ان کے مضامین میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ لفظ کی حرمت سے پوری طرح واقف ہیں اور اپنے لکھے لفظ پر پکڑے جانے کا احساس رکھتے ہیں کہ بقول مصنف ’’جب انصاف کی میزان قائم ہوگی تو ایک ایک لفظ کا حساب لیا جائے گا۔ ایمانی خوف کی اس کیفیت کو انہوں نے اپنی تحریروں میں بحر حال قائم رکھا ہے۔‘‘ (۱۶۶)

نذیرؔ کی نثر نگاری پر اپنے احساسات و جذبات کا بیان کرتے ہوئے علیم طاہر (مدیر احساس۔ مالیگاؤں) اپنے مضمون ’’ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری اردو زبان کے اہم مرکز کا نام‘‘ میں لکھتے ہیں۔

’’ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری کی نظم و نثر میں زمانے کا عکس، شوخیٔ بیان، غمِ جاناں، غم دوراں، رشتوں سے عقیدت، متحمل انداز بیان، طنز کی چاشنی، تنقید کی تلخی، نئے تلازمے، نئی لفظیات، نئی تشبیہات، احساسات کی مختلف کیفیتیں، سادگی مٹھاس، انسانی جبلتوں کا اظہار، نئے تقاضوں سے ہم آہنگی، مسائل معاشرہ، مسائل حاضرہ، غمِ ذات، غم کائنات، نئے استعارے، نئے مشاہدات نئے تجربات، نیا لب ولہجہ، تہذیبوں کا عروج وزوال، نئے امکانات، روایات کا احترام، جدیدیت و مابعد جدیدیت سے قربتیں ساختیات و پس ساختیات سے انسیت، اپنا نقطہ نظر، اپنا خوش گوار لہجہ، نازک خیالی جیسی خوبیاں کہیں کہیں زیر لب مسکراتی ہیں کہیں کہیں بے ساختہ ہنس پڑتی ہے۔ تو کہیں کہیں قہقہے بھی لگاتی ہے، کبھی قاری ان کی زیر لب مسکراہٹوں میں، کبھی بے ساختہ ہنس پڑنے میں، تو کبھی قہقہوں کی طلسماتی کیفیات میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اور ایسے ایسے نفسیاتی وتخیلاتی جہانوں کی سیر کرنے لگتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی ان جہانوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی پہلے ان جہانوں میں قاری کے سوچ قدم ہی پہنچتے تھے۔‘‘ (۱۶۷)

نذیرؔ کی تحریر کے متعلق اپنی گراں قدر رائے بیان کرتے ہوئے مرحوم رزاق حمید صاحب اپنے مضمون ’’نذیرؔ فتح پوری اور کالی داس گپتا رضاؔ میں فرماتے ہیں۔

’’نذیرؔ فتح پوری صاحب اپنے قلم میں سیاہی نہیں بلکہ روشنائی رکھتے ہیں۔ آپ کی تحریر شگفتہ تازہ اور عام فہم ہونے کی بنا پر موضوع سے پورا پورا انصاف کرتی ہے۔ یہ صاف وشفاف چشمے کی طرح ایسا آئینہ بناتی ہے جس میں چہرے کے تمام خدوخال مکمل طور پر نمایاں ہو جائیں نہ ترسیل کی پیچیدگی اور نہ ابلاغ کی گمراہی۔ لسانی موشگافیوں اور مرعوب کن لہجے سے موصوف اپنے قد کو اونچا دکھانے کی خواہ مخواہ کوشش نہیں کرتے۔ شبلیؔ وحالیؔ کی طرز نگارش میں اپنے کشش انگیز رنگوں کی آمیزش کر کے نئے نقش ونگار کو ڈھالتے ہیں اور غور طلب موضوع کو اس گرد وغبار سے پاک کر دیتے ہیں جو سر پھری ہواؤں نے اس پر ڈال رکھا ہے۔‘‘ (۱۶۸)

علیم صبا نویدی اور اردو ادب کے نئے زاویے:۔

ادبی شخصیات کو خراجِ تحسین عطا کرنے کے لیے ان کے فکر وفن پر تصانیف شائع کرنا نذیرؔ کی خوبی ہے۔ اسی سلسلے کی یہ تصنیف۔ علیم صبا نویدی اور اردو ادب کے نئے زاویئے ہے۔ ۹۶ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف ۲۰۱۴ء میں ڈاکٹر جاویدہ حبیب کے زیر اہتمام شائع ہوئی، علیم صبا نویدی کے تئیں اپنے خیالات کا اظہار کرنا نذیرؔ کی دیرینہ خواہش تھی، علیم صبا نویدی تامل ناڈو کی ادبی دنیا کا ایک ایسا روشن ستارہ ہے جس نے وہاں کے ادبی ماحول کو اپنی کاوشات کے بل پر تابنا کی بخشی۔ ان کی شعری تصانیف میں عرشِ غزل (کلیات) طرحِ نو (۱۹۶۷) فکر (1981) نقش گر (۱۹۸۴) اور

اثر خامہ (1991) یہ چاروں ان کے شعری مجموعہ ہیں اس کے علاوہ نثری تخلیقات بھی ہیں۔
علیم صبا نویدی سے نذیرؔ کی پہلی ملاقات ۱۹۸۲ء کے قریب نذیر کے دولت خانہ پر ہوئی جس کا نذیرؔ نے اپنے مضمون میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔اور دوسری ملاقات ۲۱ فروری ۲۰۱۰ء کو رانچی میں ہوئی جہاں وہ دونوں جناب ایم اے حق صاحب کی بیٹی کی شادی کی تقریب میں شرکت فرماتھے۔وہاں ان کا تین دن کا قیام رہا اس دوران نذیرؔ کو علیم صبا نویدی کو قریب سے جاننے کا موقع ملا۔
اس تصنیف میں نذیرؔ نے علیم کی شعری تصانیف کے ساتھ ساتھ ان کی نثری کاوشات پر بھی اظہار خیال کیا ہے،جس کے تحت وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ۔

''علیم صبا نویدی شاعر ہیں، ناقد ہیں، محقق بھی ہیں، تامل ناڈو کی ادبی تاریخ کو جس کدو کاوش سے علیم صبا نویدی نے تلاش کر کے نئی نسل کے روبرو پیش کیا ہے، وہ اپنے آپ میں ایک بے مثال کارنامہ ہے، پہلے مواد مہیا کرنا پھر اسے تحریر کے دھاگوں میں پرونا اور اس کے بعد پکی روشنائی سے خوبصورت کتابوں کی صورت میں شائع کر کے مطالعہ کی میز تک پہنچانا۔یہ ایسے معرکے ہیں جنہیں سر کرتے کرتے خون پانی بن جاتا ہے۔حوصلے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور عزم و ہمت کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں۔لیکن دوسروں کی بہ نسبت علیم صبا نویدی ان تمام مراحل سے ہنستے کھیلتے گزر جاتے ہیں، جب وہ اپنی مجوزہ منزل تک پہنچتے ہیں تو فتح کا پرچم ان کے ہاتھوں لہراتا نظر آتا ہے کامرانی کا احساس تبسم کی کرن بن کر ان کے ہونٹوں اور چہرے پر شادابی کی رُتیں بکھری بکھری نظر آتی ہیں۔'' (۱۶۹)

نذیرؔ نے علیم صبا نویدی کی غزل گوئی، افسانہ نگاری، نعت گوئی، ان کے فن پر مرتب کتابوں اور ان کے شائع کردہ اخبار ''نورِ جنوب'' وغیرہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور جو کچھ بھی محسوس کیا اسے صفحہ قرطاس پر اتار دیا۔جس کے متعلق ڈاکٹر حیات افتخار پیش گفتار، میں فرماتے ہیں۔

''اردو کے ممتاز محقق، افسانہ نگار اور شاعر علیم صبا نویدی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر اردو دنیا کے ایک اور موقر ادیب وشاعر ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری کے مضامین کا یہ مجموعہ علیم شناسی کے سلسلے میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ان مضامین میں علیم صاحب کی شخصیت اور ان کے فکر وفن کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن پر اس سے بیشتر شاید ہی کسی نے خامہ فرسائی کی ہو۔یہ مجموعہ ایک لحاظ سے علیم صاحب کی گرانقدر ادبی خدمات کا نہ صرف اعتراف ہے بلکہ ان کے فکر وفن کا احتساب ہے۔'' (۱۷۰)

اس تصنیف میں تقریباً ۲۱ رمضامین شامل ہیں جو انہوں نے ۲۹ رجولائی ۲۰۱۴ء تا ۲۸ راگست ۲۰۱۴ء کے مابین تحریر کیے، اس درمیان ان کے ذہن ودل پر صرف اور صرف علیم صبا نویدی ہی چھائے رہے۔اس مدت میں انہوں نے علیم صاحب کو مختلف انداز اور زاویوں سے سوچا سمجھا اور جانا۔
نذیرؔ نے اپنے خیالات کو پراثر انداز میں پیش کرنے کے لیے شیخ سعدی کی رباعیات وحکایات سے حوالے اخذ کیے۔ان کی یہ سعی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ نذیرؔ فارسی زبان وادب کے مطالعے کا بھی شغف رکھتے ہیں۔یوں تو نذیرؔ نے اس تصنیف کو تمام ترعیوب سے پاک رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔لیکن پھر بھی پروف ریڈنگ کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔
علیم صبا نویدی کے فکر وفن پر متعدد تصانیف ترتیب دی جا چکی ہیں لیکن یہ تصنیف علیم شناسی کے متعلق ایک نئی راہ ہموار کرتی ہے، جو نئی سمتوں کا پتہ دیتی ہے اور نئے جہانوں کی سیر کراتی ہے۔

ارشد مینا نگری۔ ہندوستانی ذہن وتہذیب کا نمائندہ شاعر:۔

۱۲۷ ؍صفحات پر مشتمل یہ تصنیف جو۲۰۱۶ء میں اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام وجود میں آئی جو ارشد مینا نگری کی ادبی کارگزاریوں کا اعتراف ہے۔اس تصنیف سے پہلے بھی آپ کے فکروفن پر تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں، یہ چوتھی کتاب بھی آپ ہی کی خدمات کا اعتراف ہے جو نذیؔر کے زورِقلم کا نتیجہ ہے۔اس تصنیف میں نذیؔر نے ارشد مینا نگری کی تخلیقات پر ناقدانہ نظر ڈالی اور اپنی رائے قلم بند کی ہے۔

''مومن شیخ عبدالرشید شیخ محبوب ۳؍مارچ ۱۹۴۲ئ کو مینا نگر (دھرن گاؤں) ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔تعلیم حاصل کی اور درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا اسی دوران، ان کا ادبی ذوق بھی پروان چڑھتا رہا اور اسی ذوق وشوق نے مومن شیخ ارشد مینا نگری کے نام سے دنیا اردو ادب میں ایک نمایاں شناخت قائم کی۔

ارشد مینا نگری کی تصانیف میں احساسات (غزلیات) نئے اُجالے (گیت اور نظمیں) دھرتی کے تارے (ادب اطفال) عید (شعری مجموعہ) سہروں کے چہرے (شعری مجموعہ) ماں (شعری مجموعہ) ابرِ نیساں (غزلیات) اور رحمت العالمین (نعتیں) شامل ہیں، ارشد مینا نگری کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب موج زن ہے۔ہولی، دیولی، راکھی، عید، سورج، چاند، موسم، بادل، بارش، حتیٰ کہ چھاتا بھی ان کی نظموں میں ہیں، ارشد مینا نگری کا مشاہدہ وسیع ہے جس کے تحت انہوں نے ہر شے کا ایک منفرد پہلو تلاش کر لیا ہے۔

ارشد مینا نگری کے کلام سے کچھ اشعار ملاحظہ ہو ؎

نیلے پیلے، اُجلے کالے، رنگ رنگیلے سانپ
انسانوں کی خوش پوشی میں ہیں زہریلے سانپ
ان کے سرد بدن کے اندر شعلوں کی ہے آتش
بھول نہ جانا آگ صفت ہیں یہ برفیلے سانپ
بنتے ہی ٹوٹ جاتا ہے آئینہ امن کا
حالات کے ہیں ہاتھوں میں پتھر اِدھر اُدھر
حوصلہ دے غموں سے لڑنے کا
چاہے دنیا کے سارے غم دیدے

ارشد کی انہیں شعری خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے نذیر تحریر فرماتے ہیں۔

''ان کا تخلیقی سفر، حمد، نعت، منقبت، غزل، دوہا، ماہیا، سہرے، قوالیاں، قطعات، (یہ تعداد اس سے دگنی بھی ہوسکتی ہے) کہ مطالعہ سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ موصوف کے دل میں ہندوستانی مزاج، اس کی تہذیبی روایت اس کی قومی یکجہتی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ان کے احساس کا کمبل پیروں، فقیروں، سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں اور رشی منیوں کی زندگیوں کے دھاگوں سے بنا ہوا محسوس ہوتا ہے۔چونکہ یہ سارے کا سارا اثاثہ ہندوستان کی ملکیت ہے، جب ماضی کے ہندوستان سے

پردہ اٹھایا جاتا ہے تب ہمیں یہ سارے نقش ونگار بابرکت صورتوں میں نظر آتے ہیں، اور ہماری بصیرتوں کو منور کرتے ہیں۔'' (۱۷۱)

اس تصنیف میں نذیرؔ نے ارشد کی شاعری کے مختلف گوشوں کا مکمل احاطہ کیا ہے، تصنیف کے شائع ہونے کے پس پردہ نذیرؔ کو جس خیال نے آمادہ کیا وہ یہ تھا۔

''میں نے اپنی زیرِ مطالعہ کتاب کا مضمون پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مذکورہ بالا کتاب سے ہی اخذ کیا ہے، بلکہ مجھے یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی تکلیف نہیں کہ مذکورہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی مجھے زیرِ مطالعہ کتاب لکھنے کی ترغیب ملی۔'' (۱۷۲)

اس پیراگراف میں نذیرؔ نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تصنیف ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب'' کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس کے مطالعہ نے نذیرؔ کو ارشد مینانگری پر تصنیف تخلیق کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

نذیرؔ نے اپنی رائے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مختلف حضرات کی دلائل وشواہد کو بھی اپنی تصنیف میں شامل کیا ہے۔ ان کی یہ خوبی انہیں ایک بہتر نقاد اور محقق بھی ثابت کرتی ہے۔ کیوں کہ ایک بہتر محقق ونقاد اپنی بات ثبوت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نذیرؔ کی یہ تصنیف اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ان کی تحقیقی اور تنقیدی کائنات میں اضافے کی صورت میں شامل ہے۔

وہ کتابیں جو رد کردی گئیں:۔

کوئی بھی ادیب یا مصنف جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے کام کو مکمل کر کے پیش کرتا ہے۔ قاضی مشتاق احمد کے فکر وفن پر بھی نذیرؔ فتح پوری نے دو کتابیں شائع کیں۔ پہلی کتاب ''اردو افسانے کی مقبول ترین آواز۔ اور دوسری کتاب، قاضی مشتاق احمد، فکر وفن'' ادبی دنیا میں نذیرؔ فتح پوری اور قاضی مشتاق احمد کی دوستی مثالی تھی۔ قاضی مشتاق نے تو نذیرؔ سے متعلق کوئی ادبی کام نہیں کیا لیکن نذیرؔ فتح پوری نے قاضی مشتاق احمد کو ادبی دنیا میں استحکام عطا کرنے کے لیے بہت سے اہم کام کئے۔

جب نذیرؔ فتح پوری کو پوری دنیا میں ان کے ادبی کاموں کے عوض نوازا جا رہی تھی اور انہیں ملک اور بیرون ملک سے اعزازات مل رہے تھے تب ان کی اعزازی ڈگری کو نشانہ بناتے ہوئے قاضی مشتاق نے مخالفت اور مخاصمت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ نذیرؔ نے ان کے تمام الزامات کا مدلل جواب دیا اور اپنے رسالے اسباق میں ایک مضمون ''ایک خط قاضی مشتاق احمد کی خدمت میں'' شائع کر دیا تو حقیقت کے چہرے سے سارے نقاب اتر گئے۔ تب اردو دنیا کو علم ہوا کہ ادارۂ اسباق اور نذیر فتح پوری کے کیسے کیسے احسانات ہیں قاضی مشتاق پر۔ قاضی مشتاق کو ادبی دنیا میں متعارف کرانے کے لئے ابتداء میں اسباق کے دو شمارے ان کے فکر وفن پر شائع کئے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''صحبت کی خوشبو'' اور ہندی میں ان کے افسانوں کی پہلی کتاب ''ایک ہی راستہ'' اسباق پبلی کیشنز کی مرہون منت ہیں۔ قطرہ قطرہ عنوان سے ان کے افسانچوں کا پہلا انتخاب بھی اسباق ہی نے شائع کیا تھا۔

قاضی مشتاق کے فکر وفن پر پہلی کتاب نذیرؔ فتح پوری نے مرتب کر کے شائع کی جس کا عنوان تھا ''اردو افسانے کی مقبول ترین آواز'' اور دوسری کتاب بھی نذیرؔ ہی نے تحریر کی، جس کا عنوان۔ قاضی مشتاق احمد فکر وفن'' ہے، نذیرؔ کی ان دو کتابوں کے علاوہ قاضی مشتاق کے فکر وفن پر کوئی تیسری کتاب نہ کسی نے مرتب کی نہ کسی نے لکھی۔ اور اب اپنی مذکورہ دونوں کتابیں نذیرؔ صاحب نے اعلانیہ رد کر دیں۔

راقمہ کے نام ایک خط میں نذیرؔ نے لکھا تھا۔

ترنم صاحبہ!

سلام مسنون!

یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ نے میری شخصیت اور شاعری کے ابواب مکمل کر لیے۔اب آپ میری نثر نگاری پر لکھنے کے لیے تیاری کر رہی ہیں۔نثر میں بھی میری کتابیں کثیر ہیں۔ادبی شخصیتوں پر میں نے کثرت سے لکھا ہے ان کتابوں پر لکھتے وقت دو کتابوں پر کوئی اظہار خیال نہیں کرنا ہے آپ کو یہ دونوں کتابیں میں نے کالعدم قرار دی ہیں۔یعنی ان کتابوں کو رد کر دیا ہے، اپنی کتابوں کی فہرست سے دونوں کتابوں کو منقطع کر دیا ہے۔یہ دونوں کتابیں قاضی مشتاق احمد کے فکر وفن پر ہیں، ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اردو افسانے کی مقبول ترین آواز (۲) قاضی مشتاق احمد۔فکروفن

میری ادبی زندگی میں جتنی اذیت مجھے قاضی مشتاق نے دی ہے اتنی کسی اور نے نہیں دی ۲۵ / برسوں تک میں جتنا قاضی مشتاق کے کام آیا ہوں اتنا کسی اور کے نہیں۔لیکن دنیا میں کچھ بے ضمیر اور بے احساس لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نظر کسی نیکی اور ایمانداری کی جانب نہیں اٹھتی، یہ لوگ اپنی چالاکی سے دوسروں کی ذات سے فائدہ اٹھالیتے ہیں لیکن خود ان کی ذات دوسروں کے لیے غیر مفید ہی ثابت ہوتی ہے، میں ایسے لوگوں سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔زندگی میں کرنے کے لیے اچھے کاموں کی کمی نہیں ہے۔اس لیے کوشش کرنی چاہیے کہ برے لوگوں سے بچیں اور بُرے کاموں سے بھی اپنے دل، ذہن اور قلم کو محفوظ رکھیں۔

آپ کے مقالے کو تین سال ہو رہے ہیں اب جلد سے جلد یہ کام مکمل کر لینا چاہیے میری کتابوں کی اشاعت کا کام تو جاری رہتا ہے آپ کہاں تک تمام کتابوں کا احاطہ کریں گی۔بس ۲۰۱۴ء تک کی کتابوں کے آگے روک لگا دیں۔میرا سلسلہ تخلیق تدوین اسپیڈ بریکر سے رکنے والا نہیں۔اگر بخیر رہا تو ۲۰۱۵ء میں منصوبے کے تحت کم از کم پانچ کتابیں آسکتی ہیں۔

باقی خیر۔فقط نذیؔر فتح پوری (یکم جنوری ۲۰۱۵ء)

ادبی نثر میں ناول کی سی روانی، افسانے کی سی دلکشی اور تنقید کی سی بیداری بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے، نذیؔر کے یہاں یہ خوبیاں قدرت کی جانب سے ان کو ایک عطیے کے طور پر ودیعت ہوئی ہیں۔جن کی داد دیتے ہی بنتی ہے، نذیؔر نے جہاں بھی قلم اٹھایا ہے۔ان کی انفراد پسند طبیعت نے ان کی رہنمائی کی ہے اور وہ روایت سے ہٹ کر کچھ نیا سا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

باب چہارم

حوالہ نمبر	کتاب/رسالے کا نام	مصنف/مرتب	صفحہ نمبر	سن اشاعت
۱)	چٹانوں کے پیچ	نذیرؔ فتح پوری	۶	۱۹۷۵ء
۲)	چٹانوں کے پیچ	نذیرؔ فتح پوری	۹	۱۹۷۵ء
۳)	چٹانوں کے پیچ	نذیر فتح پوری	۱۰	۱۹۷۵ء
۴)	زخم اور آہیں	نذیر فتح پوری	۶	۱۹۷۷ء
۵)	نذیر فتح پوری کی ادبی فتوحات	ڈاکٹر سیفی سرونجی	۱۰۹	۲۰۱۴ء
۶)	زخم اور آہیں	نذیر فتح پوری	۱۵	۱۹۷۷ء
۷)	زخم اور آہیں	نذیر فتح پوری	۱۱	۱۹۷۷ء
۸)	زخم اور آہیں	نذیر فتح پوری	۶	۱۹۷۷ء
۹)	زخم اور آہیں	نذیر فتح پوری	۱۱	۱۹۷۷ء
۱۰)	رسالہ۔ جدید ادب، جرمنی	نذیر فتح پوری	۲۵۰	جنوری تا جون ۲۰۱۲ شمارہ۔۱۸
۱۱)	نذیر فتح پوری خواتین اہل قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آراء	۶۸	۲۰۱۱ء
۱۲)	رسالہ۔ خاتونِ مشرق، دہلی	–	۱۱	جولائی ۱۹۷۸
۱۳)	ماہنامہ۔ انشاء کولکاتا	–	۳۷	جولائی، اگست ۲۰۱۲ء جلد ۲۷، شمارہ ۷، ۸
۱۴)	ماہنامہ۔ انشاء کولکاتا	–	۳۸	جولائی اگست ۲۰۱۲ء جلد ۲۷ شمارہ ۷، ۸
۱۵)	ماہنامہ۔ انشاء کولکاتا	–	۳۷	جولائی اگست ۲۰۱۲ء جلد ۲۷ شمارہ ۷، ۸
۱۶	ماہنامہ۔ زریں شعاعیں، بینگلور	–	۲۲	جنوری ۲۰۰۸ء جلد ۲۰ شمارہ۔۱
۱۷	ماہنامہ۔ ہم سخن ٹائمس۔ بھوپال	–	۹	اپریل تا مئی ۲۰۱۴ء جلد۔۱، شمارہ ۱
۱۸	ماہنامہ۔ ہم سخن ٹائمس۔ بھوپال	–	۹	اپریل تا مئی ۲۰۱۴ء جلد۔۱، شمارہ ۱
۱۹	ریزہ ریزہ دل	نذیر فتح پوری	۶۵	۲۰۰۵ء
۲۰	ریزہ ریزہ دل	نذیر فتح پوری	۲۲	۲۰۰۵ء

۲۱	نذیر فتح پوری خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ڈاکٹر حسن آراء	۶۵	۲۰۱۱ء
۲۲	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۳۲	۲۰۱۳ء
۲۳	ریزہ ریزہ دل	نذیر فتح پوری	۷۶	۲۰۰۵ء
۲۴	ریزہ ریزہ دل	نذیر فتح پوری	۸۰	۲۰۰۵ء
۲۵	ریزہ ریزہ دل	نذیر فتح پوری	۹۹	۲۰۰۵ء
۲۶	محبوبؔ ونذیرؔ۔ فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہیؔ	۱۴۳	۲۰۱۳ء
۲۷	ریزہ ریزہ دل	نذیر فتح پوری	۱۴	۲۰۰۵ء
۲۸	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۳۳	۲۰۱۳ء
۲۹	محبوبؔ ونذیرؔ فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہیؔ	۱۴۵	۲۰۱۳ء
۳۰	نذیر فتح پور کی ادبی فتوحات	ڈاکٹر سیفی سرونجی	۱۰۴	۲۰۱۴ء
۳۱	میرا دیش مہان	نذیر فتح پوری	۴	۲۰۱۳ء
۳۲	میرا دیش مہان	نذیر فتح پوری	۶۷	۲۰۱۳ء
۳۳	پیشاور کی ۱۷ کہانیاں	نذیر فتح پوری	۶	۲۰۱۵ء
۳۴	پشاور کی ۱۷ کہانیاں	نذیر فتح پوری	۸_۹	۲۰۱۵ء
۳۵	پشاور کی ۱۷ کہانیاں	نذیر فتح پوری	۱۱	۲۰۱۵ء
۳۶	پشاور کی ۱۷ کہانیاں	نذیر فتح پوری	۸۷	۲۰۱۵ء
۳۷	پشاور کی ۱۷ کہانیاں	نذیر فتح پوری	۱۳	۲۰۱۵ء
۳۸	پشاور کی ۱۷ کہانیاں	نذیر فتح پوری	۱۶	۲۰۱۵ء
۳۹	لمحوں کا سفر	نذیر فتح پوری	۱۸	۱۹۸۵ء
۴۰	سہ ماہی۔ اردو، امراوتی	–	۸۸	اپریل تا جون ۲۰۱۴ء جلد ۳ شمارہ ۲
۴۱	سہ ماہی۔ اردو، امراوتی	–	۸۸_۸۹	اپریل تا جون ۲۰۱۴ء جلد ۳، شمارہ ۲
۴۲	سہ ماہی۔ اردو، امراوتی	–	۸۸	اپریل تا جون ۲۰۱۴ء جلد ۳، شمارہ ۲
۴۳	پونے سے رانچی کا سفر	نذیر فتح پوری	۲۳	۲۰۱۱ء
۴۴	سہ ماہی۔ اسباق، پونے	نذیر فتح پوری	۱۶۹	جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء
۴۵	پونے سے رانچی کا سفر	نذیر فتح پوری	۵۸	۲۰۱۱ء
۴۶	محبوب ونذیر۔ فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہیؔ	۱۶۲	۲۰۱۴ء

۴۷	سہ ماہی۔ رنگ، دھنباد، جھارکھنڈ	–	۴۳	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء شمارہ۔ ۵۹
۴۸	پونے سے رانچی کا سفر	نذیر فتح پوری	۵۹	۲۰۱۱ء
۴۹	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۲۳	۲۰۱۳ء
۵۰	محبوب و نذیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہی	۱۶۳	۲۰۱۴ء
۵۱	محبوب و نذیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہی	۱۶۶	۲۰۱۴ء
۵۲	محبوب و نذیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہی	۱۶۵	۲۰۱۴ء
۵۳	لفظوں کے سائے تلے	نذیر فتح پوری	۴	۱۹۹۵
۵۴	محبوب و نذیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہی	۱۶۸	۲۰۱۴ء
۵۵	ماہنامہ۔ زریں شعاعیں، بینگلور	–	۱۲	ستمبر ۲۰۰۹ء جلد ۲۰ شمارہ۔ ۹۰
۵۶	ماہنامہ۔ زریں شعاعیں، بنگلور	–	۱۲	ستمبر ۲۰۰۹ء جلد ۲۰ شمارہ ۹۰
۵۷	ماہنامہ۔ زریں شعاعیں، بینگلور	–	۱۳	ستمبر ۲۰۰۹ء جلد ۲۰ شمارہ۔ ۹۰
۵۸	سہ ماہی عکس ادب، اورنگ آباد	–	۱۶	جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳ء جلد ۱ شمارہ ۴
۵۹	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	نذیر فتح پوری	۱۸	۲۰۰۳ء
۶۰	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	نذیر فتح پوری	۲۸	۲۰۰۳ء
۶۱	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	نذیر فتح پوری	۶۱	۲۰۰۳ء
۶۲	سہ ماہی۔ رنگ دھنباد جھارکھنڈ	–	۲۵	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۶۳	سہ ماہی۔ رنگ دھنباد، جھارکھنڈ	–	۱۲۹	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۶۴	سہ ماہی رنگ، دھنباد جھارکھنڈ	–	۱۳۰	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۶۵	سہ ماہی رنگ، دھنباد جھارکھنڈ	–	۱۴۰	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۶۶	نذیر فتح پوری خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آراء	۹۴	۲۰۱۱ء
۶۷	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۹۳	۲۰۱۳ء
۶۸	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۰۲	۲۰۱۳ء
۶۹	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۹۹	۲۰۱۳ء
۷۰	شعرائے پونہ۔ ایک تحقیق	نذیر فتح پوری	۱۷۔۱۸	۲۰۰۵ء
۷۱	محبوب و نذیر۔ فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہی	۱۴۹	۲۰۱۳ء
۷۲	نذیر فتح پوری خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آراء	۹۷	۲۰۱۱ء

۷۳	رسالہ جدید ادب، جرمنی	-	۲۶۳	جنوری تا جون ۲۰۱۲ء
۷۴	شعرائے پونہ۔ ایک تحقیق	نذیر فتح پوری	۲۱	۲۰۰۵ء
۷۵	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۹۰	۲۰۱۳ء
۷۶	پونہ میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ تا حال	نذیر فتح پوری	۱۱	۲۰۱۰ء
۷۷	پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ تا حال	نذیر فتح پوری	۸	۲۰۱۰ء
۷۸	پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ تا حال	نذیر فتح پوری	۳۲	۲۰۱۰ء
۷۹	پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ تا حال	نذیر فتح پوری	۳۹	۲۰۱۰ء
۸۰	پونہ میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ تا حال	نذیر فتح پوری	٦٦	۲۰۱۰ء
۸۱	پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ تا حال	نذیر فتح پوری	۲۰۴	۲۰۱۰ء
۸۲	محبوب و نذیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہیؔ	۱۵۴	۲۰۱۳ء
۸۳	امیر تیمور	نذیر فتح پوری	۴	۲۰۱۰ء
۸۴	امیر تیمور	نذیر فتح پوری	۵	۲۰۱۰ء
۸۵	امیر تیمور	نذیر فتح پوری	٦	۲۰۱۰ء
۸٦	امیر تیمور	نذیر فتح پوری	۸۰	۲۰۱۰ء
۸۷	امیر تیمور ہندوستان میں	نذیر فتح پوری	٦	۲۰۱۱ء
۸۸	امیر تیمور ہندوستان میں	نذیر فتح پوری	۴	۲۰۱۱ء
۸۹	امیر تیمور ہندوستان میں	نذیر فتح پوری	۵	۲۰۱۱ء
۹۰	امیر تیمور ہندوستان میں	نذیر فتح پوری	۵	۲۰۱۱ء
۹۱	امیر تیمور ہندوستان میں	نذیر فتح پوری	٦	۲۰۱۱ء
۹۲	امیر تیمور ہندوستان میں	نذیر فتح پوری	۱۰۴	۲۰۱۱ء
۹۳	امیر تیمور ہندوستان میں	نذیر فتح پوری	٦	۲۰۱۱ء
۹۴	ماہنامہ۔ زبان و ادب، پٹنہ	-	٦۴	جولائی ۲۰۱۲ء
۹۵	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۲۴	۲۰۱۱ء
۹٦	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۲۵	۲۰۱۱ء
۹۷	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۳۸	۲۰۱۱ء
۹۸	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۳۸	۲۰۱۱ء

۹۹	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۳۹	۲۰۱۱ء
۱۰۰	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۴۵	۲۰۱۱ء
۱۰۱	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۴۸	۲۰۱۱ء
۱۰۲	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۴۹	۲۰۱۱ء
۱۰۳	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۵۰	۲۰۱۱ء
۱۰۴	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۵۱/۵۰	۲۰۱۱ء
۱۰۵	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۵۳	۲۰۱۱ء
۱۰۶	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۵۷	۲۰۱۱ء
۱۰۷	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۵۹	۲۰۱۱ء
۱۰۸	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۷۴	۲۰۱۱ء
۱۰۹	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۸۷	۲۰۱۱ء
۱۱۰	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۱۲۴	۲۰۱۱ء
۱۱۱	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۱۳۸	۲۰۱۱ء
۱۱۲	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۱۷۵	۲۰۱۱ء
۱۱۳	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۱۷۶	۲۰۱۱ء
۱۱۴	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۱۷۹	۲۰۱۱ء
۱۱۵	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۱۷۹	۲۰۱۱ء
۱۱۶	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیر فتح پوری	۷۷	۲۰۱۱ء
۱۱۷	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۸	۲۰۱۳ء
۱۱۸	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۰۶	۲۰۱۳ء
۱۱۹	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۱۵	۲۰۱۳ء
۱۲۰	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۶۹	۲۰۱۳ء
۱۲۱	نذیر فتح پوری خواتین اہل قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آراء	۹۹	۲۰۱۱ء
۱۲۲	سہ ماہی، رنگ، دھنباد، جھارکھنڈ	–	۶۲	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۱۲۳	سہ ماہی، رنگ، دھنباد، جھارکھنڈ	–	۶۵	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۱۲۴	سہ ماہی، رنگ، دھنباد، جھارکھنڈ	–	۱۳۸	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء

۱۲۵	سہ ماہی، رنگ، دھنباد، جھارکھنڈ	-	۱۳۸، ۱۳۹	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۱۲۶	جگن ناتھ آزاد، ایک مستقل ادارہ	نذیر فتح پوری	۱۲	۱۹۹۸
۱۲۷	محبوب و نذیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہیؔ	۱۳۱	۲۰۱۳ء
۱۲۸	سہ ماہی۔ اردو امراؤتی	-	۹۳	اپریل تا جون ۲۰۱۴ء جلد ۳۔ شمارہ ۲
۱۲۹	سہ ماہی اسباق، علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر پونہ	-	۳۴۸	جولائی ۲۰۰۱ تا مارچ ۲۰۰۲ء
۱۳۰	ساحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ	نذیر فتح پوری	۱۲	۲۰۰۷ء
۱۳۱	ساحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ	نذیر فتح پوری	۱۶	۲۰۰۷ء
۱۳۲	اہل ادب کی تنقیدی اور تحقیقی نظر	ساحر شیوی	۱۵۵	۲۰۱۴ء
۱۳۳	ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ	نذیر فتح پوری	۱۰	۲۰۰۸ء
۱۳۴	ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ	نذیر فتح پوری	۱۱	۲۰۰۸ء
۱۳۵	نذیر فتح پوری خواتین اہل قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آراء	۱۲۸	۲۰۱۱ء
۱۳۶	سہ ماہی، رنگ، دھنباد، جھارکھنڈ	-	۵۶	۲۰۱۲ء
۱۳۷	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	نذیر فتح پوری	۱۱	۲۰۱۰ء
۱۳۸	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	نذیر فتح پوری	۱۵	۲۰۱۰ء
۱۳۹	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	نذیر فتح پوری	۴۲، ۴۳	۲۰۱۰ء
۱۴۰	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	نذیر فتح پوری	۶۷	۲۰۱۰ء
۱۴۱	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	نذیر فتح پوری	۸	۲۰۱۰ء
۱۴۲	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	نذیر فتح پوری	۸	۲۰۱۰ء
۱۴۳	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	نذیر فتح پوری	۷	۲۰۱۰ء
۱۴۴	ماہنامہ۔ رہنمائے تعلیم جدید، دہلی	-	۲۷	فروری مارچ ۲۰۱۲ء جلد ۵۷، شمارہ ۶، ۷
۱۴۵	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترجم	۱۶۶	۲۰۱۳ء
۱۴۶	سہ ماہی۔ رنگ، دھنباد جھارکھنڈ	-	۱۳۵	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء شمارہ ۵۹
۱۴۷	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/ محبوب راہی	پچھلا فلیپ	۲۰۱۳ء
۱۴۸	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/ محبوب راہی	۶۵	۲۰۱۳ء
۱۴۹	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/ محبوب راہی	۶۸	۲۰۱۳ء
۱۵۰	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/ محبوب راہی	۸۸	۲۰۱۳ء

۱۵۱	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/محبوب راہی	۷۹	۲۰۱۳ء
۱۵۲	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/محبوب راہی	۸۰	۲۰۱۳ء
۱۵۳	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/محبوب راہی	۸۶	۲۰۱۳ء
۱۵۴	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/محبوب راہی	۹۲	۲۰۱۳ء
۱۵۵	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/محبوب راہی	۹۳	۲۰۱۳ء
۱۵۶	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیر فتح پوری/محبوب راہی	۱۰۵	۲۰۱۳ء
۱۵۷	میر شاعری میں جانور	نذیر فتح پوری	۷	۲۰۱۴ء
۱۵۸	میر شاعری میں جانور	نذیر فتح پوری	۳۳،۳۴	۲۰۱۴ء
۱۵۹	مناظر صاحب کتابیں ملیں	نذیر فتح پوری	۷۶	۲۰۱۴ء
۱۶۰	مناظر صاحب کتابیں ملیں	نذیر فتح پوری	۴۱	۲۰۱۴ء
۱۶۱	مناظر صاحب کتابیں ملیں	نذیر فتح پوری	۱۳۔۱۴	۲۰۱۴ء
۱۶۲	مناظر صاحب کتابیں ملیں	نذیر فتح پوری	۱۰	۲۰۱۴
۱۶۳	مناظر صاحب کتابیں ملیں	نذیر فتح پوری	۹۸	۲۰۱۴ء
۱۶۴	مناظر صاحب کتابیں ملیں	نذیر فتح پوری	اپہلافلیپ	۲۰۱۴ء
۱۶۵	مناظر صاحب کتابیں ملیں	نذیر فتح پوری	۴	۲۰۱۴ء
۱۶۶	محبوب و نذیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہیؔ	۱۷۱	۲۰۱۳ء
۱۶۷	ششماہی۔احساس مالیگاؤں	-	۵۴	جون تادسمبر۲۰۱۴ءجلددوم شمارہ ۴
۱۶۸	سہ ماہی اسباق۔پونہ	-	۱۴۲	اکتوبر تادسمبر۲۰۱۴ء
۱۶۹	علیم صبا نویدی اور اردو ادب کے نئے زاویے	ُنذیر فتح پوری	۷	۲۰۱۴ء
۱۷۰	علیم صبا نویدی اور اردو ادب کے نئے زاویے	ُنذیر فتح پوری	۴	۲۰۱۴ء
۱۷۱	ارشد مینا نگری ہندوستانی ذہن و تہذیب کا نمائندہ شاعر	ُنذیر فتح پوری	۱۰	۲۰۱۴ء
۱۷۲	ارشد مینا نگری ہندوستانی ذہن و تہذیب کا نمائندہ شاعر	ُنذیر فتح پوری	۹	۲۰۱۴ء

☆☆☆

باب پنجم

نذیر فتح پوری اور متفرق اصناف نثر

باب پنجم

نذؔیر فتح پوری اور متفرق اصناف نثر

اس باب میں نذؔیر کی متفرق اصناف نثر مثلاً (۱) طنز و مزاح (۲) صحافت نگاری (۳) ترجمہ نگاری اور (۴) ترتیب وانتخاب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہے۔

نذؔیر فتح پوری بحیثیت طنز و مزاح نگار

نذؔیر نے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں بھی اپنے نوک قلم سے بہت سے مضامین صفحہ قرطاس پر اتارے ہیں۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ان کے یہ مضامین ''خانہ بدوش'' کے فرضی نام سے مختلف رسائل وجرائد میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ حالانکہ ان رسائل وجرائد کے مدیران تو اس بات سے واقف تھے کہ خانہ بدوش کے نام سے شائع ہونے والے یہ مضامین کس شخص کی تخلیقات ہیں لیکن قارئین اس بات سے انجان تھے۔ نذؔیر نے ان تمام مضامین کو یکجا کر کے ایک مسودہ کی شکل دی ہے جو ''غالب اور ہم'' عنوان سے مستقبل میں کبھی شائع ہو سکتا ہے۔ نذؔیر کی طنزیہ ومزاحیہ تحریر کا جائزہ اس ایک اقتباس میں ملاحظہ کریں۔ عنوان ہے ''مطالبۂ دیوانِ غالب''۔

''جانِ وفا پرست کو ایک شمیم نو بہار　　فرق سبزہ مست کو ابر تنکر کی بار ایک

''آج دیوانِ غالؔب کھولتے ہی اس شعر پر نظر پڑی تو ہماری تفہیم کے سوتے خشک ہو گئے بہت ہاتھ پیر مارے سر کھجایا، پیشانی رگڑی، انگڑائی لی، جماہی لی، پہلو بدلا، لغت اُٹھایا، معنی تلاش کیے، حرف سے حرف جوڑ کر الفاظ کی تہوں میں ڈبکی لگائی مگر بے سود، ذہن کی ایک گرہ نہیں کھلی، تفہیم کا ایک نقطہ بھی روشن ہی ہوا۔ سچ ہے شعرِ غالؔب کا مطالعہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ بڑوں کا بھی کھیل نہیں ہے، ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے جب بارش نہیں ہوتی تھی آسمان پر بادل بھی نہیں چھائے تھے، مطلع قطعی صاف تھا فضا میں گرد و غبار بھی نہیں تھا۔ ہم موسم کا فائدہ اٹھانے کی نیت سے قلم کاغذ لے کر بیٹھے ہی تھے کہ مقامی کالج کے ایک ڈاکٹر پروفیسر غریب خانے پر تشریف لائے، تمبا کو کی پیک ہٹا کر زبان کی آڑ میں دفن کرتے ہوئے بولے۔

''سنا ہے آپ کے پاس دیوانِ غالؔب ہے اور آپ اس کے مطالعے سے مستفید ہو کر ان دنوں شعروں کے انبار لگا رہے ہیں۔''

ہم نے کہا یہ درست ہے کہ ہمارے پاس دیوان غالؔب ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ہم اس کا مطالعہ کرتے اور مستفید بھی ہوتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ہم اچھے اچھے شعر بھی کہہ رہے ہیں مگر آپ کو اس سے کیا مطلب؟

کہنے لگے۔ ''میں وہ دیوان غالب دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ہم نے کہا۔ '' آپ نے آج تک دیوانِ غالؔب نہیں دیکھا''

انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

ہم نے کہا آپ تو اردو کے اسکالر ہیں، اردو میں ہی پی ایچ ڈی کی ہے اور آج کل آپ کالج میں اردو ادب پڑھاتے ہیں۔ اردو کی مختلف انجمنوں کے سربراہ ہیں پھر بھی آپ نے آج تک دیوانِ غالبؔ نہیں دیکھا۔''

کہنے لگے ''ان تمام باتوں سے دیوانِ غالبؔ کا کیا تعلق ہے۔''

ہم نے کہا ''سفارش'' کے عنوان سے اردو اور دیوناگری میں آپ کا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے پھر بھی دیوانِ غالبؔ کے مطالعے سے محروم رہے۔؟

کہنے لگے۔ ''اپنا دیوانِ مرتب کرنے سے پہلے ساحر لدھیانوی کی تلخیاں'' کالج کی لائبریری سے اٹھالایا تھا۔ اس نے اتنا ساتھ دیا کہ دیوانِ غالبؔ کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔''

ہم نے پوچھا! ''اب کیسے ضرورت پیش آئی!؟

کہنے لگے ''دوسرا دیوانِ مرتب کر رہا ہوں۔''

اس اقتباس سے نذیرؔ کی طنزیہ و مزاحیہ تحریر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ نذیرؔ کو طنز و مزاح لکھنے کا حوصلہ مشفق خواجہ سے ملتا ہے جس کے متعلق وہ سلطانہ مہر صاحبہ سے بات چیت کے دوران فرماتے ہیں۔

''مشفق خواجہ کا طنز و مزاح بھی پڑھتا ہوں۔ ان کی تقلید میں طنز و مزاح لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' (۱)

نذیرؔ کے ان مضامین کے عنوانات ملاحظہ کریں۔

قبرستان میں مشاعرہ، ہم نے سوٹیر خریدا۔ صاحب کالم جگ اندھیارا۔ غالبؔ اور ہم۔ غالبؔ اور ماہیا۔ مطالبہ دیوانِ غالبؔ، قصہ ہمارے ڈاکٹر بننے کا، مشفق خواجہ نے اپنا معنوی استاد، استاد لاغر مرادآبادی کو بنایا تھا۔ نذیر نے اپنے معنوی استاد کو، استاد ہدہد گلشن آبادی کا نام دیا ہے۔

نذیرؔ بہ حیثیت صحافت نگار

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اپنے مضمون ''ہندوستان میں اردو صحافت آزادی کے بعد'' میں لفظ صحافت کے معنی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''صحافت عربی لفظ ہے جو ''صحیفہ'' سے نکلا ہے۔ اس لفظ کا مترادف JOURNALISM ہے۔
جس کا ماخذ لاطینی لفظ DIURNAL ہے۔ WEBSTER DICTIONARY میں لفظ
صحافت کی وضاحت اس طرح ملتی ہے۔

WRITING DESIGNED FOR PUBLICATION IN A NEWS PAPER OR PUBLIC MAGAZINE WRITING CHARACTERISED BY A DIRECT RESENTATION OF FACTS OR DISCRIPTION WRITING DESIGNED TO APPEAL TO CURRENT POPULAR TASTE OR CURRENT PUBLIC INTEREST.

یعنی اخبار و رسائل میں چھاپنے کی غرض سے تحریری مواد کی تیاری کا نام صحافت ہے جس میں عوامی مذاق

اور حالیہ دلچسپیوں سے متعلق امور بالواسطہ طریقہ پر اپنی اصل شکل وصورت میں پیش کیے جاتے ہیں۔'' (۲)

راجستھان میں اردو صحافت کی حالتِ زار پر روشنی ڈالتے ہوئے نذیرؔ فرماتے ہیں۔

''راجستھان میں اردو صحافت کو فروغ نہیں ملا۔ اخبارات اُسی زبان میں کامیاب ہوتے ہیں جس زبان کی نمائندگی عام لوگ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اردو صحافت کا سراغ نہ آزادی سے پہلے ملتا ہے نہ آزادی کے بعد، جہاں تک مجھے معلوم ہے راجستھان میں کبھی کوئی اردو روزنامچہ جاری نہیں ہوا۔'' (۳)

پھر نذیرؔ اس کے آگے فرماتے ہیں۔

''ہفتہ روزہ اخبار کی اشاعت کا بھی یہاں کوئی قابل ذکر ریکارڈ نہیں، کبھی کبھی کہیں سے کسی ہفتہ روزہ اخبار نے سر اٹھایا تو بہت جلد وہ سر دستار فضیلت سے محروم ہوگیا۔ میری معلومات کے مطابق بہت پہلے ایک ہفتہ روزہ اخبار ''بدلہ ہوا زمانہ'' جے پور سے جاری ہوا تھا، لیکن چند شماروں کی اشاعت کے بعد اس نے دم توڑ دیا۔ یہ اخبار عوامی کم اور ادبی زیادہ تھا۔'' (۴)

راجستھان میں اردو صحافیوں کی از حد ضرورت ہے، جو عوام کے حالات کی بھرپور عکاسی بھی کرسکیں۔ اور عصری حالات کا جائزہ بھی لے سکیں۔

بہر حال نذیرؔ خود ''اسباق'' نامی سہ ماہی رسالے کے مالک و مدیر ہیں، یہ رسالہ ۹ مئی ۱۹۸۱ کو نذیرؔ اور کچھ خاص احباب کی سرپرستی میں اسباق ٹرسٹ کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ کچھ عرصے بعد یہ ٹرسٹ بکھر گیا اور رسالہ بند ہونے کے کگار پر آپہنچا، لیکن نذیرؔ نے اسے بند نہیں ہونے دیا اور تن تنہا اس کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی، اور آج ۳۵ سال بعد بھی وہ اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دے رہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ کوئی آسان کام تھا جو خود بخود ہوگیا۔ اس رسالے کو پالنے اور پروان چڑھانے میں نذیرؔ نے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دی۔ اپنا خون پلا کر اس کی پرورش کی، نذیرؔ اس رسالے کو اپنی گیارہویں اولاد تسلیم کرتے ہیں۔ اپنے رسالے اور صحافت نگاری کے متعلق ان کی فکر و نظریات کو سمجھنے کے لیے یہاں اس انٹرویو کو شامل کیا جارہا ہے جو جناب رفیق جعفر نے دس سال قبل نذیرؔ سے صحافت نگاری کے متعلق لیا تھا۔

☆ ''اسباق'' کا چوبیسواں سال چل رہا ہے۔ یہ رسالہ اپنی اشاعت کے سلور جوبلی سال کی طرف رواں دواں ہے لیکن آپ کے اداریے اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ نے اپنے رسالے کو خود کفیل نہیں کیا ایسا کیوں؟

◀ اس کیوں کی کئی وجوہات ہیں۔ اگر بیان کرنے لگوں تو ایک ضخیم کتاب کا مواد تیار ہوجائے اس لیے صرف یہ عرض کروں گا کہ کوشش تو بہت کی لیکن اب تک یہ سودا گھاٹے کا ہی ثابت ہوا۔

☆ اگر ایسا ہے تو آپ یہ رسالہ بند کیوں نہیں کر دیتے؟

◀ رسالہ بند کردوں تو میری روح مجروح ہوجائے گی کیونکہ یہ میری روح کی غذا ہے اور روح سے میرا جسم منسلک ہے۔ میرے جسم سے میرے اہل وعیال کا تعلق ہے اور میری شاعری میری ادبی تحقیق میری عادت ہی نہیں میری فطرت بھی ہے۔ یہ سب ایک دم ختم ہوجائے گا اور گھٹن زدہ زندگی میرے پیشے یعنی مکانوں، دکانوں اور عمارتوں کی معماری سے مجھے دور کردے گی۔ اس خوف سے مجھے یہ گھاٹا منظور ہے یوں سمجھیے کہ یہ میری مجبوری ہے۔

☆ تو گویا آپ نے اپنی مجبوری سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ دشواریوں کے باوجود مطمئن ہیں؟

◀ پوری طرح تو نہیں لیکن کئی فیصد اطمینان یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک پیاری زندہ زبان اردو کی خدمت کا موقع مجھے

فراہم کیا۔اس خدمت نے مجھے عزت بھی دی اور شہرت بھی۔اور جو لوگ بھی اس زبان اوراس کے ادب کی میری طرح خدمت کرر ہے ہیں وہ مجھے عزیز ہیں۔ان میں سے بہت سارے لوگوں سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔میل ملاپ اور خطوط کے ذریعے یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔میرے ایسے احباب کی تعداد بہت ہے جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

☆ اگر یہ بات ہے تو آپ کے رسالے کو اب تک خود کفیل ہو جانا چاہیے تھا جبکہ ہندوستان سے نکلنے والے کئی رسالے غیر مما لک میں رہنے والے ادیبوں شاعروں کی مدد کی وجہ سے نہ صرف مسلسل شائع ہورہے ہیں بلکہ ان کے مدیران تو لکھ پتی بھی بن گئے ہیں غیر مما لک کا سفر بھی کرتے رہتے ہیں۔آپ کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوا۔؟

◄ میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں نہیں ہوا، دوسرے مدیران پتہ نہیں کیا کرتے ہیں۔ویسا کرنا مجھے نہیں آیا۔میں یہ جانتا ہوں کہ ''اسباق'' کے معیار کو میں نے اب تک اپنے تئیں برقرار رکھا ہے۔سمجھوتہ، مروت، چاپلوسی اور جھوٹ نہ میرے مزاج میں ہے اور نہ ہی میرے قلم میں۔اگر ایسا کرنے سے لوگ تعاون نہیں کرتے تو نہ کریں۔اس کام کے کرنے میں اللہ جب تک میرا ساتھ دے گا میں رسالہ نکالتا رہوں گا۔

☆ آپ نے ''اسباق'' کے معیار کی بات کی تو یہ بتایئے کہ ''اسباق'' کا معیار کیا ہے کہ آپ اس کے لیے سمجھوتے کرنے کو تیار نہیں؟

◄ آپ کے عجیب سوال کا جواب مجھے فوراً نہیں دینا چاہیے، پھر بھی سن لیجئے کہ میرے ہر شمارے میں میرے معیار کی آپ کو خوشبو نظر آئے گی۔میرا مطلب ہے میں ایسا صاف ستھرا ادب شائع کرنا پسند کرتا ہوں جو عام یا عامیانہ نہ ہو اور جس میں زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی بات ہو، گہرائی و گیرائی بھی ہو۔عصرِ حاضر کی غمازی بھی ہو، انسانی فطرت کی عکاسی بھی ہو اور انسانیت کی فنکارانہ تبلیغ بھی ہو۔میرے ان خیالات کو آپ جو بھی نام دیں میں اسی کو اپنے رسالے کا معیار سمجھتا ہوں۔جو تخلیق اس معیار پر پوری نہیں اترتی وہ 'اسباق' میں نہیں چھپ سکتی۔دوستی، پیار، محبت اور روپیہ پیسے کی طاقت بھی مجھے نہ منوا سکتی ہے اور نہ خرید سکتی ہے۔بکنے والی چیزیں بہت ہیں خریدنے والے ان چیزوں کو کیوں نہیں خریدتے۔شاعروں، ادیبوں اور مدیران کے اذہان کو کیوں خریدنا چاہتے ہیں؟ مختصر یہ کہ میں اپنے ضمیر کو بیچ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

◄ آج کے اس لین دین اور تجارتی زمانے میں بھی آپ ایسی باتیں کرر ہے ہیں۔آپکے اصول سخت ہیں جس سے نقصان ہوسکتا ہے۔

☆ اس کی مجھے پرواہ نہیں ہے رفیق صاحب! ایک بات یاد رکھیں کہ گر سبھی بکاؤ ہو جائیں تو نہ اردو زبان کی شان برقرار رہے گی اور نہ ہی اردو ادب کا کوئی مقام اور معیار رہے گا۔میرے خیال سے ایک میں ہی نہیں اور بھی کئی ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان وادب کی ساری دنیا میں قدر و قیمت ہے۔اور انشاء اللہ رہے گی۔

☆ آپ کے جذبات اور خیالات سے کس کافر کو انکار ہوسکتا ہے۔آپ کی باتیں سن کر اندازہ ہوا کہ آپ اردو زبان سے بہت پیار کرتے ہیں۔اب یہ بتایئے کہ اردو کا مستقبل کیا ہوگا؟

◄ آپ کے گھسے پٹے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ حال کا بیج ہی مستقبل میں پھل دیتا ہے لیکن بیج جس زمین میں بویا جارہا ہے وہ زمین بنجر نہ ہو زرخیز ہو اور حسبِ ضرورت اس بیج والی زمین کو نمی ملتے رہے۔

☆ نذیرؔ صاحب! یہ تو آپ شاعری کررہے ہیں صاف صاف سیدھے سیدھے انداز میں بتایئے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

◀ آپ کے سوال کے جواب میں مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا ہے اس کی وضاحت اور کیا کروں۔ اردو کے سلسلے میں آپ کچھ اور سننا چاہتے ہیں تو سنئے! میرے نزدیک اردو والوں کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اردو کا مستقبل کیا ہوگا بس فرض سمجھ کر اردو کا کام کرتے رہنا چاہیے۔

☆ یہ بات آپ نے بہت اچھی کہی۔

◀ اب مزید سنئے کہ مرکزی اور ریاستی حکوتوں کی آس نہ رکھتے ہوئے اپنے طور پر اپنے خرچ پر اردو کا کام کرتے رہنا چاہیے۔ یہ زبان صرف زبان ہی نہیں ایک تہذیب بھی ہے۔ اس تہذیب سے آشنائی ہماری قوم کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اخلاقیات بھی ہے اور انسانیت بھی اس کے مظاہرے متاثر کن ہوتے ہیں اور اتنے پرکشش ہوتے ہیں کہ دیگر زبان والے کھینچے چلے آتے ہیں۔ اس سے پیار، محبت، خلوص اور یکجہتی بڑھتی ہے۔

☆ آپ سچ کہہ رہے ہیں لیکن یہ خبر عام ہے کہ اردو کا چلن ماند پڑتا جارہا ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو اردو کے بجائے انگریزی اور مقامی زبانوں میں تعلیم دلانا ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ یہ بات بھی غلط نہیں ہے کیونکہ مسئلہ روٹی روزی کا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں۔؟

◀ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ کسی بھی زبان کے بچے کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دلانا ضروری ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ وہی زبان اس کے گھر کی بھی زبان ہوتی ہے اور اس کے ماحول کی بھی، جس کی وجہ سے بچہ ہر بات ذہن نشین کرتا جاتا ہے۔ جس سے آگے اسے فائدہ ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کم از کم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد یا اس کے ساتھ مقامی زبان اور انگریزی کا بھی سیکھنا ضروری ہے۔ دیگر زبانیں بھی بچہ اپنی مادری زبان کے ذریعے آسانی سے سیکھ سکتا ہے اور سیکھی ہوئی زبانوں میں وہ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرسکتا ہے۔

☆ بات تو آپ نے معقول کہی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اردو والے بھی انگریزی یا مقامی زبانوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے لگے ہیں۔ اتر پردیش اور بہار میں تو ہندی ذریعہ تعلیم عام ہے اور اردو والے اسی طرف راغب بھی ہیں۔

◀ میں نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار تو کردیا لیکن آپ نے یہ جو سوال کیا یہ سچائی بھی میرے سامنے ہے تو میں یہ عرض کروں کہ ہمارے ہندوستان میں ہر ریاست میں رہنے والے کو مقامی زبان اور انگریزی زبان سیکھنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی زبانوں کے سیکھنے کے مواقع ملتے ہوں تو سیکھ لینا چاہیے۔ یہی مشورہ میں اردو والوں کو بھی دوں گا۔ اب رہی بات درسی تعلیم کی تو عرض ہے کہ اردو یہاں روٹی روزی کے مسائل پوری طرح حل نہیں کرسکتی۔ اگر مواقع ہیں اور ہوسکتے ہیں تو ایک محدود پیمانے پر۔ اس لیے بچے کو اگر انگریزی یا مقامی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور وہ بچہ اردو تہذیب سے تعلق رکھتا ہے تو اسے گھر میں یا ٹیوشن کے ذریعے اردو سکھانا پڑھانا بے حد ضروری ہے تاکہ بچہ اپنی تہذیبی جڑوں سے جڑا رہے۔ اور ایک ضروری بات یہ ہے کہ اردو میں اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے مذہب کا کافی سرمایہ موجود ہے جس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

☆ مطلب یہ کہ اردو کا تحفظ ضروری ہے۔

◀ جی ہاں! یہ ہر اردو والے کا فرض ہے۔ ایسے یہ زبان اتنی سخت جان اور اتنی رئیس اور طاقتور ہے کہ اس میں اپنے آپ کو زندہ اور تابندہ رکھنے کی صفات موجود ہیں۔ یہ کسی کی ہمدردی کی قطعاً محتاج نہیں اور اردو والوں کو بھی مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تو یہ زبان عالمی زبانوں میں نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ غیر ممالک کی یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم کے معقول انتظامات ہو رہے ہیں۔ دنیا کے مشہور ٹی وی چینلس پر اردو پروگراموں کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ حیدر آباد کے راموجی راؤ کا ای ٹی وی اردو چینل دنیا کے تقریباً پچپن ممالک میں دکھایا جاتا ہے۔ اردو مذہبی چینل کیو ٹی وی کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ بی بی سی لندن ریڈیو پر اردو نیوز پروگرام ساری دنیا میں شوق سے سنے جاتے ہیں۔ اب تو ۱۲ رمئی ۲۰۰۴ء سے برٹش ریڈیو کے وائس آف امریکہ نے اپنی ۱۲ گھنٹے کی اردو سروس شروع کر دی ہے۔

کیا یہ سب اردو کی ترقی اور مقبولیت کا ثبوت نہیں؟

☆ جی ہاں! یہ سب سچ ہے کہ اردو زبان تیزی سے ساری دنیا میں پھیل رہی ہے لیکن یہ بولنے اور سننے کی حد تک ہے۔ لیکن سوال اس کے رسم الخط کا ہے؟

◀ جی ہاں! یہ سوال ہی نہیں بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے پیچھے تو مجھے بہت بڑی منظّم سازش بھی نظر آتی ہے جس کا ثبوت میرے پاس تو نہیں لیکن آئے دن اردو رسم الخط کی مخالفتیں اور پھر اردو والوں کی لاپرواہی کی حماقتیں اور ریاست اتر پردیش میں سرکاری سطح پر اردو کی تعلیم کا اخراج اور اردو اخبارات، رسائل اور کتابوں کی خریداری میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی کنجوسی، سرکاری اشتہارات کے لیے ناقابل قبول شرائط۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ یہ اردو رسم الخط کے ساتھ دشمنی نہیں تو پھر کیا ہے۔ کسی زبان کے رسم الخط کو ختم کر دیا جائے تو اس کی روح اس کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اردو والوں کو چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔

☆ آپ نے بہت اچھی باتیں بتائیں، اب یہ بتایئے کہ کیا ہمارے ملک کی ریاستی سرکاری اردو اکیڈمیاں اردو کی ترقی میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔؟

◀ اردو اکیڈمیاں جو بھی کر رہی ہیں وہ اردو کے لیے ہی کر رہی ہیں۔ یہ کام بھی کیا کم ہے۔ اب یہ اردو والوں پر منحصر ہے کہ ریاستی حکومتوں کی بنائی ہوئی ان اردو اکیڈمیوں سے کیا کام لیتے ہیں جبکہ ان کا بجٹ لاکھوں کروڑوں میں ہوتا ہے اور حکومتیں اس بجٹ کو خرچ کرنے کے لیے اردو والوں کو ہی کرسیوں پر بٹھاتی ہیں۔ اگر کام غلط ہو رہا ہے تو اس کی ذمہ دار حکومتیں نہیں خود اردو والے ہی ہیں۔ اور ریاستی حکومتوں کے علاوہ ہماری مرکزی حکومت بھی اردو پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ کرتی ہے۔ یہ بجٹ بھی اردو والوں کے ہی ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

☆ اردو والوں کو آپ کچھ مشورہ دیں گے؟

◀ یہ میرا مشورہ نہیں اپیل ہے گذارش ہے اُردو سماج سے کہ شخصی اور جماعتی طور پر اردو اور اردو رسم الخط کو قائم رکھنے اور عام کرنے کی مہم چلائیں، اردو سے پیار بڑھائیں، عالمی مشاعرے اور آل انڈیا مشاعروں کے نام پر جو اردو تہذیب کا غلط

روپ پیش کیا جار ہا ہے اس پر روک لگائیں۔ لاکھوں کے بجٹ سے ہونے والے ان مشاعروں کا بائیکاٹ کریں۔ یہی پیسہ اردو کے فروغ کے لیے صرف کریں اور مرکزی اور ریاستی بجٹ کا صحیح استعمال کروائیں۔ جہاں جائز اور ضروری ہو وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی مانگ کریں۔ ویسے دہلی، بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان تو ہے لیکن عمل میں سستی اور کاہلی پائی جاتی ہے۔ اور آندھرا پردیش کے کچھ علاقوں میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے عمل اطمینان بخش ہے۔ جب تین ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل سکتا ہے تو دوسری ریاستوں میں یہ درجہ کیوں نہیں مل سکتا۔ یوپی، ایم پی، اور راجستھان میں تو یہ کام فوراً ہونا چاہیے بلکہ اس سے پہلے تو مہاراشٹر مستحق ہے مراٹھی کے بعد یہاں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو سب سے زیادہ بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے۔ اس کے لیے کوشش کی جائے تو یقیناً کامیابی مل سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اردو تہذیب کی ایک فضا بن جائے اور یہی فضا ملک اور قوم کے لیے بہتر ہو سکتی ہے اور غیر ممالک میں ہماری شان اور ہمارا مان بڑھا سکتی ہے۔

☆ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے اردو کی غیر ممالک میں مقبولیت کی بات کہی۔ اسی سے جڑی ہوئی بات میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جو آج کل غیر ممالک میں اردو کی نئی بستیوں کی پبلسٹی ہو رہی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیلال ہے؟

آپ نے اپنے سوال میں لفظ پبلسٹی کا جو استعمال کیا ہے وہ معنی خیز ہے۔ یہ سچ ہے کہ بہت پبلسٹی ہو رہی ہے کچھ رسائل اور کچھ شخصیتیں وہاں کے کارناموں کے گن بھی گا رہے ہیں۔ یہ کچھ حد تک سچائی ضرور ہے لیکن ہمیں زیادہ خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کیونکہ یہ پیسوں کا کھیل بھی ہے جو تماشے کروا رہا ہے۔ اس سے نہ کسی مستحق ادیب وشاعر کا فائدہ ہو رہا ہے اور نہ ہی اردو کا کچھ بھلا ہو رہا ہے۔ کچھ ہندوستانی اور کچھ پاکستانی ادیب وشاعر جو وہاں جا کر بس گئے ہیں اُن کے پاس کچھ دولت آ گئی ہے۔ جس کے بل پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اردو میں ضرور ہو رہا ہے اردو کے لیے نہیں ہو رہا ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ اردو کو ذریعہ اکر یا صاف لفظوں میں یہ کہ اردو کو استعمال کر کے شہرتیں اور عزتیں حاصل کی جا رہی ہیں۔ ایسا ہے رفیق صاحب! کہ صرف پبلسٹی کے دم پر نہ شخصیتیں بنتی ہیں اور نہ ہی شاعری۔ نہ ہی تنقید اور افسانہ نگاری مستحکم اور معیاری قرار پاتی ہے۔ سارا منظر نامہ آپ کے سامنے ہے۔ دیکھئے سمجھئے اور انتظار کیجئے کیونکہ وقت سب سے بڑا منصف ہے۔ اب رہی بات غیر ممالک میں اردو کی بستیوں کی تو میں یہ کہتا ہوں کہ پہلے آپ ہمارے ملک کی پرانی اردو بستیوں کو آباد کرنے کی فکر کیجئے۔ سوچئے کہ اردو جہاں پیدا ہوئی وہاں اردو کا حال کیا ہے؟ اردو والے ہی اردو کے دشمن کیوں ہیں؟ اصل میں ہمارے قومی لیڈران اور اردو اخبارات اور رسائل کے مدیران کو خود غرضی، خود پرستی اور خودنمائی کو بالائے طاق رکھ کر متحد ہو کر کام کرنا ہوگا۔ یہ نہیں کریں گے تو نقصان ہوگا اور یاد رکھئے اردو کا نقصان ملک کا نقصان ہے، قوم کا نقصان ہے۔

☆ آپ نے بہت اچھے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اردو کے سلسلے میں بہت ساری باتیں ہو چکیں۔ اب ذرا باتوں کا رُخ موڑیں۔

◀ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔

☆ یہ بتائیں کہ 'اسباق' کی وجہ سے بحیثیت شاعر آپ مشہور ہیں یا آپ کے شاعر ہونے کی وجہ سے 'اسباق' کو شہرت ملی؟

◀ ''اسباق'' تو بعد کی چیز ہے۔ ''اسباق'' نکلنے سے بہت پہلے ہی بحیثیت شاعر میں مشہور ہو گیا تھا۔

☆ اردو میں آپ بہت شہرت رکھتے ہیں۔ حوالوں اور مثالوں میں بھی آپ کا نام آنے لگا ہے۔ کہیں میں نے پڑھا ہے کہ اُردو ماہیا کا پہلا مجموعہ آپ کا ہی پاکستان میں چھپا ہے تو میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا آپ دوسری اصنافِ سخن سے زیادہ اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار کے لیے ماہیا کو اہمیت دیتے ہیں؟

◀ نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ میرا مزاج شاعرانہ ہے۔ کوئی خیال جب ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وہ شاعری کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے بے چین ہوتا ہے تو وہ خود ہی کسی بھی صنفِ سخن میں ڈھل جاتا ہے۔ ویسے غزل میری پسند ہے نظم میری عادت ہے اور ماہیا میرا شوق اور مزاج ہے۔ فطری تقاضوں اور نفسیاتی اپچ نے مجھے افسانہ، ڈرامہ اور نثر کی دیگر اصناف سے بھی جوڑ دیا ہے۔ کم ہی سہی میں نثر میں بھی طبع آزمائی کرتا رہتا ہوں۔ تنقید اور تبصرہ میرے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ اس لیے اس سے بچتا ہوں۔ ہاں تحقیق سے مجھے دلچسپی ہے۔ تحقیق کی پیچیدگیوں، مشکلوں اور تلاش و تجسس سے میں لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اُردو ماہیوں پر کچھ برسوں تک میں نے بہت کام کیا ہے۔ بے شمار ماہیے کئی طرح کے موضوعات پر کہے ہیں جو رسائل میں چھپے بھی ہیں اور ہندوستان میں میں نے ماہیا نگاری کی مہم بھی چلائی ہے۔ میری تحریک پر اچھے شاعروں نے بہت اچھے ماہیے بھی لکھے ہیں۔ ''اسباق'' کے اوراق تو آج بھی ماہیا کے لیے وقف ہیں شاید میری اس دلچسپی کی وجہ سے ماہیا نگاری کی دنیا میں میری شہرت ہو گئی ہے۔ یہ خدا کا شکر ہے۔

☆ آج جو شاعری ہو رہی ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

◀ جی ہاں بالکل مطمئن ہوں۔ شعری تخلیقی سفر پر ایک کارواں چل پڑا ہے۔ آج جتنی اور جتنی اچھی شاعری ہو رہی ہے اتنی نہ ترقی پسندی کے دور میں ہوئی تھی اور نہ جدیدیت کے دور میں، تجربات، نیا پن اور ڈکشن آج بہت ہی تازہ ہے۔ عوام اور خواص کے لیے بہترین مواد موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ چونکہ شاعری زیادہ ہو رہی ہے اس لیے اچھائیاں کچھ دبی دبی سی ہیں، انھیں اُبھارنے اور سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے میں اپنی بساط بھر کوشش تو ضرور کرتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آج کی شاعری کی خوبیاں اور اچھائیاں اہلِ ذوق حضرات کے سامنے آئیں۔

☆ آپ کا تعلق راجستھان کی سرزمین سے ہے اور آپ پونہ میں رہتے ہیں کیا آپ کو پونہ راس آ گیا۔؟

◀ جی ہاں! آج سے تقریباً چالیس برس پہلے میں یہاں آیا تھا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پونہ نے مجھے میری قابلیت اور حیثیت سے زیادہ دیا ہے۔ شہرت، عزت، گھر اور عزت کے ساتھ گذارے کے لائق پیسہ۔ میں اس زمین کو یہاں کے ماحول کو یہاں کے لوگوں کو سلام کرتا ہوں اور پونہ کو میں وطنِ ثانی سمجھتا ہوں۔ (۵)

اس انٹرویو سے نذیؔر کے صحافتی نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے اور ان کے منصوبوں کو سمجھنے میں بھی مدد حاصل ہوتی ہے۔ ساتھ ہی نذیؔر ان تکالیف کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہیں اس صحافتی سفر میں پیش آتی رہی ہیں۔ جس کے متعلق جناب ایم۔ یوسف ندیم فرماتے ہیں۔

''وہ (نذیرؔ) اُردو کا بے لوث خادم اور صحافی بھی ہے۔ماہنامہ ''اسباق'' پونہ کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اُردو کی بقاء اور ترقی کے لیے ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔اس کا حوصلہ قابل ستائش ہے کہ ناقدری اور بے حسی کے سمندر میں ''اسباق'' کی کشتی کو پہاڑوں کی اونچائی تک اُٹھنے والی موجوں کی زد سے بچا بچا کر آگے کی طرف کھیتا چلا جا رہا ہے۔''(۶)

اس تحریر میں نذیرؔ کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔لیکن ندیم صاحب لکھتے وقت شاید یہ بھول گئے کہ ''اسباق'' ماہنامہ نہیں سہ ماہی رسالہ ہے۔

نذیرؔ کی اسباق سے اس بے انتہائی محبت کو سلطانہ مہر اپنے ایک مضمون ''آئینۂ سخن......نذیرؔ فتح پوری'' میں ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں۔

''خدائے برتر پر نذیرؔ فتح پوری کا سچا یقین اور کھرے اعتماد نے ہی نذیرؔ کو وہ طاقت بخشی کہ انہوں نے پونہ جیسے شہر کی مٹّی میں ایک ادبی جریدے ''اسباق'' کی اشاعت کا بیج بویا، غالباً ربع صدی گذرنے کو ہوگئی کہ نذیرؔ بھائی کی محبت کا یہ چھوٹا سا بیج پہلے پودا بنا اور اب ایک جواں تناور شجرِ سایہ دار نظر آ رہا ہے۔اب صحیح معنوں میں نذیرؔ فتح پوری کا کوئی دلبر دوست ہے تو وہ ''اسباق' ہے جوان کی طاقت و توانائی بھی ہے، جوان کی مسکراہٹ، ہنسی اور قہقہہ بھی ہے اور جوان کا پیار، محبت اور عشق بھی۔''(۷)

قاضی مشتاق احمد اسباق کے لیے نذیرؔ کی دلی محبت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''اسباق'' اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور سب سے بڑی طاقت، ''اسباق'' نے اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے لگائے تھے لیکن نذیرؔ نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا، وہ ریگستان کے دیش سے آیا ہے اور جانتا ہے کہ ریگستان میں گلاب کا پودا لگانا اور پھر اس سے پھول آنے کی امید کرنا فضول ہے۔لیکن وہ ''اسباق'' کے لیے اپنا خون اور پسینہ بہاتا رہا۔خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر اس نے اپنا قلمی سفر بھی جاری رکھا ہے۔''(۸)

''اسباق'' کی اہمیت افادیت اور اہم گوشے''

'اسباق' کے ذریعہ نذیرؔ ۳۵ سالوں سے ایک سچے مجاہد کی مانند میدانِ صحافت میں ڈٹے ہوئے ہیں۔اور اردو زبان و ادب کی خدمت میں سرگرم ہیں۔اور اپنی اسی محنت و لگن کے باعث وہ ادبی صحافت میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ چند خاص خوبیاں ہیں جنھوں نے اسباق کو خاص مقام عطا کیا ہے۔جن میں سب سے خاص خوبی یہ ہے کہ اپنے اس طویل اشاعتی سفر میں وہ کسی تحریک، شخصیت، نظریے یا کسی خاص پالیسی کا حمایتی نہیں رہا ہے۔اس کا طریقہ کار ہمیشہ آزادانہ رہا ہے، اس کے قارئین بھلے ہی کثیر التعداد میں نہ ہوں لیکن ہیں ضرور، نذیرؔ نے قارئین کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے کبھی بھی بیجا طریقوں کا استعمال نہیں کیا۔وہ اپنے چند خاص معاونین و قارئین کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن ہیں۔اسباق کی اشاعت میں پوری پابندی برتی جاتی ہے پھر بھی کبھی کبھی تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔نذیرؔ کے ذاتی اخراجات سے یہ رسالہ اشاعت کی منازل طے کرتا ہے۔کبھی کبھی مہاراشٹر اردو اکیڈمی اور قومی کونسل سے تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔ابتدا میں اسے حکیم رازیؔ ادیبی کی سرپرستی حاصل ہوئی، اس کے بعد چند عرصے تک علامہ کالی داس گپتا رضا، اور پروفیسر گوپی چند نارنگ اس کے سرپرست ہوئے دور حاضر میں منور پیر بھائی (چیرمین غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ) اس کے سرپرست ہیں۔اور نذیرؔ ان کے دل سے شکر گزار ہیں۔

اسباق کے گوشے اور نمبر اپنے آپ میں اہمیت کے حامل ہیں اس کے ذریعہ نذیرؔ نے نہ صرف مشہور و معروف شعراء و ادباء پر گوشے شائع کیے ہیں بلکہ ان شعراء و ادباء کو بھی روشناس کروایا جن کا نام اور کام دونوں گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو گیا تھا۔ملک کی بہت سی لائبریریوں میں

اس کے ریکارڈ محفوظ کیے جاتے ہیں۔نذیؔر نے ادارہ اسباق کے تحت کئی ادبی محفلیں اور نشستیں بھی منعقد کروائی ہیں، پونہ اور بیرونِ پونہ کے شعراء وادباء کے لئے خیر مقدمی نشستیں بھی اسباق کے زیر اہتمام وجود میں آئیں ہیں۔اسباق کا نام نذیؔر کی ذاتی دلچسپی اور جی توڑ محنت کے سبب زندہ ہے۔پونہ میں ادارہ اسباق کے ذریعہ ادبی کام اشاعت پذیر ہو کر منظر عام پر آ رہے ہیں۔اس کا دفتر نذیؔر کے گھر میں ہی ہے۔

ہندوستان میں ماہیہ نگاری کو فروغ دینے اور اسے ادبی مقام دلانے میں اسباق کا اہم رول رہا ہے۔ ہندوستان کے مشہور ومقبول شاعروں کے ماہیے اسباق میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ادیبوں اور شاعروں کے فکروفن پر ’اسباق‘ کے گوشے اور نمبر

۱۔ شاعر اظہار مسرتؔ، جے پور راجستھان (گوشہ)

۲۔ افسانہ نگار وشاعر اُدے سرن ارمانؔ، مرادآباد (گوشہ)

۳۔ شاعر وادیب ڈاکٹر حنیف ترینؔ، سعودی عرب (گوشہ)

۴۔ شاعر وادیب اور مدیر حیدرؔ قریشی، جرمنی (گوشہ)

۵۔ شاعر نازؔ صحرائی، گڑگاؤں ہریانہ (گوشہ)

۶۔ ادیبؔ مالیگانوی، مہاراشٹر (نمبر)

۷۔ افسانہ نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی، پنجاب (گوشہ)

۸۔ جلیلؔ الہ آبادی۔اورنگ آباد (گوشہ)

۹۔ شاعر دلدارؔ ہاشمی۔پونہ (گوشہ)

۱۰۔ شاعر،ادیب اور مدیر کوثرؔ صدیقی، بھوپال (نمبر)

۱۱۔ شاعر،ادیب اور مدیر صلاح الدین نیرؔ، حیدرآباد (گوشہ)

۱۲۔ شاعر ومصوّر رشید اعجازؔ، پونہ (نمبر)

۱۳۔ شاعر ظہیرؔ غازی پوری، ہزاری باغ، بہار (نمبر)

۱۴۔ علامہ کالی داس گپتا رضاؔ ممبئی (نمبر)

۱۵۔ ادیب، نقاد، شاعر، مرتب، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔ بھاگل پور بہار (گوشہ)

۱۶۔ شاعر اور گیت نگار سوہن راہی، برطانیہ (نمبر)

۱۷۔ علامہ محویؔ صدیقی، بھوپال (نمبر)

۱۸۔ شاعر وادیب عابد ادیب، اُدے پور راجستھان (گوشہ)

۱۹۔ شاعر وادیب ڈاکٹر محبوب راہیؔ، اکولہ مہاراشٹر (گوشہ)

۲۰۔ حکیم رازیؔ ادیبی، پونہ (گوشہ)

۲۱۔ شانؔ بھارتی، دھنباد، جھارکھنڈ (گوشہ)

۲۲۔ ڈاکٹر آغاز بلڈانوی۔ محبّ الرحمٰن وفا۔ مہاراشٹر (گوشہ)

۲۳۔ کویت نمبر۔ میمونہ علی چوگلے، صابر عمر گالسولکر (نمبر)

۲۴۔ مضطر صدیقی۔ شاہد پٹھان۔ راجستھان (گوشہ)

۲۵۔ شبیر فرازؔ، خلیل تنویر راجستھان (گوشہ)

۲۶۔ سعید رحمانی، آنند لہر کٹک۔ کشمیر (گوشہ)

۲۷۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، سرفراز شاکر (گوشہ)

۲۸۔ مرحوم ماجد الباقری، پربھا ماتھر، ڈاکٹر غلام دستگیر شیخ، رونق افروز۔ (گوشہ)

۲۹۔ صادقہ نواب سحرؔ، پریتا واجپئی (گوشہ)

۳۰۔ محمد کلیم ضیاؔء (گوشہ)

۳۱۔ ڈاکٹر محسن جلگانوی، پرکاش فکری (گوشہ)

۳۲۔ اظہر جاوید، اشوک مزاؔج (گوشہ)

۳۳۔ مظہر سلیم، رفیق شاہین (گوشہ)

۳۴۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی، ڈاکٹر عقیلہ سیّد غوث (گوشہ)

۳۵۔ ضررو صفی، یٰسین احمد حیدآباد (گوشہ)

۳۶۔ ماں کے نام خاص نمبر ۴۰۰ صفحات (نمبر)

۳۷۔ اسلم عمادی۔ کویت (گوشہ)

۳۸۔ عباس خان۔ پاکستان (گوشہ)

۳۹۔ اشعر ملیح آبادی۔ شارق عدیل (گوشہ)

۴۰۔ محمد فیاض فاروقی۔ (گوشہ)

اُردو کی ہندوستانی بستیوں پر گوشے

۱۔ اکولہ (مہاراشٹر ۲۔ بیدر (کرناٹک)

اسباق کی ایک اہم پیشکش۔ جہان استاد داغؔ دہلوی۔ تحقیق و انتخاب کالی داس گپتا رضاؔ

اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام اب تک سیکڑوں کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

کچھ خاص خط مدیر اسباق ''نذیرؔ فتح پوری'' کے نام

ذیل میں کچھ خاص خطوط پیش کیے جا رہے ہیں۔ جو مدیر اسباق کے نام تحریر کیے گیے ہیں۔ یہ اردو ادب کی مقبول شخصیات ہیں جن کے

ساتھ نذیؔر کے گہرے مراسم رہے ہیں۔ان خطوط کی تحریر سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ یہ حضرات بھی نذیؔر کی شخصیت اور فن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔اس بات کا انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

(یہ خط اسباق، پونہ، اپریل تا دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں صفحہ نمبر ۹ پر شائع ہوا۔)

ایک خط...ستیہ پال آنند

مکرمی نذیؔر فتح پوری صاحب۔آداب!

اسباق کا شمارہ (جنوری، فروری، مارچ) سرفیس میل سے آج یعنی ستمبر ۴ کو چھ ماہ کی تاخیر سے پہنچا۔ مجھے ڈاک کی دروں کا علم ہے اور میں جانتا ہوں کہ رسالہ نکالنا اور پھر اسے ہوائی ڈاک سے اوورسیز بھیجنا دل گردے کا کام ہے۔ یہ آپ کی ہمت ہے کہ آپ خنداں پیشانی سے اس فرض کو نبھائے چلے جاتے ہیں......رسالے کے اندر رکھے ہوئے مکتوب میں آپ نے مجھے دعوت دی ہے کہ میں ہر شمارے کے لیے، مکتوب کی صورت میں ہی سہی کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔ حاضر ہوں......میں سرجری کے بعد ایک ماہ تک ہسپتال اور پھر نرسنگ ہوم میں رہا، بیوی کی رحلت کے بعد اکیلا رہتا ہوں اور چونکہ اٹھ کر چل نہیں سکتا اس لیے گھر واپس آنے میں کوئی تک نہیں تھی۔ نرسنگ ہوم میں مجھے خاطر خواہ طبی امداد ملی اور فزیوتھیراپی کے ابتدائی مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ نکل آیا۔ اب گھر آ گیا ہوں۔ ہفتے میں تین بار فزیوتھیراپسٹ گھر پر آ کر مجھے چلنے پھرنے کی تربیت ایسے ہی دیتا رہے گا جیسے ہم گھروں میں اپنے بچوں کو دیتے ہیں۔ ابھی خود ڈرائیو کرنے اور باہر نکلنے میں کچھ ہفتے لگیں گے۔

ڈاکٹر اے عبداللہ واشنگٹن میٹروپالیٹن ایریا کی جانی پہچانی ہستی ہیں۔ آج سے تیس برس پہلے انہوں نے اس علاقے میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور پھر سارے امریکہ تک اس کی شاخیں کھول کر اس کو پھیلا دیا۔ اب یہ ایک تناور درخت ہے اور فنڈ کی فراہمی کر کے اے ایم یو علی گڑھ کے غریب طلباء کو وظیفے بھی فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ میرے سب سے قریبی دوست ہیں۔ اس وقت وہی میرے گھر میں تشریف فرما ہیں اور کمپیوٹر پر میرے اس مکتوب کو لکھ رہے ہیں اور میں بول بول کر انہیں لکھوا رہا ہوں......کوئی پانچ برس پہلے ڈاکٹر عبد اللہ، جو خود ایک دانشور محقق ہیں، مجھے فرمانے لگے کہ آپ کی شاعری میں گذشتہ دس برسوں سے موت کے موضوع سے خطرناک حد تک دلچسپی در آئی ہے۔ یہ کسی آفت ناگہانی کی پیش آگاہی تو نہیں؟۔ خیر، بات آئی گئی ہوگئی، لیکن کچھ دنوں میں ہی وہ ایک مضمون لکھ کر لائے جس کا عنوان تھا ''ستیہ پال آنند کی مرگ پیش آگاہی کی نظمیں'' اس میں میری ایک درجن کے قریب نظمیں زیر بحث لائی گئی تھیں، یہ مضمون پہلے لاہور کے ایک ادبی مجلّے میں شامل اشاعت ہوا اور پھر ڈاکٹر عبداللہ کی ترتیب دی ہوئی کتاب ''ستیہ پال آنند کی نظم گاری'' میں بھی شامل کیا گیا۔ یہ کتاب دو برس پہلے نند کشور وکرم صاحب نے دہلی سے شائع کی ہے۔

موت کا موضوع شاعروں کی پسندیدہ اوقات گذاری ہے۔ اردو میں تو خصوصاً خود ترحمی کا شکار غزل گو شاعر اس موضوع کے ابجد میں الف سے چلتا ہوا یائے معروف یا یائے مجہول تک چلتا جاتا ہے تا آنکہ وہ فاؔنی بدایونی کا ہم پلہ نہ ہو جائے۔ صنفِ نظم کی حالت قدرے مختلف ہے۔ اس میں شاعر ذہن، ادراک، شعور کی تہہ در تہہ پرتیں کھولتا چلا جاتا ہے اور نفسِ مضمون یا متن میں جذبات کی رہ کی کارکردگی کو دبائے رکھتا ہے۔ خود ترحمی سے علاقہ صرف اس حد تک رہتا ہے جہاں تک شاعر بیمار جذباتی ہیجان سے قطع تعلق روا رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے جن نظموں کی نشان دہی کی ان میں سے کچھ ایسی تھیں جنہیں 'مرگ شناسائی' یا مرگ آشنائی کی نظمیں کہا جا سکتا ہے، یعنی میری موت کیسے ہوگی، میں کیسے مروں گا، موت مجھے کیسے دبوچے گی۔ یا جو مرگ کی دائمی خواہش یا خاموشی سے روح کے قفس عنصری سے پرواز کر جانے کی امید پر مبنی تھیں، کچھ نظمیں

اس بات کو لے کر چلتی تھیں کہ میری موت کے بعد کیا ہوگا؟ میں یہی رہوں گا جو کہ اب ہوں یا کسی دوسری طبیعی یا غیر طبیعی حالت میں تبدیل ہو جاؤں گا۔تیسری قسم ان نظموں کی تھی جن میں خالق عالم سے تخاطب تھا، یا سزا اور جزا کے تصور پر بحث مباحثے میں اللہ کو شریک گفتگو کیا گیا تھا۔ چوتھی قسم کی نظمیں وہ تھیں جن میں نظم کا تخلیق کار خود کو صرف ایک انسان نہ سمجھ کر ایک شاعر کے طور پر دیکھتا ہے اور خود کو کسی ولی سے کم نہیں سمجھتا اور اس لحاظ سے موت کو زندگی کا وقفہ سمجھ کر اس پر بحث کرتا ہے۔ بمصداق (موت اک ماندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر)......(اک اور دریا کا سامنا تھا منیؔر مجھ کو جو ایک دریا کے پار پہنچا تو میں نے دیکھا۔)......(من چو سبزہ بار ہا روئیدہ ایم) وغیرہم۔

میری شاعری کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال ہے۔ میں یقیناً اس دوران میں موت کے بارے میں مختلف اور متضاد مفروضوں سے نبرد آزما رہا ہوں۔ زندگی کی شروعات کیا کسی فرد کا ملکِ عدم میں شب بسری کے بعد دن کے اجالے کے سفر کا نام ہے۔ یا اس سے برعکس زندگی ایک رات ہے اور عدم کی گھڑی آتے ہی ایک نئی صبح کا طلوع ہوگا۔ غالبؔ کے ہاں استعاروں کی مدوریت اور ملفوفیت کا عنکبوتی جالا اس قدر الجھا ہوا ہے کہ باصری پیکر تراشی صاف صاف نظر نہیں آتی۔ میرؔ کے ہاں لہجے کی سادگی سے وہی بات آسانی سے کہہ دینے کا ہنر موجود ہے۔ غالب اگر آسان زبان استعمال بھی کرتے ہیں تو صرف اتنا کہہ کر ان کی تسلی ہو جاتی ہے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہ شعر بیانیہ کی بہترین (یا بدترین) مثال ہے۔ اس میں کوئی استعارہ نہیں ہے۔ صرف ''قید و بند'' اور ''حیات و موت'' کو ایک ساتھ پرو کر ان کی درجہ بندی کر دی گئی ہے۔ کنایے کے طور پر دوسرے مصرعے کا استفہامیہ ہونا اس بات پر دال ہے کہ غم اور حیات لازم و ملزوم ہیں، اور اس سے صرف موت ہی نجات دلا سکتی ہے۔ میرؔ کا یہ شعر باصری پیکر تراشی کا بہترین نمونہ ہونے کے علاوہ اس بات پر دال ہے کہ زندگی شب تگ و دو ہے۔ موت صبح سکون و استراحت ہے۔ باصری تمثال ابھر کر سامنے آتی ہے۔ رو رو کاٹنا، آنکھیں موندنا، جاگنا، آرام کرنا......سب پہلو دیکھے بھالے ہوئے ہیں۔

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند   یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی، آرام کیا

ایک مجذوب شاعر کو لیں۔ سرمدؔ کو شہنشاہ اورنگ زیب نے قتل کروا دیا تھا۔ (اور اپنے موضوع سے ہٹ کر یہ عرض کروں کہ سرمدؔ نے کہا تھا۔ ''عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد۔ من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!'') اسی مجذوب شاعر نے زندگی کی آخری سانسوں یعنی نزع کی کیفیت اور موت کی آمد آمد کے درمیان لٹکے ہوئے اس لحۂ موجود کو جسے انگریزی میں Twilight Area Between Life and Death کہا جا سکتا ہے، اس طرح بیان کیا ہے۔

شوریست کہ در خوابِ عدم چشم کشودیم   دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ، غنودیم

(شاید میں درست شعر نہیں لکھوا پایا۔ بستر پر دراز ہوں اور اٹھ کر چیک کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ معافی!)

میں نے جو پندرہ کے قریب نظمیں اس موضوع پر پہلے خلق کی تھیں، ان میں وہ چھ نظمیں شامل نہیں تھیں جو میں نے اپنی بیوی کی رحلت کے بعد لکھی ہیں اور یہ نظمیں اپنا مضمون لکھتے ہوئے ڈاکٹر عبد اللہ کے زیرِ مطالعہ نہیں تھیں، ورنہ انہیں اپنے مضمون میں کچھ رد و بدل کرنا ضروری لگتا۔

موت کے ساتھ مکالمہ؟ کوئی شاعر سے پوچھے کہ یہ کیا تک ہوئی؟ پہلے تو یہ فرض کر لیا جائے کہ موت ایک personified entity ہے جو انسانی پیکر میں یا کسی دیگر طبیعی وجودِ آشکارہ میں آپ کے سامنے کھڑی ہے (آپ نے اسے مونث تو فرض کر ہی لیا، حالانکہ اس کا کوئی جواز

نہیں ہے،!) اور آپ اس کے ساتھ سوال و جواب کر رہے ہیں، اس مکتوب کے ساتھ منسلک نظم لکھنے سے پہلے یہ تکنیک میں نے کبھی استعمال نہیں کی اور اس لیے بھی نہیں کی کہ موت کا فرشتہ (مذکر) یا موت کی دیوی (مونث) دونوں مرنے والے سے بات چیت نہیں کرتے۔ لیکن کیا موت کسی ایسے شخص کو یہ چیلنج دے سکتی ہے کہ تم مجھ سے تو نہیں ڈرتے، مجھے علم ہے، لیکن کیا تم اپنے کسی عزیز کے مرنے پر بھی آنسو نہ بہانے کی قسم کھا سکتے ہو؟۔

اس نظم کا عنوان سوؔدا سے مستعار ہے۔ اس نظم کی آخری سطریں میؔر کے ایک شعر میں مربوط استعارے سے اخذ کی گئی ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو اسے شامل اشاعت کر سکتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی...الہ آباد۔۱۴ر ستمبر ۱۹۹۳ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم!

آپ کا تازہ مجموعہ ''تیسرا سفر'' نظر نواز ہوا۔ میں نے اسے بہت دلچسپی اور لطف کے ساتھ پڑھا۔ نظام صدیقی کے دیباچے کی لفاظی اور بے معنی عبارتوں کی یلغار نے البتہ بہت بدحظ کیا۔ آپ کو ان دیباچوں کی ضرورت نہیں۔ آپ کا کلام خود اپنا تعارف اور اپنی سند ہے۔

محفلِ عشرت سے تو اٹھوا دیا
دشتِ غربت سے بھی اُٹھوا دے مجھے

آنکھ کی پہنائی میں جھانک
پھر جو چاہے منظر دے

آسمانی عذابوں کو موت آ گئی
جب سروں سے دوپٹے ہٹائے گئے

سبحان اللہ! بس ذرا انتخاب میں تھوڑی سی سختی اور کرڈالتے تو کیا خوب ہوتا۔ اوپر کے تین شعروں جیسے شعر زیادہ ہونا تھے۔ ہیں تو بہت سے لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ ناجنس بھی ہیں۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ مجموعہ بہت کامیاب رہا۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

بہت دنوں سے اسباق نہیں دیکھا، کیا بات ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا...لاہور ۸/ر دسمبر ۲۰۰۲ء

محترمی نذیؔر فتح پوری صاحب......السلام علیکم!

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے، مٹھی بھر مایۂ کے متعدد نسخے ارسال کیے۔ میں نے ان میں سے ڈاکٹر انور سدید کو ان کا نسخہ پہنچا دیا اور باقی نسخے احباب میں تقسیم کر دیے ہیں، احباب نے آپ کی اس کاوش کو بے حد سراہا ہے اور آپ کو اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے، مبارکباد! میرے لیے آپ کی یہ کتاب ایک محبت بھرا تحفہ ہے۔ کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔ خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے ٹوٹ کر پیار کرنے والے دوست حاصل ہیں ورنہ نفسا نفسی کے اس عالم میں ہر شخص کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ آپ نے یہ کتاب لکھ کر جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا ہے اس کی میں دل و جان سے قدر کرتا ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

آپ کی غزل بھی مل گئی ہے۔مکرر شکریہ!

مخلص

وزیر آغا

رضا نقوی واہی..پٹنہ، ۷/ جولائی ۱۹۸۸ء

جناب نذیر فتح پوری صاحب......خوش رہئے!

یہ حقیقت ہے کہ آپ چند فنکاروں نے نئی شاعری کو جو آپ و تاب بخشی ہے اس سے اُردو کے وزن و وقار میں بلندی آئی ہے۔ ورنہ اس صدی کی چھٹی دہائی میں بے راہ روی، زبان کی شکست و ریخت اور ابلاغ و ترسیل کی بے معنویت نے کم از کم مجھ جیسے ۷۴ / برس کے بوڑھے کو تو حواس باختہ کر دیا تھا۔ جدید شاعروں کے ساتھ ساتھ جدید نقاد بھی لنگوٹ باندھے میدان میں اُتر آئے تھے جو جدید شاعری کو اپنی تحریروں کے لمبے لمبے بانسوں کے ذریعے آسمان پر چڑھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ جدیدیوں کے لشکر میں آپ جیسے فنکار بھی خال خال موجود تھے، جنہوں نے ساتویں دہائی تک آتے آتے شعری افق کی گھٹا ٹوپ تاریکی کو آہستہ آہستہ اُجالے میں تبدیل کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کا شاعر، عصری مسائل کا آئینہ دار بن گیا ہے۔

آپ کا کلام پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان سا ہو گیا ہے کہ اب ''برج بانو'' کی آبرو آپ جیسے ہوشمند حضرات کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گی

والسلام رضا نقوی واہی

بشیر بدر..بھوپال۔۲۶/ مارچ ۱۹۹۳ء

آپ کی غزلوں کا مجموعہ ''تیسرا سفر'' ملا۔ کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار دو چار اور نئے اور انوکھے شعر مل جاتے ہیں۔ آپ کی غزل میں وہ اکثر خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے غزل اپنے عہد میں اپنے بعد کے زمانے میں بھی زندہ رہتی ہے۔ آپ نے یہ مجموعہ بھیج کر کرم کیا ہے۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

نیاز مند

بشیر بدر

مجروح سلطان پوری..بمبئی، ۲۴/ اگست ۱۹۹۳ء

عزیز گرامی قدر نذیر فتح پوری صاحب!

کتاب کا تحفہ کسی تحفۂ سعادت سے کم نہیں، شکریہ، آپ کی شاعری نئے استعاروں کی تلاش ہے۔ اور آپ ابھی اسی میں منہمک ہیں اور ٹھیک بھی ہے۔ جب قلم اور لفظ پر گرفت مکمل ہو جائے تو معانی اور اس کے نئے نئے زاویوں کا مشاہدہ اور اس مشاہدے کے ذریعے ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح تعمیر کردار انسانی کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی نشاط پسندی تخریب میں بھی تعمیر کے آب و رنگ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش ایک مبارک عمل ہے۔ اللہم زد فزد!

اچھی اور کامیاب شاعری انھیں عناصر سے تخلیق ہوتی ہے۔ آپ جس کی جستجو میں ہیں منزل صاف نظر آ رہی ہے۔ اب رسائی زود یا بدیر آپ کی سعیٔ رفتار پر منحصر ہے۔ آپ اپنے سفر کا خاصا حصہ طے کر چکے ہیں۔ ''دیکھ لینا ایک دن میں مسکراؤں گا بہت'' پہلے مصرعے کو یہاں کالعدم

سمجھ رہا ہوں۔

مجروح سلطانپوری

ڈاکٹر اُدے سرن ارمانؔ..**بلہاری مراد آباد۔۶؍دسمبر ۱۹۸۰ء**

معزز محترم جناب نذیرؔ فتح پوری صاحب!

بعد عجز و اعزاز آداب قبول ہو۔امید کہ مزاج گرامی بہ خیر ہوگا۔آپ کے دونوں ناول مجھے خیریت کے ساتھ مل گئے۔اس وقت تک میں نے قریب قریب دونوں ناول پڑھ لیے ہیں۔'چٹانوں کے بیچ' جو آپ کا سب سے پہلا ناول ہے تھیم کے لحاظ سے بہت ہی اچھا ناول ہے۔آپ نے جو کچھ بھی لکھا ہے نہایت کامیابی کے ساتھ لکھا ہے۔شاعر نثّار کم ہوتے ہیں اور اچھے شاعر اچھے نثّار ہوں یہ بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔رب العالمین نے آپ کو یہ دونوں صفات عطا فرمائی ہیں۔ مجھے تو دونوں ناول بے حد پسند آئے ہیں۔ایسے معیاری اور اصلاحی ناول کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ایسے ناولوں پر فلمیں بنیں اور سرکار انعام سے نوازے تو دیش کی کایا پلٹ ہو جائے مگر افسوس ہمارے ملک میں قدرداں ہی نہیں ہیں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب سیاست کی ساحری سے متاثر ہو کر ہو رہا ہے ایسا نہ ہوتا تو ''گیتا نجلی'' کو ایک لاکھ کا نوبل پرائز بنگالی سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر انگلینڈ پہنچنے پر ملتا؟ بنگلا شاعر ٹیگور انگریزی دنیا میں پہنچ کر ''وِشوکوی'' بن گئے اور جب تک بنگالی دنیا میں رہے تب تک ہندوستان کے لوگوں کو بھی پتہ نہیں چلا کہ کوئی ٹیگور بھی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کے یہ دونوں ناول انگریزی میں بھی شائع ہونے چاہیں تب آپ کو پتہ چلے گا کہ گیٹے، تھامس ہارڈی، ٹالسٹائی، چیٹر فیلڈ اور شیکسپیئر کے آپ کتنے قریب پہنچ جائیں گے دونوں ناولوں کے لیے شکریہ!!

آپ کا بھائی

ڈاکٹر ادے سرن ارمانؔ

پروفیسر عنوان چشتی..**دہلی۔۷؍مئی ۱۹۸۷ء**

نذیرؔ فتح پوری اُردو کے اُن جیالے شاعروں میں شامل ہیں۔جنھوں نے زندگی کو برتا ہے اور اپنے وجود کا تجربہ کیا ہے۔انہوں نے اپنے داخلی کوائف اور جذبات کو خارجی علامتوں، پیکروں، اور لفظیات کے ذریعے مجسم کیا ہے۔اس عمل میں انھوں نے روایت سے روشنی اور تجربے سے تازگی حاصل کی ہے۔یہی خصوصیت نذیرؔ کو ان کے ہم عصروں میں اہم جگہ دیتی ہے۔

مخلص

پروفیسر عنوان چشتی

بلراج کومل..**دہلی،۲۳؍جنوری ۱۹۸۷ء**

برادرم،تسلیم

آپ کا خط ملا اور اس کے ساتھ آپ کا مجموعہ کلام 'لمحوں کا سفر' بھی یہ خوبصورت تحفہ بھجوانے کے لیے ممنون ہوں۔آپ کا کلام میں رسائل میں دیکھتا ہوں۔ایک ساتھ بہت سی چیزیں پڑھیں تو طبیعت سرشار ہوگئی۔آپ کے کلام میں ایک آزاد اور کھلی فضا کی کیفیات ہیں۔آپ منجمد اور مصنوعی سلاسل سے آزاد ہیں۔

خدا کرے آپ کا تخلیقی سفر آپ کے لیے ہمیشہ جمالیاتی مسرتوں کا سرچشمہ بنا رہے۔ میری دلی مبارکباد

وہ کہکشاں بدست مرے گھر جو آ گیا　　گھر کی ہر ایک چیز اُجالوں سے بھر گئی

آپ کے فکری تجسس، عصری احساس اور رزیز میں منکسر مزاجی نے آپ کے کلام کو حسن و وقار کی دولت عطا کی ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے ''اسباق'' کبھی کبھی ملتا ہے۔

بلراج کومل

فضا ابن فیضی...**مئوناتھ بھنجن ۷؍مارچ ۱۹۸۷ء**

برادر عزیز و مکرم......دعائیں!

آپ کے شعری مجموعے کا دلکش تحفہ ''لمحوں کا سفر'' ملا۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ مبارک ہو۔ سرورق کا یہ شعر دل کو چھو گیا۔

سب کو حیرت ہے کہ اک اُمّی لقب　　لفظ و معنی کا پیمبر بن گیا

ڈاکٹر عصمت جاوید، مظہر امام، مناظر عاشق، عتیق احمد عتیق اور ظہیر غازی پوری کی مشمولہ تقریظات، آپ کی شاعری کے خوبصورت امکانات کا اچھا اشاریہ ہیں۔ بلاشبہ تہذیبی تسلسل کے کہکشاں زار سے جگنوؤں کے شبستاں تک، نیم روشن دائروں کا ایک حسین سلسلہ ہے۔ جس سے ''لمحوں کا سفر'' عبارت ہے۔ اس طرح شوق اور توجہ سے کہتے رہیے۔ مشق و مزاولت کی گرمی سے اس رنگ میں اور چمک دمک پیدا ہوگی اور اسلوب نکھرتا جائے گا۔ آپ میرے محبّ مخلص جناب عتیق احمد عتیق کے شاگرد رشید ہیں۔ اس تعلق سے بھی آپ میرے دل سے قریب ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ اُردو کے ذہین قارئین آپ کے فنی اکتسابات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

فضا ابن فیضی

وارث علوی...**احمد آباد ۶؍فروری ۱۹۸۵ء**

محترمی نذیرؔ صاحب

آپ کا مجموعہ ''لمحوں کا سفر'' ملا۔ بہت بہت شکریہ! عدم فرصتی کے باعث ادھر ادھر سے ورق گردانی کرتا رہا لیکن جو کچھ کلام نظر سے گذرا وہ زیادہ یکسوئی سے مطالعہ کا مطالبہ کرتا رہا۔ جیسے جیسے پڑھتا گیا آتشِ شوق بڑھتی گئی۔ مجھے آپ کا رنگِ سخن مرغوب خاطر ہوا۔ آپ میں تخلیقی اُپج ہے اور اظہار بیان میں ایک نوع کی بے ساختگی ہے۔ مضمون آفرینی کا آپ میں خاص ملکہ ہے آپ میں شعر گوئی کا ملکہ قدرت کا عطیہ ہے۔ زیادہ فکر سخن اور اساتذہ کے گہرے مطالعے سے آپ کی سخن طرازی میں زیادہ عمق اور وسعت پیدا ہوگی۔ آپ سے توقعات وابستہ نہ کرنا کفران ہوگا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کالی داس گپتا رضاؔ سے آپ کے مراسم ہیں، وہ مجھے بہت عزیز ہیں۔ ہمارے درمیان یہ مشترکہ رابطہ بھی کچھ کم گراں مایہ نہیں۔ اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص

وارث علوی

رزّاق حمید...**ناسک ۱۷؍ستمبر ۱۹۸۶ء**

محترم نذیرؔ فتح پوری صاحب۔ سلام و نیاز

اُس وقت نہایت جلدی میں کچھ جملے گھسیٹ گیا تھا۔ فروگذاشت کے لیے معذرت طلب ہوں۔ 86-9-15 کو آ کاش وانی جلگاؤں سے ایک مختصر بزمِ سخن کی گئی تھی جس میں میں بھی شریک تھا۔ آغاز میں شبیر ہاشمی صاحب کا تبصرہ نشر ہوا جو ''لمحوں کا سفر'' اور ''لمحے لمحے کا کرب'' پر اظہارِ نقد تھا۔ تبصرہ بے لاگ اور جامع تھا۔ جیسا شبیر ہاشمی نے کہا ہے آپ واقعی سچے اور کھرے شاعر ہیں۔ ''لمحوں کا سفر'' میں نے بار بار پڑھی۔ میں تنقید نگاری سے ناواقف ہوں پھر بھی شعر کے جادو کا شکار ہونے کی حیثیت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ''تعارف' کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

جب بھی تنہا ہوتا ہوں　　کاغذ کالے کرتا ہوں
ہر موسم میں جلتا ہوں　　میں بھی سورج جیسا ہوں
دیپک جیسی فطرت ہے　　جلتا بجھتا رہتا ہوں
میں فطرت کی آنکھوں سے　　آنسو بن کر ٹپکا ہوں
پھولوں جیسی عادت ہے　　سب سے ہنس کر ملتا ہوں
زخموں سے ہے پیار مجھے　　رنگوں کا دلدادہ ہوں
خود سے بچھڑ کر آج نذیرؔ　　تجھ سے ملنے آیا ہوں

اور یہ اشعار تو ذہن میں محفوظ ہوکر رہ گئے۔

خود کو پتھر بنالیا ہم نے　　تیرے دل کا جواب ہیں ہم لوگ
تری نظر کا تجسس ہے معتبر پھر بھی　　مری بساط سے بڑھ کر مجھے تلاش نہ کر
دل میں آتا ہے کہ میں آئینہ بن جاؤں نذیرؔ　　اپنی صورت کے لیے کوئی ترستا ہوگا
مجھ کو نہ پڑھ کتاب کی مانند اے نذیرؔ　　میں حرف حرف تیری سمجھ میں نہ آؤں گا
اس کی ہمدردی بھی میرے حق میں زہریلی رہی　　اس کے چھونے سے مرا زخم اور گہرا ہوگیا
ہم نے تو معمورۂ دنیا سجانے کے لیے　　پتھروں سے زخم کھائے جذبۂ تعمیر میں
خود سے ملنے کی لگن جب تک نہ ہو　　توڑ سکتے ہی نہیں دیوار لوگ
ڈھونڈا کرے گا مجھ کو مرے بعد ہر کوئی　　آئندہ نسل کو یہ سزا دے کے جاؤں گا
تجھ سے دھنک مزاج کی ملتیں جو قربتیں　　میں سو طرح کے رنگ برابر سنبھالتا
دھیان سمتوں سے ہٹے راہ سے ہٹ جائے قدم　　آنکھ منظر میں اُلجھ جائے تو کیا کیا ہووے
تم بلاتے، ہر بلاشبہ کبھی آجاتا نذیرؔ　　چلچلاتی دھوپ میں سایہ نہ پانی دیکھتا
تھی جس کی آرزو وہ نہیں دی گئی مجھے　　میں آسماں طلب تھا زمیں دی گئی مجھے
جلتا ہے جو سورج کی طرح غیر کی خاطر　　کس شہر میں رہتا ہے وہ دیوانہ بتا چل
سوکھے ہوئے ہونٹوں کی طلب ہی سہی لیکن　　قطرے کو سمندر سے اُٹھا سوچ سمجھ کر
جس کو پتھر سمجھ رہے تھے لوگ　　چھو کے دیکھا تو وہ بشر نکلا
زور کچھ اپنے عزائم کا دکھا پانی پر　　ناؤ کاغذ کی سہی پھر بھی چلا پانی پر
اُس طرف سے پھول برسے تھے مگر　　اس طرف آئے تو پتھر ہو گئے

اور

سب کو حیرت ہے کہ اک امّی لقب
لفظ و معنی کا پیمبر بن گیا

باقی باتیں آئندہ ملاقات میں۔خدا حافظ،منتظر جواب

رزّاق حمید

مجروح سلطان پوری..بمبئی ۲۱ر اکتوبر ۱۹۹۴ء

نذؔیر فتح پوری صاحب مکرم

''اسباق'' چشم افروز ہوا۔شکریہ۔اپنے علم کے لیے جاننا چاہتا ہوں کہ یہ 'تخلیق' کے ہوتے 'تخلیقیت' علم صرف ونحو کے مصادر و حاصل مصدر کی کونسی قسم ہے۔تاویل سے 'تاویلیت'،تعمیل سے 'تعمیلیت' اور تقریر سے 'تقریریت' وعلیٰ ہٰذا القیاس تخلیق سے 'تخلیقیت' کی ضرورت کب اور کہاں پیش آتی ہیں۔کرم ہوگا اگر آگاہ کیا جاؤں کہ لاعلم ہوں۔واللہ باللہ!

یوسف ناظم..بمبئی

نذؔیر فتح پوری کہنہ مشق شاعر ہیں۔جذبہ اور خلوص ان کے کلام کی شناخت ہے۔اتنی خشوع وخضوع سے شعر کہتے ہیں کہ شعر بولنے لگتے ہیں وہ صاحبِ دل معلوم ہوتے ہیں ورنہ یہ نہ کہتے۔

دل کے آگے سارا جگ ڈھول برابر لگتا ہے

اسی دل سے وہ دعا مانگتے ہیں۔

خزاں گزیدہ ہوں صبر و قرار دے ربّی
مرے چمن کو متاعِ بہار دے ربّی

شاعر ایسی دعائیں مانگے گا تو اس کے اشعار کا بہار کا اشاریہ ہونا لازمی ہے۔نذؔیر فتح پوری کا کلام میری رائے میں بے حد سادہ ہے۔وہ کشیدہ کاری نہیں کرتے۔وہ جانتے ہیں کہ حسن سادہ کو گل بوٹے نہیں چاہیے۔وہ کہتے ہیں۔

جو بھی کارِ آگہی ہے شاعروں کا کام ہے
اب نہیں آنے کے دنیا میں پیمبر دیکھنا

میں نے کوشش کی کہ میں انھیں ان کے کلام سے جانوں کسی اور کے مشورے پر نہ چلوں یہ اس لحاظ سے اچھا ہوا کہ گھر بیٹھے شاعر سے ملاقات ہوگئی۔کسی ناظم مشاعرہ کی تفہیم کی ضرورت پیش نہیں آئی۔نذؔیر فتح پوری سے میں ملا بھی ہوں اور ان کے جذبے کی مہک اور آنکھوں کی چمک سے متاثر بھی ہوا ہوں۔پونے جیسے مقام پر اپنے ادبی ذوق کو پروان چڑھانا اور اسے باوقار بنانا چتوڑ کا قلعہ فتح کرنے سے کچھ کم کارنامہ نہیں ہے۔یہ کام انھوں نے اس لیے کرلیا کہ ان کے وطن کا نام ہی فتح پور ہے۔مختصر بحر میں انھیں موتی رولنا آتا ہے۔

تجھ تک اُڑ کر آجاؤں چاہ کے ایسے شہپر دے
کانٹے روند کے آیا ہوں اب تو پھول سا بستر دے
بے مسکن صدیاں بیتیں اب بنجاروں کو گھر دے

شاعر کا کام کہنا ہے سننے والا اپنے وقت پر ضرور سنے گا۔یہی آگہی شاعر کو زندہ رکھتی ہے اور وہ کہہ سکتا ہے۔

دونوں میں کیسا رشتہ تھا — میں ڈوبا تو وہ اُبھرا تھا
کھیتوں میں لاشیں بوئی تھیں — بستی بستی خوف اُگا تھا

صحافت میں اداریے کی اہمیت اور'اسباق' کی اداریہ نگاری

صحافت میں اداریہ رسالے اور اخبار کی روح کی حیثیت رکھتا ہے۔کیوں کہ جو مرتبہ جسم میں روح کو حاصل ہے رسالے یا اخبار میں بھی اداریہ کو وہی مقام حاصل ہے۔اس کے مطالعے سے ہی رسالے کا مقصد و رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔اس سلسلے میں جناب رفیق جعفر کا خیال ہے۔

''کسی بھی اخبار یا رسالے کا اداریہ بڑے غور سے پڑھا جاتا ہے۔کیونکہ اس سے مدیر کے مقصد اور نظریہ کا انکشاف ہوتا ہے۔
جس مدیر کے لکھے اداریے جاندار، بامقصد اور دلوں کو چھونے والے ہوتے ہیں وہ بحث یا بات چیت کا موضوع بھی بنتے ہیں اور قارئین کے لیے عمل کا پیغام بھی بنتے ہیں۔(۹)

رفیق جعفر کی یہ تحریر اس بات پر زور دیتی ہے کہ اداریہ کا صحافت میں خاص مقام ہے اور یہ مدیر کی سوچ کو بھی قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے، مدیر کی فہم وسمجھ کے بل بوتے پر ہی رسالے کا رجحان طے ہوتا ہے۔اداریے کے ذریعہ قارئین کو پیغام بھی دیا جا سکتا ہے اور اسی لیے مدیر کو اپنا اداریہ بہت ہی غور وفکر کے بعد سوچ سمجھ کر لکھنا چاہیے۔ایسا اداریہ جس میں وہ اپنے مرکزی خیال کو واضح طور پر پیش کر سکے۔حالانکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قارئین مدیر کی بات سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں۔لیکن پھر بھی مدیر کو اپنا کام بحسن وخوبی انجام دینا چاہیے۔مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اداریہ اکثر قارئین کے دل کی آواز ہوتا ہے اور حالات کا عکاس بھی۔ذیل میں ہم نذیؔر کے چند اداریے پیش کر رہے ہیں۔جن کے مطالعہ سے اداریہ نگار کی علمیت اور مطالعے کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

گفت باہمی

(۱)

نذیؔر فتح پوری

ادب میں جب تک تحریکیں زندہ رہیں ادب بھی رواں دواں رہا۔موضوع اگرچہ ایک ہی رہا لیکن اسلوبیات کے تنوع نے شاعری اور افسانے کی دنیا میں ایسے گہرے نقوش مرتب کیے کہ ان کے نشانات آج بھی روشن ہیں۔کچھ لوگ ترقی پسند ادب کو آج برا بھلا کہتے نہیں تھکتے لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ترقی پسندی کے زمانے میں جو ادب تخلیق ہوا اس کی بنیاد ہی پر آج کے صحت مند ادب کی عمارت پُرشکوہ انداز میں کھڑی نظر آتی ہے۔اس بنیاد سے اگر یہ پتھر ہٹا دیا جائے تو یہ عمارت اپنے آپ ہی مخدوش عمارتوں میں شمار ہونے لگ جائے گی۔

پہلی تحریک آنے والی دوسری تحریک کے لیے ہمیشہ بنیاد کا کام کرتی ہے۔عمارت پر عمارت تعمیر کرنے میں وہ دقت پیش نہیں آتی جو بنیادیں ڈھالنے میں آتی ہے۔زمیں میں اندر تک کھدائی کر کے کچی مٹی نکالنا اور مضبوط چٹانوں تک پہنچ کر بنیادیں ڈھالنے کا کام ترقی پسند تحریک نے کیا اسی پر جدیدیت کا منزلہ چڑھا دیا گیا۔اور یہ کوئی برائی یا شرم کی بات نہیں تھی۔مقصد اور مطمع نظر تو تعمیری ہی تھا کہ زبان وادب کا تحفظ کیا جائے۔سو ہوا۔مابعد جدید تحریک بھی اسی نظریہ کا حصہ ہے۔

اس سے پہلے جنگ آزادی کو بھی ہم ایک تحریک ہی کے طور پر لیں تو ان تحریکوں نے تخلیقِ ادب کے سلسلے کو جو توانائی اور نیا خون دیا ہے اسی کے جلوے آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔آج ادب میں کوئی تحریک موجود نہیں ہے۔تیزی سے تغیر پذیر ہوتے ہوئے دنیا کے حالات کی پارہ

صفتی ساکت وجامد ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ امریکہ کی جارحیت نے دنیا کو تباہی کے جس دہانے پر پہنچا دیا ہے اور ایک کے بعد ایک مسلم ملکوں کو منصوبہ بند طریقہ سے پامال کیا جارہا ہے اسے تحریک کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ عالمی دہشت گردی بھی موضوعِ تخلیق ہوسکتی ہے۔ آج دہشت گردی کا صرف ایک ہی چہرا اسامہ بن لادن کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے پیچھے کتنے رنگ اور کتنے بھیانک صورتوں والے چہرے موجود ہیں۔ اس کا تصور کر کے ہی روح کانپ جاتی ہے۔ کہیں حضرت محمدؐ کے کارٹون بنا کر، کہیں قرآن سوزی کا باقاعدہ اعلان کر کے، کہیں بابری مسجد کو منصوبہ بند طریقے سے پامال کر کے، غزہ پر حملے کر کے، فلسطین کے گرد حصار بنا کر، گجرات جیسے بھیانک فسادات برپا کروا کے اور اب ایران کو دھمکیوں پر دھمکیاں دے کر خاموش بیٹھنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ یہ تمام حادثات وسانحات انفرادی طور پر تخلیق سخن کا حصہ ضرور بنے ہیں لیکن ان کے پس پردہ کوئی تحریک وجود میں نہیں آئی۔ کیوں کہ یہ سارے سانحات بڑی طاقتوں کے منفعت پسند نظریات کی دین ہیں۔ اس لیے ان کے خلاف تحریک جاری رکھنے کے لیے کسی بڑی طاقت کی پشت پناہی نہیں مل سکتی اور اس طرح ادب پر مسلط جس جمود کے لیے واویلہ مچایا جارہا ہے وہ ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ حالانکہ ادب آج بھی زندہ ہے۔ محترک ہے ترقی پذیر ہے، اپنے اپنے طور پر ہر لکھاری، اپنے اطراف اور دنیا کے حالات پر کچھ نہ کچھ لکھ رہا ہے، لیکن کسی پلیٹ فارم سے محروم ہونے کی وجہ سے اس کے نظریات وتفکرات کی خاطر خواہ ترسیل نہیں ہو پا رہی ہے۔

گذشتہ کچھ برسوں میں ''اسلامی ادب'' کی گونج بھی سنائی دی، اسے تحریک کے طور پر متعارف کرانے کی کوشش کی گئی۔ اس موضوع پر سیمینار اور سمپوزیم بھی منعقد کئے گیے۔ لیکن اپنے دلوں میں مذہب بیزاری کا جذبہ رکھنے والوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اس کی گونج کو صدا بہ صحرا ثابت کرنے کے لیے میدانِ کارزار میں کود پڑے۔ کچھ نے اسے ''عقبی دروازے سے نقب زنی کر کے گھس آنے والی تحریک کا نام دیا اس پر تنقید وتبصرے بھی ہوئے جوابات بھی دیئے گیے۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نظریہ قائم نہ ہوسکا۔

کچھ اہل قلم جو داڑھیوں، ٹوپیوں اور چوٹیوں پر استہزاء آمیز ریمارکس پاس کرتے نہیں تھکتے۔ انہوں نے صوفی سنتوں جیسی کوئی بات چلانے کی کوشش کی لیکن یہ سکہ بھی وقت کے بازار میں کھوٹا ثابت ہوا۔

جہاں تک ادبی رسائل کی تحریکوں کا سوال ہے کچھ رسالے تو گوشوں اور نمبروں کی نذر ہوگئے۔ کچھ رسائل کے مدیران نے اپنے اپنے طور پر نظریہ سازی کی کوشش کی مگر ان کا دائرہ کار انہیں لوگوں تک ہی محدود رہا جو ان کے رسالوں میں چھپنے کی تمنا دل میں رکھتے ہیں۔ وہی تمام ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ ایک مدیر نے تو آج کے ادب کو کوڑے کا ڈھیر لکھ دیا۔ گویا ہم سب بالخصوص اردو میں لکھنے والے ایسے موتی ہیں جو دھاگے سے محروم ہیں۔ اور الگ الگ سمتوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن اپنی چمک دمک کے ساتھ۔ کیا ان موتیوں کو ہار بنانے کے لیے کسی بڑی تحریک کی ضرورت ہے۔

ادب میں گوشہ اور خواتین کے لیے پردہ بہت ضروری ہے۔ پردے میں رہ کر ایک خاتون اپنی عفت کو جس طرح محفوظ تصور کرتی ہے۔ اسی طرح ادب میں کسی تخلیقی قلمکار کے فکر وفن پر گوشہ چھپ جانے سے وہ بھی اپنے اندر ایک طمانیت اور آسودگی محسوس کرتا ہے۔ اسباق کے گوشے تجارتی گوشے نہیں ہیں۔ ہم ذاتی طور پر انہیں ادبی معیار اور علمی وقار عطا کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر، رنگ اور انتساب جیسے رسالوں میں گوشہ گذار ہونے کے باوجود بعض فنکار اسباق کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ دیپک بدکی، خلیل تنویر اس کی تازہ مثالیں ہیں۔

لاہور پاکستان میں مقیم رسالہ تخلیق کے خالق ومالک تغزل آمیز شعری شعور کے حامل سیاسی اور صحافتی تحریروں میں مشاق، پنجابی کہانیوں

کے کامیاب کہانی کار، درد دل میں گرفتار، شدتِ جذبات سے مغلوب ہونے والے انسان، مضبوط قوتِ ارادی کے مالک، خدمتِ ادب کی خانقاہ کے سالک، کشادہ ذہن، وسیع القلب، کامیاب صحافی، کامیاب شاعر، کامیاب افسانہ نگار اور کامیاب مدیر، ہندوستان، پاکستان اور اردو کی تیسری بستی میں جن کے والہ وشیدا احباب کا ایک جم غفیر سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ نام اظہر جاوید، کام بہت سے، بالخصوص خلوص کی ندیاں بہانا، خود اس میں غوطہ لگانا اور دوسروں کو پار اتار دینا، یہ سخاوت، یہ ذکاوت، یہ عنایت، یہ لطافت، جس کی شخصیت کے روشن پہلو شمار کیے جاتے ہیں۔ ہم اسباق کے چند صفحات ان کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں شائع کر کے اپنے آپ کو سرخ رو محسوس کر رہے ہیں۔ ہمارے کرم فرما محترم کے ایل نارنگ ساقی نے اس وقیع اور ادبی طور پر حقیقت سے لبریز گوشے کی ترتیب کی زحمت اٹھائی۔ اظہر جاوید اور کے ایل نارنگ ساقی کی باہم دوستی ایک سکے کے دو پہلو کی طرح ہے۔ جاوید اور ساقی کس کے دوست نہیں ہیں؟ یہ موضوع تحقیق طلب ہے۔

ہماری یہ تحریر خالص ادارتی نوٹ نہیں ہے اس میں ہماری محبت اور صداقت کی روشنائی بھی تحلیل ہو چکی ہے۔ ایک تخلیق کار کا درد ایک تخلیق کار ہی جانتا ہے۔ اسی طرح ایک مدیر کا درد بھی دوسرا مدیر ہی بہتر طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اظہر جاوید کی طرح ہم نے بھی تخلیق اور تدوین دونوں میدانوں میں اپنی بساط بھر کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ؎

تھا نذیر احمد پذیرائی کا یہ انداز خوب ناؤ بھر کر شعر لکھے داد پائی بوند بھر

جس طرح اظہر جاوید عمر میں ہم سے ۸رسال بڑے ہیں اسی طرح ان کا رسالہ تخلیق بھی اسباق سے عمر میں ۱۱رسال بڑا ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے بڑا بناتا ہے۔ بزرگی ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ یہ بلند رتبہ خدا جس کے مقدر میں لکھتا ہے اسی کو ملتا ہے، حاسدوں کی اپنی دنیا ہے اسی دنیا میں ان کا سکہ چلتا ہے۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ حاسدوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ بلکہ حاسدوں کا سلوک ہمارے تخلیقی اور تعمیری جذبے کو مہمیز کرتا ہے۔ اور ہم نئے نئے جہانوں کی تلاش میں ایڑ لگاتے اور ستاروں سے آگے کے جہانوں کی سیر سے سرفراز ہوتے رہتے ہیں۔

ہم اشوک مزاج جیسے فکری شاعر کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ جو اپنا مزاج ہمیشہ بہ خیر رکھتے ہیں۔ لیکن اپنی غزلوں کے خوبصورت اشعار سے حالات و ماحول کا مزاج متغیر کرتے رہتے ہیں، غزل جہاں جاتی ہے اپنی انفرادیت کے ساتھ ہی اپنے تخلیق کار کی افادیت بھی منوا لیتی ہے۔ ہم غزل کو ہمیشہ ایک باوفا صنف سخن تصور کرتے ہیں۔ جو اس سے پیار کرتا ہے یہ اس سے پورے تخلیقی شعور اور پُر خلوص جذبے کے ساتھ پیار کرتی ہے۔ آئیں دیکھیں اشوک مزاج کی غزلوں میں آپ کو یہ خلوص اور اپنائیت کس حد تک نظر آتی ہے۔ ایک مختصر گوشہ اشوک مزاج کے فکر و فن پر اسی شمارے میں ملاحظہ کریں۔

- ماں نمبر کی داد و تحسین کے پھول ابھی تک ہم پر نچھاور ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں چند مکتوبات اور رشید انصاری کا ایک تجزیاتی تبصرہ ہم نظر قارئین کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر مسعود جعفری۔ ڈاکٹر امام اعظم اور محمد اسلم غازی کے علاوہ روزنامہ انقلاب اور روزنامہ اردو ٹائمز کے مبصرین نے بھی ماں نمبر پر نہایت وقیع تبصرے شائع کرائے ہیں، مدیر اسباق کو بلڈانہ کی ایک ادبی تنظیم سحر غزل اکادمی نے ''ماں ادبی ایوارڈ'' سے سرفراز فرما کر ماں کے چاہنے والوں کے لیے داد و تحسین کا نیا در وا کیا ہے۔

اس بار ہماری آپس کی باتوں کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ دراصل کوئی سننے والا ہو تو کہنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ بات بنانے کے موقع تو اکثر آتے رہتے ہیں لیکن بات کرنے کا موقع بہت مشکل سے ہاتھ لگتا ہے۔ آج ہم نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

غزل کے بانکے اور سجیلے شاعر ہمارے دوست عبداللہ کمال کا گذشتہ دنوں ممبرا ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ زندگی میں اور شاعری میں وہ اپنی راہیں خود متعین کرتے تھے۔ جن فنکاروں نے سمجھوتوں کی بے ساکھیوں کی جانب ہمیشہ قہر آلود نظروں سے دیکھا عبداللہ کمال ان میں سے ایک تھے۔ آنجہانی کالی داس گپتا رضا سے وہ بہت قریب تھے۔ رضا صاحب کے دو شعری مجموعوں۔ ''غزل گلاب'' اور ''نظم سمندر'' کے انتخاب کی عبد اللہ کمال کو سعادت حاصل ہے۔ ہم رضا صاحب کے مضمون ''وحشی غزل کا نیا رِنگ ماسٹر'' کے ذریعہ عبداللہ کمال کو یاد کرتے ہیں۔ کہ اس سے بہتر کوئی خراجِ عقیدت مرحوم کے لیے نہیں ہوسکتا۔ (اسباق اپریل تا دسمبر ۲۰۱۰ء)

اداریہ

گفتِ باہمی

اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ

(۲)

نذیر فتح پوری

تقسیم ہند نے ایک ملک کے دو ٹکڑے کئے۔ قوموں کو بانٹ دیا۔ رشتوں کے حصہ بخرے کردیئے، تہذیبوں کی دھجیاں اڑادیں۔ پاکستان بننے کے بعد نقلِ مکانی کے وقت جو خونی حادثات رونما ہوئے وہ آج بھی انسانیت کی پیشانی پر بے گناہوں کے لہو سے ''پتھر کی لکیر'' کی مانند تحریر ہیں۔ ایسی لکیر جو گزرتے وقت کے ساتھ مزید گہری ہوتی جارہی ہے۔ آئے دن رونما ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اور سیاسی بیان بازیوں کے تضادات نے باہمی منافرت میں شدید اضافہ کیا ہے۔

دھرتی کے ہاتھ اپنے ہی خنجر سے کٹ گئے

دو بیٹے ایک ماں کے تھے آپس میں بٹ گئے

ظاہر ہے دو بیٹوں کی تقسیم پورے گھر آنگن کا نقشہ بگاڑ دیتی ہے۔ ایک چیز کے دو حصے کرکے آپس میں بانٹ لیا جاتا ہے، تقسیم ہند کے بعد سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا جو یہاں سے وہاں گئے وہ ۶۶ برسوں کے بعد بھی مہاجرت کی کرب ناک اذیت میں مبتلا ہیں۔ جنھوں نے تقسیم کے وقت ہندوستان کی مٹی میں اپنے پیروں کو گاڑے رکھا، آج ان کی جو حالت ہے وہ ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

اب آیئے اس زبان کی طرف جو تقسیم ہند سے قبل پورے ہندوستان کی سب سے محبوب زبان تھی۔ کیا ہندو کیا مسلم، کیا سکھ کیا عیسائی، تمام کا شمار اس کے پرستاروں میں ہوتا تھا۔ جو تہذیبوں کی پالی اور محبتوں کی محافظ تھی۔ جس کے بارے میں کبھی داغ نے کہا تھا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ

ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

بعد میں خوش فہمیوں کے متوالوں نے ثانی مصرعے کو تبدیل کردیا اور ''سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے'' کہہ کر اندر ہی اندر اپنی کامیابی کا جشن منانے لگے۔ لیکن اردو کی جو حالتِ زار ہے وہ ساری دنیا کے سامنے ہے، ۶۶ سال سے اردو کا مقدمہ مختلف صورتوں میں، مختلف اکابرین کی زبان سے حکومت کے ایوانوں میں پیش کیا جاتا رہا ہے، کچھ دنوں تک یہ بحث تازہ رہتی ہے پھر اسے سرد خانے کے حوالے کردیا جاتا ہے۔

بیتے سال کے آخری مہینے کے دوسرے عشرے میں راجیہ سبھا کے ایوان میں یہ نعرہ بلند ہوا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا کر اس کے تحفظ کے لیے راہ ہموار کی جائے اور اسے اس کا گم شدہ مقام از سرِ نو فراہم کیا جائے۔ اس آواز اٹھانے والی شخصیت کا نام چودھری منور سلیم ہے جو

مدھیہ پردیش سے سماج وادی پارٹی کے راجیہ سبھا کے رکن ہیں۔ یہ خبر انقلاب سے من وعن شائع کی جارہی ہے جس سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اگر اردو کو دوسری سرکاری زبان بنادیا جائے تو نہ صرف یہ کہ زبان کے حق میں یہ بات مفید ہوگی بلکہ ہندوستان کی نفرت بھری فضاؤں میں پھر ایک بار مہر ومحبت کے نغمے گونج اٹھیں گے اور معاشی طور پر بھی اردو والوں کو ملازمتیں میسر آئیں گی اور انہیں راحت کی سانس ملے گی۔

''نئی دہلی۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں کلیدی رول ادا کرنے والی اردو زبان کے ساتھ ناانصافیوں کے خلاف منگل کو راجیہ سبھا میں صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ مدھیہ پردیش سے سماجوادی پارٹی کے راجیہ سبھا کے رکن چودھری منور سلیم نے اُردو زبان کو ملک کے سرکاری کام کاج میں دوسری زبان کا درجہ دینے اور مرکزی سطح پر اسکولوں میں اس شیریں زبان کی تعلیم کا نظم کرنے کی مانگ کی۔ اُردو جو ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے کے تعلق سے انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اس کی ترقی کے لیے مرکزی کمیشن قائم ہو اور اس کے لئے علیحدہ بجٹ مختص کیا جائے۔ اہم بات یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں کئے گئے ان مطالبوں کا سماجوادی پارٹی کے علاوہ بی جے پی بی ایس پی کانگریس، ترنمول کانگریس سمیت زیادہ تر پارٹیوں کے اراکین نے خیر مقدم کیا۔ چودھری منور سلیم نے پارلیمنٹ کے جاری سرمائی اجلاس میں ضابطہ ۱۸۰ر کے تحت خصوصیت کے ساتھ اُردو کے حق میں آواز بلند کی۔ اپنا مطالبہ دلکش انداز میں پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''میں آج ایک ایسی زبان کا معاملہ ایوان میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کی پیدائش اسی سرزمین میں ہوئی وہ یہیں جوان ہوئی اور اب یہیں سسک سسک کر بھارت ماتا کے سپوتوں سے کہہ رہی ہے کہ میں اُردو ہوں، میں نے ہی انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیکر آزادی کے متوالوں میں جنون پیدا کیا تھا، میں نے ہی کہا تھا ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' میں نے ہی لکھا تھا کہ

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی
تخت لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی

میں ہی وہ اردو ہوں جس نے اپنی تحریروں سے مولانا آزاد کے اخبار الہلال اور جواہر لعل نہرو کے قومی آواز کے ذریعہ ملک کی آزادی کی اہمیت ملک کے عوام کو سمجھائی تھی۔ میں آپ کی وہ عوامی زبان اور بھائی چارے کی علامت ہوں جس نے کہا تھا کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''۔

اردو کو ایک مذہب کی زبان باور کرانے کی کوششوں کا جواب دیتے ہوئے چودھری سلیم نے کہا کہ ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو کسی مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ برج نارائن چکبست، دیاشنکر نسیم، نریش کمار شاد، منشی پریم چند اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی زبان ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مطالبہ کیا کہ ''اسی لیے اس زبان کی ترقی کے لئے میں حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس کو سرکاری کام کاج کی دوسری زبان کا درجہ دے۔ اردو کے فروغ کے لئے علیحدہ بجٹ مختص کیا جائے، اردو اخبارات کو سرکاری اشتہارات وغیرہ دینے کے تعلق سے حوصلہ افزا اقدام کئے جائیں اور اسکولوں میں اردو زبان کی تعلیم کے لئے مرکز کی جانب سے خصوصی نظم اور کوشش کی جائے۔'' راجیہ سبھا سے باہر نمائندہ انقلاب سے گفتگو کرتے ہوئے چودھری منور سلیم نے کہا کہ اردو کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے جس کے خلاف آواز بلند کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ (ممتاز عالم رضوی۔ روزنامہ انقلاب ممبئی) ۱۲ر دسمبر ۲۰۱۲ء

ڈاک کا نظام۔نظام قیامت

کسی نے کہا تھا۔ ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے

یہی حال آجکل محکمہ ڈاک کا ہوگیا ہے۔اسباق کا شمارہ (اپریل،مئی،جون ۲۰۱۲ء) کی ترسیل ہم نے وقت پر بہ حسن وخوبی انجام دیدی تھی۔دوسرے شہروں کی بات جانے دیں۔ہمارے مقامی ممبران کو بھی پرچہ ایک ماہ کے جان لیوا انتظار کے بعد موصول ہوا۔کئی ممبران کو دودوبار کاپیاں ارسال کرنے کے بعد بھی دستیاب نہیں ہو پارہی ہیں۔یہی حال ہمارے نام آنے والی ڈاک کا ہے۔سادہ ڈاک کے لیے تو ہماری آنکھیں ترس گئیں۔پنویل سے پونہ کا سفر بس کے ذریعہ تین گھنٹے کا ہے۔لیکن ظہیر انصاری کا رسالہ ماہنامہ ''تحریرنو'' کا اگست کا شمارہ ہمیں نومبر کی ۲۷ر تاریخ کو ملا۔اس کے بعد کے دو شمارے اور ماہنامہ ''بے باک'' کے ساتھ ہی ''رہنمائے تعلیم جدید'' کے شمارے آج تک موصول نہیں ہوئے۔کچھ M.O بھی غائب ہوئے جو مسلسل تکرار کے بعد ملے۔ایسا کیوں ہورہا ہے۔اس کے پیچھے کیا راز ہے۔کیا سبب ہے۔حد تو یہ ہے کہ ہمارے خاص خاص دوستوں کو ہماری ڈاک نہیں ملتی اور ان کی ڈاک ہم تک نہیں پہنچ پاتی۔ایک افراتفری کا عالم ہے۔کس کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے۔کس کے حضور التماس گذاریں۔یہاں فریاد وفغاں کے سارے راستے بند ہیں ''کوچہ قاتل کے سوا'' اس لیے ہم ''اسباق'' کے معاونین سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اس بے یقینی کے دور میں ہمارا ساتھ دیں۔ہم پر بھروسہ رکھیں۔یہ اردو کا کاز ہے۔ہم سبھی کو مل جل کر اسے کامیابی کے ساتھ پورا کرنا ہے۔

(اسباق جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء)

اداریہ گفت باہمی

قلم کی حُرمت

(۳)

نذیر فتح پوری

دنیا کی ہر زبان کا ادب اخلاقی اور غیر اخلاقی تحریروں کے راستوں سے ہو کر گزرتا ہے۔اردو میں بھی صورتِ حال مختلف نہیں ہے۔جہاں ایک طرف قصیدہ خوانی اور تملق پسندی کی عبارتیں ماضی کے اوراق کا حصہ بنی ہوئی ہیں وہاں ہجو گوئی بھی اپنے تمام تر تمسخر،استہزہ اور الزام تراشیوں کی عبارتوں کے ساتھ موجود ہے۔پہلے یہ رواج عام نہیں تھا لیکن تقسیم ملک سے دوتین دہائی قبل بالخصوص ہجو گوئی نے جو کردارکشی کا رخ اختیار کیا تھا وہ افسوس ناک تھا پہلے لوگ اپنے اصلی ناموں سے اپنے مخالفین پر تنقید کے کم اور تنقیص کے پتھر کثرت سے مارتے تھے۔آگے چل کر براہِ راست یلغار کی جسارت کم ہونے لگی اور نام بدل بدل کر مخالفین ایک دوسرے کے لیے دشنام طرازیاں کرنے لگے۔اس سلسلے میں سب سے زیادہ معتوب علامہ اقبال اور ان کے کلام کو ٹھہرایا گیا، چہرے پر چہرے لگا کر علامہ اقبال کی شخصیت کی کجی اور شاعری کی فنی غلطیوں کو نشان زد کیا جانے لگا۔حتیٰ کہ مولانا حسرت موہانی جیسے بے باک اور ہمہ تن سینہ سپر نظر آنے والے مجاہد قلم وگفتار نے بھی جب ''گلشن اقبال'' کی خوشہ چینی کے لیے کمر کسی تو مصنوعی نا کام کا سہارا لیا۔غالباً ''تنقید ہمدرد'' کے فرضی نام سے کئی مضامین لکھے جو علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو مسخ کرنے کے ارادے سے لکھے گئے تھے۔علامہ اقبال کی شاعری میں خامیاں تلاش کرنے کے لئے مختلف اہل قلم نے مختلف فرضی ناموں سے اقبال کے خلاف

لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ لوگوں نے اپنے اصلی ناموں کے ساتھ بھی اقبال سے معرکہ آرائی کرنے سے خوف نہیں کھایا ان میں ایک نام یاس یگانہ چنگیزی کا بھی ہے۔ لیکن علامہ سے ان کا ادبی منصب کوئی نہیں چھین سکا۔

ادبی تنقید بری چیز نہیں۔ کسی بھی فن پارے کو فن کی کسوٹی پر کس کر اس کے محاسن اور عیوب کو نمایاں کرنے میں کوئی برائی نہیں۔ ایماندارانہ تنقید آئینے کی مثال ہوتی ہے۔ جس سے فن کار اپنے فن کو نکھار سکتا ہے سنوار سکتا ہے۔ یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس سے ادب میں بیداری کا ثبوت ملتا ہے بس ذرا اس بات کا خیال رہے کہ ''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''

آیئے ہم محبتوں کی زبان لکھنے کی عادت ڈالیں۔ لفظوں کے پھول کھلائیں۔ خوشیوں کو ہم راز بنائیں۔ سسکتی انسانیت کے زخموں پر ہمدردی کا مرہم رکھیں۔ کیوں کہ ہم چلے جائیں گے، ہمارا لکھا رہ جائے گا۔ اور وہ دفتر ہمارے ساتھ جائے گا جو کرامن کاتبین تحریر کر رہے ہیں۔ حشر کے میدان میں ہمارے ایک ایک حرف کا حساب لیا جائے گا۔ قلم قرطاس کو گواہ بنا کر پیش کیا جائے گا۔

غالبؔ نے جس کی شکایت بہت پہلے کی تھی

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

لیکن ہماری تحریروں کے گواہ وہ لوگ ہیں جو ہماری تحریر پڑھتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہم ان کو اپنی روشن تحریروں کے گواہ بنائیں۔ کل قیامت میں جہاں ایک نیکی بے حساب اجر کا باعث ہوگی وہاں ہمارے قارئین کی گواہیاں ہمارے کام آئے۔ تب ہمیں غالبؔ کی طرح شکایت نہ ہوگی کہ ہم فرشتوں کے لکھے پر ناحق پکڑے جا رہے ہیں۔

بات پھر گوشوں کی

بات پھر وہی گوشوں اور خاص نمبروں کی ہے۔ کچھ مدیران کے لیے یہ انگور واقعی کھٹے ہیں۔ ایسے لوگ نہ آم کھا سکتے ہیں نہ گٹھلیوں کے دام وصول کر سکتے ہیں۔ جب بازار میں کسی کی دُکان نقصان میں چلی جاتی ہے تو جھنجھلاہٹ تو اس پر سوار ہوتی ہی ہے۔ لیکن کوئی اور اپنی دُکان میں کیا فروخت کرتا ہے۔ پڑوسی دُکاندار کو اس کی ٹوہ کس لیے ہوتی ہے۔ رہا سوال ان اہلِ قلم کا جو گوشوں کی اشاعت کو ناپسند کرتے ہیں وہ اپنے خول میں بند رہیں ان کے دروازے پر کوئی مدیر دستک دینے آئے تو انکار کر دیں۔ معذرت چاہ لیں یا حد سے بڑھ جائے تو ڈانٹ پلا دیں۔ کوئی آپ کا کیا بگاڑ لیگا۔ دوسروں کو نشانہ بنانے کا حق آپ کو کس نے دیا ہے۔ کیا آپ کے پاس لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ہے۔

آج صف اوّل کے ادیبوں اور ناقدوں پر نمبر اور گوشے اہتمام سے شائع ہو رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی ادبی حیثیت مُسلّم ہے۔ جن کی شخصیت مکرم و محترم ہے۔ جن کے ادبی کارنامے چاند اور سورج کی طرح آسمان ادب پر روشنی لٹا رہے ہیں ایسے میں کوئی رسالہ کسی محبوب راہیؔ اور نذیرؔ فتح پوری پر دس بیس صفحات کا گوشہ شائع کرتا ہے تو آپ کی اَنا کو کہاں ٹھیس پہنچی ہے۔ آپ کی جیب سے کیا خرچ ہو رہا ہے۔ آپ کی بالغ نظری اور آپ کے ادبی مقام پر کہاں اُنگلی اٹھ رہی ہے۔ ہر گھر کا آنگن الگ ہوتا ہے۔ اس کی تہذیب الگ ہوتی ہے۔ ایک پڑوسی شادی کے وقت اپنے آنگن میں ڈھول بجاتا ہے۔ دوسرا شہنائی کو ترجیح دیتا ہے۔ تیسرا زنخے نچواتا ہے۔ چوتھا خاموشی سے اپنی بیٹی کی ڈولی اٹھوا دیتا ہے۔ ایسے میں باراتی چاروں شادیوں میں شریک ہوتے ہیں اور انگلیاں چاٹ چاٹ کر مرغن غذاؤں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس میں قابل مذمت کون سی

بات ہے۔

میرے بھائی! میرے بزرگ دوست، میرے محترم! ضبط سے کام لیں۔ دل کو بڑا رکھیں۔ جو آپ کی پسند کا راستہ ہے اس پر آپ ثابت قدمی سے چلتے جائیں۔ کوئی آپ کو اپنے راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ آپ گوشہ نہ نکالیں۔ نمبر نہ نکالیں۔ کتابوں پر تبصرے نہ فرمائیں۔ شخصیات پر توصیفی مضامین شائع نہ کریں۔ یہ کام کرانے کے لیے کوئی آپ کے گلے میں باہیں ڈال کر، یا آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر یا ہاتھ جوڑ کر آپ سے گزارش نہیں کرتا۔ آپ کیوں کانٹوں میں اپنے آپ کو گھسیٹتے ہیں۔ دامن تو اُلجھے گا ہی۔ جسم تو لہولہو ہوگا ہی۔ کیا چمن میں پھول کم ہو گئے۔ کیا شبنم نے سحر سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ کیا کلیوں نے چٹکنا اور چٹکنے کے بعد کھلنا بند کر دیا۔ کیا آبشاروں میں روانی نہ رہی۔ کیا وادیوں سے جگنوؤں نے ہجرت کر لی۔ کیا رات صرف آنسو بہانے کے لیے رہ گئی ہے۔ کیا دن صرف آگ برسانے کے لیے رہ گیا۔ اتنا سارا فطری حسن آپ کے روبرو بکھرا پڑا ہے۔ قلم کو آنکھ بنائیے۔ آنکھ کو وسعت دیجیے۔ اور لکھیے کہ لکھنے کا موسم ابھی جوان ہے۔☆☆☆ (اسباق اپریل تا جون ۲۰۱۲ء)

کالی داس گپتا رضا اور مختار مسعود کو فروغِ اُردو ادب ایوارڈ

(۴)

حال ہی میں فروغِ اُردو ادب دوحہ قطر کے چوتھے عالمی ایوارڈ کے لیے ہندوستان سے محترم کالی داس گپتا رضا اور پاکستان سے محترم مختار مسعود کے ناموں کا اعلان ہوا۔

مارچ ۱۹۹۹ء میں شولا پور مہاراشٹر کے تین روزہ اُردو میلے کا افتتاح فرماتے ہوئے محترم کالی داس گپتا رضا نے اعلان کیا تھا۔

''اُردو مجھ سے نہیں ہے، میں اُردو سے ہوں''

آپ کے اس تاریخی جملے کی اخبار والوں نے شاہ سرخی جمائی تھی اور غیر اُردو داں طبقے میں اس جملے کی گونج دور تک اور دیر تک سنائی دی تھی محترم کالی داس گپتا رضا کی تمام زندگی اُردو کی بقا اور فروغ میں گزری لیکن پچھلی ایک دہائی سے وہ اپنی کاروباری زندگی سے سبک دوش ہو کر صرف اُردو کے فروغ اور نشر و اشاعت میں منہمک ہیں۔ اب تک ان کی ساٹھ (۶۰) کتابیں شائع ہو کر اربابِ فکر و نظر سے داد و تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ان کی تمام کتابیں مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی ہیں۔ وہ ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کی شعریات کا دامن وسیع ہے۔ غزل، نظم، رباعی اور گیت جیسی تخلیقی اصناف میں ان کی متعدد کتابیں موجود ہیں۔ نثر میں ان کا رنگ انفرادی ہے۔ مشرقی افریقہ میں اُردو کے موضوع پر ان کی دو کتابیں تحقیق اور تنقید کی عمدہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

کالی داس گپتا رضاؔ اگرچہ اگروال ہیں، لیکن ان کا ادبی سلسلہ جوشؔ ملسیانی کے توسط سے براہِ راست مرحوم داغؔ دہلوی سے ملتا ہے۔

تحقیق کے میدان میں رضاؔ صاحب کے کارنامے بے بدل ہیں۔ ذوقؔ اور داغؔ پر انہوں نے قابلِ ذکر کام کیا ہے۔ اپنے استاد حضرت جوش ملسیانی کی ادبی زندگی پر بھی رضا صاحب نے اہم کام کیا ہے۔ اور اس ضمن میں ان کی کتابیں آچکی ہیں۔ آزادی کے بعد جس طرح علامہ اقبال کو فراموش کر دیا گیا تھا اسی طرح اپنے زمانے کے معروف شاعر و ادیب چکبست کو بھی لوگ بھول رہے تھے لیکن رضا صاحب نے اپنی بے پناہ تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر چکبست کو نئی زندگی عطا کی اور اس موضوع پر متعدد تصانیف شائع کر کے چکبست کی ادبی حیثیت کو نمایاں کیا۔ چکبست کی بازیافت کا سہرا رضاؔ صاحب کے سر جاتا ہے۔

رضاؔ صاحب نے علامہ اقبال پر بھی مضامین لکھے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ وہ اقبال پر بہت کام کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے ستمبر ۱۹۹۹ء میں اپنے پونہ قیام کے دوران بتائی تھی، لیکن ابھی ان کے ''غالبیات'' کے منصوبے مکمل نہیں ہوئے ہیں۔

غالبؔ ان کی تحقیق کا محبوب اور وسیع موضوع ہے۔ غالبؔ پر رضا صاحب کو اتھارٹی تسلیم کرلیا گیا ہے۔ غالبؔ پر انھوں نے مختلف زاویوں سے لکھا ہے۔ ''غالب درونِ خانہ'' جیسی کتاب غالبیات میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اس سلسلے میں ''دیوانِ غالب'' تاریخی ترتیب سے'' ان کا سب سے بڑا کارنامہ تسلیم کیا ہے۔ اس میں غالب کے دو ہزار متروک اشعار شامل ہیں اور غالب کی تمام شاعری تاریخ وار مرتب کی گئی ہے۔

رضا صاحب کی پیدائش پنجاب میں ہوئی تھی۔ پنجاب میں ان کا بچپن بیتا، جوان ہوئے اور تعلیم مکمل کی۔ ان کے والدِ محترم فارسی اور اُردو کے ماہر تھے۔ فنونِ لطیفہ سے شغف رکھتے تھے۔ ان کی حویلی میں ایک سے بڑھ کر ایک کلاونت حاضری دینے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ شعر اور موسیقی کی محفلیں خوب جمتی تھیں۔ اسی ماحول نے رضا صاحب کے اندر کے فنکار کو بیدار کیا اور اس طرح اُردو کی اس دم توڑتی صدی میں ایک زندہ محافظ ملا

رضا صاحب کی ادبی پذیرائی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک آپ کے فکر و فن پر اُنیس (۱۹) کتابیں چھپ چکی ہیں اور کئی یونیورسٹیوں میں آپ پر تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں۔

رضا صاحب کا ادبی کام مختلف جہتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ نے بے شمار کتابوں پر 'حرفِ چند' لکھ کر نئے اذہان کی رہنمائی کی ہے۔ کئی نامور جدید شعراء پر تنقیدی مضامین لکھ کر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

رضا صاحب نے چند خوبصورت خاکے بھی لکھے ہیں، جن میں حسینا، درگا دیوی، عبدل بابا اور ماں کافی مقبول ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

....

مختار مسعود، غیر منقسم بھارت کے وقت سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور علی گڑھ کی تاریخی درسگاہ میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ سرکاری طور پر بھی آپ اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ آپ کا شمار صاحب اسلوب نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی اب تک پانچ گراں قدر تصانیف منظرِ عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔ آپ کی مشہور زمانہ کتاب ''آوازِ دوست'' کے بیس اور ''سفر نصیب'' کے چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ''لوحِ ایام'' کے عنوان سے آپ نے ایرانی انقلاب کا آنکھوں دیکھا حال سپردِ قلم کیا تھا، جسے انقلاب ایران کے موضوع پر ایک مستند کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔ اب تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ایک ادیب کے طور پر آپ منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل تسلیم کیے جاچکے ہیں۔ ہم ادارہ 'اسباق' اور 'اسباق' کے بے شمار قارئین کرام کی جانب سے محترم کالی داس گپتا رضا اور محترم مختار مسعود صاحب کو اس گراں قدر ایوارڈ کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

اسباق جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء

(جنوری تا جون ۱۹۹۸ء)

تازہ شمارہ حاضر ہے۔ (۵)

اُردو تحریکوں کی زبان ہے، انقلاب زندہ باد کا نعرہ اُردو ہی کا عنایت کردہ ہے۔ اُردو تخلیقی توانائیوں کا مخزن و منبع ہے۔ دنیا کی جتنی تخلیقی

زبانوں میں اصنافِ سخن موجود ہیں۔اُردو ان سب کو اپنے دامن میں سمیٹنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔مبارکباد کے مستحق ہیں اردو کے وہ اہلِ قلم جو اُردو میں تخلیقی تحریکوں کو زندہ رکھنے اور فروغ دینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔آنجہانی رام لال نابھوی ایسے ہی لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔وہ اب نہیں رہے۔یہ ان کے اختیار میں نہ تھا۔لیکن ان کے اختیار میں جو تھا وہ کام انجام دے کر چلے گئے۔ہم اس شمارے سے ان کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور نئے لکھنے والوں کو انشائیہ جیسی مشکل مگر باغ و بہار تخلیق کو فروغ دینے کی دعوت دیتے ہیں اور 'اسباق' کے توسط سے انشائیے کی ترسیل واشاعت کا یقین دلاتے ہیں۔

ان دنوں اُردو زبان میں تخلیقی طور پر درست وزن میں ماہیا نگاری کی تحریک شباب پر ہے۔اُردو کے تمام مراکز میں اس کی روشنی پھیل رہی ہے، پاکستان سے حیدر قریشی، امین خیال اور سعید شباب اور ان کے ساتھیوں نے ماہیا کے درست وزن کو فروغ دینے کا بیڑہ اُٹھایا تھا۔بھارت میں اس کا خاطر خواہ استقبال ہوا۔پونہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ بھارت میں درست وزن میں ماہیا نگاری کرنے والے دو شاعر (مرحوم رشید اور نذیر کا تعلق پونہ سے ہے۔میں نے حیدر قریشی کی ترغیب اور رشید اعجاز نے میری فرمائش پر درست وزن میں ماہیے پیش کیے۔

ہندوستان میں ماہیوں کا پہلا مجموعہ ریگِ رواں (نذیر) پاکستان سے امین خیال نے شائع کیا۔ماہیوں کا پہلا انتخاب ''رم جھم رم جھم'' کے نام سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے پیش کیا اور ماہیا پر پہلا نمبر گلبن احمد آباد نے شائع کیا۔

ہم نئے لکھنے والوں کو درست وزن میں ماہیا نگاری کی دعوت دیتے ہیں اور 'اسباق' کے ذریعے ترسیل واشاعت کا یقین دلاتے ہیں۔

☆☆☆

(جلد۶،شمارہ۔ا۔۲،سنہ۱۹۸۶ء)

(۶)

اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک عام آدمی اور فنکار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔فنکاری قدرت کی طرف سے فنکار کو ایک ایسا نایاب اور قابل رشک اعزاز ہے جسے سیم وزر کے عوض بیچا اور خریدا نہیں جاسکتا۔کچھ لوگ پیدائشی فنکار ہوتے ہیں اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے دنیا کو متاثر کرتے ہیں۔کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پیدائشی فنکار نہیں ہوتے لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی خوبیوں کا بیباکانہ مظاہرہ کر کے دنیا کے سامنے اپنے فنکار ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ایسے لوگوں کو کامیابی بڑی تگ ودو کے بعد ہی ملتی ہے۔

صرف فلم اور اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے ہی فنکار نہیں ہوا کرتے، یا شاعری، افسانہ نویسی اور مصوّری ہی کو فنکاری کا نام نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اچھی گفتگو کرنا، کسی اُلجھے ہوئے مسئلے کو سلجھا دینا، کسی بگڑے ہوئے کام کو بنا دینا، کسی اُجڑے ہوئے مکان کو بسا دینا بھی ایک قسم کی فنکارانہ چابکدستی ہے۔یہ تمام خوبیاں بھی قدرت کی دین ہوتی ہیں۔

جب احساس بیدار ہوتا ہے تو فنکار کے ذہن سے تخلیق کے سوتے پھوٹ کر دنیا کو سیراب کر دیتے ہیں۔کچھ فنکار دنیا کو ''سکھ شانتی'' کے گہوارے میں جھلانے کے لیے اپنے جسم کا لہو تک قربان کر دیتے ہیں لیکن اپنی پریشانیوں کا تذکرہ بھی نہیں کرتے۔پرائے غموں کی آگ میں چپکے چپکے جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔ایسے فنکاروں کی موت پر زندگی ناز کرتی ہے اور قدرت کے حضور ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا جاتا ہے۔دنیا ان کی موت پر خون کے آنسو روتی ہے اور تاریخ میں ان کا ذکر سنہری حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

نظر رکھنے والوں کے لیے 'دنیا' فنکاری کا نادر نمونہ ہے، مختلف رنگوں سے سجی، مختلف حصوں میں بٹی، مختلف جزیروں میں گھری اس دنیا کے

ہر منظر میں ایک ایسی بے پناہ فنکاری کا عکس دکھائی دیتا ہے جس کی مثال کرۂ ارض پر کہیں نہیں ملتی۔

دُنیا' اپنے خالق کی خلاّقی اور معزز نمائی کا بیش بہا عطیہ ہے جس کی حفاظت بنی نوع انسان کا پہلا فرض ہے۔

☆☆☆

(جلد اوّل، شمارہ ۷۔۸۔۱۹۸۳ء)

(۷)

'اسباق' کا داریہ ۴ سپردِ قرطاس کرتے ہوئے آج قلم کی نوک سے بیشمار تلخ و تند حقائق سرّی حدود توڑ کر ظاہری دنیا میں نمودار ہونے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ تاہم سینہ ہائے حقائق پر ضبط کا سنگِ گراں رکھتے ہوئے قلم کا رُخ وادیٔ شاداب کی جانب موڑ دینا ہی اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں خوابوں کا ایک جہاں آباد ہے، خواب تلخ بھی ہوتے ہیں اور شیریں بھی۔ سچائیوں کی تفسیر ہوتے ہیں اور تصورات کی تعبیر بھی!

خوابوں کی علامت و شناخت سے بڑھ کر حالات و ماحول کا کوئی عکاس نہیں ہوتا۔ جو خواب کھلی آنکھوں سے دیکھے جاتے ہیں وہی حقائق سے بڑھ کر حقائق کے غماز و مظہر ہوتے ہیں۔ گذشتہ زندگی کا ایک ایسا ہی خواب ہمارے شعور کی روشن کتاب کے اُجلے صفحات پر آج بھی تازہ ہے۔ آج وہ خواب، ہم قارئین 'اسباق' کے روبرو پیش کرتے ہیں۔

رنگوں کے کواڑ کھلتے ہیں، شعور کے پرندے محوِ پرواز ہیں۔ جذبۂ تخلیق و تعمیر لہو کی بوند بوند میں اچھل رہا ہے۔ آنکھوں کی دہلیز پر ایک خوابی دستک کے قدم پڑتے ہیں۔ آہٹ کے ساتھ ہی تلخیوں میں ڈوبا ایک منظر صفحۂ شعور پر پھیل جاتا ہے۔

خوش فہمیوں کی نیند اوڑھے ہوئے خاموش، منجمد، پتھرایا ہوا سا بے حس و حرکت، ایک سمندر، سمندر کے کنارے، سمندر کی بیکراں اور پر اسرار خاموشی کو تفکرات کے ہونٹوں سے قطرہ قطرہ پینے کی سعیٔ مسلسل میں مستغرق ایک سر پھرا متحرک سایہ! سایہ اکائی کی صورت خاموشی کا سمندر پینے میں ناکام، سایہ کی تلملاہٹ، منجمد خاموشی کو پاش پاش کرنے کا عزم اپنی جگہ، سایہ کی بے تاب نظریں سمندر کے لامتناہی سینے پر اپنی بے بسی کا ماتمی لباس چھوڑ کر جب لوٹتی ہیں تو چمکیلے اور نوکیلے سنگ ریزوں کے ایک ڈھیر میں کھو جاتی ہیں۔ سنگ ریزے سائے کو اس کی پشت پر ایستادہ پتھریلی چٹانوں کا احساس دلاتے ہیں۔ سایہ کی قوتِ فیصلہ سنگریزوں کو اُٹھا لیتی ہے۔ اس انتخاب پر اپنے ہی بوجھ سے دبی چٹانیں واویلا مچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس وقت شدت سے انھیں اس محرومی اور غفلت کا احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کبھی اپنا حلقہ پیدا کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟

سمندر کا سکوت سایہ کو دعوتِ عمل دیتا ہے۔ سایہ ایک چمکیلا سنگ ریزہ اُٹھا کر سمندر کے سینے پر اُچھال دیتا ہے۔ سمندر کی چیخ فضا کو مرتعش کرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ خاموشی کی چادر تار تار ہو جاتی ہے اور لہروں کے دوش پر دائروں کا سفر پھیلتا چلا جاتا ہے۔

سمندر کی آنکھوں میں کچی نیند کے پنچھی پھڑ پھڑاتے ہیں۔ سمندر اپنی نیم وا غصیلی آنکھوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کے غرور کو ایک ادنیٰ کنکر سے توڑنے والے سایہ پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ تو کچھ لمحوں کے لیے وہ ندامت سے اپنے ہی اندر قطرہ قطرہ ڈوب جاتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی پل سمندر کی انا آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ وہ ایک اُتھلی سی لہر اُچھال کر سایہ پر یلغار کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اسی لمحہ سایہ کے ہاتھ سے دوسرا چمکیلا سنگریزہ پھسل کر سمندر کے حلق میں اُتر جاتا ہے۔ سمندر بپھر جاتا ہے، اور اپنی جلالی لہروں کو منظّم کر کے سایہ پر دوسرا حملہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اسی لمحہ سایہ کی پشت پر سورج نمودار ہوتا ہے۔ روشنی کا جھپکا سا ہوتا ہے۔ کرنیں پہن کر سایہ ایک واضح وجود بن جاتا ہے۔ اور سمندر کی آنکھوں میں پیوست ہونے لگتا ہے۔ لمحہ بھر کو سمندر کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔

سمندر سایہ کے روشن وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور اپنے حواس مجتمع کرتا ہے۔ پھر کناروں کو مدد کے لیے پکارتا ہے اور پھنکارتا ہوا سایہ پر حملہ آور ہونے کے لیے بڑھتا ہے تو حیرت ہائے خوف کے متعدد نیزے اس کی آنکھوں میں گڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ سایہ کی پشت پر صحتمند وتوانا جسموں کا ایک لامتناہی سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے جس کے چہرے عمل کی روشنی سے چمک رہے ہیں اور جو اپنی اپنی مٹھیوں میں سمندر کا مقابلہ کرنے کے لیے سنگریزے دبائے ہوئے ہیں۔ سمندر کا تخریبی جوش برف کے ٹیلے کی طرح اپنے ہی وجود کی آبی کھائیوں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ 'وقت' جو دور کھڑا سمندر اور سایہ کی جنگ دیکھ رہا تھا۔ سایہ کی ظفرمندی اور سمندر کی پسپائی پر ایک فاتحانہ قہقہہ اُچھالتا ہوا کہتا ہے "یہ سایہ کی نہیں میری جیت ہے۔"

سایہ اپنے تمام روشن ساتھیوں کے ساتھ متشکرانہ چہرے سے وقت کی قہقہہ بدوش آواز کی سمت مڑ جاتا ہے، یہاں سے ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

☆☆☆

اُردو اسٹیج ، اسباق

جلد دوئم ،نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

(۸)

اُردو زبان کی فلاح و بہبودی اور ترسیل و تبلیغ کے لیے جہاں اُردو رسائل واخبارات کا زندہ رکھنا از حد ضروری ہے وہاں اُردو کو عوام سے جوڑنے کے لیے اُردو اسٹیج کا وجود بھی خصوصی حیثیت و اہمیت کا حامل ہے۔

آزادی کے بعد ہم اُردو والوں نے رسائل واخبارات کی دنیا میں جتنی نمایاں اور قابلِ ذکر ترقی کی ہے، اسٹیج کے میدان میں ہم اتنے ہی پسماندگی کا شکار ہوئے ہیں۔

جن دنوں ہندوستان میں فلموں کا رواج کم تھا اور لوگ ڈراموں کے زیادہ شائق تھے ان دنوں بنگالی، گجراتی، اُردو اور مراٹھی زبانوں کے اسٹیج چلانے والی باقاعدہ کمپنیاں قائم تھیں جو بڑے بڑے شہروں میں جا کر معیاری ڈرامے پیش کرتی تھیں۔ دیگر زبانوں کی طرح اُردو اسٹیج بھی ان دنوں اپنے پورے شباب پر تھا۔ امتیاز علی تاج اور آغا حشر کاشمیری جیسے مایہ ناز ڈرامہ نویس اس فن کو جلا بخشنے کے لیے موجود تھے۔ اس دور میں منظوم مکالماتی ڈراموں کا رواج عام تھا۔ عموماً عشق و محبت کی ولولہ انگیز داستانیں جذباتی انداز میں پیش کی جاتیں پھر تاریخی کہانیوں پر لکھے ڈرامے جو بے حد پسند کیے جاتے۔

افسوس کی بات ہے کہ آج بنگالی اور مراٹھی کے مقابلے میں اُردو اسٹیج کا وجود صفر کے برابر رہ گیا ہے اور بنگالی، مراٹھی کے ڈرامے عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں لیکن (دو ایک حیدر آبادی لطائفی ڈراموں کو چھوڑ کر) اُردو والوں کے پلّے ایک بھی ایسا ڈرامہ نہیں جو عالمگیر نہ سہی ملک گیر شہرت ہی کا حامل ہوا۔

آج چونکہ پورا سماجی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ بدل چکا ہے۔ لکھنے والوں کو لکھنے کے لئے موضوع تلاشنے کی ضرورت نہیں سب کچھ سامنے ہے۔ ذاتی مشاہدات، شخصی احساسات اور اندر کی کلبلاہٹ کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ ہم آہنگی، انسانی تفاوت، نسلی امتیاز، علاقائی تعصب، مذہبی منافرت اور سیاسی قلابازیوں کے خلاف ہمارے قلمکار احتجاجی مورچہ سنبھال کر اسٹیج کے میدان کا رُخ کریں تو انسانی خدمت کے ناطے ایک قابل فخر کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔

اُردو کے مشہور افسانہ نویس منشی پریم چند نے کہا تھا ''اگر اُردو کو عوام سے جوڑنا چاہتے ہو تو اسے مکالموں میں ڈھال کر اسٹیج کے ذریعے عوام کے سامنے پیش کرو۔''

☆☆☆

جولائی۔اگست،شمارہ ۳۔۴۔۱۹۸۱ء

(۹)

۱۔ اسباق کا شمارہ ۳۔۴، نئی سج دھج، نرالی شان اور متنوع تخلیقات کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اسباق شمارہ ۱۔۲ کا ادبی حلقوں میں خاطر خواہ خیر مقدم کیا گیا اور توقع سے زیادہ اس کی پذیرائی ہوئی۔ اس سلسلہ میں بیرونی محبانِ اردو کے ساتھ ساتھ اہالیانِ پونہ نے بھی ہمارے اس اقدام کو سراہتے ہوئے دادو تحسین کے وہ نعرے بلند کیئے کہ فرطِ جذبات سے ہماری آنکھیں نم ہوگئیں۔

۲۔ پونہ ماضی بعید میں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہاں شعر و ادب کے تعلق سے ادبی مباحثے، مناظرے اور دنگلی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ گھر گھر اور محفل محفل شعر و ادب کے چراغ روشن تھے۔ یہاں کی عوامی زندگی پر مشاعروں کی گہری چھاپ تھی۔ مشاعرہ کا اعلان سنتے ہی لوگ گھر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کی خوشیاں شعراء کرام کی شرکت کے بغیر نامکمل اور تشنہ سمجھی جاتی تھیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں شعر و ادب کو دخل تھا۔ عموماً چوپال اور چوراہوں پر عالیشان مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ مقامی شعراء کے علاوہ بیرونی شعراء کرام بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ لیکن آج معاملہ برعکس ہے۔ یا تو مشاعرے ہوتے ہی نہیں یا اگر کوئی سرفروش بہ کفن اپنے سر باندھنے کی جسارت بھی کرتا ہے تو اسے منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ یہی حال تقریباً دیگر بڑے شہروں کا بھی ہے۔ ہمارے اہل قلم حضرات نے سنجیدگی سے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ وہ کیا وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے سامعین ادبی محفلوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور یہ کہ ہم نے اپنے نقشِ قدم پر چلنے والوں کے لیے کیا آسانیاں فراہم کی ہیں۔ ہم نے اپنی شمعِ سخن کی لو سے کتنے نئے چراغ جلائے ہیں۔ مستقبل قریب میں شعر و ادب کی بقا اور پرورش کے لیے کتنے سرفروشانِ ادب تیار کیے ہیں۔ ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کا استحصال کرتے ہیں۔ ہم اپنے علم اور گونا گوں قابلیت کو صرف اپنی انا کی تسکین اور فریقِ ثانی کی تذلیل کے لیے بروئے کار لاکر اپنی علمی فوقیت کا سکہ جمانا چاہتے ہیں۔ ہمارے دلوں سے خدمت کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ دامے، درمے، قدمے سخنے، کسی بھی نوعیت سے ہم اُردو کے خادم اور پرستار کہلانے کے قابل نہیں رہے۔ ہم صرف گفتار کے غازی ہیں، ہم اُپدیش دے سکتے ہیں۔ سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں کود پڑنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ ہم ایک پل کے لیے سنجیدگی سے اپنے دل کو ٹٹولیں، تنہائی میں اپنے ضمیر سے پوچھیں۔ اور اپنے آپ کا محاسبہ کریں تب ہمیں احساس ہوگا (اگر واقعی ہم ضمیر رکھتے ہیں) کہ اُردو کو تباہ و برباد کرنے میں ہم سب سے آگے ہیں اُردو کے قاتل ہم خود ہیں۔ اُردو کے سینے پر گنتی کے زخم ہیں لیکن اس کی پشت زخموں سے لالہ زار ہے۔

پیچھے کون ہے اپنوں میں　　　پیٹھ لہو میں تر ہے نذیرؔ

۳۔ (الف) دنیا میں کوئی وحید العصر نہیں، خدا نے ایک دوسرے کا جواب پیدا کیا ہے۔

(ب) آئینے سے وہ لوگ گھبراتے ہیں جنھوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ بگاڑ رکھا ہے۔

(ج)   جو علم جہالت کی تبلیغ کرے وہ نور نہیں، تیرگی پھیلاتا ہے۔

۴۔   شوق کوئی ہو، کوئی جذبہ ہو   بوجھ پڑتا ہے جیب پر بابا   (رشید اعجاز مرحوم)

ہمیں بہ خوبی احساس ہے کہ اسباق کے اجراء سے محبان اُردو کی جیبوں پر بوجھ پڑا ہے لیکن یہ بوجھ اتنا سخت بھی نہیں کہ اٹھایا ہی نہ جاسکے، سال کے پندرہ روپے ہر کس و ناکس کے بس کی بات ہے۔ پونہ شہر ہی میں تقریباً ایک لاکھ اُردو لکھنے اور پڑھنے والے موجود ہیں۔ اس کثیر التعداد آبادی کا سواں حصہ بھی 'اسباق' خرید کر پڑھے تو ہم اس جریدہ کی دائمی بقا کے ضامن بن سکتے ہیں۔

☆☆☆

فروری تا ستمبر ۱۹۹۵ء

(۱۰)

کسی بھی زبان میں نئی لفظیات کا داخل ہونا اِک خوش آئند بات ہے، اس چیز کو روکا نہیں جاسکتا اور روکنا بھی نہیں چاہیے۔ اسباق کے پچھلے شمارے میں ہمارے محترم بزرگ شاعر جناب مجروحؔ سلطانپوری کا خط شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے دریافت فرمایا تھا کہ "تخلیق سے" تخلیقیت کی ضرورت کب اور کہاں پیش آتی ہے؟ کرم ہوگا اگر آگاہ کیا جاؤں۔"

ہماری رائے میں تخلیق اور تخلیقیت ایک ہی لفظ کا نام نہیں ہے۔ مثلاً اگر یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شاعر کے مزاج میں اُپج کم تھی تو وہاں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں کے مزاج میں تخلیق کم تھی، یہی کہنا پڑے گا کہ قوتِ تخلیق کم تھی، یعنی تخلیقی پن کی کمی تھی، جدید زبان کی پیروی کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں کے مزاج میں تخلیقیت کم تھی۔ ہم یہ سطور محض اس لیے لکھ رہے ہیں کہ جناب مجروح سلطانپوری نے سوال ہم سے کیا ہے، ورنہ محترم نظام صدیقی نے ایک بھرپور مقالہ مجروح صاحب کے جواب میں لکھ دیا ہے۔ یہ مقالہ زیرِ مطالعہ شمارے میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے بھی اپنے مکتوب میں تخلیقیت کی صراحت بیان فرمادی ہے۔ چند خطوط اور بھی موصول ہوئے ہیں، ہم ان کو من وعن شائع کر رہے ہیں۔

ہم انتہائی افسوس اور بے پناہ رنج وغم کے ساتھ بتاتے کے لیے مجبور ہیں کہ ہمارے دوست رشیدؔ اعجاز کا حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ۱۲؍ مئی ۱۹۹۵ء کی صبح سوا چھ بجے پونہ کے   کے۔ ای۔ ایم اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی قابلِ تقلید انسان بھی تھے۔ موصوف نے زندگی بھر چراغ جلانے کا کام کیا مگر وقت سے پہلے موت کی بے رحم آندھی نے ان کی زندگی کا چراغ بجھا دیا۔ رشید اعجاز 'اسباق' کے بنیادگذاروں میں سے ایک تھے۔ 'اسباق' کی جانب سے ان کی پذیرائی کے طور پر ایک شمارہ بھی ان کے نام شائع کیا گیا تھا۔ آپ نے غزل، نظم، دوہا، رباعی، آزاد غزل، ماہیا جیسی مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور ایک بھرپور معیاری اثاثہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں آپ کی نظموں کا مجموعہ 'سوچ بن' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جس پر مہاراشٹر اُردو اکیڈمی نے انعام بھی دیا تھا۔ پسماندگان میں بیوی اور دو لڑکے ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کو جنت الفردوس عطا کرے اور ان کے ادبی اثاثے کی اشاعت و تحفظ کا غیب سے انتظام فرمائے، آمین

☆☆☆

ہندوستان کی یہ اُردو بستیاں

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۹ء (بیسویں صدی کا آخری شمارہ)

(۱۱)

اُردو کا جادو اِن دنوں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ بالخصوص یورپ میں اُردو اپنی تمام تر تخلیقی توانائی کے ساتھ حکومت کر رہی ہے۔ عالمی مشاعرے، مختلف علمی ادبی موضوعات پر شاندار سمینار، تنقیدی محفلیں، مذاکرے، مباحثے گویا فطرت کی نمائندگی کرنے والے فرشتے کا نغمہ ہر جگہ کانوں میں شہد ٹپکا رہا ہے۔ دیدہ ودل کو نور عطا کرنے والی خوبصورت کتابیں بھی چھپ رہی ہیں۔ طباعتی رنگوں سے مزین ادبی رسائل اُردو کے رنگ گھر گھر بکھیر رہے ہیں۔ بھارت کے چند ادبی رسائل اُردو کے ان سمندر پار جزیروں کو دریافت کرنے کا سہرا اپنے سر باندھ چکے ہیں۔ لیکن عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ مہمان نوازی کی فکر میں اپنے پڑوسی کو بھول جاتے ہیں، جو ہر لحاظ سے توجہ کا پہلا مستحق ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں جناب متین قادری کی کتاب کے اجراء پر اورنگ آباد میں ڈاکٹر محبوب راہی سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا۔ تب مجھے خیال گزرا کہ اُردو جزائر کی تلاش میں ہم اُردو کے ان شہروں اور اضلاع کو فراموش کر چکے ہیں جہاں پسماندگی اور غربت کے باوجود آج بھی اچھا شعر کہنے والے موجود ہیں۔ اچھا افسانہ لکھنے والے موجود ہیں۔ لیکن ادبی رسائل تک ان کی پہنچ نہیں ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی تک پہنچنا ان لوگوں کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جہاں ادب گھروں میں پیدا ہوتا ہے۔ محلّہ اور بستی کی محفلوں میں سماعتوں سے ٹکرا کر ختم ہو جاتا ہے۔ بعید نہیں کہ پورے ضلع میں دو چار لوگ اپنی مسلسل جدوجہد اور مہنگے ڈاک خرچ کا بوجھ برداشت کر کے اپنی شناخت بنا لیتے ہیں لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو دبستان ادب کی مجوزہ دہلیز پر قدم بھی نہیں رکھ پاتے اور معدوم ہو جاتے ہیں۔ ہم 'اسباق' کے توسط سے بھارت کی ایسی اُردو بستیوں کو تلاش کر کے موجودہ ادبی دبستان میں داخل کرانے کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی مہاراشٹر کے ضلع اکولہ کی صورت میں حاضر ہے۔

ہم شکر گزار ہیں پہلے ڈاکٹر محبوب راہی کے جن کے مشورے اس باب میں نقشِ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موصوف نے صرف مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ بنیاد کا پہلا پتھر بھی اپنے ہی ہاتھوں رکھ دیا یعنی مکمل گوشہ مرتب کر کے دیا۔ دیگر اہلِ قلم نے بھی ان سے معاونت کر کے اس منصوبے کو کامیاب کیا۔ ان سبھی کا شکریہ!!

ہم چاہتے ہیں کہ بھارت کے تمام اہم ضلعوں پر اسی قسم کے گوشے مرتب کریں۔ ہمیں آپ کے علمی اور قلمی تعاون کی ضرورت ہے۔ دیکھئے کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق؟

☆☆☆

''رسالہ اسباق'' کے منظوم اداریہ

(۱۲)

نذیرؔ نے چند منظوم اداریے بھی تحریر کیے ہیں۔

شمارہ جولائی ۲۰۰۴ء تا دسمبر ۲۰۰۴ء

اداریہ منظوم

گفت باہمی

ہمارے دور کے محبوب راہیؔ کا سفر دیکھو

تلاشِ فکر وفن میں ایک مدت سے ہے سرگرداں
ہمارے دور کے محبوب راہیؔ کا سفر دیکھو

سر آئینہ شمعیں جتنی بھی روشن ہوئیں، کی ہیں
جسارت کے نمونے جتنے دِکھلاتے تھے دکھلائے
ہوئی ہیں بے نشاں جتنی اندھیروں کی جبیں، کی ہیں
لہو جتنا جلایا ہے ستارے اتنے ٹانکے ہیں
چمکتے جگنوؤں کی بے پنا ہی کا سفر دیکھو
ہمارے دور کے محبوب راہیؔ کا سفر دیکھو

خزاں کی بے ثباتی کو یہ آئینہ دکھاتا ہے
نرالی شان ہے اس کی انوکھے عزم ہیں اس کے
سرِ شاخِ تمنا پھول بن کر مسکراتا ہے
بڑے احسان ہیں اس کے چمن کے گوشے گوشے پر
کہاں پہنچا نسیمِ صبح گاہی کا سفر دیکھو
ہمارے دور کے محبوب راہیؔ کا سفر دیکھو

خود اپنا آپ کھو کر سچ کی یہ تحقیق کرتا ہے
تلاش وجستجو میں دو قدم آگے ہے یہ سب سے
اذیت جھیلتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے
یہی پہچان ہے اس کے بڑا فنکار ہونے کی
یہ دل کے خون کرنے کی گواہی کا سفر دیکھو
ہمارے دور کے محبوب راہیؔ کا سفر دیکھو

یہ خواب زندگی کی خوشنما تعبیر کرتا ہے
قلم کی نوک سے جب چھیڑتا ہے داستانِ دل
حقیقت میں حقیقت کا جہاں تعمیر کرتا ہے
خیالی آسمانوں پر نہیں پرواز کا قائل
فقیری میں بھی اس کی بادشاہی کا سفر دیکھو
ہمارے دور کے محبوب راہیؔ کا سفر دیکھو

(گوشہ محبوب راہیؔ کے لیے) نذیرؔ فتح پوری

دلّی کے ادبی رسالے رہنمائے تعلیم جدید کی اعزازی ادارت کی ذمہ داری بھی کچھ شماروں تک نذیرؔ فتح پوری نے نبھائی تھی۔ ایک شمارے کا اداریہ ملاحظہ کریں۔

اداریہ۔ اگست ۲۰۱۲ء

مری گفتگو ہے تم سے

(۱۳)

نذیر فتح پوری

اپنے وقت کے مقبول ترین اور محبوب ترین ادبی شخصیت کے حامل کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ کی ادبی زندگی اور فکر وفن پر رہنمائے تعلیم جدید کا یہ خاص نمبر ایسے خاص حالات اور ماحول میں شائع کیا جارہا ہے جب اُردو کی زندگی کی آخری سانسوں کا شمار کیا جانے لگا ہے۔ حالانکہ یہ ایک دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ نہیں ہے دوسری طرف اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان ثابت کر کے اس کے سر سے قومی یکجہتی کا تاج اتارنے کی کوشش بھی عرصہ دراز سے جاری ہے، کچھ اردو والے بھی اس کوشش کو فروغ دینے میں آگے آگے دکھائی دیتے ہیں نہیں معلوم کہ یہ مسئلہ کیوں بار بار اٹھایا جارہا ہے۔ ایسے ماحول میں کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ پر یہ خصوصی شمارہ ایک طرح سے ان مفروضوں کی نفی کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

بیدی سحرؔ اردو زبان، تہذیب اور شعر وادب کی جان تھے، یہ بہت پرانی بات نہیں ہے۔ ابھی ان کے خوبصورت اشعار سے نہال ہونے والی سماعتیں موجود ہیں۔ ان کی پُر خلوص محفلوں سے فیضیاب متعدد احباب آج بھی ان کو یاد کرتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ پنجاب کے اس سپوت نے اردو کو جس وارفتگی اور پیوستگی کے ساتھ اپنے دل کا ہار اور جان کا قرار بنا رکھا تھا وہ اپنے آپ میں لائق تحسین ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو زبان وادب کی آبیاری نے انہیں محبت کے تخت پر بٹھایا تو انہوں نے بھی زندگی بھر اس تخت کا وقار اور احترام قائم رکھا۔

یہاں پونے مہاراشٹر میں منعقدہ پونے فیسٹول کے مشاعروں میں ان کو دیکھنے اور ان کی زبان سے اشعار سننے کا شرف مجھے مل چکا ہے۔ ایک بار ایک ادبی نشست میں ان سے ہمکلامی کا شرف بھی حاصل ہو چکا ہے۔ جس کی ایک باوقار تصویر میرے البم میں موجود ہے۔ یہاں مشاعرے سے پہلے اور مشاعرے کے بعد وہ اپنے شیدائیوں سے جس خلوص اور اپنائیت سے پیش آتے تھے اس سے ان کی فراخ دلی کے ساتھ ساتھ منکسر المزاجی اور محبت بھری شخصیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

آنجہانی مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ کی شاعری ان کی حیات اور ان کی نجی ملاقاتوں سے متعلق کافی اظہار خیال ہوا ہے۔ کافی کچھ شائع ہوا ہے در اصل جو پیاری شخصیت ہوتی ہیں آخری سفر کوچ کرنے کے بعد بھی چاہنے والے انہیں یاد کرتے رہتے ہیں۔

اردو میخانے کے پیر مغاں جناب کے ایل نارنگ ساقی بھی اپنی ہر دلعزیزی اور بامروت شخصیت کی وجہ سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ اردو رسائل کی آبیاری میں بھی وہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بیدی سحرؔ صاحب سے ساقی صاحب کو بے پناہ محبت اور عقیدت ہے، جس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ان کے ملک عدم سفر کر جانے کے بعد بھی نارنگ صاحب نے انہیں ہر حال میں یاد رکھا ہے۔ ان کے نام سے ایک ادبی ٹرسٹ قائم کر رکھا ہے جس کے توسط سے وہ اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سحر صاحب کے فکر وفن پر کتابیں شائع کر کے اور اردو کے معیاری رسائل میں سحر صاحب کے تعلق سے گوشوں کی صورت میں مضامین شائع کر کے ان کے تعلق سے اپنی محبت اور عقیدت کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح اردو کے موجودہ دور کے قارئین تک سحر صاحب کے افکار پہنچانے کی ایک سعی مشکور ہے۔ جو قابل داد بھی ہے اور تقلید بھی۔ میں اس تعلق سے ایک بات ضرور کہوں گا کہ کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ کی کوئی ادبی نیکی خدا کے دربار میں مقبول ہوئی تھی جس کے نتیجے میں انہیں کے ایل نارنگ ساقی جیسا ادبی وارث میسر آیا۔ جس کی کوششوں سے آج تک ادبی محفلوں میں سحر صاحب کے افکار کا اجالا موجود ہے۔

ورنہ گذشتہ دہے میں ہمارے سامنے کیسے کیسے قابل قدر ماہر اقبالیات اور ماہر غالبیات اٹھ گئے جن کو یاد کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔

ادارہ رہنمائے تعلیم جدید کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ آج ہم زیر مطالعہ شمارے کے ذریعہ بیدی سحر کو نہ صرف یہ کہ یاد کر رہے ہیں بلکہ ایک قابل قدر شمارہ ان کی ذات کے لیے مختص کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔اس طرح رسالے کی بنیادی پالیسی کو مزید استحکام ملے گا۔اس رسالے کے ذریعہ ہمیشہ ملک،قوم اور زبانوں کو جوڑنے کا فریضہ انجام دیا گیا ہے۔یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ہم اس نمبر کی اشاعت کے لئے محترم ساقی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔جنھوں نے زیر مطالعہ نمبر کی اشاعت کے لیے ادارے کو استحکام عطا کیا۔ہم آئندہ بھی ان سے اسی طرح محبت بھرے تعاون کی خواہش رکھتے ہیں۔

قلمی معاونین کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ ذاتی نوعیت کے مضامین اور دوسروں کی شخصیت کے خلاف مراسلے ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔رہنمائے تعلیم کے ذریعہ ہم شخصیت سازی کا کام کرتے ہیں،شخصیت کشی کا نہیں۔

☆☆☆

نذیؔر فتح پوری کی ترجمہ نگاری

ترجمہ نگاری کا فن اپنے آپ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔اور اس کی اشد ضرورت بھی ہے کیوں کہ یہ دو زبانوں کے بیچ ایک پُل کا کام کرتا ہے۔اس کے ذریعہ ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک اس فن پارے کی رسائی ممکن ہو سکے اس کے لئے سب سے خاص بات یہ ہے کہ مترجم کا ان دونوں زبانوں پر عبور رکھنا بے حد ضروری ہے تب ہی جا کر وہ ایک اچھا ترجمہ نگار ثابت ہو سکتا ہے۔نذیؔر نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور ایک ہندی ناول کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے کی ہمت دکھائی۔ترجمہ کی اہمیت و افادیت کے متعلق وہ اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں کہ

''میں ترجمے کو مفید سمجھتا ہوں،دوسری زبانوں کا ادب جو اردو میں ترجمے کے وسیلے سے ہم تک پہنچا ہے ویسا ادب اردو میں نہیں لکھا گیا۔''(۱۰)

''ڈھلی ڈھلی شام کا اُجالا''ایک ہندی ناول ہے اس کی مصنفہ محترمہ پربھا ماتھر جی ہیں۔آپ کا تعلق یوپی کے ایک معزز خاندان سے ہے آپ سنگیت میں وشارد ہیں اور سیاست میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔یہ ناول ڈاکٹروں کی زندگی پر مبنی ہے۔اس کا مرکزی کردار نیتا نام کی ایک لڑکی ہے وہ میڈیکل کالج کی طالب علم ہے۔وہیں اس کی ملاقات منیش نام کے لڑکے سے ہوتی ہے اور منیش اور نیتا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔نیتا کے چہرے پر سفید داغ ہے۔یہ داغ اس کی زندگی میں زہر گھول دیتا ہے۔آخر میں وہ اس داغ کی بیماری کا علاج ڈھونڈنے کی غرض سے امریکا چلی جاتی ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے مگر افسوس کہ وہ اس کامیابی کو اپنے دوست منیش کے حوالے کر کے اس دارِفانی سے کوچ کر جاتی ہے۔

اس ناول کو نذیر نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔جس کے متعلق پربھا جی فرماتی ہیں۔

''اردو کے چند قارئین نے اسے ہندی میں پڑھنے کے بعد مشورہ دیا کہ ناول اردو میں بھی آنا چاہیے اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں

نے اردو کے مشہور شاعر و ادیب نذیؔر فتح پوری صاحب سے مشورہ کیا۔انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اتنا اہم اور طاقت ور ناول ہر قاری کے مطالعہ میں آنا چاہیے۔''(۱۱)

اور اسی خاص وجہ سے یہ ناول نذیؔر کے ذریعہ اردو ادب میں داخل ہوا۔

یہ ناول صرف نیتا کی زندگی کی روداد نہیں ہے بلکہ ان تمام عورتوں کی درد بھری داستان ہے جو محض اپنے جسم پر اس طرح کے سفید داغ ہو جانے کے سبب ذلت، احساسِ کمتری اور شرمساری کی زندگی گزارتی ہیں۔کئی لڑکیاں اس بیماری کے سبب شادی سے محروم رہ جاتی ہیں،کوئی بھی انہیں اپنانا نہیں چاہتا،اس کے علاوہ اس ناول میں دوسری سازشوں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے جو ہمارے معاشرے میں عورتوں کی زندگی میں زہر گھول رہی ہیں۔جن میں جہیز سب سے اہم ہے۔جہیز کی وجہ سے کئی لڑکیاں شادی کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں اور اگر شادی ہو بھی جاتی ہے تو سسرال والوں کے ظلم وستم کا شکار ہو جاتی ہیں۔

نذیؔر کی یہ تصنیف بقول خود۔

''نوٹ۔یہ ترجمہ ۱۶؍اگست ۲۰۰۹ء کو مکمل ہوا(۱۲)

مکمل ہو کر اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام اکتوبر ۲۰۰۹ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔اس ناول کے اردو میں ترجمہ ہونے کے مقصد کو پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔سادہ اور سلیس زبان کے استعمال کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ کا استعمال کیا اور نثر کو شستہ اور شائستہ بنا کر پیش کیا ۱۴۴ صفحات پر مشتمل اس ناول میں نذیؔر نے اچھی زبان کے ساتھ کرداروں کے دلی جذبات و احساسات کو اس شدت کے ساتھ بیان کیا کہ وہ قاری کے دل میں گھر کرتے چلے جاتے ہیں۔نذیؔر نے اس ناول کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا بلکہ دل کی گہرائیوں میں جذب کر کے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جس کا اعتراف وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''مجھے خوشی ہے کہ اس ناول کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا فرض میں نے نبھایا ہے،میں نے ناول کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ خود کو اس ناول کی روح میں اتار کر اسے تخلیقیت سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے۔''(۱۳)

یہ ناول ایک اصلاحی ناول ہے جس کے تحت عورتوں کے اس درد کو قلمبند کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے جس کی طرف اکثر لوگوں کا دھیان نہیں جاتا...... جناب رشید انصاری اپنے ایک مضمون ''نذیؔر فتح پوری کی ترجمہ نگاری۔''ڈھلی ڈھلی شام کا اُجالا'' کے حوالے سے'' میں نذیؔر کو خراج تحسین ان الفاظ میں پہنچاتے ہیں۔

''قابل مبارک باد ہیں نذیؔر فتح پوری صاحب کہ موصوف نے ایک بڑے اچھے ہندی ناول کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس خوبی و مہارت سے کیا کہ ترجمہ کا حق ادا کر دیا،ترجمہ کی یہ خوبی کہ ''ترجمہ،ترجمہ معلوم نہ ہو'' اپنے ترجمے میں سمو دی ہے۔کہیں کہیں ہندی الفاظ کا استعمال اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ شاید تحریری ترجمہ ہے ورنہ کتاب کی زبان انتہائی شستہ اور اسلوب دلکش ہے۔ترجمہ کا بوجھل پن کہیں محسوس نہیں ہوتا ہے۔''(۱۴)

جہاں رشید انصاری صاحب نے ترجمہ میں خوبیاں تلاش کیں ہیں وہیں خامیوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی ہے مثلاً اپنے اسی مضمون میں وہ آگے فرماتے ہیں۔

''پروف ریڈنگ کی غلطیاں کم ہیں مگر جو چند غلطیاں ہیں وہ بری طرح کھٹکتی ہیں۔مثلاً بکھیئے (بچئیے)

اسی طرح اکثر جگہ ہندی اور ایک دو جگہ غیر ضروری طور پر انگریزی الفاظ کا استعمال ناگوار گزرتا ہے۔'' (۱۵)

بہر حال مجموعی طور پر یہ ترجمہ اور نذیر مبارک باد کے مستحق ہیں اور یہ ترجمہ اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

نذیر نے رمیش بھوجک سمیر کی ہندی کہانی ''شنکر کی ماں'' کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انسانی خلوص و محبت کے موضوع پر تحریر یہ افسانہ ذات پات کے نام پر پھیلی نفرت کو دور کر محبت اپنائیت وانسانیت کا پیغام دیتی نظر آتی ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ہر روز دیکھنے میں آتا تھا کہ نظرائے ہوئے بچوں کی پیشانیوں پر ہاتھ رکھ کر شنکر کی ماں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدا رہی ہے۔ اس کے بعد ایک صاف پانی کے گلاس میں منتر پڑھ کر اس پر دم کرتی اور دن میں تین بار بچوں کو وہ پانی پلانے کی ہدایت کرتے ہوئے اس شخص کو بری طرح لعن طعن کرتی جس کی نظر لگنے سے بچہ بیمار ہوا ہے اس کے بعد اپنی جھاڑو لے کر محلے کی گلیوں کی صفائی پر نکل پڑتی جو شنکر کی ماں کا پشتینی کام تھا۔'' (۱٦)

اس کے علاوہ پریتا بھارگو کی پانچ ہندی نظموں کا بھی نذیر نے اردو میں ترجمہ کیا جو ماں سے محبت و عقیدت کے جذبات لئے ہوئے ہے نظم سے ایک بند ملاحظہ ہو۔

''گھروں کی
کھلی کھڑکیوں سے
جھانک رہی دوکانیں
ٹوہتے بیوپاری
روشن بازار سب!!
بے چاری ماں کی مٹھی میں
سب کچھ ہے
سوائے
ایک اکنّی کے'' (۱۷)

☆☆☆

ترتیب وانتخاب

نذیر کی ترتیب وانتخاب سے متعلق تصانیف ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔

دلدار ہاشمی فن اور شخصیت:۔

دلداری ہاشمی کے فکر وفن پر نذیر کی یہ کتاب ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ دلدار ہاشمی وہی شخصیت ہیں جن کی شاعری پر نذیر نے اپنی زندگی کا سب سے پہلا ادبی مضمون تحریر کیا تھا۔

اس تصنیف کے چار مضامین خود نذیر نے تحریر کیے ہیں۔ جو دلدار ہاشمی کی شخصیت وفن پر منحصر ہیں ان کے علاوہ علامہ کالی داس گپتا رضا،

عصمت جاوید شیخ اور ناوک حمزہ پوری جیسے قابل احترام حضرات کے گراں قدر مضامین بھی شامل کیے گیے ہیں۔ یہ وہی دلدار ہاشمی ہیں جنہوں نے ابتدائی دنوں میں نذیرؔ کی ادبی طور پر رہنمائی کی تھی دلدار ہاشمی جب تک موجود رہے ہمیشہ نذیرؔ کی پشت پناہی کرتے رہے۔ نذیرؔ بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ چالیس برسوں تک دونوں میں قربت رہی۔ یہاں تک کہ نذیر نے انہیں فتح پور کے مشاعروں میں بھی مدعو کیا اور وہاں کے تمام احباب سے دوبدو ملاقات کرنے کا موقع فراہم کیا۔

علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر:۔

اسباق کے اس نمبر کے مرتبین میں نذیرؔ فتح پوری کے ساتھ ساتھ جناب امین حزیں اور سنجے گوڈبولے بھی شامل ہیں ماہر غالبیات علامہ کالی داس گپتا رضا کی برسی کے موقع پر یہ نمبر اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوء نذیرؔ فرماتے ہیں۔

''رضا صاحب کے فکر وفن کی تمام جہتوں کو الگ الگ ابواب میں پیش کر کے ''رضا فہمی'' کے لیے نئے راستے بھی فراہم کیے ہیں'' (۱۸)

اس نمبر میں مختلف عنوانات کے تحت مقالے قلم بند کیے گئے ہیں جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، عتیق احمد عتیق، ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر اقبال گل، حسن عباس فطرت، مالک رام، ساحر شیوی، علی سردار جعفری، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر یحییٰ نشیط، امین حزیں، سنجے گوڈبولے اور نذیرؔ فتح پوری وغیرہ اہل قلم حضرات کے گراں قدر شحات شامل ہیں جو رضا فہمی کی نئ راہیں وا کرتے ہیں اور ان میں علامہ کالی داس گپتا رضا کے فکر وفن کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ رضا نمبر اس لئے اہمت کا حامل ہے رضا نمبر اس لیے بھی اہم ہے کہ رضا جیسے فنکار کو اردو ادب میں جائز مقام دلا سکے۔

حیدر قریشی فن اور شخصیت:۔

''حیدر قریشی فن اور شخصیت'' اس تصنیف کو سنجے گوڈبولے اور نذیر فتح پوری نے مرتب کیا ہے۔ یہ تصنیف ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل اس تصنیف کو آٹھ ابواب میں تقسیم کر کے مضامین ومنظوم تاثرات پیش کئے گئے ہیں اس تصنیف میں نذیر کے بھی چار مضامین گفت باہمی، لفظوں کا مسیحا، غزلیں، نظمیں، ماہیے اور اردو ماہیے کے سرخیل حیدر قریشی کی خدمت میں نذرِ خلوص (منظوم تاثر) شامل ہیں۔ نذیرؔ کے علاوہ علامہ کالی داس گپتا رضا، علامہ شارق جمال، ڈاکر محبوب راہیؔ، قاضی مشتاق احمد، ڈاکٹر فراز حامدی اور جوگندر پال جیسے قابل احترام حضرات کے مضامین بھی خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔

اس تصنیف کی اشاعت کا سبب بتاتے ہوئے نذیرؔ فرماتے ہیں

''کتاب ''حیدر قریشی......فن اور شخصیت، نہ تو حیدر قریشی کے فن کا محاسبہ ہے، نہ محاکمہ بلکہ یہ ان کے طویل ادبی سفر کی کامیابیوں پر ایک محبت بھرا اخراج ہے چاہتوں کا گلدستہ ہے ان کی ادبی کامرانیوں کا اعتراف ہے۔'' (۱۹)

نذیر کا یہ اعتراف کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ عالمی شہرت کے مالک حیدر قریشی کا اصل نام قریشی غلام حیدر ارشد ہے آپ کے والد کا نام قریشی غلام سرور صاحب تھا۔ آپ کی تاریخی پیدائش سرکاری دستاویزات کے مطابق یکم ستمبر ۱۹۵۳ ہے جبکہ خاندانی روایت کے مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۵۲ء ہے۔ آپ رحیم یار خاں، خان پور (سابق ریاست بھاولپور جو اب پنجاب پاکستان میں شامل ہے) میں پیدا ہوئے اردو میں ایم

اے تک تعلیم حاصل کر کے ۱۹۷۱ سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔اور غزل، نظم، ماہیہ، افسانہ، خاکہ، انشائیہ، سفرنامہ، یادنگاری اور تنقید و تحقیق کے میدان میں متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں سلگتے خواب (غزلیں) عمر گریزاں (غزلیں، نظمیں، ماہیے) محبت کے پھول (ماہیے) دعائے دل (غزلیں، نظمیں) غزلیں، نظمیں، ماہیے (چاروں مجموعوں کا مجموعہ)، روشنی کی بشارت (افسانے)، قصے کہانیاں (افسانے)، افسانے (دونوں مجموعوں کی ایک جلد)، ایٹمی جنگ (تین افسانے اردو اور ہندی میں) میں انتظار کرتا ہوں (افسانے کا ہندی ترجمہ)، میری محبتیں (خاکے) سوئے حجاز (سفرنامہ)، فاصلے کی قربتیں (انشائیے)، افسانے، خاکے، انشائیے، (چار کتابیں ایک جلد میں)، کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری، قسط وار شائع ہوئی)، ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین)، اردو میں ماہیہ نگاری (تحقیق و تنقید)، اردو ماہیے کی تحریک (مضامین)، اور اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین)، وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔آپ نے ایک ادبی رسالہ جدید ادب بھی جاری کیا تھا۔دورِ حاضر میں آپ جرمنی میں مقیم ہیں۔

نذیؔر اپنے مضمون ''لفظوں کا مسیحا'' جو کہ خاکہ نما ہے میں جناب حیدر قریشی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ حیدر قریشی کسی طلسماتی شخصیت کا نام ہے۔جہاں دیکھو وہاں موجود، جب سوچو تب حاضر، اردو کے بیشتر رسائل اور اخبارات پر وہ آسمان کی طرح چھائے ہوئے ہیں، جرمنی میں رہتے ہیں مگر ادب کا ریموٹ کنٹرول ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جس کا استعمال وہ تخریب کے لیے ہرگز نہیں کرتے، البتہ ماہیے کی تحریک میں رکاوٹ پیدا کرنے والوں کو وہ اپنے ریموٹ کنٹرول سے خوفزدہ ضرور کرتے رہتے ہیں۔ریموٹ کنٹرول کے درست استعمال کو وہ ماہیے کے درست وزن کی تحریک کے ساتھ ساتھ چلاتے ہیں۔اپنی اس ہنرمندی کی داد پاتے ہیں اور دل ہی دل میں اس کا جشن مناتے ہیں۔''(۲۰)

یہ تحریر حیدر قریشی کی شخصیت کو مزید سحر انگیز بناتی ہے۔نذیر کی تحریر کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے مضمون میں شگفتہ نثر سے حیدر قریشی کی شخصیت کو مزید خوبصورت بنا کر پیش کیا ہے۔یہ تصنیف نذیر کی نثری کاوشوں میں ایک اہم اضافہ کہی جا سکتی ہے۔

امین حزیں۔شخص شاعر اور استاد:۔

یہ تصنیف ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں نذیؔر کے پانچ مضامین شامل ہیں ان کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی، مناظر عاشق ہر گانوی، قاضی مشتاق احمد، حیدر قریشی اور ڈاکٹر اسلم حنیف کے مضامین بھی ہماری معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

''گفت باہمی'' کے تحت نذیؔر امین حزیں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ جناب امین حزیں شاعری و نثر کے ساتھ ساتھ تقریر کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔کیسا بھی موضوع ہو وہ مدلل اور مسلسل گفتگو کر سکتے ہیں۔جب انہیں کہیں تقریر کرنی ہو تو اس کے پہلے ایسی کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ان تمام خوبیوں کے ساتھ نذیؔر نے امین حزیں کی شخصیت کو نکھارا اور ابھارا ہے۔

عصمت جاوید شیخ:۔

ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ کا اصل نام عصمت اللہ شیخ تھا۔لیکن ادبی دنیا میں عصمت جاوید شیخ کے نام سے شہرت پائی۔آپ ۲/اگست ۱۹۲۲ء کو پونہ میں محلّہ محی آباد میں ایک علمی اور ادبی خاندان میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام منشی عبدالباقی تھا اور دادا عبدالغفور تھے۔آپ کے دادا پونہ کے مشہور شاعر سلیم چشتی پونوی کے بھائی تھے۔عصمت جاوید ایک مشہور و معروف شاعر و ادیب، محقق و نقاد، اور ماہر لسانیات کی بنا پر اردو ادب میں

جانے جاتے ہیں۔اوران کی انہیں خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے نذیر نے ''عصمت جاوید شیخ'' تصنیف کی ترتیب کا کام انجام دیا ہے۔یہ کتاب مارچ ۲۰۰۴ء میں اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ۱۴۴ صفحات پر شائع ہو کر منظر عام پر آئی، کتاب کے سرورق پر عصمت جاوید کی تصویر آویزاں ہے جوان کے سنجیدہ مزاج کی گواہ ہے۔اس کتاب کا انتساب نذیر نے جناب منور پیر بھائی (چیرمین حاجی غلام احمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونے) کے نام کیا ہے پھر گفت باہمی، ڈاکٹر عصمت جاوید کے پونہ میں ڈاکٹر عصمت جاوید کے دادا سلیم چشتی پونوی، والد منشی عبدالباقی، اور ڈاکٹر عصمت جاوید کی غزل گوئی کے زیر عنوان نذؔیر نے عصمت جاوید کی ذاتی اور ادبی شخصیت پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

اس تصنیف کو نذیر نے چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔جس میں عصمت جاوید کے خاندان اور شخصیت، شاعری، ماہر لسانیات اور درسیات، مترجم، ملاقاتیں، تاثرات، لغت کے متعلق کچھ خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔عصمت جاوید کی شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں جن حضرات نے اپنا تعاون مضامین کی شکل میں پیش کیا ان میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، منور جہاں عصمت جاوید (اہلیہ عصمت جاوید) میر ہاشم، علیم صبا نویدی، جلیل الہ آبادی، ڈاکٹر یحییٰ نشیط، احمد اقبال، محمد حسن فاروقی، پروفیسر عبدالستار رودلوی، عبدالحمید خان، رؤف خیر، قاضی مشتاق احمد، جے پی سعید، ڈاکٹر مظہر محی الدین، رشید الدین، ذوالفقار حسین، ڈاکٹر مسرت فردوس، مشتاق مدنی اور نذؔیر فتح پوری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔نذؔیر نے ان سبھی حضرات کے مضامین کو یکجا کر کے اُنہیں چھ حصوں میں ترتیب دیا ہے۔عصمت جاوید کی ادبی زندگی کے آغاز کے متعلق نذؔیر کا خیال ہے کہ

> '' اردو ادبیات کے اُستاد حضرت نکہت شاہجہانپوری کی رہنمائی میں آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔اور عصمت اللہ شیخ سے عصمت جاوید بن گئے۔آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا ابتداء میں آپ کے کچھ افسانے شائع بھی ہوئے لیکن شاعری سے اپنے آپ کو بچانا عصمت جاوید کے اختیار میں نہیں تھا۔'' (۲۱)

عصمت جاوید کی تصانیف میں اکیلا درخت (شعری مجموعہ ۱۹۹۸ء) فکر پیا (لسانیات اور ادبی تنقید۔۱۹۷۱ء) قلب ماہیت (کافکا کے ناول Metamorphosis کا ترجمہ۔۱۹۷۸ء) وجدان (تنقیدی تناظر میں جمالیاتی نظریات کا جائزہ۔۱۹۷۹ء) تاش کا گھر، نئی اردو قوائد، اردو پر فارس کے لسانی اثرات ۱۹۸۷ء عکس، اسرار خودی (علامہ اقبال کی فارسی کتاب اسرارِ خودی کا ترجمہ ۱۹۹۱ء) گلبانگ خیام (عمر خیام کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ) ۱۹۹۱ء) مراٹھی آموز (اردو داں طبقے کے لیے مراٹھی گرامر کی کتاب ۱۹۹۲ء) لالۂ طور (علامہ اقبال کی نظم کا ترجمہ) قفسِ رنگ (پابند نظم، سانیٹ، رباعیات، آزاد نظموں پر مشتمل مجموعہ)، بیاں اپنا اپنا (خاص شعراء اور علماء دین کی نعتوں کا ترجمہ) حضورِ رسالت (علامہ اقبال کی نظم حضورِ رسالت کا منظوم اور نثری ترجمہ) تلفظ نما نعت، اور مرخوابوں کی بستی (خود نوشت سوانح) وغیرہ شامل ہیں۔عصمت جاوید شیخ کی انہیں ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نذؔیر فرماتے ہیں۔

> ''ڈاکٹر عصمت جاوید کے قلم کی روشنائی کبھی خشک نہیں ہوئی، ان کا ذہن ہمیشہ بیدار رہا، ان کی فکر کے موتی ہمیشہ آبدار رہے۔خدا نے ان کو ادب کا جو قیمتی خزانہ عطا کیا تھا، موصوف نے اسے دل کھول کر لٹایا۔اپنے بعد کی نسل کے لکھنے والوں کی آپ نے بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی۔
>
> آپ الفاظ کے تاجر نہیں حاتم رہے۔'' (۲۲)

یہ تصنیف عصمت جاوید کی شخصیت کا مکمل احاطہ پیش کرتی ہے۔اسکے ذریعہ جاوید صاحب کے خاندانی پس منظر کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی

کارگزاریوں سے بھی روبہ روہونے کا موقع میسر آیا ہے۔اور نذیؔر اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس تصنیف کے مواد کو بڑی مستعدی اور چابکدستی سے ترتیب دیا اور جاوید صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

علامہ کالی داس گپتا رضاؔ کے ادبی سفر:-

زندگی ایک مسلسل سفر کی علامت ہے، جو شخص اس دنیا میں آیا ہے وہ ایک مسافر کے مانند ہے،اور مسافر کبھی رکتا نہیں ہے وہ اپنی منزلِ مقصود پر جا کر ہی دم لیتا ہے۔ایسی ہی ایک ہردل عزیز شخصیت کالی داس گپتا رضاؔ کی ہے جو اپنے سفر کے دوران ہردم سرگرم عمل رہے اور اردو کی خدمت میں دل وجان سے حاضر رہے۔

علامہ کالی داس ۲۵ راگست ۱۹۲۵ء کو مکندر پور، ضلع جالندھر پنجاب میں پیدا ہوئے اور ۳ رمارچ ۲۰۰۱ء کو دلی میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے،لیکن اس وقفے میں انہوں نے جو ادبی کارنامے انجام دیے وہ نا قابل فراموش ہیں ان خدمات کو انجام تک پہنچانے کے لیے انہیں جو سفر در پیش آئے وہ بھی اہمیت کے حامل ہیں اُن کے انہیں اسفار کی روداد کو نذیؔر فتح پوری نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر'' میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

سفرناموں کی اہمیت مسلم ہے یہ تاریخی تہذیبی اور سماجی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔اور اپنے عہد و ماحول کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُردو میں سفرنامے بہت پہلے سے لکھے جا رہے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے نذیؔر لکھتے ہیں۔

''اس میدان میں سب سے پہلا جھنڈا تو حیدر آباد دکن کے یوسف خان کمبل پوش نے لہرایا تھا۔انہوں نے ۱۸۳۸ء میں ہندوستان سے محض تفریح اور گھومنے پھرنے کی غرض سے انگلستان کا سفر کیا تھا۔''(۲۳)

لیکن زیر مطالعہ تصنیف کی حیثیت کسی باقاعدہ اور منصوبہ بند سفرنامے کی نہیں ہے رضا ماہر غالبیات تھے۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کی روداد خود نہیں لکھی، رضا صاحب کے انتقال کے بعد ان کی شخصیت پر ایک نایاب دستاویزی نمبر ''اسباق'' کے زیر اہتمام شائع کیا گیا اور فرمائش کر کے یہ سفر سامنے لکھوائے گئے تھے اس تصنیف کے چند سفرنامے اسی رضا نمبر سے اخذ کیے گئے ہیں جن کے عنوانات ہیں۔

(۱) علامہ کالی داس گپتا رضا مشرقی افریقہ میں، از وجے اورن۔(۲) علامہ کالی داس گپتا رضا، پنجاب میں، از شراون کمار ورما (۳) علامہ کالی داس گپتا رضا میسور میں از رزّاق افسر (۴) علامہ کالی داس گپتا رضا ،لندن میں۔از گلشن کھنہ (۵) علامہ کالی داس گپتا رضا شولا پور میں از نذیؔر، یہ پانچوں عنوان سہ ماہی اسباق کے کالی داس گپتا رضا نمبر میں صفحہ ۲۸۴ سے ۳۰۷ تک شامل کئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ ''علامہ کالی داس گپتا رضا کویت میں از محمد کمال اظہر، علامہ کالی داس گپتا رضا آگرہ میں، از اسرار اکبر آبادی، علامہ کالی داس گپتا رضا اودے پور میں از خلیل تنویر، علامہ کالی داس گپتا رضا اودے پور میں از ڈاکٹر پریم بھنڈاری کے زرخیز قلم سے وجود میں آئے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ''نذیر ایک مسافر'' اور نیا دن پھوٹ کر نکلا علامہ کالی داس گپتا رضا کے زور قلم سے وجود میں آئے ہیں۔

اس تصنیف کے چھ مضمون (۱) ''سفرٗ مدام سفر ہے سفر سے کیا ڈرنا (۲) علامہ کالمی داس گپتا رضا چند حقائق (۳) علامہ کالی داس گپتا رضا کا آخری سفر (۴) علامہ کالی داس گپتا رضا جودھپور میں (۵) علامہ کالی داس گپتا رضا کی رباعیات کا سفر اور (۶) علامہ کالی داس گپتا رضا شولا پور میں'' خود نذیر نے تحریر فرمائے ہیں۔

''سفر مدام سفر ہے سفر سے کیا ڈرنا'' اس عنوان میں نذیرؔ نے رضا صاحب کے تخلیقی اور تحقیقی سفر کو چند لفظوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور'' کالی داس گپتا رضا نمبر'' کے لیے انھوں نے جن صاحبان سے مقالے لکھوائے ان کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔'' علامہ کالی داس گپتا رضا چند حقائق اس عنوان میں نذیر نے رضا کی زندگی کے چند اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے جن میں سب سے خاص واقعہ گیان چند جین کا رضا صاحب پر متعصب ہونے کا الزام لگانا ہے۔

رضا نے جین صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس کو انہوں نے رضا کے انتقال کے بعد ماہنامہ شاعر میں شائع کروایا اس خط کا متن کچھ یوں تھا۔

> ''میرے مثنوی، چراغِ دہر، کے اُردو ترجمے کے خلاف ڈاکٹر نقوی نے جو مضمون لکھا تھا، خلیق انجم نے اسے بڑے ٹھسے سے ''ہماری زبان'' میں چھاپا ہے۔ کیا حنیف نقوی صاحب دوسروں کے کام میں کیڑے ڈالنے ہی میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرتے رہیں گے آج کل میری صحت اجازت نہیں دیتی، ذرا ٹھیک ہولوں تو اس کا جواب لکھوں گا، میں نے دیکھا کہ کسی ہندو مشہور شاعر یا ادیب کو بخشا نہیں گیا ہے۔ دیا شنکر نسیم، چکبست، فراق، مالک رام، گیان چند، گوپی چند نارنگ اور اب میں، سبھی پر کیچڑ اچھالی گئی، صرف جگن ناتھ آزاد بچے ہیں کیوں کہ انہوں نے اقبال کی پرستاری میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔'' (۲۴)

اس خط کو لکھنے کی خاص وجہ کیا رہی ہوگی یہ تو نہیں بتایا جا سکتا مگر نذیرؔ اس تعلق سے لکھتے ہیں۔

> ''میرا خیال ہے اس قسم کی تحریر رضا صاحب نے گیان چند کو صرف اس لیے لکھی تھی کہ حنیف نقوی ان کے شاگرد ہیں اور وہ شاید ان کی گوشمالی کریں'' (۲۵)

جبکہ رضا کے دل میں ایسے خیالات بالکل نہ تھے اگر ایسا کوئی جذبہ ان کے دل میں ہوتا تو ساحر شیوی کے اعزاز میں منعقدہ جلسے میں ایک ادبی رسالے کے مدیر نے رضا صاحب کے پیر چھو کر ان کی عزت افزائی کی لیکن رضا صاحب نے انہیں ٹوک دیا اور کہنے لگے کہ۔

> ''جب تمہارا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا تو تم ایسا کیوں کرتے ہو۔'' (۲۶)

اگر ان کے دل میں تعصب جیسا کوئی جذبہ ہوتا تو وہ اس مدیر کی اس حرکت کے باعث دل ہی دل میں خوش ہوتے کہ آخر کار ایک مسلمان اپنے مذہب کی رو سے ہٹ کر میرے سامنے جھک کر میرے پیر چھو رہا ہے۔ لیکن انہوں نے اس مدیر کو روک کر اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ اسلام اور مسلمان دونوں کا ہی ان کے دل میں بے حد احترام تھا۔

اردو رضا صاحب کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور اس حسینہ سے ان کی محبت اپنی حدوں سے تجاوز کر چکی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں مہاراشٹر اردو اکادمی نے انہیں پہلی بار ایوارڈ سے نوازا اس وقت وہاں کے وزیر اعلیٰ منوہر جوشی تھے ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد رضا صاحب نے جوشی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے جو غیر متعصّبانہ تقریر کی اس کے چند الفاظ کچھ یوں تھے۔

> ''جوشی صاحب آپ نے جو بھی انعام دیا ہے یہ مجھے نہیں دیا بلکہ اُردو کو دیا ہے۔''
>
> انہوں نے یہ بھی کہا۔
>
> ''میں اردو سے ہوں، اُردو مجھ سے نہیں،'' (۲۷)

اُردو کے ساتھ جو تعصب کیا جا رہا ہے اُسے ایک غیر ملکی زبان بتایا جا رہا ہے اس کے متعلق رضا صاحب نے ۱۹۹۹ء میں شولا پور کے اردو

میلے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ بہت قیمتی ہیں۔

’’ اُردو زبان دشمنی کا فن نہیں جانتی، اس لیے ہمارے منہ سے اُردو کے متعلق جو بات نکلتی ہے وہ میٹھی اور موافق ہی ہوتی ہے اُردو کے ساتھ جو نا انصافی ہوئی ہے اس کا غبار میرے دل میں بھی ہے مگر اردو زبان کا مزاج مجھے روکتا ہے کہ میں غبار نہیں بلکہ شرینی بانٹوں تو وہی آپ کے پیش نظر ہے۔ اردو کو غیر ملکی زبان کہنا شدید عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ اگر پاکستان میں اردو کی اتنی پذیرائی ہورہی ہے تو ہمیں خوش ہونا چاہیے اور اہل پاکستان کو ہمارا شکر گذار ہونا چاہیے کہ ہم نے انہیں اتنی نفیس، سلیس اور عمدہ زبان دی، اردو ہماری اپنی زبان ہے۔ ہندوستان کی زبان ہے، یہ جہاں بھی جس ملک میں بھی بولی جائے گی ہمارے لیے مسرت کا باعث ہوگی۔‘‘ (۲۸)

’’علامہ کالی داس گپتا رضا کا آخری سفر‘‘ اس عنوان میں نذیؔر نے رضا کے انتقال کی روداد و حالات قلم بند کیے ہیں اور اپنے نجی تاثرات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

رضا صاحب کا انتقال ۲۱/ مارچ ۲۰۰۱ء کو دہلی میں ہوا تھا جبکہ وہ پدم شری ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے دہلی آئے تھے اس سانحہ کی خبر نذیؔر کو ۲۲/ مارچ کو موصول ہوئی۔ نذیؔر اس وقت کی دلی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں۔

’’یہ ۲۲/ مارچ ۲۰۰۱ء کے دن کا واقعہ ہے، میں صبح صبح سنجے گوڈبولے کے گھر کسی کام سے گیا ہوا تھا کہ اچانک سنجے کے فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف انقلاب کے دفتر سے ندیم صدیقی بول رہے تھے انہوں نے پوچھا کہ ’’کیا یہ خبر سچّی ہے کہ کل دہلی میں کالی داس گپتا رضا کا انتقال ہوگیا؟ میں لرز کر رہ گیا۔ جواب میں میں نے کہا کہ مجھے ایسی کوئی خبر نہیں ملی، فون بند ہونے کے بعد سامنے کھڑے ہوئے سنجے سے میں نے کہا کہ اب گپتا صاحب نہیں رہے اور پھر میں رونے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا‘‘ (۲۹)

نذیؔر نے رضا کے انتقال کی خبر سننے کے بعد اپنی متغیر حالت کے بیان کے ساتھ ساتھ ان چند خاص لوگوں کے تاثرات کو بھی شامل عنوان کیا ہے جو ۲۳/ مارچ کے شمارۂ انقلاب میں رضا کے انتقال پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں یوسف ناظم (ادیب و شاعر) حسن کمال (صحافی ادیب و شاعر) ڈاکٹر یونس اگاسکر (ادیب و مترجم) محمود ایوبی (افسانہ نگار) عبداللہ کمال (شاعر و صحافی) عبدالاحد ساز (شاعر و ادیب) اور خود نذیر فتح پوری کے تاثرات کو شامل کیا گیا ہے۔ نذیر کے تاثرات شمارے میں سب سے آخر میں قلم بند کیے گیے تھے ملاحظہ کریں۔

’’رضؔا صاحب کی رحلت سے اُردو تحقیق، اور تنقید کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں اور ہماری گنگا جمنی تہذیب دھواں ہوتی نظر آرہی ہے جس کی بنا چکبست، لبھو رام جوشؔ، مالک رام، دتاتریا کیفی اور تلوک چند محروم جیسے بزرگوں نے ڈالی تھی۔ ان کے بہت سے کام ادھورے رہ گئے کاش اردو دنیا ان کے ورثے کو فروغ دے سکے کہ اس میں ان کے تئیں سچا خراجِ عقیدت چھپا ہوا ہے۔‘‘ (۳۰)

رضا صاحب کے انتقال کے بعد بطورِ خراج تحسین نذیؔر نے اسباق کا رضا نمبر شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور ۲۰۰ صفحات کا رضا نمبر شائع کرنے کا قصد کرلیا۔ لیکن امید سے بڑھ کر کام ہوا اور صفحات کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ۴۰۰ ہوگئی۔ اور اس کارِ خیر کو نذیؔر نے چند خاص لوگوں کے تعاون سے منصوبہ بند طریقے سے انجام تک پہنچایا۔

''علامہ کالی داس گپتا رضا شولا پور'' میں اس عنوان میں نذیؔر نے رضا کے شولا پور میں اُردو میلے میں شرکت کرنے کا ذکر کیا ہے یہ میلا ۱۲/ مارچ ۱۹۹۹ء کوشولا پور میں منعقد کیا گیا۔ ۱۲/ مارچ کو میلے کا افتتاح رضا کے مبارک ہاتھوں سے ہوا اس افتتاحیہ میں انہوں نے ایک نظم اور ایک قطعہ خاص طور پر عاشقانِ اردو کے لیے پڑھے اس قطعہ میں اُردو کے درخشاں مستقبل کے لیے دعا مانگی گئی ہے۔ اس میلے کے تیسرے دن ۱۴/ مارچ کو ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا تھا جس کے مہمان خصوصی رضا صاحب تھے اس مشاعرے کی صدارت کا شرف علی سردار جعفری کو حاصل ہوا۔

''علامہ کالی داس گپتا رضا، جودھپور میں'' اس عنوان میں رضا کے جودھپور کے سفر کا بیان کیا گیا ہے جب پہلی بار ۱۹۸۸ء میں وہ جودھپور تشریف لائے تھے اور یہاں کے قلعہ کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے تھے۔ قلعہ کی پُر وقار شان و شوکت نے انہیں یہ رباعی لکھنے پر مجبور کر دیا۔

'' شب بھر تو نڈر قلعہ کھڑا تنتا ہے
دن چڑھتا ہے دیواروں سے دل چھنتا ہے
جیسے تن و روح سے بشر بنتے ہیں
اخلاص و وفا سے جودھپور بنتا ہے (۳۱)

''علامہ کالی داس گپتا رضا کی رباعیات کا سفر'' اس عنوان سے رضا کی رباعیات پر گفتگو کی گئی ہے رضا نے تحقیق کے ساتھ ساتھ رباعیات بھی لکھی ہیں، اپنی رباعیوں میں ہمیں وہ اپنے وجود پر یقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں ہندو میتھولوجی کو بیان کرتے ہوئے ان کی کچھ رباعیات روایتی انداز کی بھی ہیں انہوں نے تمام شعری اسالیب کا استعمال کیا ہے مثلاً مکالمہ، بیانیہ، خطابیہ ان کی رباعی ہر انداز میں ملتی ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہوں۔

''سورج میں ہوں، چاند میں ہوں، ہالا میں ہوں
اوّل سے آخر تک اجالا میں ہوں
بخشی ہے حیات کو ''شعاعِ جاوید''
ظلمات کو مات دینے والا میں ہوں (۳۲)

نذیؔر نے اپنی اس کتاب کے آخر میں علامہ کالی داس گپتا رضا کے لکھے ہوئے دو مضمون بھی قلم بند کیے ہیں جو انہوں نے نذیؔر کی تصانیف ''تیسرا سفر'' اور نیا دن پھوٹ کر نکلا پر تحریر فرمائے تھے۔

نذیؔر ایک مسافر (تیسرا سفر) اس عنوان میں رضا نے نذیر کے تیسرے شعری مجموعے تیسرا سفر پر تبصرہ کیا ہے حالانکہ تبصرہ بہت مختصر ہے لیکن بہت ہی خاص اور مفید معلومات فراہم کرواتا ہے ایک انوکھے رنگ میں رنگا یہ تبصرہ نذیؔر کی شعری صلاحیتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس تبصرہ میں رضا ''یہ نذیر کون ہے؟ اس سوال کو خود ہی ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر خود ہی اس کا جواب ان الفاظ میں دیتے ہیں

''یہ ہے ہندوستان کے تقریباً ہر رسالے میں چھپنے والا، ڈرامے، افسانے، ناول لکھنے والا اور بیشتر شعر کہنے والا، پونہ کے مشہور رسالہ اسباق کا مدیر و مالک اور میرا عزیز۔'' (۳۳)

اس تبصرہ کا اختتام رضا نے اس سوال پر کیا ہے کہ ''کیا نذیؔر کا سفر آج بھی جاری ہے''؟ اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ہاں ان کا سفر آج بھی مسلسل جاری ہے وہ ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح کہیں رکے یا بیٹھے نہیں ہیں بلکہ سفر کی ان گنت مشکلوں کو برداشت کرتے ہوئے اور

منازل کو پار کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جارہے ہیں جس کا مبینہ ثبوت ان کا چوتھا شعری مجموعہ 'سفر مدام سفر (۲۰۰۸) تتلیوں بھرا آسمان (۲۰۱۲) اور دیوانِ نذیؔر فتح پوری (۲۰۱۲) اعتراف (۲۰۱۲) نظم سفر (۲۰۱۴) اور اس کے علاوہ بھی بہت سی تصانیف ہیں جو یکے بعد دیگرے شائع ہوتی آرہی ہیں۔

''نیا دن پھوٹ کر نکلا'' اس عنوان میں رضا نے نذیؔر کے شعری مجموعے ''نیا دن پھوٹ کر نکلا'' پر خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازہ ہے، نذیؔر کے اس مجموعے میں غزل، نظم، گیت، دوہے، ماہیے اور کہہ مکرنیہ وغیرہ موجود ہیں۔ نذیؔر غزلوں کے میدان میں تو اپنا خاص مقام بنا ہی چکے ہیں ان کے گیت بھی اپنی دلکشی کے سبب ایک الگ ہی فضا قائم کرتے ہیں۔ ان کے ایک خوبصورت گیت کے چند بول ملاحظہ ہوں۔

''میرے گیت مجھے واپس کر دے

اے میرے درد کے سودائی

میری پریت مجھے واپس کر دے

گیتوں کے ساتھ ساتھ غزل تو ان کا خاص میدان ہے ہی اس کے متعلق رضا صاحب کا ماننا ہے کہ

''نذیؔر کا یہ غزلیہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ چھوٹے چھوٹے اور اوسط درجے کے اوزان میں شعر کہنا ان کا اسلوب ہے۔ (۳۴)

اس تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حسن عباس فطرت اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں۔

''اگر آدمی کی سیرت کے خدوخال کا محاسبہ مقصود ہو تو اسے مرض یہ سفر میں دیکھو۔ اس طرح نذیؔر فتح پوری نے گپتا رضا لائق رشک و تقلید خصائل و کردار کو مزید رنگ و روغن دیدیا ہے اور ان کے اسفار کو مقامی ادیبوں اور شعراء سے لکھوا کر ان کے صفاتِ حسنہ کو زیادہ جاندار بنا دیا ہے۔'' (۳۵)

اپنے اسی مضمون میں حسن عباس فطرت اس کتاب کے وجود میں آنے کا جو مقصد بیان کرتے ہیں وہ انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں

''اس کتاب کے ظہور میں آنے کی علت غائی ہے کہ گیان چند جین صاحب کی کتاب کے باعث جو بدنامی رضا صاحب کی ہوئی اس کا اب تک کسی قریب ترین دوست تک نے جواب نہیں دیا تھا۔ نذیؔر فتح پوری نے مختلف شواہد و دلائل و ذاتی تجربہ کا حوالہ دیتے ہوئے گپتا صاحب کے موقف کو واضح کیا ہے اور ان کے خلوص، بے تعصبی، اردو سے شدید محبت اور شہرت سے بے تعلقی کو الم نشرح کیا ہے۔'' (۳۶)

زیر نظر تصنیف ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل اس تصنیف میں رضا کی شخصیت، ادبی صلاحیتوں اور کاوشوں نیز ان کے پختہ عزم اور یقین کامل کا اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی جن جن مقامات کا انہوں نے سفر کیا ان مقامات کی سیاسی، سماجی اور ادبی فضا کی بھی عکاسی موجود ہے رضا کے تحقیقی اور تخلیقی سفر پر یہ ایک بھرپور تصنیف ہے۔

جلیل الہ آبادی شخصیت اور شاعری:۔

دورِ حاضر میں جبکہ انسان اپنے آپ کو ہی سب سے برتر و بالا سمجھتا ہے ایسے میں کسی شخص کی قدر و قیمت متعین کرنا اسے اپنا حق دلانا یہ ہر

کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہر کوئی شخص اس کام کو انجام نہیں دے سکتا، لیکن نذیؔر نے یہاں بھی دلداری کا ثبوت دیتے ہوئے جلیل الہ آبادی کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تصنیف ''جلیل الہ آبادی شخصیت اور شاعری'' کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اس تصنیف کو دو باب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب شخصیت پر مشتمل ہے اس میں نذیؔر نے جلیل الہ آبادی کے لیے توشیحی نظم تحریر کی ہے جس میں بڑے خوبصورت انداز میں جلیل کی پوری شخصیت کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے جلیل کی زندگی کے متعلق سوچ، فکر و عمل، ان کی شاعری و مرتبہ سب کچھ بیان کر کے ساتھ ساتھ ان کے لیے خدائے تعالیٰ سے دعا گو بھی ہوئے ہیں۔

اُڑان بھر کے نئے آسماں تلاش کئے
جلائے فکر و عمل کے کہاں کہاں نہ دیئے
یونہی گزاری نہیں زندگی خلاؤں میں
نہیں چلائے کبھی تیر یوں ہواؤں میں
ادب میں یونہی کبھی مرتبہ نہیں ملتا
لہو نہ ہو تو کوئی بھی دیا نہیں جلتا
برائے شعر کبھی شاعری نہیں کی ہے
غزل کو فکر کے جلوؤں کی روشنی دی ہے
دراز سلسلے عمر رواں کے ہو جائیں
غزل کے باغ میں کچھ اور تخم بو جائیں (۳۷)

پھر گفتِ باہمی کے عنوان سے نذیؔر نے جلیؔل کی پیدائش سے لے کر دورِ حال تک کی زندگی کو بیان کیا ہے۔ اس باب میں ان کی پیدائش، پرورش، تعلیم، فکر معاش، پونہ میں قیام، پونے سے اورنگ آباد روانگی یہ سب حالات مختصر انداز میں قلم بند کیے ہیں۔

بعد ازیں جلیؔل آلہ آبادی کچھ باتیں کچھ یادیں'' عنوان میں نذیؔر نے جلیل کے شعری مجموعوں ان کے رفیق و احباب اور جلیل کے بارے میں ان کی رائے اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی کچھ خاص یادوں کو دہرایا گیا ہے ایک جگہ نذیؔر نے جلیل کی شخصیت کی قلمی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے۔

''سانولا رنگ، درمیانی قد، ہونٹوں کے پس پردہ دبی پان کی پیک، شفیق آنکھیں، رفیق سوچیں، ضمیر زندہ، چہرہ سنجیدہ، لباس سادہ، دل کشادہ ہر قسم کی خدمت کے جذبے سے بھرا دل، جب تک پونہ میں رہے پونہ کی فضا کو مشاعروں کی خوشبو سے مہکایا۔
کئی نمائندہ شاعروں کو پونہ بلوایا، یوں بھی اپنی کرامت دکھائی راجندر سنگھ بیدی سے صدارت کرائی، آزادی کے بعد پہلا شعری مجموعہ لہو رنگ چھپوایا ''راجندر سنگھ بیدی'' سے مقدمہ لکھوایا، اور مجروح سلطانپوری سے اجراء کرایا، اس مجموعہ پر یوپی اردو اکادمی سے انعام پایا۔ (۳۸)

کہنے کو تو یہ نثر ہے مگر اسے بھی نذیؔر نے شاعری کے پیکر میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔

''جلیل الہ آبادی اور پونہ'' اس عنوان سے نذیؔر نے جلیل کی پونہ سے محبت ان کے رفقاء سے جلیل کے مراسم اور پونہ سے دلی لگاؤ کا بیان

کیا ہے ایک خط جو جلیل نے نذیرؔ کے نام لکھا ہے اس میں وہ پونہ کے لیے اپنی دلی محبت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''میری جان ہے پونہ

اس خاکِ دکن پر میرا ایمان ہے پونہ

دنیائے ادب میں میری پہچان ہے پونہ

ویسے تو مرے دیش کا ہر شہر ہے اپنا

واللہ میرا جسم میری جاں ہے پونہ'' (۳۹)

ان چار عنوان کے علاوہ اس باب میں ''اعتراف'' از قاضی مشتاق احمد، جلیل الہ آبادی۔ کچھ یادیں از دلدار ہاشمی، فکر وفن کا آئینہ حضرت جلیل از جمشید عالم فتح پوری، اہلیہ محترمہ کے انتقال پر از جلیل الہ آباد بھی شامل ہیں۔

اس تصنیف کا دوسرا باب جلیل کی شاعری پر مشتمل ہے جو (۱۶) سولہ حصوں پر بعنوان (۱) کچھ لہورنگ کے بارے میں از راجندر سنگھ بیدی، ۲) تاثرات از مشیر احمد، (۳) قطعہ تاریخ از نیر سلیمی (۴) قطعہ تاریخ اشاعت لہورنگ از حکیم رازی ادیبی، (۵) لہورنگ شہر وفا ہو رہا ہے، عالم فتح پوری (۶) چوراہا میری نظر میں ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ (۷) کچھ چوراہا کے بارے میں۔ قاضی سلیم (۸) جلیل الہ آبادی کا شعری سفر از میر ہاشم (۹) جلیل الہ آبادی کی مقطع نگاری از رفیق جعفر (۱۰) جلیل عصر حاضر کے نمائندہ شاعر از رفیق شاہین (۱۱) ایک منفرد آواز جو صدا بصحرا نہیں از عبدالوہاب جذب (۱۲) فکر وفن کا سدا بہار شجر از ڈاکٹر لطیف سبحانی (۱۳) جلیل الہ آبادی کی غزل از شاہد پٹھان (۱۴) جلیل آلہ آبادی، الہ آباد سے اورنگ آباد تک از محمد خواجہ معین الدین۔ (۱۵) غیر مطبوعہ کلام از جلیل الہ آبادی (۱۶) نظم از نذیر فتح پوری، شامل ہیں ان سبھی حضرات نے جلیل کی شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔

اس تصنیف کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جلیل گروہ بندی میں یقین نہیں رکھتے تھے وہ قدیم اور جدید شعراء کا احترام کرتے ہیں لیکن تقلید سے پرہیز کرتے نظر آتے ہیں انہوں نے اپنی راہیں خود ہموار کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کی شاعری عام فہم ہے بلکہ کلاسیکیت اور جدیدیت سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن انفرادیت بھی موجود ہے نذیرؔ کی یہ تصنیف ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اپریل ۲۰۰۸ء میں اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ نذیرؔ نے اس تصنیف میں دریا دلی کا ثبوت دیا اور جلیل کی شخصیت اور شاعری کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کرنے کے لیے خود بھی لکھا اور اپنے رفقاء سے بھی لکھوایا۔

اصغر ویلوری کی غزلیہ شاعری:۔

جناب وی، ایس اسماعیل بیگ۔ دنیائے اردو ادب میں اصغرؔ ویلوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور یہ تصنیف جس کا نام ''اصغر ویلوری کی غزلیہ شاعری'' ہے انہیں کی ادبی خدمات کا اعتراف ہے۔ جسے ''نذیرؔ نے ترتیب دیا ہے۔ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی یہ تصنیف اصغر ویلوری کی غزلیہ شاعری کا احاطہ کرتی ہے اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔

اصغر ویلوری کے شعری سرمایے میں'' حروف (شعری مجموعہ غزل، رباعیات اور قطعات) ۱۹۹۲ء، نقوش اصغر (رباعیات)، کھلے الفاظ (غزلیں)، رباعیات اصغر (رباعیات)، رقصِ قلم (غزلیں) اور حق نما (نعتیں) وغیرہ شامل ہیں ان سبھی تصانیف کو اہل ادب نے کھلے دل

سے اپنایا اور ان پر اپنی ناقدانہ رائے بھی تجویز کی جس کی جھلکیاں اس تصنیف کے مضامین میں نمایاں ہوتی ہے۔اس تصنیف میں تقریباً ۱۵ مضامین شامل ہیں یہ تمام مضامین نذیر کی کڑی محنت اور لگن کے سبب اس کتاب میں یکجا ہو پائی ہیں۔اس کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے نذیر گفت باہمی میں فرماتے ہیں۔

''اس کتاب میں شامل تمام مضامین کے توسط سے شاعر کی سخن طرازیوں کے الگ الگ رنگوں کا احاطہ کیا گیا ہے ہر رنگ چوکھا ہے روشن ہے، جھلمل کرتا ہوا ہے۔'' (۴۰)

''پیش لفظ'' کے زیر عنوان اصغر صاحب نے اپنی ادبی کارگزاریوں کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ان کے حالاتِ زندگی سے بھی واقف کروایا ہے یہ تصنیف اصغر ویلوری کی شاعری میں نئے نئے گوشوں کی تلاش میں سرگرداں ہے اور ان کی شاعری کے رنگارنگ پہلوؤں سے شرابور ہے ان تمام رنگوں کو ایک جگہ یکجا کرنے کا مشکل کام نذیر نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے جس کے لئے اصغر ویلوری نذیر کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں

''جناب نذیر صاحب جن سے مرے دیرینہ مراسم ہیں، انہوں نے اپنے منفرد لہجے میں سیر حاصل مقدمہ رقم فرمایا ہے اور مرتب کی ذمہ داری بحسن وخوبی نبھائی ہے۔ میں ان کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔'' (۴۱)

اصغر کی شاعری اردو ادب میں کیا مقام رکھتی ہے اس کا اندازہ اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی جیسا نقاد بھی ان کی شاعری پر ان الفاظ میں اپنے تاثرات سپردِ قلم کرتا ہے۔

''مجموعی طور پر میں نے آپ کی غزلوں میں دلکشی اور لطافت خیال دیکھی زبان کی صفائی اور خوبی کا آپ خاص خیال رکھتے ہیں یہ بھی آپ کی شاعرانہ پختگی کی دلیل ہے۔'' (۴۲)

جناب محبوب راہی نے بھی اصغر ویلوری کی شاعری پر طویل مقالہ لکھا جو نہایت معلوماتی ہے۔ جناب رفیق جعفر اصغر کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اصغر ویلوری کی غزلیہ شاعری صاف شفاف اخلاقیات، سچے جذبات اور زندگی کی حقیقتوں کی شاعری ہے، اس میں حالی کی مقصدیت بھی ہے، اقبال کی مذہبیت بھی، غالب کی گہرائی بھی ہے اور جگر کی شوخی بھی۔لیکن یہ بات تو صاف ہے کہ انہوں نے زندگی کو کسی دوسرے کی عینک لگا کر نہیں دیکھا بلکہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' (۴۳)

رفیق جعفر کے اس قول کی روشنی میں اصغر ویلوری کی شاعری اور بھی شستہ اور شائستہ انداز میں ہمارے سامنے آجاتی ہے خود نذیر بھی اصغر کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف اس انداز سے کرتے ہیں۔

''جہاں تک اصغر ویلوری کی تخلیقی صلاحیتوں کا سوال ہے، خدا نے یہ بیش بہا نعمت انہیں خزانے بھر کر عطا کی ہے۔ موصوف نے اس دولت کو دونوں ہاتھوں سے بے مقصد نہ لٹاتے ہوئے انتہائی سلیقے، ہنر اور تخلیقی دردمندی کے ساتھ مقفیٰ اور مسجع پیراہن عطا کر کے اہل بصیرت اور بصارت کے روبرو پیش کیا ہے۔ پرکھنے والوں نے جسے پرکھا اور جانچنے والوں نے جسے جانچا۔ کھرا سونا وہ ہے جو ہر کسوٹی پر کھرا اترے۔ جس کی چمک دمک ورنگ وروپ تا حیات قائم رہے۔'' (۴۴)

مختلف حضرات کی رائے نے اصغر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اپنی ناقدانہ نظر ڈالی اوران کی خوبیوں اور خامیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے،اوران کی یہی ناقدانہ رائے اردوادب میں اصغرویلوری کا مقام ومرتبہ متعین کرتی ہے۔

ڈاکٹرنورالسعید اختر۔تحقیق ،تنقیداور تخلیق کے تناظر میں:۔

ڈاکٹرنورالسعید اختر گلشن اردو کے وہ درخشاں ستارے ہیں جن کی خدمات کوفراموش نہیں کیا جاسکتا اوران کی انہیں خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے ڈاکٹر نذیر فتح پوری نے اپریل ۲۰۱۰ء میں ’’ڈاکٹرنورالسعید اختر۔تحقیق تنقیداور تخلیق کے تناظر میں‘‘ کے زیرعنوان کتاب مرتب کی جس میں مختلف اہل قلم حضرات کے کم وبیش ۲۰ مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔اس کتاب کی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے نذیر فرماتے ہیں۔

’’ڈاکٹرنورالسعید اختر کے فکروفن پر پہلی بارزیرمطالعہ کتاب مرتب کی جارہی ہے۔جومضامین ان کے فکروفن پر مرتب کیے گئے ہیں وہ الگ الگ وقتوں میں الگ الگ اہل قلم نے لکھے ہیں۔‘‘(۴۵)

ڈاکٹر اختر کے والد کا نام محمد عبدالحمید تھا۔آپ ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کوکھام گاؤں (ضلع بلڈانہ مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد مہاراشٹر میں اسسٹنٹ کلکٹر کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں آپ نے ۱۹۶۲ء میں فارسی ادب میں ناگپور یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن کیا۔اور درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔پھرممبئی یونیورسٹی سے وجہی کی نثری تصانیف ’تاج الحقائق‘ کی تنقیدی تدوین کے موضوع پر پروفیسرنظام الدین گوریکر کی رہنمائی میں تحقیقی مقالہ تحریرکیااور ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔آپ کی تصانیف میں تاج الحقائق از ملا وجہی ۱۹۷۱ء نقوش دکن ۱۹۷۶ء مثنوی گلزاروحدت ۱۹۷۹ء مغلوں کا شوقِ شکار ۱۹۹۳ء دیوانِ غلام محمد میاں سمجھوسورتی ۱۹۹۳ء مثنوی بہرام وگل اندام ۱۹۹۹ء تیشۂ فرہاد ۲۰۰۰ء کیف رشید (تدوین) ۲۰۰۲ء ضرب تیشہ ۲۰۰۳ء مضراب دکن ۲۰۰۶ء پروفیسرشیخ چاندابن حسین ناگوری ۲۰۰۷ء دیوانِ شاہ ضیاالدین پروانہ ۲۰۰۷ء رنگ وآہنگ (محمد حفیظ الکبیرقریشی احوال وافکار) ۲۰۰۸ء نازش دکن ۲۰۰۹ء اورسوغات دکن (معروف شخصیات پرمضامین) ۲۰۱۰ء وغیرہ شامل ہیں

ڈاکٹراختر کی شخصیت اورادبی کاوشات پراظہارخیال کرتے ہوئے نذیرفرماتے ہیں۔

’’نورالسعید اختر کاتعلق دکن کی سرزمین سے ہے۔دکن کی مٹی میں علم وادب کے نایاب گوہرُ لے ملے پڑے ہیں۔ان گوہروں کوڈھونڈ ڈھونڈکر، پونچھ پونچھ کر، اُجال اجال کرصفحہ قرطاس پرسجانے کا کام اختر صاحب برسوں سے انجام دے رہے ہیں۔اور اب وہ خودبھی ان قیمتی گوہروں میں شمار ہونے لگے ہیں جن کی تاب وتوانائی سے عروسِ دکن کے ماتھے کاجھومرجگمگا رہا ہے۔‘‘(۴۶)

نذیر کی اس تحریر کے آئینے میں ڈاکٹراختر کی صاف اورشفاف تصویراور بھی نکھر کرسامنے آتی ہےاوران کا یہ قطعہ اختر کی شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

رنگین پتھروں کوا تنا سنوارتا ہے
تحقیق بیں نظر سے،ان کونکھارتا ہے
نورالسعید اختر، اردو کا کوہکن ہے
یہ تیشہ ٔقلم سے، ہیرے تراشتا ہے

ماں کے نام:۔

خدا نے ''ماں'' کے قدموں تلے جنت بنائی ہے۔ ''ماں'' ایک ایسا لفظ جو ہر درد و غم رنج و مصیبت اور آفت و پریشانی میں بے ساختہ منھ سے نکل جاتا ہے اور شدتِ رنج و غم کم ہوتا نظر آتا ہے جس کے سبب انسان راحت و سکون محسوس کرتا ہے۔

اسی عظیم ہستی ''ماں'' کو خراج تحسین عطا کرتے ہوئے نذیر نے اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ۲۰۱۰ء میں ''ماں کے نام'' زیر عنوان تصنیف مرتب کی، ۳۶۲ صفحات پر مشتمل اس تصنیف میں غزل، نظم، قطعہ، لوری، دوہے، دوہا نظم، ماہیہ، گیت، افسانے، کہانیاں، افسانچے، مقالات اور تاثرات کے ذریعہ شعراء و ادب سے ''ماں'' کی محبت کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ ان حضرات میں ہندوستان اور بیرون ممالک کے معزز اہل قلم کار شامل ہیں جن میں ڈاکٹر محبوب راہی ڈاکٹر فیروز عالم، آصف الرحمٰن طارق، عارف نقوی، تسنیم ثنا خان گلشن کھنہ، صفوت علی صفوت، منور احمد کنڈے، سید جعفر امیر، پروین شیر، اقبال حیدر، اسحاق ساجد، رفیق شاہین، حیدر قریشی، قدرت اللہ شہاب، علامہ کالی داس گپتا رضا، پروفیسر اقبال گل، منشا خورشید، نذیر فتح پوری اور مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

نذیر نے بھی چند افسانچے، ماں کا آخری سفر پریتا بھارگو کی پانچ ہندی نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر، رمیش بھوجک کی کہانی ''شنکر کی ماں'' کو اردو میں ترجمہ کر کے اور اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعہ اپنی ماں سے اپنی محبت کا اظہار اور ان کے انتقال پر اپنے دلی جذبات کا بیان کیا ہے اور ''انتساب'' میں عقیدت کے پھول ان الفاظ میں پیش کیے ہیں۔

''دعاؤں کے صحیفے پڑھ رہا ہوں
عبادت کے طریقے پڑھ رہا ہوں
مجھے یاد آ رہی ہے اپنی ماں کی
میں ممتا کے وظیفے پڑھ رہا ہوں (۴۷)

نذیر کے یہ اشعار ان کی دلی کیفیت کے غماز ہیں۔ اصل میں یہ کتاب اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء کا اسباق کا شمارہ ہے جو''ماں کے نام'' عنوان سے شائع ہوا تھا بعد میں نذیر نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ ماں کے وجود کو تحریری روپ میں پیش کر کے نہ صرف ماؤں کی دعائیں حاصل کی ہیں بلکہ ماں کے احساس اور اس کی محبت و خلوص کو مختلف رنگوں میں پیش کر کے ''ماں'' کو نظم و نثر کی دنیا کا سرتاج بنا دیا۔

آزاد بنام نذیر:۔

خطوط شروع سے ہی دو افراد کے بیچ رابطہ قائم کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں ایسے ہی دو افراد کے مابین خط و کتابت کو نذیر نے اپنی تصنیف ''آزاد بنام نذیر'' میں شائع کر دیا ہے دراصل اس تصنیف میں نذیر نے آزاد کے ان ۳۹ خطوط کو شامل کیا ہے جو انہیں آزاد نے خطوط کے جواب میں لکھے ہیں یہ تمام خطوط ۳۰ نومبر ۱۹۷۸ تا ۱۴ جنوری ۲۰۰۴ کے درمیان وقفہ میں تحریر کیے گئے ہیں۔

آزاد نے نذیر کو پہلا خط تب لکھا جب نذیر نے ''سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' کے عنوان سے اردو کی تعریف و توصیف میں شعراء سے نظمیں لکھوائیں۔ اور اس تعلق سے انہوں نے آزاد کو بھی خط لکھا جس کا جواب انہیں مع نظم ۳۰ نومبر ۱۹۷۸ کو ارسال ہوا اس کے بعد خط و کتابت کا جو سلسلہ شروع ہوا تو ایک طویل مدت تک جاری رہا۔ نذیر نے اس تصنیف میں جن خطوط کو شامل کیا ہے وہ دراصل انہیں کی ایک

تصنیف ''جگن ناتھ آزاد ایک مستقل ادارہ'' کے مواد کو یکجا کرنے اور ترتیب دینے کے باعث لکھے گئے ہیں۔ان خطوط میں چند خطوط طویل بھی ہیں لیکن ان کی طوالت بے مقصد نہیں ہے ان طویل خطوط میں بہت سے اہم سوالوں کے جواب اور بہت سے خاص مسائل کی عقدہ کشائی کی گئی ہے۔

اس تصنیف کا آغاز ''جگن ناتھ آزاد سے مراسلت'' کے عنوان سے ہوتا ہے اس کے بعد مختلف عنوان مثلاً آزاد صاحب کی تحریر، آزاد کے فکر وفن پر پہلی کتاب، آزاد سے انٹرویو، پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے تحریری مکالمہ اور اس کے بعد خطوط شامل کیے گیے ہیں، تمام خطوط کے بعد آزاد کا غیر مطبوعہ کلام جس میں غزلیں، نظمیں، اور کچھ اشعار ہیں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ بعدازاں ایک خطبہ جو کہ عمان میں جشن آزادی کی تقریب کے موقع پر شاعر، نقاد و محقق پرتو روہیلہ نے پیش کیا تھا کو بھی شامل کیا گیا ہے اور اس جشن کی رپورٹ بھی شامل کی گی ہے۔

اس تصنیف میں نذؔیر نے ہر خط کے ساتھ نوٹ شامل کیے ہیں۔خط میں جو گفتگو کی گئی ہے اس کے متعلق ضروری معلومات کو ان میں تحریر کیا گیا ہے اسی طرح کے ایک نوٹ سے نذیر کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوتی ہے کہ زندگی نے انہیں ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں ۱۸۲ روپے بھی ان کے لیے جوئے شیر لانے کے برابر تھے۔

''نوٹ:۔اس خط کی کئی باتیں وضاحت چاہتی ہیں۔میری کتاب جگن ناتھ آزاد ایک مستقل ادارہ کی بلٹی جب مجھے آزاد صاحب نے ارسال کی تو واقعی ایک ہفتہ زائد بیت جانے کے بعد بھی مجھ سے بلٹی چھڑانے کے لیے ۱۸۲ روپے کا انتظام نہ ہو سکا اور اس طرح کتابوں کا پارسل حاصل کرنے میں مجھ سے تاخیر ہوئی۔'' (۴۸)

نذؔیر نے اپنی کتاب جگن ناتھ آزاد کے خطوط کو بڑے سلیقے اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے ان کے مطابق یہ کتاب اپنے موضوع ومواد کے لحاظ سے اولیت کا شرف حاصل کرنے کی مستحق ہے۔جس کا ثبوت ان کی یہ تحریر ہے۔

''مجھے نہیں معلوم کہ اس سے پہلے کسی اور نے آزاد صاحب کے خطوط مرتب کر کے شائع کیے ہوں اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ سعادت بھی راقم التحریر ہی کے حصے میں آئی کہ پہلی بار آزاد صاحب کے خط کتابی صورت میں شائع کیے جا رہے ہیں۔'' (۴۹)

۸۰ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف ۲۰۱۱ میں اشاعت پذیر ہوئی۔اس تصنیف پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب حبیب کیفی اپنے مضمون 'نذیر فتح پوری دھنک رنگ شخصیت' میں رقم طراز ہیں۔

''سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل کے فاصلے پر بسنے والے قلم کے سپاہی کس طرح قریب سے قریب تر ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے لئے اہم ترین ہو اٹھتے ہیں یہ بات ان خطوط سے اجاگر ہوتی ہے۔کتاب میں جگن ناتھ آزاد کی تحریر، فکر وفن کے علاوہ قابل مطالعہ تحریری مکالمہ بھی ہے جو آزاد کے فنی نظریات کے ساتھ ہی زندگی کے رویوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔'' (۵۰)

اس تصنیف پر اپنی رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر عظیم راہی فرماتے ہیں۔

''آپ نے جگن ناتھ آزاد کے خطوط اپنے نام شائع کر کے بڑا اہم کام کیا ہے۔ان خطوط کے مطالعے سے جہاں آپ کی زندگی کے نشیب وفراز اور اسباق کے ابتدائی دنوں کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔کس جانفشانی سے آپ نے اولاد کی طرح اپنے پرچے کو پروان چڑھایا ہے اپنے خون پسینے سے سینچا اور سنوارا ہے۔وہیں جگن ناتھ آزاد کی ادبی مصروفیتوں سے بھی واقفیت ہوتی ہے اور اس بات کا علم بھی ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا شاعر اپنی تخلیق کی اشاعت کے لیے کتنا فکر مند رہتا ہے اور اپنی تخلیق کے چھپنے پر اسے کسی قدر مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ (۵۱)

کلیاتِ آزادسیکری:۔

راجستھان کے معروف شاعر عبداللہ آزادسیکری کے کلیات کو ترتیب دے کر شائع کرنے کا سہرا نذیر کے سر بندھا ہے۔'' کلیات آزادسیکری'' کے نام سے یہ تصنیف فروری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی آزاد کے گھریلو حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے سید شبیر علی آثرسیکری فرماتے ہیں

'' آپ (آزادسیکری) سیکر میں نصیرالدین صاحب رنگریز کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پیدائش سے ہی آپ کو افلاس نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔آپ کے والد رنگسازی کا کام کرتے تھے۔'' (۵۲)

آزادسیکری کے ابتدائی و معاشی حالات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے نذیر فرماتے ہیں۔

'' وہ ایک غریب رنگیریز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی برادری کے تمام افراد کپڑوں کو رنگ دیا کرتے تھے۔یہی کام ان کے آبا و اجداد بھی کرتے تھے۔آزاد صاحب تین چار سال تک حصولِ تعلیم کے لیے زور آزمائی کرنے کے بعد اپنے والدین کے ساتھ کپڑوں کی پوتائی میں لگ گئے۔اوران کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔'' (۵۳)

لیکن ان مشکل حالات کے باوجود بھی وہ نہایت غیرت منداور خوددار آدمی تھے اس بات کا انکشاف نذیر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

'' ان کے بارے میں کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے غربت میں رہ کر کبھی غیرت کا دامن نہیں چھوڑا چار مصرعوں میں انہوں نے خود بھی اس بات کا اظہار و اعتراف کیا ہے۔

مجھ کو جینے کا کچھ شعور نہیں
میری عادت میں جی حضور نہیں
میں ہی منزل سے دور ہوں گویا
ورنہ منزل تو مجھ سے دور نہیں'' (۵۴)

آزادسیکری کی شعری کائنات میں غزلیں، نظمیں، رباعیاں، قطعات، نعت، منقبت، سلام، آزاد نظم وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں، ان کی شاعری غور و فکر کی دعوت دیتی ہے یہ رنگ مشاہدے کی وسعت کے سبب ان کی شاعری میں جگہ پا گیا۔صبر و قناعت نے ان کی شاعری کو اور گہرا رنگ عطا کیا۔اور مصلحت پرستی کبھی ان کی شاعری میں داخل نہ ہوسکی، آزاد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے نذیر فرماتے ہیں۔

'' نظموں میں ان کی فکر کے جوہر بہتر کھلتے تھے۔ان کی نظمیں بہت ہی رواں دواں اور حقیقت کشا ہوتی تھیں۔زندگی کی سچائیوں سے لبریز لفظ لفظ حقائق کا ترجمان، آزاد کی شاعری کا یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔نظموں کے علاوہ ان کی غزلوں کے اشعار میں بھی ان رنگوں کی چھوٹ جا بجا نظر آتی ہے۔'' (۵۵)

پھر آگے نذیر آزاد کے اشعار میں نشتریت کے متعلق فرماتے ہیں۔

'' میر تقی میر کی شاعری میں ۷۲ نشتر مشہور ہیں۔اس کے برعکس آزاد کی شاعری بے شمار نشتروں کی آماجگاہ ہے۔بظاہر یہ نشتر بہت تیز اور زود اثر شاید محسوس نہ ہوں لیکن ان کی گہرائی میں اترنے کے بعد ان کی نشتریت پر یقین کرنا پڑتا ہے۔'' (۵۶)

جناب نور محمد پٹھان آزادسیکری کی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں۔

''ان کی طبیعت میں سادگی تھی، مزاج میں سنجیدگی تھی، ان کی شاعری عوام کے دل کی آواز تھی کبھی کبھی ان کی شاعری کا رنگ باغیانہ بھی ہو جاتا تھا۔ یہ فطری بات ہے۔ مخالف حالات پر ہر کسی کو غصہ آتا ہے ان کی شاعری میں بہت سے رنگ ملتے ہیں'' (۵۷)

آزاؔد صاحب نے ظہوؔر صاحب اور ذہینؔ صاحب سے شریف تلمذ حاصل کیا اور انہیں کی رہنمائی میں اپنے شعری ذوق کو نکھارا اور سنوارا، ان کے کلیات سے کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

مری غریبی پہ دولت کا داؤ چل نہ سکا
مرے خیالوں کو منعم کوئی بدل نہ سکا
ہٹے نہ راہِ خودی سے ذرا بھی پاؤں کبھی
اگر چہ ٹھوکریں کھا کھا کے میں سنبھل نہ سکا
غم ہائے روزگار سے آزاد کیا ڈروں
راضی میں ہوں حقیقتاً اُس کی رضا کے ساتھ
خود خزاں دیدہ رہا آزاد باغ دہر میں
دے رہا ہے گلشنِ اردو کو پیغام بہار

نذیؔر کی آزاد سیکری سے پہلی ملاقات سیکر میں ہی ہوئی تھی جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا، اسی دوران ایک بار کسی کام سے سیکر جانا ہوا تو آزاد سیکری سے ملاقات ہوگئی۔ وہ سیکر شیخاواٹی کے مشہور عوامی شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ تھوڑا بہت میرے نام سے واقف تھے میں نے جب اپنا تعارف پیش کیا تو بڑی گرم جوشی اور اپنائیت سے پیش آئے۔'' (۵۸)

اس ملاقات نے نذیؔر کو بے حد متاثر کیا۔ اس کے بعد ان کی دوسری ملاقات اچانک پونے میں ہوئی جب وہ مرحوم ابراہیم خان چوہان کے گھر تشریف لائے تھے۔ اس دوسری ملاقات سے نذیؔر بہت مسرور ہوئے۔ شاید انہیں ملاقاتوں کا اثر تھا جو نذیؔر نے اس کلیات کو ترتیب دے کر شائع کیا۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آزاد کے کلام کو ڈھونڈنا اور اسے کتابی صورت میں شائع کرنا دونوں ہی کام جوئے شیر لانے کے برابر تھے لیکن نذیؔر اس کام میں سرخ رو ہوئے اور ان حضرات نے بھی نذیؔر کا خوب خوب ساتھ نبھایا جنھوں نے اس مسودے کی فراہمی میں نذیؔر کا ساتھ دیا ان کے متعلق نذیؔر لکھتے ہیں۔

''محمد ریاض جاٹو کا تعلق چونکہ سیکر سے ہے لہٰذا انہوں نے وعدہ کیا کہ میں ہر حال میں آزاد صاحب کی ''بیاض شعر'' ڈھونڈ نکالوں گا خدا کا شکر ہے کہ بیاضِ شعر برسوں تک پوشیدہ رہی اسے محمد ریاض جاٹو نے چند ماہ کی تلاش کے بعد حاصل کر لیا۔ اس تلاشی میں ان کا ساتھ جناب الطاف حسین بھاٹی نے بھی دیا محمد فیاض احمد فاروقی اور آزاد صاحب کے شاگرد رشید جناب شبیر اثر سیکری نے بھی کلام کی فراہمی میں بھرپور معاونت فرمائی۔ اور اب اپنے ہم رکاب وہم مزاج الحاج محمد قریشی کے ساتھ مل کر اس کی طباعت واشاعت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔'' (۵۹)

نذیؔر ان سبھی صاحبان کے شکر گزار ہیں۔ اس جائزے کے بعد یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا جسے نذیؔر اور ان کے

احباب نے آسان بنادیا۔نذیؔر نے اسے ایک ''ادبی نیکی'' قرار دیا ہے۔

مختلف الجہات شخصیت ملک تاسے:۔

نذیر کی تصنیف ''مختلف الجہات شخصیت ملک تاسے'' ملک احمد تاسے کی اردو خدمات پر مبنی ہے۔ملک تاسے جو ایک ادب پرور شخصیت ہیں اور ادب کی خدمت کو ادبی نیکی سمجھتے ہیں۔ایسی معتبر شخصیت کو ادبی خراج عقیدت کے طور پر یہ تصنیف پیش کی ہے جو ۷۸ صفحات پر مشتمل ہے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی اس تصنیف میں نذیؔر نے مختلف حضرات کے مضامین شامل کیے، اس تصنیف میں ملک تاسے کی حالاتِ زندگی سے لے کر ان کے شعری مجموعوں ان کے سفرنامے گردسفر اور دیگر کارناموں کی روداد شامل کی گئی ہے۔

ملک تاسے ۱۹/ اپریل ۱۹۲۲ء کو نظام پور ضلع بھیونڈی کے کوکنی گھرانے میں پیدا ہوئے آپ کی تصانیف میں دردنہاں (شعری مجموعہ ۱۹۹۳ء) گردِسفر (سفرنامہ) ۲۰۰۵ء نقوش عصر (شعری مجموعہ ۲۰۰۷ء خیابانِ صدرنگ (مجموعہ مضامین ومقالات ۲۰۰۹ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کی اشاعت پر آپ کو مختلف انعامات واعزازات سے بھی نوازہ گیا ہے۔آپ کی شعر گوئی کی شروعات ۱۹۴۵ میں ہوئی اور آپ کے کلام پر ترقی پسندی کا جذبہ غالب تھا۔آپ کی تحریری خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے نذیؔر فرماتے ہیں۔

''صحت مند زبان، صحت مند تصورات اور تعمیری افکار کے حامل ملک تاسے عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں پہنچ کر کوئی علم اور قلم کا تصور نہیں کرسکتا۔وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہونے باوجود ادب سوچتے ہیں، ادب پڑھتے ہیں، ادب لکھتے ہیں اور ادب جیتے ہیں۔'' (۶۰)

نذیؔر کے یہ الفاظ ملک تاسے کی ادب دوستی بلکہ یوں کہیں کہ ادب دیوانگی کی غمازی کرتے ہیں۔نذیر کی یہ تصنیف ملک تاسے کی ادبی کارگزاریوں کو قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے اور نذیؔر اس کارِ خیر کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

میخانہ اردو کا پیر مغاں نارنگ ساقی:۔

جناب کے۔ایل نارنگ ساقی اور ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اور ان کی یہی مقبولیت ''میخانہ اردو کا پیر مغاں نارنگ ساقی'' کے وجود میں آنے کا سبب بنی۔ ''دیکھو ہم نے ایسے بسر کی'' ...... کے تحت نارنگ ساقی نے اپنے ذاتی اور ادبی زندگی کے حالات وکوائف نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں سیدھے سادے واقعات کو نارنگ صاحب نے نہایت شگفتہ اور دلچسپ پیرائے اظہار عطا کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ

''میری پیدائش ۲۴/ اگست ۱۹۳۶ء کو ضلع فیروز پور کے قصبہ سوڈھی نگر (سلطان خانوادہ) کے متوسط طبقہ کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی۔کھاتا پیتا گھرانہ اُس کو کہتے ہیں جو بہت دیکھ سمجھ کے کھاتا اور پیتا ہے۔تاکہ کھانے پینے کا یہ سلسلہ خاندان میں تادیر جاری وساری رہے۔انجمن ترقی پسند مصنفین نے جلد بازی میں اپنی پہلی کانفرنس میری پیدائش سے کچھ پہلے اپریل ۱۹۳۶ء میں کانپور میں منعقد کرلی، انہیں شاید یہ خدشہ تھا کہ اگر کچھ دیر ہوگئی تو ایک اور ترقی پسند ان کی انجمن میں شامل نہ ہوجائے'' (۶۱)

نارنگ ساقی کی یہ تحریر ان کی ظریفانہ طبیعت کا پتہ دیتی ہے۔زبان کی یہی دلچسپی اس تصنیف میں شامل ہے جو باقی مضامین پر سبقت لے جاتی ہے اس تصنیف کے سبھی مضامین نارنگ صاحب کی تصانیف۔ ''ہمارے کنور صاحب'' یادوں کے جشن'' کلیاتِ سحر، ادیبوں کے لطیفے، خوش کلامیاں قلم کاروں کی اور ان کے تحریر کردہ مضامین پر تاثرات ہیں جو مختلف حضرات کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔نذیؔر نے ان سبھی مضامین کو یکجا کیا اور کتابی صورت میں محفوظ کردیا۔اس تصنیف میں نارنگ ساقی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اٹھتا ہے اور ان کی ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ

ان کی ذاتی زندگی سے بھی واقفیت کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔نذیرؔ سے نارنگ صاحب کی پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی تھی جس کے متعلق نذیرؔ گفت باہمی' میں فرماتے ہیں۔

"میری ان سے بس ایک دن کی ملاقات ہے۔دلی میں صرف ایک دن میں ان کی رفاقت میں رہا ہوں اس دن شبیر فراز فتح پوری بھی میرے ساتھ تھے۔ہم دونوں جب ان کے دفتر پہنچے تو انہوں نے بے حد خلوص اور اپنائیت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا گرمیوں کا موسم تھا ٹھنڈے مشروب سے ہماری پیاس بجھائی گئی۔یہاں کوئی جام و مینا کا تصور ہی نہیں تھا۔جس کے لیے ساقی ادبی حلقوں میں مشہور ہیں۔" (۶۲)

اسی ملاقات سے نذیرؔ کو نارنگ ساقی کی شخصیت سے مستفیض ہونے کا موقع مل گیا بھلے ہی انہیں روبہ رو ملاقات کے موقع میسر نہ آئیں ہوں وہ فون پر ہی رابطہ قائم کر کے نارنگ ساقی سے اپنا ادبی رشتہ استوار کیے ہوئے ہیں۔اور ساقی نارنگ کی شخصیت کو اپنی توشیحی نظم میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ب بہت معروف ہیں، ساقی بہت مشہور ہیں ساقی
تکبر اور نخوت سے بہت ہی دور ہیں ساقی
ک کبھی یہ دوست داری میں جہاں داری نہیں کرتے
محبت خوب کرتے ہیں اداکاری نہیں کرتے
ے یہی اوصاف ہیں جو آپ کا رتبہ بڑھاتے ہیں
یہی اوصاف ہیں جو آپ کو اوپر اٹھاتے ہیں
ا اذیت ناک لمحوں کو مسرت بخش دیتے ہیں
لطیفوں سے بجھے دل کو حرارت بخش دیتے ہیں" (۶۳)

نارنگ ساقی کی اسی رنگارنگ شخصیت کو پروفیسر گوپی چند نارنگ "پیش لفظ" میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"اردو کے عاشق، صادق، ادیب اور قلم کاروں کے بے لوث میزبان اور فرشتہ صفت انسان کرشن لال نارنگ ساقی جیسے لوگ آج بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔یہ ایسا نارنگ ہے جس میں رنگ ہی رنگ ہے، یہ مئے خانے کا ایسا ساقی ہے جو دوسروں کا پیالہ تو بھرتا ہے لیکن خود اپنا سبو ہمیشہ خالی رکھتا ہے۔سب پر اپنی محبتیں لٹاتا ہے یہ ایسا قلم کار ہے جس نے اپنے قلم کو کبھی تلوار نہیں بنایا ہے۔ایسا لطیفہ گو ہے جس نے کبھی جھوٹ بول کر یا ٹھٹھا کر کے نہیں ہنسایا، ایسا انسان ہے جس نے کبھی اپنی علمیت کا رعب نہیں جمایا۔دراصل ساقی کی شخصیت میں رنگارنگی اور کشادگی ہے۔وہ زندگی کو جینے کا ہنر جانتا ہے دوستی اور تعلقات نبھانے کی اداؤں سے اچھی طرح واقف ہے۔اسے دشمنی کو چٹکیوں میں ختم کرنے کی حکمت بھی آتی ہے۔اس کی شخصیت ناتوانا گزیدہ ہے اور نہ ہی انا پرست۔وہ جیسا اندر ہے ویسا ہی باہر بھی نظر آتا ہے۔" (۶۴)

ساقی صاحب کی شخصیت پر پروفیسر نارنگ کا یہ سیر حاصل تبصرہ ان کی شخصیت کے پیچیدہ پہلوؤں کی بھی گرہ کشائی کرتا ہے اور پروفیسر نارنگ یہاں تک کہنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں کہ "انہیں محبت کی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں آتی" یہ نارنگ ساقی کی شخصیت کا ہی جادو ہے

جو پروفیسر نارنگ جیسی شخصیت بھی اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتی ہے۔

پروفیسر نارنگ کے ساتھ ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بھی ''آؤ ساقی کہ بزمِ عشرت ہے'' میں نارنگ ساقی کی ادبی شخصیت کا اعتراف پوری خوش دلی سے کیا ہے۔اس مضمون میں وہ نارنگ ساقی کے ساتھ ساتھ نذیر کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ساقی صاحب نے ادیبوں کے لطیفے جمع کرنے شروع کیے اور جلد ہی ایک نہایت خوش مزاج اور خوش مذاق مجموعہ ''ادیبوں کے لطیفے'' کے نام سے شائع کردیا۔ پھر کچھ دن بعد ایک اور مجموعہ ''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' بھی منظرِ عام پر لے آئے۔آپ کے اور ہمارے عزیز دوست نذیر فتح پوری کا ہم سب پر شکریہ واجب ہے کہ وہ ''میخانۂ اردو کا پیرِ مغاں، نارنگ ساقی'' کے عنوان سے ایک بھاری بھرکم اور پرلطف مجموعہ مرتب کرلائے ہیں جس میں ہمارے تقریباً سب ہی سربرآوردہ لکھنے والوں کی تحریریں یکجا کردی گئی ہیں۔ان میں کچھ ان کی شخصیت کے بارے میں ہیں اور زیادہ تر مضامین ساقی صاحب کے بارے میں کم اور خود مصنف کے بارے میں زیادہ کہا گیا ہے اور ایسا نہیں کہ مصنف نے اپنی تعریف میں صفحے سیاہ کیے ہیں۔'' (۶۵)

جہاں شمس الرحمٰن فاروقی نذیر کے شکرگزار ہیں وہیں نذیر اس کتاب کی ترتیب کو ادبی نیکی کے زمرے میں رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

''اس کتاب کی ترتیب کی ذمہ داری کو میں ایک ادبی نیکی محسوس کرتا ہوں۔ یہ میرے لیے ایک انعام کے مترادف ہے۔'' (۶۶)

جناب سہیل انجم (نامہ نگار وائس آف امریکہ، دہلی) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نذیر کی اس ادبی نیکی کے متعلق اپنے خیالات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''یہ کتاب نارنگ ساقی کی شخصیت کے بالکل حسب حال اور اس کے مطابق اور شایانِ شان ہے اس کی ورق گردانی ساقی کی ہمہ جہت شخصیت پر ایسی روشنی ڈالتی ہے کہ سب کچھ عیاں ہوجاتا ہے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ جاتی۔نذیر فتح پوری نے کمال کا کام کیا ہے۔انہوں نے اس کتاب کی ترتیب کی ذمہ اری کو اگر اپنے لیے ایک ادب نیکی اور ایک انعام قرار دیا ہے تو کچھ تو بات ہوگی جس نے انہیں ایسا بھاری بھرکم کام کرنے کی ترغیب دی'' (۶۷)

نذیر کے ترتیبی کارناموں میں ایک نام اور جڑ گیا ہے۔۵۹۶ صفحات پر مشتمل اس تصنیف میں ایک سو پچیس (125) مضامین شامل ہیں ان مضمون نگاروں میں نذیر کے ساتھ ساتھ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، جگن ناتھ آزاد، کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، افتخار امام صدیقی، بلراج کومل، خوشونت سنگھ، شین، کاف۔نظام، پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر قمر رئیس، مالک رام ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مخمور سعیدی، وارث علوی، پروفیسر وہاب اشرفی، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، اور یوسف ناظم، جیسے اور بھی بہت سے نام ہیں جو اردو ادب کی آبیاری میں سرگرداں ہیں یہ تصنیف ۲۰۱۲ء میں ایم۔آر پبلی کیشن کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔کتاب کے سرورق پر نارنگ صاحب کی تصویر کے ساتھ دوسرے حضرات کی تصویر بھی آویزاں ہیں مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نارنگ ساقی کی شخصیت اور ان کی تصانیف کو قریب سے جاننے میں یہ تصنیف معاون ثابت ہوتی ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔

دیوداس بسمل حیات اور ادب:-

نذیر اردو سے قادر الکلام شاعر ادیب اور محقق ہیں۔ وہ کوئی بھی تحقیقی مقالہ یا تنقیدی جائزہ تحریر کرتے وقت مواد کا غور و فکر سے مطالعہ کرنے

کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ان کی ادبی فتوحات اہلِ ذوق ادب سے داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ''دیوداس بسمل حیات اور ادب'' ہے۔یہ تصنیف ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں مختلف حضرات کے مضامین کے علاوہ دیوداس بسمل کے مضامین اور انتخاب کلام شامل کیا گیا ہے۔

لکشمی چند سوامی قلمی نام دیوداس بسمل ۱۳ نومبر ۱۹۴۳ کو میرٹھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد میرٹھ کے میونسپل اسکول میں سرکاری ملازم تھے۔آپ نے ساڑھے سترہ برس کی عمر میں بی اے پاس کیا اور اس کے فوراً بعد اُسی پرائمری اسکول میں ملازمت کے فرائض انجام دیئے جہاں سے انہوں نے خود پانچویں جماعت پڑھی تھی۔پھر آپ سے مرکزی سرکار کے ڈفینس اکاؤنٹس کے شعبہ میں بطور آڈیٹر نوکری کی ابتدا کی اور پھر ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اس شعبہ کے راج بھاشا ادھیکاری کے عہدے تک پہنچے۔۴۱ سال کی ملازمی خدمات کے بعد ۲۰۰۳ء میں آپ سبکدوش ہوئے۔اسی درمیان ۱۹۹۰ء میں آپ مستقل طور پر پونہ میں مقیم ہوگئے۔دورِ ملازمت میں آپ کو آپ کی خدمات کے باعث انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں ہندی کی ساہتیہ رتن کی ڈگری اور مرکزی سرکار کے وزارت داخلہ منسٹر آف ہوم ایجوکیشن کے مترجم کی سند وغیرہ شامل ہے۔حالانکہ آپ ہندی زبان کے راج بھاشا ادھیکاری کے عہدہ پر فائز تھے۔لیکن آپ کو اردو سے بھی بے حد محبت ہے جس کا مبینہ ثبوت آپ کا جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی سے اردو کا سرٹیفکٹ کورس پاس کرنا ہے۔ہندی اور اردو کے علاوہ آپ مراٹھی گجراتی بنگالی اور انگریزی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔

آپ کے ادبی اثاثے میں غزلیں، نظمیں، گیت، ڈرامہ، افسانے، مکالمے، مضامین، تحقیقی مقالے، کالم نگاری اور ترجمہ نگاری وغیرہ شامل ہیں، آپ کے شعری مجموعوں میں (۱) ٹکڑے ٹکڑے زندگی (غزلوں کا مجموعہ ۱۹۸۸) (۲) خواب کتنے بنیں (نظموں کا مجموعہ ۱۹۸۸) گیت گانے دو مجھے (گیتوں کا مجموعہ ۲۰۰۱) درختوں کے لمبے ہوئے سائے (غزلوں، نظموں اور گیتوں کا مجموعہ ۲۰۰۱ء) شامل ہیں جو ہندی رسم الخط میں شائع ہوئے لیکن اردو شاعری سے تعلق رکھتے ہیں اردو رسم الخط میں آپ کا شعری مجموعہ ''گل گلشن گلفام'' کے نام سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔

آپ نے اردو بنگالی مراٹھی سندھی ہندی اور انگریزی سے مختلف موضوعات کا ترجمہ کیا۔آپ نے کوکنگ ایکسپرٹ ترلا دلال کی تین انگریزی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا۔

آپ کا ایک اور اہم کارنامہ ''عمر بھر سفر میں'' ہے اس تصنیف میں اردو کے ۳۱۴ قدیم شاعروں ۱۲۲۵ اشعار کی تشریح دیوناگری رسم الخط میں کی ہے۔ان اشعار کی تشریح سادہ وسلیس زبان میں کی گئی تا کہ ہندی داں طبقہ با آسانی پڑھ سکے اس تصنیف ''دیوداس بسمل حیات اور ادب'' میں نذیر نے اپنے خیالات گفت باہمی اور ''دیوداس بسمل سے پہلی ملاقات قلم بند کیے ہیں۔جس میں انہوں نے دیوداس بسمل سے اپنی پہلی ملاقات اور اُن کے ادبی کارناموں کا خلاصہ کیا ہے۔اور اپنی رائے ان الفاظ میں تحریر کی۔

> ''دیوداس بسمل کا قلم تھکنے کا نام نہیں لیتا۔وہ اپنی بات بہت ہی تفصیل سے کہنا پسند کرتے ہیں انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید قارئین ان کی بات پوری طرح سمجھ نہیں پائیں گے۔اسی لئے وہ اپنی تحریروں میں متعدد حوالوں سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (۶۸)

''دیوداس بسمل کی تشریحی کتاب'' کے عنوان سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ''عمر بھر سفر میں'' کے متعلق اپنے خیالات قلم بند کیے ہیں اور توازن برقرار رکھتے ہوئے جہاں وہ بسمل صاحب کی تحریری صلاحیت سے آگاہ کرواتے ہیں وہیں خامیوں سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے ہیں۔

جناب فیروز اشرف دیوداس بسمل کو ''اردو کا جانباز سپاہی'' قرار دیتے ہیں اور پردیپ نپھا دکر'' کھیت میں مشقت کرنے والا شخص بتاتے ہیں پردیپ نپھاڈکر نے اپنے مضمون کے تحت دیوداس بسمل کے ذاتی کوائف بیان کیے ہیں۔اوراس بات کا انکشاف بھی کرتے ہیں کہ دیوداس بسمل سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا نہایت مشکل کام ہے۔اس کے برعکس دیوداس بسمل اپنے مضمون ''بقلم خود'' میں تحریر فرما ہیں کہ۔

''پونے شہر کے اردو ادب میں ایک اہم شخصیت ایک ہستی کا نام ہے جناب نذیر فتح پوری آپ مشہور و معروف شاعر بھی ہیں، نثر نگار بھی، ڈرامہ نگار بھی، مدیر بھی، نقاد بھی، اور محقق بھی، انہوں نے مجھے میری تنہائی سے ڈھونڈ نکالا اور حکم صادر کیا کہ میں کچھ اپنے بارے میں لکھ کر انہیں دوں۔اب میں پس وپیش میں ہوں کہ میں کیا کہوں؟ ایک معمولی، گمنام، تک بندی کرنے والا شاعر، جس نے اردو بھی پوری طرح نہیں پڑھی، بس ٹوٹا پھوٹا کچھ کہہ لیتا ہوں، یوں پچاس سال سے قلم گھس ضرور رہا ہوں لیکن کچھ خاص کیا نہیں ہے۔نذیر صاحب کی حکم عدولی نہیں کرسکتا، ان کا حکم بسر وچشم اور اپنے ادبی سفر سے متعلق چند سطور قارئین کے پیش خدمت ہے۔'' (۶۹)

اوراس کے بعد بسمل صاحب اپنی ادبی کارگزاریوں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔یہاں اس تحریر کو شامل کرنے کا مقصد خاص یہی تھا کہ جس کام کو پردیپ نپھاڈکر نہایت مشکل کام بتا رہے تھے اس کام کو نذیر نے دیوداس بسمل صاحب سے کروا ہی لیا۔

ان تصانیف کے علاوہ نذیر کی تین تصانیف اور ہیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔کوثر صدیقی۔فن اور شخصیت۔۲۰۰۰ء مناظر عاشق ہرگانوی کا ادبی سفرنامہ ۲۰۰۴ء اور فراز حامدی کے اردو گیت ۲۰۰۶ء یہ تصانیف مجھے دستیاب نہیں ہوسکیں اسی لیے میں ان پر اظہار خیال نہ کرسکی۔

☆☆☆

حوالہ جات

باب پنجم

حوالہ نمبر	نام کتاب/ رسالہ	مصنف/مرتب	صفحہ نمبر	سنِ اشاعت
(۱)	نذیر فتح پوری خواتین اہل قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/حسن آراء	۲۲	۲۰۱۱ء
۲)	ہندوستان میں اردو صفحات آزادی کے بعد	عثمان انجم	۱۱	۲۰۱۳ء
۳)	ہندوستان میں اردو صحافت آزادی کے بعد	عثمان انجم	۱۲۰	۲۰۱۳ء
۴)	ہندوستان میں اردو صحافت آزادی کے بعد	عثمان انجم	۱۲۰۔۱۲۱	۲۰۱۳ء
۵)	نذیر فتح پوری شخص شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۶۳۔۱۷۰	۲۰۰۶ء
۶)	لمحوں کا سفر	نذیر فتح پوری	۱۸	۱۹۸۵ء
۷)	نذیر فتح پوری خواتین اہل قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آراء	۲۸	۲۰۱۱ء
۸)	نذیر فتح پوری شخص شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۷۲	۲۰۰۶ء
۹)	نذیر فتح پوری شخص شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۱۵۹	۲۰۱۳ء
۱۰)	پونہ یاترا	مناظر عاشق ہرگانوی	۴۳	۲۰۱۳ء
۱۱)	ڈھلی ڈھلی شام کا اُجالا	نذیر فتح پوری	۱۱	۲۰۰۹ء
۱۲)	ڈھلی ڈھلی شام کا اُجالا	نذیر فتح پوری	۱۶۱	۲۰۰۹ء
۱۳)	ڈھلی ڈھلی شام کا اُجالا	نذیر فتح پوری	۵	۲۰۰۹ء
۱۴)	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۴۰	۲۰۱۳ء
۱۵)	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۴۲	۲۰۱۳ء
۱۶)	اسباق، ماں کے نام	=	۲۰۹	اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء
۱۷)	اسباق، ماں کے نام	=	۳۰۲	اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء
۱۸)	اسباق۔علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر	=	۴	جولائی ۲۰۰۱ تا مارچ ۲۰۰۲ء
۱۹)	حیدر قریشی فن اور شخصیت	نذیر فتح پوری/ سنجے گوڑبولے	۸	۲۰۰۲ء
۲۰)	حیدر قریشی فن اور شخصیت	نذیر فتح پوری/ سنجے گوڑبولے	۱۸	۲۰۰۲ء
۲۱)	عصمت جاوید شیخ	نذیر فتح پوری	۸	۲۰۰۴ء

۲۲)	عصمت جاوید شیخ	نذیر فتح پوری	۱۲	۲۰۰۴ء
۲۳)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۶	۲۰۰۷ء
۲۴)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۱۵	۲۰۰۷ء
۲۵)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۱۵	۲۰۰۷ء
۲۶)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۱۲	۲۰۰۷ء
۲۷)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۱۱	۲۰۰۷ء
۲۸)	علامہ کالی داس گپتا رضا - اسباق نمبر	نذیر فتح پوری	۳۱۱	جولائی ۲۰۰۱ تا مارچ ۲۰۰۲ء
۲۹)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۱۹	۲۰۰۷ء
۳۰)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۲۰	۲۰۰۷ء
۳۱)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۸۷	۲۰۰۷ء
۳۲)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۹۱	۲۰۰۷ء
۳۳)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۹۷	۲۰۰۷ء
۳۴)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیر فتح پوری	۱۰۳	۲۰۰۷ء
۳۵)	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۶۳	۲۰۱۳ء
۳۶)	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۱۶۴	۲۰۱۳ء
۳۷)	جلیل آلہ آبادی شخصیت اور شاعری	نذیر فتح پوری	۶	۲۰۰۸ء
۳۸)	جلیل آلہ آبادی شخصیت اور شاعری	نذیر فتح پوری	۱۶	۲۰۰۸ء
۳۹)	جلیل آلہ آبادی شخصیت اور شاعری	نذیر فتح پوری	۲۲	۲۰۰۸ء
۴۰)	اصغر دہلوی کی غزلیہ شاعری	نذیر فتح پوری	۸	۲۰۰۸ء
۴۱)	اصغر دہلوی کی غزلیہ شاعری	نذیر فتح پوری	۱۰	۲۰۰۸ء
۴۲)	اصغر دہلوی کی غزلیہ شاعری	نذیر فتح پوری	۱۰۹	۲۰۰۸ء
۴۳)	اصغر دہلوی کی غزلیہ شاعری	نذیر فتح پوری	۶۴	۲۰۰۸ء
۴۴)	اصغر دہلوی کی غزلیہ شاعری	نذیر فتح پوری	۵	۲۰۰۸ء
۴۵)	ڈاکٹر نور السعید اختر۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق کے تناظر میں	نذیر فتح پوری	۶	۲۰۱۰ء
۴۶)	ڈاکٹر نور السعید اختر، تحقیق، تنقید اور تخلیق کے تناظر میں	نذیر فتح پوری	۶	۲۰۱۰ء

۴۷)	ماں کے نام	نذیر فتح پوری	۶	۲۰۱۰ء
۴۸)	آزاؔد بنام نذیر	نذیر فتح پوری	۴۶	۲۰۱۱ء
۴۹)	آزاؔد بنام نذؔیر	نذیر فتح پوری	۶	۲۰۱۱ء
۵۰)	نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۷۸	۲۰۱۳ء
۵۱)	محبوب و نذؔیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہؔی	۱۶۰	۲۰۱۳ء
۵۲)	کلیاتِ آزاد سیکری	نذیر فتح پوری	۱۲۳	۲۰۱۲ء
۵۳)	کلیات آزاد سیکری	نذیر فتح پوری	۹۔۱۰	۲۰۱۲ء
۵۴)	کلیات آزاد سیکری	نذیر فتح پوری	۱۳۔۱۴	۲۰۱۲ء
۵۵)	کلیات آزاد سیکری	نذیر فتح پوری	۱۱۔۱۲	۲۰۱۲ء
۵۶)	کلیات آزاد سیکری	نذیر فتح پوری	۱۴	۲۰۱۲ء
۵۷)	کلیات آزاد سیکری	نذیر فتح پوری	۱۲۸	۲۰۱۲ء
۵۸)	کلیات آزاد سیکری	نذیر فتح پوری	۹	۲۰۱۲ء
۵۹)	کلیات آزاد سیکری	نذیر فتح پوری	۱۶	۲۰۱۲ء
۶۰)	مختلف الجہات شخصیت۔ ملک تا سے	نذیر فتح پوری	۵۔۶	۲۰۱۲ء
۶۱)	میخانۂ اردو کا پیر مغاں۔ نارنگ ساقی	نذیر فتح پوری	۲۳۔۲۴	۲۰۱۲ء
۶۲)	میخانۂ اردو کا پیر مغاں۔ نارنگ ساقی	نذیر فتح پوری	۲۰	۲۰۱۲ء
۶۳)	میخانۂ اردو کا پیر مغاں۔ نارنگ ساقی	نذیر فتح پوری	۵۵۰	۲۰۱۲ء
۶۴)	میخانۂ اردو کا پیر مغاں۔ نارنگ ساقی	نذیر فتح پوری	۱۱	۲۰۱۲ء
۶۵)	میخانۂ اردو کا پیر مغاں۔ نارنگ ساقی	نذیر فتح پوری	۱۴	۲۰۱۲ء
۶۶)	میخانۂ اردو کا پیر مغاں۔ نارنگ ساقی	نذیر فتح پوری	۲۲	۲۰۱۲ء
۶۷)	ماہنامہ رہنمائے تعلیم جدید۔ دہلی	-	۴۲	مئی ۲۰۱۳ء جلد ۶۔ شمارہ ۹
۶۸)	دیوداس بسمل حیات اور ادب	نذیر فتح پوری	۶	۲۰۱۵ء
۶۹)	دیوداس بسمل حیات اور ادب	نذیر فتح پوری	۵۶	۲۰۱۵ء

☆☆☆

باب ششم

ماحصل

ماحصل

نذؔیر فتح پوری راجستھان کے مردم خیز علاقے فتح پور شیخاواٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں پونہ میں آباد ہیں۔ یہاں انہیں عزت وشہرت دونوں ہی حاصل ہوئی۔ لیکن آج بھی وہ اپنے وطن عزیز راجستھان کو بھولے نہیں ہیں۔ راجستھان انکی رگوں میں بستا ہے۔ نذؔیر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک کامیاب شاعر اور نثر نگار ہیں۔

شاعری میں حمد، نعت، گیت، ماہیے، غزل، آزاد غزل، تضمین، مثنوی، نظم، دوہے، کہہ مکرنیاں وغیرہ میں وہ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن غزلوں میں ان کا اصل رنگ وروپ نظر آتا ہے۔ ان کی غزل گوئی آج کے پُر آشوب دور کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ جدید اور قدیم روایات کے ماننے والے ہیں۔ اسی لیے ان کی غزل گوئی کا کینوس وسیع ہو گیا ہے۔

نذؔیر فتح پوری نے اپنی نثر نگاری کی طرح اپنی شاعری میں بھی کسی تحریک کی پابندی کو قبول نہیں کیا۔ اردو غزل ادب کی محبوب صنف رہی ہے۔ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے غزل کے دامن کو وسیع اور کشادہ کیا ہے۔ اسی لیے نذؔیر نے بھی اپنا خونِ جگر غزل کی محبت میں صرف کیا۔ نذؔیر کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی غزلیں شاعر کے مشاہدات احساسات اور تجربات کی آواز ہیں۔ جن کو انہوں نے غزل کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

دورِ حاضر کی غزل مسائلی غزل ہے۔ آج کے شاعر نے انسان ہی کو اپنی شاعری کا مرکز ومحور بنالیا ہے۔ نذؔیر نے بھی عام انسان کی خوشیاں محرومیاں، حالات زندگی کے تصادمات ماحول کے جبر وکرب، سماجی انتشار کو عصری بصیرت عطا کی ہے۔

نذؔیر کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ترقی پسندی، جدیدیت پسندی اور آزاد شاعری کے دھبوں سے اپنی شاعری کو بچائے رکھا اگرچہ ان کی شاعری آفاقی شاعری نہیں ہے لیکن سچے جذبات واحساسات کی ترجمان ضرور ہے۔ وہ گرد وپیش کے حالات سے باخبر رہتے ہیں انسانی قدروں کے زوال پر فکر مند بھی ہوتے ہیں اور رنجیدہ بھی۔ جمہوری اصولوں کی پامالی ان کو مضطرب کر دیتی ہے۔ عہد حاضر کی مادہ پرستی اور مظلوم انسانیت پر ان کا دل چیخ اٹھتا ہے۔

ذرا سی ٹھیس لگی تو ٹوٹ جائیں گے
یہ آئینوں کا نگر ہے یہاں نہ پتھر لا

اہلِ کشتی حوصلوں سے کام لے
وہ دکھائی دے رہا ہے دور ساحل کا چراغ

نذؔیر نے اپنی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کے ذریعہ بارگاہِ رسالت میں عقیدت کے پھول پیش کیے ہیں۔ ان کی عقیدت صرف لفظی نہیں ہے۔ انہوں نے عبد ومعبود کے رشتے کو نہایت والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے حمدیہ اور نعتیہ اشعار کو پاکیزہ آیات سے پاکیزہ بنایا ہے۔ اور قاری کے مکمل وجود کو مضطرب کیا ہے۔

نذؔیر نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہیں ہیں جن میں توانائی ہے۔ حالانکہ انہوں نے اپنی نظموں میں کوئی فلسفہ بیان نہیں کیا۔ اس کے باوجود ان کا قاری پہلے خیالات کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر اندازِ بیان، شعری مفہوم اور اسی کے سبب پیدا ہونے والی تاثیر سے اثر لیتا ہے۔ نذؔیر کی

نظمیں بیدار مغز، گہری فکر و ذہانت، اور تنقیدِ نفس کی بہتر مثال ہے۔ اپنی نظموں کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے وہ ہیئت، موضوع اور ساخت کو سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔ اور تشبیہ، استعارہ اور علامتوں کے استعمال سے بھی اپنی نظموں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جس طرح نظموں میں موضوعات کی کوئی قید نہیں اسی طرح نذؔیر نے بھی ساری بندشوں سے آزاد کر نظمیں کہیں ہیں۔ دہشت گردی اور قومی یکجہتی جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں ہندوستان میں موجود تکلیفوں اور پریشانیوں کا ذکر کیا۔ اور وطن کی مٹی سے اپنی نظموں کو مہکایا۔ نذؔیر نے توشیحی نظموں کے ذریعہ بھی مختلف شخصیات کی تعریف و توصیف کی اور ان کے فکر و فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آپ نے بچوں کے لیے بھی سبق آموز نظمیں لکھیں جس میں بچوں کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے ملک کی تعمیر کا سبق بھی دیا ہے۔

صنف مثنوی میں بھی نذؔیر نے اپنے قلم کا جادو جگایا اور نور کوہلی کی مثنوی ''زہر خند'' کے جواب میں ''جوابِ زہر خند'' تحریر کی، اس مثنوی میں نذؔیر نے نوؔر کوہلی کی مثنوی میں جتنے بھی الزام اسلام اور مسلمانوں پر لگائے گئے ہیں کا حرف بہ حرف ثبوت کے ساتھ جواب تحریر کیا ہے۔ نذؔیر نے نور کوہلی کے لگائے ہر بے بنیاد الزام کو مع دلیل ردّ کیا اور محبت، خلوص و قومی یکجہتی کا پیغام دیا۔ یہ مثنوی نذؔیر کے قومی نظریہ کی وضاحت کرتی ہے اور دورِ حاضر کے آلودہ سیاسی ماحول کی پرتیں کھول کر اس آلودگی کو صاف کرنے کی اپیل بھی کرتی ہے۔

نذؔیر کا شمار اردو کے ان چند خاص شعراء کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے جنہوں نے پنجاب کی مقبول ترین صنف سخن ماہیہ کو اردو میں پہچان دلائی نذؔیر کے ماہیوں میں پنجابی ماہیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے ماہیوں میں ماہیے کی مٹھاس اور رس بھی موجود ہے۔ لیکن ساتھ ہی پنجاب کے دریائی مزاج کے برعکس راجستھان کا ریگستان مزاج ملتا ہے اور راجستھانی ثقافت بھی موجود ہے۔ اردو ماہیہ نگاری کی تاریخ میں ان کی اس خدمت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

نذؔیر کے گیتوں کے مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کے گیتوں کا رنگ ادبی ہے۔ ان کے گیتوں میں بھی عہد حاضر کے مسائل اور جدید دور کے تقاضوں کا عکس موجود ہے۔ ان کے گیتوں میں ان کی ذاتی زندگی کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ ان کے گیتوں میں حسن و جمال کی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ درد و غم کی تڑپ بھی موجود ہے۔ خیالات کی ادائیگی کے لیے الفاظ کا انتخاب اس حد تک موزوں ہوتا ہے کہ قاری مسرور ہو جاتا ہے۔

نذؔیر نے دوہا نگاری کے تقاضوں پر بھی اپنی گہری نظر رکھی ہے اور سادگی اور روانی سے اپنی دل کی بات کو مختلف پیکر عطا کر دیے۔ ان کے دوہوں میں عہد حاضر کی سچائیاں بھی ملیں گی اور رومان پرور رعنائیاں بھی موجود ہیں۔ دوہا نگاری فنی لحاظ سے مکمل ہے۔ لیکن تعداد کے لحاظ سے دیگر اصناف شاعری کے مقابلے کم ہیں۔ یہی عالم ان کی تکونیوں کا بھی ہے۔ ان کی تکونیاں بھی تعداد کے لحاظ سے بے شک کم ہیں لیکن ان میں بھی نذؔیر کی مخصوص فکر جلوہ گر ہے۔ نذؔیر نے کہہ مکرنیاں اور سہ سطری نظموں میں بھی طبع آزمائی کی۔ پر ان پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔

شاعری کے ساتھ نذؔیر نے نثر نگاری میں بھی اپنی قلم کے جوہر دکھائے اور ناول، افسانہ، مختصر افسانچہ، ڈرامہ، مضمون، سوانح، سفر نامہ، طنز و مزاح، تاریخ و تذکرہ، تحقیق و تنقید، ترجمہ، صحافت نگاری ترتیب و انتخاب اور فلمی مکالمے کے ذریعہ نثر کا بیش بہا ذخیرہ اردو ادب کو نذر کیا۔

نذؔیر نے اپنے پہلے ناول میں راجپوت معاشرے کو موضوع بنایا اور دوسرے ناول میں عام زندگی سے کردار منتخب کر کے اصلاحی ناول لکھا ان کے ناول فنّی لحاظ سے مکمل نظر آتے ہیں۔ ان ناولوں میں زندگی کی بنتی بگڑتی قدروں پر نہایت چابکدستی سے قلم اٹھایا اور واقعات کو تسلسل سے بیان کر کے خوبصورتی دلکشی اور کشش پیدا کر دی ہے۔ پاک محبت کے احساس و جذبات لیے ہوئے یہ دونوں ناول نذؔیر کے حساس دل کی ترجمانی

کرتے ہیں۔

نذیر کے افسانے بھی ماحول کے عکاس ہیں۔اخلاقی قدروں کی پامالی سسکتی بلکتی انسانیت ،حالات کی ناسازگاریوں ،غریبوں کا خون چوستی سرمایہ داری، معاشرے میں پھیلے ہوئے تعصبی زہر، حیوانی جبریت کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔نفسیاتی الجھنیں اورادھورے خواب سے افسانوں کا تانا بانا بنا ہے۔اوراس فنکاری سے ہرافسانہ تخلیق کیا ہے کہ کردار قاری کو اپنے اردگرد چلتے پھرتے اور سانسیں لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔یہی خوبی ان کو انفرادیت عطا کرتی ہے۔مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردوافسانوی ادب میں بھی نذیر نے اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔

نذیر کی افسانچہ نگاری میں بھی یہی سب خوبیاں موجود ہیں۔جوان کے افسانوں میں ہے۔افسانچہ تخلیق کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔بہت کم الفاظ میں افسانچہ نگار کو اپنی بات کہنی ہوتی ہے۔ذراسی بھی لغزش سے افسانچہ ایک لطیفہ یا نثری نظم ہوکر رہ جاتا ہے۔نذیر اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ نذیر نے زندگی کا مشاہدہ کیا۔مشاہدات کو تجربات کی بھٹی میں تپا تپا کر افسانوں کے روپ میں پیش کیا ہے۔اگرچہ افسانچہ لکھنا بہت مشکل فن ہے۔اس فن میں وہی طبع آزمائی کرسکتا ہے جس میں دم خم ہو۔نذیر کے افسانچے معیاری ہیں اور اپنی مختصر تحریر میں بڑے بڑے کام کرجاتے ہیں۔

نذیر کے ڈراموں نے بھی مقبولیت عام حاصل کی ہے۔اور یہ بھی ان کے ناول اور افسانوں کی طرح زندگی کے ترجمان ہیں۔ڈرامے کے مکالمے ادبی چاشنی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔نذیر کی ڈرامہ نگاری کا ایک اہم خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ڈراموں کو فحش نگاری سے بچائے رکھا۔اردوڈرامے میں اورخصوصاً راجستھان کے اردوڈراموں کی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نذیر نے اپنی سوانح ’’بیتے کل کا اک اک پل‘‘ کے نام سے تحریر کی ہے۔سوانح کے عنوان سے ہی اس کی خوبی نمایاں ہے،بچپن سے لے کر پوری زندگی کے پلوں کو ایسے پیش کیا ہے کہ پڑھتے وقت قاری ان کے ہمراہ ہوجاتا۔اورانہیں یہ اپنی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔

نذیر فلموں کے لیے اسکرپٹ اور گانے بھی لکھ چکے ہیں۔مگرافسوس کہ وہ اس میدان میں اپنی مصروفیات خانہ داری کے سبب کامیاب نہ ہوسکے۔لیکن کہتے ہیں نہ کہ اللہ جو کرتا ہے ہمارے بھلے کے لیے ہی کرتا ہے۔اگر وہ ممبئی جاکر فلمی دنیا میں مصروف ہوجاتے تو ادب کا جوذخیرہ آج ان کے پاس جمع ہوا ہے وہ شاید نہیں ہوتا۔اوراردوادب اور ہم قارئین اس ذخیرہ سے مستفیض نہیں ہوپاتے۔

نذیر نے اپنے سفرنامے’’پونے سے رانچی کا سفر‘‘ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین استعمال اس انداز سے کیا کہ پڑھنے والا ایک بار شروع کردے تو ختم کر کے ہی دم لے۔ظرافت کے پیرائے میں روداد سفر کا بیاں خوشنما رنگ پیدا کردیتا ہے۔نہایت مہذب اور شاہستہ انداز میں طنز کی چاشنی کا استعمال قاری کو لطف اندوز کرتا ہے۔نذیر نے اپنی دلکش بیانی سے اپنے شریک سفر قلمکاروں کی خوبصورت تصویریں کھینچی ہیں۔اوران کی اسی غیر معمولی قدرت بیان کے کے سبب ہم ان کے شریک سفر بن جاتے ہیں۔

نذیر نے ادبی مضامین کے ذریعہ اردوادب کی مقبول واہم شخصیات پر قلم اٹھایا اور نئے زاویئے سے ان پر نظر ڈالی۔ان کے مضامین کے مجموعے’’لفظوں کے سائے تلے‘‘ اور’’اعتراف‘‘ اس کا ثبوت ہیں جو مضمون نگاری کے فن پر پورے اترتے ہیں۔

نذیر نے تنقید وتحقیق کے موضوع پر’’تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی‘‘’’شعرائے پونہ۔ایک تحقیق‘‘ پونے میں اردوافسانہ۔ایک تحقیق‘‘ اوراردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر‘‘ جیسی گراں قدر معلوماتی تصانیف تحریر کیں۔’’اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر‘‘نذیر کی لسانی معنویت اور موضوع کی انفرادیت کے اعتبار سے دیگر مقالات پر فوقیت رکھتا ہے۔انہوں نے بڑی جانفشانی سے ان تصانیف کا مواد جمع کیا ہے۔اور تحقیقی

مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ نذیر کی تحقیقی کاوشات اوّل تا آخر قارئین کو اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔

ان تصانیف کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ نذیر نے مختلف ادبی شخصیات کے فکروفن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے مثلاً جگن ناتھ آزاد، علامہ کالی داس گپتا رضا، ساحر شیوی، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، علیم صبا نویدی اور ارشد مینا نگری جیسی ماہر ادب شخصیات کے فکروفن کو نئے زاویوں سے جانچا پرکھا ہے اور اپنے ذاتی تعلقات ہونے کے باوجود ان شخصیات پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔

نذیر کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''غالب اور ہم'' آج بھی مسودے کی شکل میں محفوظ ہے یہ وہی مضامین ہیں جو نذیر نے ایک زمانے میں ''خانہ بدوش'' کے فرضی نام سے مختلف رسائل وجرائد میں شائع کروائے طنز ومزاح کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے یہ مضامین قاری کو فرحت ومسرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

پچھلے ۳۵ رسالوں سے ''سہ ماہی'' ''اسباق'' کے ذریعہ نذیر اردو کی خدمت کررہے ہیں۔ پونہ میں اردو کے لیے ناسازگار حالات کے باوجود اسباق کے ذریعہ اردو کے پھول کو کھلائے ہوئے ہیں اور بڑے عزم وحوصلے سے اسباق کو کامیابی کی منزل پر لے گئے۔ اور یہ سفر ہنوز جاری ہے۔ اس کے علاوہ اسباق پبلی کیشنز کے ذریعہ نذیر خود کے علاوہ دوسرے حضرات کی تصانیف بھی شائع کرچکے ہیں جن کی تعداد ۱۰۰ ر سے تجاوز کرچکی ہے۔ یہ اردو ادب کے لیے ناقابل فراموش خدمت ہے۔

نذیر نے نہ صرف اردو ادب بلکہ ہندی ادب کی جانب بھی رخ کیا۔ چنانچہ ایک ہندی ناول کچھ نظموں اور افسانوں کو بھی اردو میں ترجمہ کیا ترجمہ اس انداز سے کیا ہے کہ وہ ترجمہ ان کی تصانیف معلوم ہوتی ہے۔ اسلوب بیاں کے سبب ترجمہ بوجھل نہیں لگتا۔

نذیر نے ترتیب وانتخاب کے ذریعہ تقریباً ۱۵ رکتابوں کو ترتیب دیا اور شائع کروایا۔ ان تصانیف کی بنا پر نذیر نے مختلف حضرات کے مضامین یکجا کیے اور مشہور سے لے کر گمنام ہستیوں پر کتابیں ترتیب دیں۔

یہ نذیر کی مخلصانہ شخصیت ہی ہے جو انہوں نے گمنام حضرات کی نثری وشعری خدمات کو دنیائے اردو ادب سے روشناس کروایا۔ ان شخصیات کے فکروفن پر نذیر نے خود بھی مضامین لکھے اور اپنے رفیقوں سے بھی لکھوائے اور اس طرح گمنام شخصیات کو جائز مقام دلوایا۔ یہ کارنامہ بھی غیر معمولی ہے۔

نذیر کی تمام شائع شدہ تصانیف ان کی تعمیری سوچ، دورحاضر کے روشن نظریات اور صحت مند رجحانات کے منہ بولتی تصویر پیش کرتی ہیں۔ ان کی شخصیت اردو تہذیب، اردو اقدار وروایات کی پاسدار ہے۔ ان کی تمام تصانیف لسانی بے ساختگی، اظہار بیان کی عمدگی، علمی دلائل وخصائل اور ادبی رعنائی سے بھرپور ہیں اور ان کی ادبی حیثیت متعین کرتی ہیں۔

نذیر کی پوری زندگی مشکلوں سے بھری ہے انہوں نے ذرّہ سے آفتاب بننے کا سفر انہیں مشکلات کو جھیلتے ہوئے پار کیا ہے۔ معاشی پریشانیوں نے ان کی راہوں میں دشواریاں پیدا کی لیکن وہ اپنے پختہ ارادوں کے دم پر ان پریشانیوں پر بھی فتح پاگئے ان کے عزم وحوصلے بلند سے بلندتر ہوتے گئے۔ اپنے اسی عزم وحوصلے کے دم پر اتنی پریشانیوں کے باوجود اپنے ادبی ذوق کا گلہ نہیں گھونٹا اور اردو شعروادب کی خدمت میں مصروف رہے۔

زندگی کی تلخیاں، اپنوں کی ایذارسانیاں اور غیروں کی غم گساریاں، دکھ درد کا تجربہ، زیست کی محرومیاں، ملاقاتوں کے فاصلے، محبت کی

آرزو، سایہ دار درخت کی تلاش اور ایسے ہی نہ جانے کتنے احساس ہیں جنہوں نے نذیؔر کی شاعری میں جگہ پائی، اور ادب کے خزانے میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی کاوشات کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو کے مشہور و معروف رسائل و جرائد نے ان کے فن اور شخصیت پر گوشے شائع کیے۔ نذیؔر نے اپنے احساس و جذبات، نظر و دل اور تلاش و جستجو کی راہیں متعین کی، نئے نئے اسلوب اور جہتوں کی اختراع کی اور اپنی اسی شناخت کے ساتھ وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے ہیں۔

نذیؔر کی ادبی خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو ادب کا ایسا روشن ستارہ ہیں جس کی روشنی بہت دور تک پھیل رہی ہے اور بہت دیر تک پھیلی رہے گی۔ وہ اردو ادب کے ان ادیبوں اور شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کی علمی و ادبی بصیرت اور فن شاعری پر گرفت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظر میں شعر و ادب تنقید حیات بھی ہے اور تہذیب حیات بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شعری و نثری اصناف موجودہ سماج کی آئینہ دار ہیں۔

☆☆☆

BIBILIOGRAPHY

کتابیات

شمار نمبر	نام کتاب	مصنف/مرتب	سنہ اشاعت
(۱)	نذیرؔ فتح پوری خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں/ ڈاکٹر حسن آراء	۲۰۱۱ء
(۲)	ہندوستان میں اردو صحافت آزادی کے بعد	عثمام انجم	۲۰۱۳ء
(۳)	نذیرؔ فتح پوری۔ شخص، شاعر و مدیر	رفیق جعفر	۲۰۰۶ء
(۴)	لمحوں کا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۱۹۸۵ء
(۵)	پونہ یاترا	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰۱۳ء
(۶)	ڈھلی ڈھلی شام کا اُجالا	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۹ء
(۷)	نذیرؔ فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک	ترنم	۲۰۱۳ء
(۸)	حیدر قریشی فن اور شخصیت	نذیرؔ فتح پوری/ سنجے گوڈبولے	۲۰۰۲ء
(۹)	عصمت جاوید شیخ	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۴ء
۱۰)	علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۷ء
۱۱)	جلیل آلہ آبادی شخصیت اور شاعری	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۸ء
۱۲)	اصغر ویلوری کی غزلیہ شاعری	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۸ء
۱۳)	ڈاکٹر نورالسعید اختر، تحقیق، تنقید اور تخلیق کے تناظر میں	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۰ء
۱۴)	ماں کے نام	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۱ء
۱۵)	آزاد بنام نذیرؔ	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۰ء
۱۶)	محبوب و نذیر فنکار بے نظیر	ڈاکٹر عظیم راہیؔ	۲۰۱۳ء
۱۷)	کلیاتِ آزاد سیکری	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۲ء
۱۸)	مختلف جہات شخصیت ملک تا سے	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۲ء
۱۹)	میخانہ اُردو کا پیر مغاں نارنگ ساقی	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۲ء
۲۰)	علیم صبا نویدی اور اردو ادب کے نئے زاویے	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۴ء
۲۱)	ارشد مینا نگری ہندوستانی ذہن و تہذیب کا نمائندہ شاعر	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۴ء
۲۲)	دیو داس بسمل۔ حیات و ادب	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۵ء

۲۳)	چٹانوں کے بیچ	نذیرؔ فتح پوری	۱۹۷۵ء
۲۴)	زخم اور آہیں	نذیرؔ فتح پوری	۱۹۷۷ء
۲۵)	نذیرؔ فتح پوری کی ادبی فتوحات	ڈاکٹر سیفی سرونجی	۲۰۱۴ء
۲۶)	ریزہ ریزہ دل	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۵ء
۲۷)	میرا دیش مہان	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۳ء
۲۸)	پشاور کی ۱۷ کہانیاں	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۵ء
۲۹)	پونے سے رانچی کا سفر	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۱ء
۳۰)	لفظوں کے سائے تلے	نذیرؔ فتح پوری	۱۹۹۵ء
۳۱)	تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۳ء
۳۲)	شعرائے پونہ۔ایک تحقیق	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۵ء
۳۳)	پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق ۱۹۲۳ تا حال	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۰ء
۳۴)	امیر تیمور	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۰ء
۳۵)	امیر تیمور ہندوستان میں	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۱ء
۳۶)	اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۱ء
۳۷)	جگن ناتھ آزاد۔ایک مستقل ادارہ	نذیرؔ فتح پوری	۱۹۹۸ء
۳۸)	ساحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۷ء
۳۹)	اہلِ ادب کی تنقیدی و تحقیقی نظر	ساحر شیوی	۲۰۱۴ء
۴۰)	ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۸ء
۴۱)	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۰ء
۴۲)	گوپی چند نارنگ ایک ہمہ جہت شخصیت	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۳ء
۴۳)	میری شاعری میں جانور	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۴ء
۴۴)	مناظر صاحب کتابیں ملیں	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۱۴ء
۴۵)	غزل اندر غزل	نذیرؔ فتح پوری	۱۹۸۸ء
۴۶)	اکرام	نذیرؔ فتح پوری/محبوب راہیؔ	۱۹۹۸ء
۴۷)	یہ زمین میری ہے	نذیرؔ فتح پوری	۲۰۰۳ء

۴۸)	نظم سفر	نذیر فتح پوری	۲۰۱۴ء
۴۹)	بچو آؤ گیت سنائیں	نذیر فتح پوری	۲۰۱۴ء
۵۰)	اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۱۹۸۷ء
۵۱)	تاریخ ادب اردو	نور الحسن نقوی	۲۰۰۹ء
۵۲)	کاشف الحقائق	امداد امام اثر	۱۹۵۱ء
۵۳)	جواب زہر خند	نذیر فتح پوری	۲۰۱۱ء
۵۴)	ریگ رواں	نذیر فتح پوری	۱۹۹۷ء
۵۵)	نذیر فتح پوری نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰۰۸ء
۵۶)	میرے گیت اکیلے رہ گئے	نذیر فتح پوری	۲۰۰ء

PAPER AND MAGZINES

رسائل وجرائد

نمبر شمار	رسالے/ جریدے کا نام	مقام اشاعت	سنِ اشاعت
۱)	سہ ماہی اسباق	پونہ	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۲)	ماہنامہ۔ رنگ وبو	حیدرآباد	اکتوبر ۲۰۱۱ء
۳)	سہ ماہی۔ اسباق	پونہ	اپریل تا جون ۲۰۱۳ء
۴)	ماہنامہ رہنمائے تعلیم جدید	دہلی	نومبر ۲۰۱۲ء
۵)	سہ ماہی۔ رنگ	دھنباد	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۶)	ماہنامہ رہنمائے تعلیم جدبد	دہلی	جون ۲۰۱۲ء
۷)	جدید ادب	جرمنی	جنوری تا جون ۲۰۱۲ء شمارہ ۱۸
۸)	ماہنامہ۔ خاتونِ مشرق	دہلی	جولائی ۱۹۷۸ء
۹)	ماہنامہ۔ انشاء	کولکاتا	جولائی، اگست ۲۰۱۲ء جلد ۲۷ شمارہ ۷۔۸
۱۰)	ماہنامہ۔ زریں شعاعیں	بینگلور	جنوری ۲۰۰۸ء جلد ۲۰، شمارہ ۱
۱۱)	ماہنامہ۔ ہم سخن ٹائمس	بھوپال	اپریل تا مئی ۲۰۱۴ء جلد۔ ا شمارہ ا
۱۲)	سہ ماہی۔ اردو	امراوتی	اپریل تا جون ۲۰۱۴ء جلد ۳۔ شمارہ ۲

۱۳)	سہ ماہی۔اسباق	پونہ	جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء
۱۴)	ماہنامہ۔زریں شعاعیں	بینگلور	ستمبر ۲۰۰۹ء جلد ۲۰ شمارہ ۹۰
۱۵)	سہ ماہی۔عکس ادب	اورنگ آباد	جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، جلد ا، شمارہ ۴
۱۶)	ماہنامہ۔زبان وادب	پٹنہ	جولائی ۲۰۱۳ء
۱۷)	ماہنامہ۔رہنمائے تعلیم جدید	دہلی	فروری مارچ ۲۰۱۲ء جلد ۷۵۔شمارہ ۶۔۷
۱۸)	ششماہی۔احساس	مالیگاؤں	جون تا دسمبر ۲۰۱۴ء
۱۹)	سہ ماہی۔اسباق	پونہ	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء
۲۰)	سہ ماہی۔اسباق ماں کے نام	پونہ	اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء
۲۱)	سہ ماہی۔اسباق، علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر	پونہ	جولائی ۲۰۰۱ تا مارچ ۲۰۰۲ء
۲۲)	ماہناہ۔رہنمائے تعلیم جدید	دہلی	مئی ۲۰۱۳ء جلد۔۲ شمارہ۔۹

☆☆☆